ترجمۂ قرآن کے اُصول و ضوابط کے حوالہ سے
حضرت شیخ المشائخ قبلہ پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی لازوال تحریر

اُصولِ ترجمہ

تصنیف
شیخ المشائخ، پیرِ طریقت، رہبرِ شریعت
شیخ الحدیث والتفسیر مولانا پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

مکتبہ آوازِ حق
دار العلوم جامعہ غوثیہ معینیہ
بیرون یکہ توت پشاور شہر
091-2560759

حضور قبلہ پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، کی تراجم کے اُصول کے حوالہ سے ایک لازوال تحریر

اُصولِ ترجمہ

از

شیخ المشائخ، پیرِ طریقت رہبر شریعت شیخ الحدیث والتفسیر

مولانا پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ادارہ غوثیہ معینیہ پشاور پاکستان

ناشر

مکتبہ آوازِ حق دار العلوم جامعہ غوثیہ معینیہ بیرون یکہ توت پشاور شہر

0316-9567661

نام کتاب	:	اُصولِ ترجمہ
مصنف	:	شیخ المشائخ مولانا پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
کمپوزر	:	عاطف شہزاد چشتی
نظر ثانی	:	اُستاذِ حدیث سید ظاہر علی شاہ، پروفیسر آلِ اظہر صاحب
ناشر	:	مکتبۂ آوازِ حق دارالعلوم جامعہ غوثیہ معینیہ بیرون یکہ توت پشاور شہر
تعداد	:	1100
سالِ اشاعت	:	جنوری، 2017ء
قیمت	:	530 روپے

التماس

حضرت قبلہ شیخ المشائخ پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی یہ تحریر ''اُصولِ ترجمہ'' دراصل اُن کی زیرِ سرپرستی شائع ہونے والے جریدہ ماہنامہ آوازِ حق میں ماہ بہ ماہ قسط وار شائع ہوتی رہی۔ حضرت شیخ المشائخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی حیات میں ہی اسے کتابی شکل میں ترتیب دے کر نظرِ ثانی کر لی تھی مگر زندگی نے وفا نہ کی۔

اس کتاب کی تدوین واشاعت میں قرآن کریم کی آیات اور احادیث نبوی ﷺ کے حوالہ جات میں ہر ممکن احتیاط برتی گئی ہے تاہم ادارہ کسی بھی نادانستہ غلطی کے لیے معذرت خواہ ہے اور اس کی نشان دہی کے لیے قارئین کا ممنون ہوگا۔

اس کتاب کے مضمون اور بیان کردہ حقائق کے حوالہ سے ہم اپنے معزز قارئین کی آراء، تجاویز اور مثبت تنقید کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

اِس کتاب کے حوالہ سے قارئین کے ذہن میں کوئی اشتباہ ہو تو اس کو دور کرنے کے لیے بھی ادارہ ھٰذا سے رابطہ کیا جا سکتا ہے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اُس کا ازالہ کیا جا سکے۔

منجانب:۔

صاحبزادہ ڈاکٹر مولانا صدیق علی چشتی

﴿کتاب ملنے کے پتے﴾

☆ المکتبۃ النظامیہ جامع مسجد ابوایوب انصاری گھنٹہ گھر پشاور۔ 0335-8317496

☆ نظامیہ کتاب گھر۔ زبیدہ سنٹر ۴۰ اُردو بازار لاہور 0301-4377868

☆ دارالنور دکان نمبر ۴ مرکز الاولیس دربار مارکیٹ لاہور 04237247702

☆ مکتبہ غوثیہ۔ یونیورسٹی روڈ، بالمقابل عسکری پارک کراچی 021-34926110

☆ مکتبہ اعلیٰ حضرت دربار مارکیٹ لاہور 04237247301

☆ مکتبہ المصطفیٰ چکدرہ 0343-9070902

☆ شبیر برادرز زبیدہ سنٹر ۴۰، اُردو بازار لاہور 042-37246006

☆ مکتبہ امام احمد رضا کری روڈ راولپنڈی 0514907446

☆ اہل السنہ پبلی کیشنز دینہ جہلم 03335833360

☆ مکتبہ دارالاحناف کامران مارکیٹ نیواڈا امردان 03119231283

☆ مکتبہ غفوریہ قادریہ طارق آباد تندوڈاک سوات 03449294923

☆ مکتبہ اہلسنت مکہ سنٹر دوکان نمبر ۳، بیسمنٹ نزد لوئر مال تھانہ اُردو بازار لاہور

☆ مکتبہ رضائے مصطفیٰ پیپل منڈی پشاور۔ 0300-5864762

☆☆☆☆☆

یادداشت

دورانِ مطالعہ ضرورتاً انڈر لائن کیجئے، اشارات لکھ کر صفحہ نمبر نوٹ فرما لیجئے۔

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر

فہرست

پیش لفظ

اہل علم پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کا حق ادا کرنا نہایت مشکل اور پیچیدہ کام ہے متعلقہ زبانوں کے روزمرہ ومحاورات، گرائمر، تشبیہات اور استعارات سے واقفیت رکھنے کے علاوہ ان زبانوں کے مزاج کو سمجھنا بھی نہایت ضروری ہے کہ جس کے بغیر ترجمہ کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید کا ترجمہ کرنا کلام الٰہی ہونے کے اعتبار سے اور بھی احتیاط کا متقاضی ہے۔ اردو زبان قرآن کے تراجم کے حوالہ سے دو سو سال کی شاندار تاریخ رکھتی ہے جس میں مختلف مکاتب فکر کے علماء ومشاہیر نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اور وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل کی۔

قرآن مجید کے ان تراجم میں کئی ایسی خصوصیات ملتی ہیں جو کہ مختلف مترجمین کے اپنے آپس مناہج کے یکسانیت کو ظاہر کرتی ہیں لیکن اسکے ساتھ ساتھ بہت سارے ایسے پہلو بھی ہیں جن میں اردو کے یہ تراجم ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد جہات لئے ہوئے ہیں۔ اس حوالہ سے قرآن مجید کے بہت سارے مقامات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ برصغیر میں قرآن مجید کی اردو زبان میں ترجمہ کے حوالہ سے اسکی دو سو سالہ تاریخ میں آج تک جتنے بھی تراجم ہوئے ہیں ان کی اکثریت ترجمہ کے حوالہ سے مختلف لسانی کمزوریوں کا شکار رہی ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف مسلمان قارئین مختلف لسانی واعتقادی مغالطات میں پڑتے ہیں بلکہ ان غیر معیاری تراجم کی وجہ سے غیر مسلموں کو بھی سوالات اٹھانے کے مواقع ملتے ہیں۔ قرآن شریف کے ترجمہ کی اہمیت نہ

صرف اِس وجہ سے ہے کہ اسلامی معاشرہ میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں، پڑھتے ہیں، پڑھاتے ہیں اور کلام اللہ کا ترجمہ ہونے کی حیثیت سے اِس سے استفادہ کرتے ہیں، تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور کلام اللہ کا ترجمہ کہہ کر اس پر اعتماد کرتے ہیں بلکہ غیر مسلموں کا وہ طبقہ جو قرآن شریف سے روشنی لینے کی خواہش رکھتا ہے اور اس مقصد کیلئے لسانی مجبوری کی وجہ سے صرف ترجمہ پر اکتفا کرتا ہے۔ نیز وہ طبقہ جو قرآن شریف کا اپنی دسترس زبان میں کیے ہوئے ہر ترجمہ کو ''معنوی قرآن'' کہہ کر اس کی غلطیوں کو قرآن شریف کی طرف منسوب کرتا ہے اور قرآن شریف کو غیر فطری کتاب کہنے جیسے اعتراضات اُٹھاتا ہے، بالخصوص مستشرقین یورپ اور امریکہ کی ایسے مواقع پر خاص نظر ہوتی ہے۔

قرآن شریف کا ترجمہ سب سے مشکل اور سب سے اہم ترین عبادت ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ جس زبان میں بھی کیا گیا ہو وہ اُس زبان میں ''معنوی قرآن'' کہلاتا ہے اور بعض احکام کے حوالہ سے یہ بھی لفظی قرآن جیسا ہوتا ہے۔ انجام کار جن قارئین کو قرآن شریف کے معیاری اور غیر معیاری تراجم کی تمیز نہیں ہوتی وہ غیر معیاری اور غلط ترجمہ کو بھی معنوی قرآن سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہوتے ہیں جس سے کئی اور غلطیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں جس وجہ سے قرآن شریف کے غیر معیاری ترجمہ کو اگر الٰہیات کے حوالہ سے اُمُّ الاغلاط کہا جائے تو بے مصرف نہ ہوگا۔ اِس عظیم علمی دینی کوتاہی یعنی غیر معیاری تراجم کی اصل وجہ قرآن کریم کے ترجمہ کی فطری شرائط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

زیر نظر کتاب ''**اُصول ترجمہ**'' پاکستان کے معروف عالم دین حضرت شیخ المشائخ مولانا پیر محمد چشتی نور اللہ مرقدہ کی ایسی تصنیف ہے جس میں انہوں نے ترجمہ قرآن کے حوالہ سے نہ صرف مترجم کیلئے لازمی اصول و شرائط بیان کئے ہیں بلکہ موجودہ اردو تراجم میں موجود خطرناک

علمی و اعتقادی غلطیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔اس کتاب کے عمیق مطالعہ سے نہ صرف فن ترجمہ کے ضروری قواعد سے شناسائی حاصل ہوتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے آخری الہامی کتاب قرآن مجید کے نص کو سمجھنے کی نئی راہیں کھل جاتی ہیں۔اس کے علاوہ ''اُصول ترجمہ'' میں اس بات کو واضح طور پر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مختلف اردو تراجمِ قرآن کو کن کن مشکلات اور علمی کمزوریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے؟اس کے ساتھ ساتھ حضور شیخ المشائخ رحمہ اللہ نے اس تصنیف میں وضاحت کی ہے کہ قرآن مجید کا معیاری ترجمہ کیسا ہو جو کہ نہ صرف ترجمہ کے حوالہ سے مختلف ضروریات و تقاضوں کو پورا کرتا ہو بلکہ علمی و اعتقادی مسائل کو بھی مدنظر رکھتا ہو۔

بدقسمتی سے ترجمہ قرآن کے اصول وضوابط کے حوالہ سے مارکیٹ میں کوئی بھی معیاری کتاب دستیاب نہیں ہے جس میں اس موضوع کے مختلف جہات و جوانب کو جامع انداز میں بیان کیا گیا ہو۔اس حوالہ سے زیرنظر کتاب قرآن فہمی اور تراجمِ قرآن کے حوالہ سے علمی حلقوں میں ایک بے نظیر و بیمثال اضافہ ہوگا جو قرآنی علوم بالخصوص ترجمہ قرآن کے جملہ شائقین کی راہنمائی کے لئے کافی ہوگا۔انشاءاللہ تعالیٰ

قرآنی علوم کے شائقین کے لئے بالعلوم اور حضرت شیخ المشائخ قبلہ پیر محمد چشتی رحمہ اللہ کی تحریرات اور علمی جواہر پاروں سے شغف رکھنے والے قارئین کے لئے بالخصوص یہاں ایک اہم بات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ زیرنظر کتاب ''اُصول ترجمہ'' اپنے موضوع کے لحاظ سے منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ترجمہ قرآن کے حوالہ سے اس کتاب میں بیان کیے گئے اصول و ضوابط کو پہلی بار واضح مثالوں کے ذریعہ ایسی شرح وبسط کے ساتھ قارئین تک پہنچایا جارہا ہے۔جس سے ایک طرف عام مسلمان جو قرآن فہمی کا جویاں ہے،کو علمی فائدہ ہوگا تو دوسری طرف علم دین سے وابستہ علماء کرام کو بھی ترجمہ قرآن کے حوالہ سے اپنے منہج کو صحیح سمت میں ڈھالنے اور غلطیوں

سے بچنے کے راہنما اُصول میسر آئیں گے۔ اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''اُصول ترجمہ'' کو بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد جہاں قرآن فہمی کی نئی جہتیں کھلتی ہیں وہاں قرآنی نص سے دیگر علوم وفنون مثلاً علم کلام، علم نحو، بلاغت، معقولات سمیت علم تصوف اور سلوک و عرفان کے عملی تطبیقات سے بھی (پڑھنے والے کی ذاتی استعداد کے مطابق) شناسائی حاصل ہوتی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ قرآن فہمی کے حوالہ سے حضرت قبلہ شیخ المشائخ مولانا پیر محمد چشتی نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہ الشَّرِیْف کے ہاتھ کی تحریر کردہ **''اُصول ترجمہ''** اور **''تفسیر مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن، ۳۰ جلدیں''** کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کے ترجمہ میں غلطی سے بچاؤ ممکن ہوگا بلکہ قرآن کریم کے ظاہری و پوشیدہ اسرار و معارف سے بھی تعارف و آگہی حاصل ہونے کا بہترین ذریعہ میسر ہوگا۔

مولانا صدیق علی چشتی،

جامعہ غوثیہ معینیہ بیرون یکہ توت، پشاور شہر،

استاذ شعبہ تقابل ادیان، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

حالاتِ مصنف بقلمِ مصنف

(نوٹ:۔ زیرِ نظر مضمون حضرت شیخ المشائخ قبلہ پیر محمد چشتی صاحب نے اپنی حیات میں ہی آج سے قریباً پانچ (۵) سال قبل سپردِ قلم کیا تھا۔ لہٰذا قارئین سے گزارش ہے کہ اس مضمون کو اسی تناظر میں دیکھا اور پڑھا جائے۔)

آج 2010ء سے تقریباً 73 سال قبل شاگروم میں پیدا ہوا۔ شاگروم نام کا یہ وسیع و عریض گاؤں درہ تریچ کی آخری آبادی ہے ضلع چترال تحصیل ملکھو کا یہ درہ میری پیدائش سے پہلے بھی مردم خیزی میں مشہور تھا جس میں نوابی دور کے علم دشمن ماحول میں بھی محمد جناب شاہ اور قاضی بدر الدین خواجہ جیسی ہستیاں بالترتیب عصری اور مذہبی علوم کی روشنی پھیلا رہی تھیں۔ نوابوں کے تعلیم دشمن ماحول سے آزادی اور ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہو جانے کے بعد بھی چترال کے اِس درہ سے اچھے خاصے اہل علم پیدا ہوئے میری پیدائش ریاستی دور کے جس ماحول میں ہوئی وہ کچھ اس طرح تھا کہ نوابوں کے بچوں کیلئے ابتدائی تعلیم کا انتظام مقامی طور پر میسّر تھا جبکہ قرآن شریف ناظرہ پڑھنے اور نماز و روزہ جیسے ضروری احکام سے روشناس ہونے کے ساتھ مڈل تک دُنیوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے پشاور، دہلی، لاہور اور انگلینڈ کا رُخ کیا کرتے تھے جبکہ رعایا کے بچوں کی تعلیم کا قطعاً کوئی انتظام ہی نہیں تھا مگر یہ کہ نوابوں کے کارندوں سے چھپ کر ریاست کی حدود سے نکلنے میں کامیاب ہوتا تو سفر و غربت اور بے وطنی کی صعوبتیں برداشت کر کے مذہبی یا عصری تعلیم کی کچھ روشنی پاتا جن کی تعداد اکائیوں سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔

فقدانِ تعلیم کی اِس بدحالی کے ساتھ معاشی زبوں حالی کا یہ عالم تھا کہ نوابوں کی گزر اوقات رعایا سے ظلماً وصول کیے جانے والے غلّہائے عشر پر ہوا کرتی تھی تو عام آدمیوں کی معیشت کا کہنا ہی کیا تھا درہ تریچ میں سب سے زیادہ قطعہ اراضی کے مالک ہونے کے باوجود ہمارے

خاندان میں بھی عمومی خوراک جو کی روٹی یا باجرہ کی روٹی ہوا کرتی تھی لیکن اِس کے ساتھ ہمارے خاندان پر ربِّ کریم جَلَّ جَلَالُہٗ وَعَمَّ نَوَالُہٗ کا خاص کرم یہ تھا کہ ہرن کے گوشت سے ہمارا گھر کبھی خالی نہ ہوتا تھا، میرے دادا جان (نام رحیم ولد عبدالکریم) جو اپنے وقت کے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ وفاداری، امانتداری، سخاوت، شجاعت اور صدقِ لہجہ میں مشہور تھے جن کی وفا شعاری کو دیکھ کر مہتر چترال نواب محمد ناصرالملک رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے اُنہیں امین دربار کے عہدے پر فائز کیا تھا جسکی بدولت اُنکے بیٹوں کو شاگروم سے ملحق بالائی شکارگاہوں کی اختیارداری اور ہر جگہ سے شکار کی اجازت تھی۔ میرے تایا شہزادہ رحیم (مرحوم) سرکاری شکاری ہونے کی بنا پر پورے چترال میں شکاری کے نام سے ہی مشہور تھے میرے (مرحوم) والد اُن سے عمر میں تقریباً تین سال چھوٹے تھے، گھریلو ذمہ داریوں سے زمینوں کی دیکھ بھال تک جملہ انتظامات کے نگران تھے جبکہ میرے چھوٹے چچا امام رحیم (مرحوم) اُن کے نائب و معاون تھے۔ میرے والد محمد رحیم ولد نام رحیم ہرن کے شکار سے لے کر ہر موسم کے پرندوں تک کا شکار کرنے میں پورے درہ تریچ میں اپنی مثال آپ تھے۔ شانِ قدرت ہے کہ شکار کر کے کھانے اور کھلانے والے اِس عظیم شکاری کو اِس حوالہ سے وہ شہرت نہیں ملی جو اُن کے بڑے بھائی شہزادہ رحیم کو ملی۔

علاقائی ماحول اور خاندانی روایات کا شعور پانے کے بعد میں بھی اُس راہ پر چلنے لگا جس پر چلتے ہوئے اپنے بڑوں کو دیکھا تھا لیکن شکار کے حوالہ سے میرے اور میرے بڑے بھائی جان مولانا شیر محمد مدظلہ العالی کا معاملہ اپنے بزرگوں سے مختلف رہا کیوں کہ ہمارے والد مرحوم و مغفور نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْفَ اپنے بڑے بھائی سے کئی گنا زیادہ فعّال اور ہر موسم کے شکار کا بہترین شکاری ہونے کے باوجود اپنے بڑے بھائی جیسی شہرت اِس حوالہ سے نہ پاسکے جبکہ میرے بڑے بھائی میرے مقابلہ میں کئی گنا اچھا شکاری ہوتے ہوئے بھی اِس حوالہ سے میری شہرت کو نہ پہنچ پائے حالانکہ وہ ہر موسم کے اچھے شکاری تھے چھوٹے پرندوں کے شکار کے حوالہ سے میری فنکاری کا یہ عالم تھا کہ ایک ہی درخت کے نیچے بیٹھ کر گھنٹہ سے دو گھنٹے کے دورانیہ میں پچاس

ساٹھ کی تعداد میں پرندے مار گراتا تھا مجھے مواد پہنچانے اور ذبح کرنے پر مقرر لڑکوں کا کہنا ہے کہ روزانہ کی یہ تعداد دو سو سے بھی زیادہ ہوا کرتی تھی۔ صحیح تعداد کے متعلق حتمی صورت مجھے یاد نہیں ہے۔(وَاللّٰهُ اَعْلَمُ)

یہاں پر شاید قارئین کو اُن پرندوں سے متعلق تعجب ہو کہ اس کثرت سے آنے والے وہ کیسے پرندے ہونگے اور وہ شکار گاہ کیسی ہوگی؟ تو اس کے متعلق یہ ہے کہ اُن دِنوں میں یعنی آج سے تقریباً نصف صدی قبل ہر قسم شکار کی بہتات ہونے کی طرح گندم اور باجرہ کی فصل جب پکنے کے قریب ہوتی تھی تو اُسے کھانے کے لیے پرندوں کی یہ نسل کثیر تعداد میں آیا کرتی تھی۔ جس کو کھوار زبان میں شوبیچ کہا جاتا ہے جو جسامت میں اندازاً تین چڑیوں کے برابر ہوتا ہے اور رنگت کے اعتبار سے اُن کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک خاکستری سفید، دوسری وہ جس کا سر اور گردن سمیت سینے کا بالائی حصہ سرخ باقی سارا حصہ خاکستری جو خوبصورتی و دلکشی میں اپنی مثال آپ ہے اور گوشت اُس کا بہت لذیذ ہوتا ہے۔ درہ تریچ سمیت چترال کے بالائی حصہ کی تینوں تحصیلوں میں اُس کی کثرت کیساتھ آمد کا موسم ماہ ستمبر ہوا کرتا تھا لیکن دُنیا کی ارتقائی زندگی کے دوسرے شعبوں میں نمایاں تبدیلیاں آنے کی طرح ہر موسم کے شکار میں بھی کافی حد تک تبدیلیاں آچکی ہیں۔ کیمیائی کھاد کی وجہ سے گندم کی پیداوار زیادہ ہونے کی بناء پر باجرہ کی کاشت ہی ہمارے علاقہ سے ناپید ہو چکی ہے یہ باجرہ بھی خاص نسل کا ہوتا تھا جس کو کھوار زبان میں اُڑین کہا جاتا تھا جو آج سے نصف صدی قبل ہماری عمومی خوراک ہوا کرتا تھا اور گندم کی فصل ستمبر میں پکنے کے بجائے ترقی کر کے اگست کے اوائل میں ہی تیار ہوتی ہے جس وجہ سے شوبیچ کی اُس کثرت سے آمد رہی نہ اُس کے شکار کا رواج۔ اگر کوئی اِکا دُکا دانہ اُڑتا ہوا نظر آتا ہے اُسے ماضی کی یادگار تصور کیا جاتا ہے۔ جس درخت کو میں نے شکار گاہ بنایا ہوا تھا وہ شنلک کی درمیانہ سائز کی لمبائی والا درخت تھا جس کی لمبائی اندازاً ۱۵ سے ۲۰ فٹ تک ہوگی جس کے نیچے اندازاً آٹھ کنال میں پھیلی ہوئی گندم کی فصل اور بعض سالوں میں اُڑین کی فصل ہوا کرتی تھی۔ وہ دلکش و حسین منظر میرے

لئے بھولنے کی چیز نہیں ہے جب لیبرِک وَ اِشپُر و بِرِک شو بچ کا روم (سیل) آ کر اُوپر سے درخت کو ڈھانپتا تھا اور نیچے سے میں شو نجور سے اُنہیں مار گرایا کرتا تھا۔ الغرض اُس وقت کے شکار کے حوالہ سے اپنے ماضی کے رَکن رَکن حسین جھروکوں کا تصور نہیں کرتا بلکہ ایک ایک کے تصور پر کلام اِقبال بے ساختہ زبان پر آتا ہے کہ ع

یاد آتا ہے مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

مذہبی تعلیم میں آنے کے غیبی اسباب:۔ برادری کی بزرگ ہستی صوفی گل محمد مرحوم کے پاس دوسرے لڑکوں کے ہمراہ قرآن شریف کا ناظرہ سبق پڑھ رہا تھا۔ ایک دن سبق یاد نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے ہاتھوں مار پڑی اُنہوں نے کہا کہ ''شیر ڈشمن بن گوئے تہ کریھو کتابان برے تان اَچا کسیر'' جس کا ترجمہ یہ ہے کہ شیر محمد عالم دین بن کر آئے گا تجھ پر کتابیں لاد کر اپنے پیچھے پھیرائے گا۔ مزید وضاحت اِس کی یہ ہے کہ میرے بڑے بھائی صاحب کا نام شیر محمد ہے جس کو لڑکپن میں شیر کہہ کر پکارا جاتا تھا اور وہ مذہبی تعلیم کے لیے مسافرت میں تھا۔

صوفی گل محمد کی اِس بات کا مجھ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ میں نے بھی مذہبی تعلیم کے لیے مسافرت اختیار کی، عرصہ ایک سال تک انگور کلی علاقہ ورسک چارسدہ میں ترکی حاجی صاحب مرحوم کے مدرسہ میں اپنے بڑے بھائی مولانا شیر محمد اور گاؤں کے اور چند لڑکوں کے ہمراہ مولانا عبدالعزیز چترالی (مرحوم) کے درس میں ابتدائی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ دوسرے سال میں پشاور شہر میں آ کر اُس وقت کے دارالعلوم سرحد واقع مسجد غلام جیلانی میں داخلہ لیا تقریباً تین سال تک یہیں پر ابتدائی کتابیں حضرت مولانا مفتی عبداللطیف، حضرت مولانا پائندہ محمد عرف کابل اُستاذ، حضرت مولانا محمد عمر چکسر استاذ جیسے کہنہ مشق و مشفق اساتذہ سے پڑھی۔ اِس دوران کے میرے رفقاء درس میں سے مولانا محمد وزیر سکنہ نشکو چترال (مرحوم)، مولانا کبیر شاہ سکنہ مدک چترال (حیات)، مولانا حاجی ابراہیم سکنہ ورکوپ چترال (حیات)، مجھے یاد ہیں جو ہر اعتبار سے قابل

ستائش طلباء تھے۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی سے اِن تین سالوں میں دارالعلوم کے تمام طلباء میں نمایاں حیثیت رہی کسی بھی کتاب اور کسی بھی امتحان میں کوئی اور مجھ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے نہیں پایا۔ اِس پر مستزاد یہ کہ دارالعلوم کے سالانہ جلسہ میں طلباء کی نمائندگی کرتے ہوئے عربی زبان میں جو تقریر کیا کرتا تھا وہ مزید شہرت کا سبب بنی۔ تین سال یہیں پر اوسط درجہ تک کتابیں پڑھنے کے بعد اُس وقت کے جامعہ اشرفیہ واقع ہندو متروکہ بلڈنگ نیلا گنبد لاہور چلا گیا لیکن لیٹ پہنچنے کی وجہ سے داخلہ نہ مل سکا تو مدرسہ تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی میں داخلہ لیا لیکن اسباق میں تسلی نہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ کر اُس وقت کے احسن المدارس واقع جامع مسجد الحنفیہ راولپنڈی میں جا کر داخلہ لیا اور مولانا اللہ بخش نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْف اور سید عارف اللہ شاہ رَحْمَۃُ اللّٰہِ تعالٰی عَلَیْہِ کی نگرانی میں چند کتابیں پڑھ کر سالانہ ماہ رمضان کی تعطیلات میں دورہ تفسیر پڑھنے کے لیے وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ حضرت ابوالحقائق مولانا عبدالغفور ہزاروی کے درس تفسیر میں شامل ہوا۔ جس میں (40) شرکاء درس میں سے جن رفقاء کے نام مجھے یاد ہیں، اُن میں:

1. پیر طریقت رہبر شریعت مولانا علاء الدین صدیقی مالک النور چینل انگلینڈ (حیات)۔
2. مولانا عبداللہ شاہ (مرحوم) مہتمم مدرسہ انوار الابرار ملتان۔
3. مولانا حافظ فضل احمد حال امریکہ۔
4. مولانا شیخ الحدیث نور حسین شیخ الدرس جامعہ مراڑیاں شریف گجرات۔
5. مولانا صادق شاہ کشمیری جن کی حیات و ممات کا علم نہیں ہے۔
6. پیر طریقت رہبر شریعت مولانا عابد حسین شاہ م (مرحوم) جو حضرت جماعت علی شاہ محدث علی پوری نارووال پنجاب کے سجادہ نشین تھے۔
7. مولانا مفتی عبدالشکور جو حضرت ابوالحقائق نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہُ کے صاحبزادے تھے جو اَب مرحوم ہو چکے ہیں۔

وزیر آباد کے دورہ تفسیر میں چالیس (40) دن کا دورانیہ کامیابی کیساتھ گزارنے اور امتیازی پوزیشن حاصل کرنے کے بعد دوسرے سال مولانا غلام رسول رضوی شیخ الحدیث و بانی جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور کے درس میں شامل ہوا اِس دوران اُن سے استفادہ کرنے کے علاوہ اُس وقت کے متعدد مشاہیر علماء لاہور سے بھی مستفیض ہونے کا اچھا موقع مل گیا۔ تعلیمی سال یہیں پر کامیابی کے ساتھ گزارنے اور امتیازی پوزیشن پانے کے بعد حضرت استاذ العلماء دُنیائے تدریس کے تاجدار مولانا عطاء محمد چشتی نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْفَ کے درس میں سیال شریف حاضر ہوا یہیں پر ایک سال کامیابی کے ساتھ گزارنے کے بعد جب استاذ مکرم بندیال کو منتقل ہوئے اُن کی ہمراہی میں وہیں جاکر دو سال تک حضرت کی کفش برداری کی سعادت پائی۔ سیال شریف سے لے کر بندیال شریف تک اِس دورانیہ میں حضرت مولانا صاحبزادہ عبدالحق بندیالوی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد اشرف سیالوی، حضرت شیخ المعقولات والمنقولات مولانا غلام محمد تونسوی جیسے قابل فخر رفقاء درس کی معیت رہی، بحمدہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ ابتک یہ سب کے سب حیات ہیں، جو علمی امانت کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔

درس نظامی کی آخری کتابوں کے اختتام پر غالباً 1961ء تھا، ملتان جاکر دورہ حدیث شریف کی تکمیل کے لیے شیخ الحدیث مولانا السید احمد سعید الکاظمی نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْفَ کے درس حدیث میں شامل ہوا، اُسی سال تنظیم المدارس اہل سنت پاکستان کی بنیاد بھی رکھی گئی تھی جس کے صدر حضرت غزالی زماں اور ناظم اعلیٰ مولانا غلام جہانیاں سکنہ ڈیرہ غازی خان مقرر ہوئے تھے اُن ہی کی کوششوں سے 1961ء میں تنظیم المدارس پاکستان کے زیر انتظام مدارس کے اُن طلباء کا تحریری امتحان لیا گیا تھا جو دورہ حدیث پڑھ کر فارغ تحصیل ہونے والے تھے وَن یونٹ کا زمانہ تھا موجودہ پاکستان کے چاروں صوبوں کو ملا کر مغربی پاکستان کہا جاتا تھا، سیاسی آزادی نہیں تھی، فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان (مرحوم) کا دور تھا، ذوالفقار علی بھٹو (مرحوم) ایوب خان کے وزیر

خارجہ تھے۔ تنظیم المدارس پاکستان کے اُس تاریخی امتحان میں مجھے ملک بھر سے فارغ تحصیل ہونے والوں میں پہلی پوزیشن پانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ جس کے بعد میری تدریسی خدمات حاصل کرنے کیلئے جامعہ غوثیہ کہروڑ پکا ملتان، جامعہ نعیمیہ لاہور، جامعہ سراج العلوم خانپور رحیم یارخان کے منتظمین ایک دوسرے سے آگے بڑھنے لگے جبکہ میرے شیخ فی الحدیث حضرت غزالی زماں نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْفَ مجھے اپنے مدرسہ انوار العلوم ملتان میں ہی مقرر کرنا چاہتے تھے لیکن خانپور کے حافظ سراج احمد رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ کی طلب کو اپنی پسند پر ترجیح دیتے ہوئے مجھے خانپور ضلع رحیم یارخان بھیج دیا۔ جہاں پر تقریباً دو سال تک منتہی طلباء کو پڑھانے کی سعادت نصیب ہوئی جن میں سے مولانا سید محمد فاروق القادری سجادہ نشین خانقاہ قادریہ، گڑھی اختیار خان ضلع رحیم یارخان، مولانا عزیز الرحمٰن درانی سکنہ خانپور، مولانا حافظ محمد خان، مولانا محمد احمد سکنہ خاص رحیم یارخان حال انگلینڈ، مولانا نذیر احمد حال مقیم مکہ معظمہ، مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم سکنہ دنین چترال کے نام اِس وقت یاد ہیں جبکہ حافظ سراج احمد مرحوم اور اُن کے صاحبزادے مولانا مختار احمد درانی مہتمم مدرسہ سراج العلوم جس اخلاص ومحبت سے پیش آتے رہے، وہ اب بھی مجھے یاد ہے۔

1964ء میں جب جامعہ عباسیہ بہاولپور اسلامی یونیورسٹی میں تبدیل ہو کر تخصص فی التفسیر والحدیث کے لیے اُمیدواروں کو امتحان کے لیے بلایا گیا میں بھی اپنے شیخ فی الحدیث کی ہدایات کے مطابق سراج العلوم خانپور کی تدریس سے استعفیٰ دے کر اُس میں شامل ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی غیبی توفیق سے اُس تاریخی امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی جس کا ملک بھر میں چرچا ہوا، سکالرشپ کے خصوصی اعزاز کے ساتھ تخصص فی التفسیر والحدیث کی کلاسوں سے مستفیض ہونے کے ابھی صرف چھ (6) ماہ گزرے تھے کہ جامعہ انوار العلوم ملتان کے طلباء نے کچھ داخلی سازشیوں کے دخل عمل سے ہنگامہ برپا کیا تو حضرت غزالی زماں نے حالات کنٹرول کرنے کے لیے شیخ الدرس بنا کر انوار العلوم ملتان بھیج دیا۔ شبانہ وروز محنت کر کے جب یہاں پر خوشگوار علمی فضا قائم

کرنے میں کامیاب ہوا تو یہاں کے کچھ کہنہ مشق سازشیوں نے میری سادگی اور نوجوانی کی ناتجربہ کاری سے فائدہ اُٹھا کر اعتماد کا ایسا دھوکہ دیا کہ حضرت غزالی زماں اور مفتی مسعود علی القادری رَحِمَہُمَا اللّٰہُ تَعَالٰی سے ہدایات لیے بغیر محض سازشیوں کے دھوکہ میں آ کر موسم گرما کی تعطیلات کا اعلان کر دیا۔ میرا یہ فیصلہ نہ صرف دینی مدارس کے مزاج و روایت کے منافی تھا بلکہ ہر اعتبار سے نامناسب وغلط تھا مجھے اپنی اِس غلطی کا احساس تب ہوا جب حضرت غزالی زماں نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْفَ کی طرف سے تفصیلی خط گھر کے پتہ پر وصول ہوا، جس میں اس کے پس منظر سے مجھے آگاہ کرنے کے ساتھ اِس کو نوجوانی کی ناتجربہ کاری اور حاسدوں کی سازش سے بے علمی کا نتیجہ قرار دے کر مجھے جلد از جلد انوار العلوم واپس پہنچنے کا فرمایا گیا تھا۔ حضرت کا یہ مکتوب گرامی اُس وقت مجھے وصول ہوا جب میں بیماری سے نڈھال تھا اور علاج کے لیے میو ہسپتال لاہور جانے کی تیاری تھی جس کے بعد حضرت مفتی اعجاز ولی شیخ الحدیث جامعہ نعمانیہ لاہور نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْفَ کی وساطت سے میو ہسپتال لاہور کے ایک بڑے ڈاکٹر جو پیر محمد کرم شاہ الازہری مرحوم کے برادرِ محترم تھے جن کا نام گرامی یاد نہیں آ رہا۔ اللہ تعالیٰ اُس جہاں میں اُنہیں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے کی نگرانی میں زیرِ علاج رہا۔ تقریباً تین ماہ لاہور میں علاج کے اِس دورانیہ میں جامعہ نظامیہ لاہور میں بڑی کلاسوں کو چند اسباق بھی پڑھاتا رہا، اِس دوران مجھ سے استفادہ کرنے والوں میں سے قاری خوشی محمد مرحوم اور مولانا حکیم اللہ داوگی مانسہرہ (ابھی حیات ہے) کے نام اِس وقت یاد ہیں۔

علاج سے فائدہ نہ ہونے پر کچھ تجربہ کار حضرات کے مشورے اور حضرت غزالی زماں کی نگرانی میں حضرت کے ہمسایہ حکیم عطاء اللہ مرحوم سکنہ محلہ قدیر آباد ملتان کے پاس پہنچا۔ نبض دیکھ کر انہوں نے مجھے تسلی دی اور فرمایا کہ جگر کی حرارت حد اعتدال سے تجاوز کیے ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے، ڈاکٹروں کی غلط تشخیص اور بے مصرف گرم دوائیوں نے

"جلتے پر تیل کا کام" کیا ہے۔ انجام کار حکیم عطاء اللہ مرحوم کے علاج سے چند ہفتوں میں بیماری سے نجات پانے کے بعد تصوف کی جان "فصوص الحکم" شریف پڑھنے کا دیرینہ شوق پورا کرنے کے لیے حضرت غزالی زماں کی اجازت سے مہر آباد شریف گوگڑاں ضلع لودھراں امام الواصلین، افضل العاملین، سند الکاملین، جامع المعقول والمنقول سیدی وسندی ومرشدی امام شاہ نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْفَ کی خدمت میں مہر آباد شریف پہنچا۔ صحیح النسب بخاری سادات کی یہ بستی کسی وقت "چاہ نئی والا" کے نام سے مشہور تھی، لیکن حضرت امام الواصلین کی علمی شخصیت، قال اللہ قال الرسول کی تعلیم وتبلیغ اور خلق خدا کی روحانی تربیت کی بدولت آہستہ آہستہ بستی کا نام تبدیل ہوکر سیدوں کی بستی مشہور ہونے لگی اور جس روز حضرت پیر مہر علی شاہ نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْفَ نے اپنے چہیتے خلیفہ کی احوال پرسی کے لیے یہاں پر قدم رنجہ فرمایا اُس دن سے اِس کا نام مہر آباد شریف پڑ گیا اور یہ دلکش نام اتنا مشہور ہوا کہ نئی نسل کو پرانے نام کا پتہ ہی نہیں ہے یہیں پر ڈیڑھ ماہ میں حضرت امام الواصلین نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْفَ سے فصوص الحکم شریف کا درس سبقاً سبقاً پڑھا۔ درس کے اختتام پر عید الفطر کی صبح کو عیدگاہ جانے سے قبل اپنے مبارک ہاتھوں سے میری دستار بندی فرمائی۔ یہاں پر اگر مہر آباد شریف میں قیام کے دوران حضرت کے لیل والنہار کے حوالہ سے اپنے حسین مشاہدات کا تذکرہ کروں یا فصوص الحکم شریف کے درس کے حوالہ سے فیوضات وبرکات اور مکاشفات کی تفصیل میں جاؤں تو اِس سے مستقل کتاب تیار ہوسکتی ہے لیکن میں نے یہیں پر اپنے ماضی کے جھروکوں کی صرف اور صرف اجمالی جھلک ضبط تحریر میں لانے کے سوا اور کچھ نہ کرنے کا التزام کیا ہوا ہے ورنہ مہر آباد شریف سے میری کافی سے زیادہ حسین یادیں وابستہ ہیں۔ تاہم فرمان الٰہی "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ "(۱) پر عمل کرتے ہوئے اِس حقیقت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت کے فیض رساں درس میں فصوص الحکم شریف پڑھنے

۱۔ الضحیٰ، 11۔

کے بعد شرح صدر کی وہ توفیق مجھے میسّر ہوئی جس کے بعد الٰہیات کے مشکل سے مشکل مسائل آسان ہونے لگے، درس نظامی کے جملہ فنون و کتب میں پوشیدہ رموز کا عقدہ کھلنے لگا اور بالخصوص قرآن وسنت کے معارف تک رسائی کی سبیل میسر ہوئی جسکے بعد فتاویٰ درالمختار کی اُس بات پر مجھے حق الیقین کا درجہ حاصل ہوا جو اُنہوں نے امام مجدالدین فیروز آبادی صاحب القاموس فی اللغۃ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وَمِن خواص کُتُبِہ اَنّ مَن واظَبَ علی مطالعتھا انشرَحَ صدرُہ لفَك المُعضلاتِ وَحَلِّ المشکلات''(۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی کتابوں کی خصوصیات میں سے ہے کہ جو ہمیشہ اُن کا مطالعہ کرتا ہے اُس کو لاینحل اور مشکل مسائل کا عقدہ کھولنے کے لیے شرح صدر کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔

اِس کے بعد حضرت غزالی زماں نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْف کی طرف سے جامعہ غوثیہ سکھر جا کر شیخ الدرس کا منصب سنبھالنے کا حکم ملا۔ تقریباً دو سال تک وہیں پر حضرت مولانا مفتی محمد حسین قادری نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْف کی نگرانی میں خدمات انجام دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اِس دوران حضرت مفتی صاحب مرحوم کی کمالِ شفقت ومحبت کیساتھ نواب وحید احمد خان ایڈوکیٹ مرحوم کا اخلاص اور حاجی محمد یعقوب مرحوم اور اُن کے بیٹوں کی میری ساتھ محبت بھولنے کی چیز نہیں ہے۔

یہاں پر مجھ سے درس پڑھنے والے حضرات میں صرف مولانا شمیم الحسن القادری حال خطیب کشمور، مولانا محمد فاروق مرحوم، مولانا مفتی محمد شریف خطیب روہڑی سکھر، مولانا حبیب احمد شیخ الحدیث جامعہ نوریہ کوئٹہ بلوچستان کے نام یاد ہیں۔

۱۔ فتاویٰ الدرالمختار، ج1، ص358، مطبوعہ مجتبائی دھلی۔

بعدازاں حضرت غزالی زمان کی ہدایات کے مطابق جامعہ غوثیہ معینیہ پشاور کی بنیاد 31 دسمبر 1966ء کو رکھ کر حسب استطاعت مذہبی خدمات انجام دے رہا ہوں۔اب تک میرے حلقہ درس سے بلاواسطہ علم وعمل کی تربیت حاصل کرنے کے بعد نمایاں خدمات انجام دینے والے حیات حضرات میں مندرجہ ذیل کے نام یاد ہیں:

(1) مولانا ڈاکٹر صدیق علی چشتی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد۔

(2) مولانا سید محمد فاروق القادری، سجادہ نشین خانقاہ قادریہ غفوریہ گڑھی اختیار خان، ضلع رحیم یار خان۔

(3) مولانا شاہ منیر چشتی، شیخ الحدیث دارالعلوم جامعہ جنیدیہ کارخانو خیبر روڈ پشاور۔

(4) مولانا سید محمد عرفان المشہدی خطیب یورپ۔

(5) مولانا حبیب احمد نقشبندی شیخ الحدیث جامعہ نوریہ کوئٹہ بلوچستان۔

(6) مولانا محمد قاسم چشتی شیخ الدرس دارالعلوم جامع مسجد العربی النبہان، خاران بلوچستان۔

(7) مولانا مفتی غلام صدیق قادری خطیب اعظم کوہ دامن اضاخیل متنی سرحد۔

(8) مولانا محمد صدیق نقشبندی شیخ الدرس دارالعلوم غوثیہ خالو غازی ہری پور۔

(9) مولانا پیر سید شیخ الدرس دارالعلوم قادریہ غفوریہ طارق آباد سوات۔

(10) مولانا قاری محمد انور بیگ امجدی چشتی قادری خطیب الجامع السنہری مسجد پشاور و مہتمم مدرسہ حدیقۃ القرآن پشاور۔

(11) مولانا محمد یعقوب القادری خطیب بروٹھہ اٹک۔

(12) مولانا سید منیر اللہ شاہ قادری خانقاہ قادریہ گڑھی بلوچ پشاور۔

(13) مولانا محمد درود پکتیا افغانستان

(14) مولانا محب الرحمٰن فاروقی ملکھو چترال۔

(15) مولانا قاری عطاء اللہ خطیب بلیم چترال۔

(16) مولانا جہاں شاہ رائین چترال۔

(17) مولانا محمد ضیاء الدین کراچی، اُستاذ جامعہ وقاریہ نارتھ ناظم آباد کراچی۔

(18) مولانا اخونزادہ عبدالرحمٰن لوگر افغانستان۔

(19) مولانا سید محمد صدیق بخاری خطیب شاہور جنوبی وزیرستان۔

(20) مولانا سید افضل مہتمم مدرسہ اسلامیہ حیات العلوم جلال آباد افغانستان۔

(21) مولانا حبیب اللہ خان شیخ الدرس دارالعلوم قادریہ اسبنڑ لوئر دیر۔

(22) مولانا عزیز الرحمٰن درانی خان پور ضلع رحیم یار خان۔

(23) مولانا نعمت اللہ استاذ جامعہ شمس العلوم نقشبندیہ خاران بلوچستان۔

(24) مولانا شادی خان چشتی خطیب ڈوڈا لکی مروت۔

(25) مولانا صاحبزادہ عبدالولی مہتمم مدرسہ جامعہ مومنیہ قادریہ ماشوگگر ضلع پشاور۔

(26) مولانا صاحبزادہ حمدُ اللہ سجادہ نشین حاجی محمد امین عمرزئی چارسدہ۔

(27) مولانا میاں محمد عمر انبار مہمند ایجنسی۔

(28) مولانا محمد اسحاق صدیقی شیخ الدرس فیضان مدینہ ایبٹ آباد۔

(29) مولانا الشیخ محمد عبداللہ خطیب داؤدزئی پشاور۔

(30) مولانا محمد صاحب الحق کٹھانہ پاتراک کوہستان ضلع دیر۔

(31) مولانا عبدالقادر چشتی خطیب کالام ضلع سوات۔

(32) مولانا احسان الملک باچا خطیب راموڑہ چکدرہ۔

(33) مولانا صاحبزادہ فضلِ منان خطیب کوہاٹ۔

(34) مولانا نور عزیز چشتی لیکچرار ڈگری کالج بروک دسپور چترال۔

(35) مولانا حبیب اللہ چشتی خطیب پڑانگ غار شنگی۔

(36) مولانا کلیم اللہ اُستاذ دارالعلوم جامعہ غوثیہ معینیہ پشاور۔

(37) مولانا قاری محمد حکیم مہتمم وخطیب جامعہ نجم النساء، گلبہار پشاور،......الحمد للہ علی توفیقہ اِفاضہ وتربیت کا یہ سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔

عمر کی اِس منزل میں ماضی کے نشیب وفراز کے آئینہ سبق سے جن تلخ وشیرین تجربات کا احساس کررہاہوں اُنہیں آئندہ کی امانتِ حیات کو بامقصد بنانے کے لیے رہنما اُصول سمجھ کر سفرِ حیات طے کررہاہوں، جن کی کچھ جھلکیاں یہ ہیں۔

جوانی کی عمر میں جو کام مجھے کرنے چاہئے تھے اور جن کو بہتر انداز میں انجام دے سکتا تھا وہ نہ کر پایا، جس کی سب سے بڑی وجہ مذہبی تعصب سے آلودہ معاشرہ ہے، تحقیق دشمن ماحول اور محدودیت کا زندان ہے، سیاست ناآشنا معاشرہ کا حصہ ہوتا ہے، اپنے وجود میں موجود خداداد صلاحیتوں سے بے اعتنائی اور زنگ آلود ماحول کی خرابی سے ناتجربہ کاری تھی۔ اے کاش! عمر کی اِس منزل میں پہنچ کر تجربہ کی جو روشنی محسوس کررہاہوں یہ اگر جوانی میں مجھے حاصل ہوتی تو ؎

ہم بھی آدمی تھے بڑے کام کے

O اللہ تعالیٰ جل جلالہ کا بے حد احسان ہے کہ عصبیت کے اُس حصار سے نکال کر حق پرستی، حق جوئی اور حق بینی کی شاہراہِ استقامت پر چلنے کی توفیق دی، لقمۂ حلال نصیب فرمایا، صبرو استقامت اور قناعت کی دولت سے سرفراز فرمایا۔

O اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت مجھ پر یہ بھی ہوئی کہ ابناءِ جنس کی روش کے برعکس کسی مذہبی ادارہ، انجمن، مدرسہ اور کسی بھی فورم کو حصولِ دُنیا کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ عائلی مصارف سے اضافی وسائل کو دینی مدرسہ سے لے کر تبلیغ حق کی راہ میں صرف کرنے کی توفیق شامل حال رہی، تقریر سے لے کر تحریر تک اور خطابت سے لے کر تدریس تک حسب استطاعت جس کی توفیق مل رہی ہے۔ اُسے دُنیاوی لالچ، شہرت، معاوضہ، نام ونمود وغیرہ کسی بھی دُنیوی مفاد سے بالاتر رہ کر حَسْبَةً لِلّٰہ انجام دینے کی بھی توفیق مل رہی ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے احسان دراحسان اور کرم بالائے کرم سمجھتا ہوں۔

○ رب کریم جل جلالہ کی مجھ پر خصوصی عنایت یہ بھی رہی کہ قناعت کی توفیق سے مجھے نوازا ہے کہ عائلی زندگی میں مابہ الکفاف سے زیادہ کی خواہش کبھی نہیں کی۔ضروریاتِ زندگی کے تمام گوشوں میں کفایت شعاری کی اِس توفیق کا ثمرہ ہے کہ کئی بار گزراوقات مشکل سے ہونے کے باوجود کسی کو بھی اپنی بے استطاعتی پر مطلع ہونے نہیں دیا،اپنے کسی بھی قریبی دوست احباب اور عقیدت کیشوں کا زیرِاحسان نہ ہوا،ہر حال میں ورثہ نبوت،محراب ومنبر کے تقدس اور علمی وقار کے تحفظ کو پیش نظر رکھا۔یہاں تک کہ اپنے ہاتھ سے قائم کردہ دارالعلوم کے مصارف کے لیے حکومتی امدادیا اہل ثروت کی زکوٰۃ وخیرات کو بھی کبھی خاطر میں نہیں لایا،دُنیا سے استغناء کی یہ توفیق رب کریم جلّ جلالہ وعمّ نوالہ کی مجھ پر خصوصی عنایت کے سوااور کچھ نہیں ہے ورنہ ؎

مَن انم کہ مَن دانم

وَصَلّٰی اللّٰهُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ وَصَحَابَتِهٖ اَجْمَعِیْنَ

وَاَنَاالْعَبْدُالضَّعِیْفُ

پیر محمد

چِشْتِی طَرِیْقَةً،وَالْحَنَفِی مَسْلَکًا،وَالْمُسْلِم مَذْهَبًا،

وَالْجَتْرَالِی مولدًا،وَالْبِشَاوَرِی مَسْکَنًا

☆☆☆☆☆

ابتدائیہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَه بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَه عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ (١) وقال في احاطة بعثته ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ (٢) فقال لتكميل مراده سبحانه و تعالى ﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ﴾ (٣) وقال لاظهار المقصد من انزاله ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُوْلُوا الْاَلْبَابِ﴾ (٤) فَصَلَوَاتُ اللّٰهِ وَ تَسْلِيْمَاته عَلَيْهِ وَ عَلٰى مَنِ اتبعه اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۔

بعد الحمد والصلوٰۃ! اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اِس کے کرم پر جتنا شکرادا کروں کم ہوگا کہ مولائے کریم نے مجھے قرآن کریم کے معارف کا جویاں بنایا اور زندگی کے ہر مرحلہ میں اِس سے رہنمائی ودستگیری پانے کی توفیق بخشی، سخی وفیاض قرآن نے کسی بھی مشکل میں مجھے مایوس نہیں کیا۔ تسلسل کے ساتھ درسِ قرآن اور نصف صدی پر مشتمل مطالعہ قرآن کے طویل تجربہ نے مجھے بہت کچھ دیا اور قرآنی معارف کے لانہایت ہونے سے متعلق علم الیقین سے عروج دے کر مجھے حق الیقین کے رُتبے تک پہنچایا۔ مقصدِ نزولِ قرآن کو پیشِ نظر رکھ کر ہر جدید مطالعہ نئے سے نئے معارف کے

(١) الفتح:28۔

(٢) الاعراف:158۔

(٣) الانعام:19۔

(٤) صٓ:29۔

انکشاف کا موجب بنا، تدبر فی القرآن کے اِس طویل دورانیہ میں مجھ پر حدیث نبوی ﷺ ﴿لا تنقضیٔ عجائبه﴾(۱) کے حقیقی معارف منکشف ہوئے۔ جن کی ایک جھلک اِس طرح ہے کہ قرآن شریف کی ہر آیت اور ہر جملہ بنیادی طور پر دو قسم معانی کا حامل ہے:

اول:۔ وہ جنہیں عام حالات میں لسانِ قرآنی والے یعنی عرب محض سننے اور پڑھنے سے ہی سمجھ سکتے ہیں انہیں مفہوم اول اور معانی اولیہ یا قرآن شریف کی بنیادی تعلیمات اور عمومی مفہومات بھی کہا جاسکتا ہے۔ عام اِس سے کہ یہ سمجھ اجمال کے درجہ میں ہو یا تفصیل کے انداز میں۔ اِجمال کی مثال کے لیے آیت کریمہ ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا

(۱) قرآن شریف کے تعارف میں وارد پوری حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے اِس طرح ہے:

"وَحَدَّثَنَاهُ مُحَمَّدُ بْنُ مَعْمَرٍ ، قَالَ: حَدَّثَنَا مَالِكُ بْنُ سُعَيْرٍ ، قَالَ: حَدَّثَنَا حَمْزَةُ الزَّيَّاتُ، عَنْ أَبِي الْمُخْتَارِ، قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ أَخِي الْحَارِثُ الْأَعْوَرُ، عَنِ الْحَارِثِ الْأَعْوَرِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ ، يَتَقَارَبَانِ فِي حَدِيثِهِمَا وَاللَّفْظُ لَفْظُ ابْنِ أَخِي الْحَارِثِ، عَنِ الْحَارِثِ الْأَعْوَرِ، عَنْ عَلِيٍّ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِنَّهَا سَتَكُونُ فِتْنَةٌ قَالَ: قُلْتُ فَمَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَارَسُولَ اللَّهِ ؟ قَالَ: كِتَابُ اللهِ فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ ، هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ مَنْ يَرُدُّهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللَّهُ ، وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدَى فِي غَيْرِهِ أَضَلَّهُ اللَّهُ هُوَ حَبْلُ اللهِ الْمَتِينُ وَالذِّكْرُ الْحَكِيمُ، وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ الَّذِي لَا تَزِيغُ بِهِ الْأَهْوَاءُ وَلَا تَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ رَدٍّ، وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ، وَهُوَ الَّذِي لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ حِينَ سَمِعَتْهُ أَنْ قَالُوا: إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ، مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ وَمَنْ عَمِلَ بِهِ أُجِرَ وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدَلَ وَمَنْ دُعِيَ إِلَيْهِ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ وَمَنِ اعْتَصَمَ بِهِ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ" (مسند البزار 18 مجلد کاملا، المجلد الثالث، ج:3، ص:71)

مَعَ الرّٰکِعِینَ ﴾(۱) کو دیکھا جاسکتا ہے جسے سننے یا پڑھنے سے ہی اہلِ لسان اتنا ضرور سمجھتے ہیں کہ اِس میں صلوٰۃ قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے اور راکعین کے ساتھ رکوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ باقی رہی یہ تفصیل کہ صلوٰۃ کی کیا حقیقت، ارکان، شرائط وآداب ہیں؟ اور زکوٰۃ کی کیا حقیقت اور تشریح ہے۔ اور اِسی طرح رکوع کی کیا حقیقت اور نوعیت ہے؟ اِس حوالہ سے پہلے مفہوم کو مفہومِ اجمالی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جس کے مقابلے میں تفصیل کے یہ مراتب مُفوّض الی الرسول ﷺ ہیں جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ﴾(۲) اِس کے ساتھ ''القرآن یفسر بعضه بعضا'' کی سبیل بھی موجود ہے اور عُلوم خادمہ لفہم القرآن کی متعدد راہیں بھی موجود ہیں۔ تفصیلی مفہوم کی تمثیل کے لیے دیباچۂ القرآن یعنی ''بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' شریف کو دیکھا جاسکتا ہے جسے پڑھنے اور سننے والا ہر اہلِ لسان کسی شک وتردد کے بغیر سمجھ لیتا ہے کہ اِس میں اللہ ''الرحمٰن، الرحیم'' کے نام کی مدد سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اِس مفہوم میں اجمال کی قطعاً کوئی شکل موجود نہیں ہے۔ بہر حال آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم اول کو سمجھنا عجم کے مقابلہ میں عرب کو آسان ہے کیوں کہ اِس سلسلہ میں اُنہیں کسی فن اور عُلومِ آلیہ اپنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بخلاف اہلِ عجم کے کہ اُنہیں اِس حوالہ سے کچھ عُلوم وفنون کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ جس وجہ سے اُنہیں علومِ آلیہ لفہم القرآن اور عُلومِ خادمہ للقرآن جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے جیسا علم تصریف، علم اشتقاق، علم متنِ لُغت، علم نحو، علم المعانی، علم البیان اور علم البدیع وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ غیر اہلِ لسان یعنی عجم کے لیے اِن فنون میں مہارت حاصل کیے بغیر آیاتِ قرآنیہ کے معانی اولیہ کو سمجھنا ممکن نہیں ہے گویا الٰہیات کی تعلیم وتعلم کے لیے اقوامِ عجم میں قائم مدارس وجامعات میں اِن علوم کو حاصل کرنے کے لیے جو محنت کی جاتی ہے اُس سے بنیادی مقصد اور غرض وغایت قرآن شریف

---

(۱) البقرۃ:43۔

(۲) النحل:44۔

کے اِن معانی کو سمجھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

دوم:۔ وہ جنہیں المفہوم الثانی من القرآن کہا جاتا ہے یعنی معانی اولیہ کو سمجھنے کے بعد دوسرے درجہ میں اُن کا اِدراک ہوسکتا ہے جن کی فہمائش کے لیے بعض مفسرین نے باب الاشارۃ کا عنوان منتخب کیا ہے جیسا السید محمود الالوسی البغدادی المتوفی 1270ھ آیاتِ قرآنیہ کے معانی اولیہ کے مطابق تفسیر کرنے کے بعد المعانی الثوانیہ کے اِن معارف کو ''ومن باب الاشارۃ'' کے مستقل عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں۔

محی الدین ابن عربی المتوفی 638ھ نے اِن ہی معانی ثوانیہ پر مشتمل چار مجلدات میں جو تفسیر لکھی ہے اُس کا نام ہی ''رحمۃ من الرحمٰن فی تفسیر اشارات القرآن'' رکھا ہے۔

قرآن شریف کے مفہومِ اول اور مفہومِ ثانی کے مابین اِس بنیادی فرق کے علاوہ درج ذیل وُجوہ تفریق کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے جس کے بغیر معانی اولیہ اور معانی ثوانیہ کے مابین اشتباہ ہوسکتا ہے:

❶ معانی اولیہ کا تعلق جمہور الناس سے ہے اور بلاتخصیص سب اُنہیں سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے پر مکلّف و مسئول ہیں جبکہ معانی ثوانیہ ایسے نہیں ہیں بلکہ مفہومِ اول اور اصل مقاصد سے اضافی معارف ہونے کی بنا پر اُن کی فہم و ادراک بھی خواص کو ہی نصیب ہوسکتا ہے یہ وہ حضرات ہیں جن سے متعلق حدیث میں آیا ہے ﴿مَن عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَه الله علم مالم يعلم﴾(۱) امام جلال الدین السیوطی المتوفی 911ھ نے بھی اِسے نقل کیا ہے (۲) شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے مفاہیم قرآنی کی اِس تقسیم اور مفہومِ ثانی کی توفیق پانے والے سعادت مندوں سے متعلق لکھا ہے ''واهل التدبير والتذكير لما اودع فی كتابه العزيز من

(۱) روح المعانی، ج: 1، ص: 91 تحت تفسیر سورۃ الفاتحہ مطبوعہ دارالاحیاء التراث العربی بیروت۔

(۲) الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص: 181، مطبوعہ حجازی بالقاہرہ۔

الاسرار والعلوم يفهم كل عبد علی قدر مقامه وذوقه و كشفه "(۱)اور آیت کریمہ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾(۲) کا عموم بھی اِس نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ قرآن شریف کے معانی اولیہ سے ثابت ہونے والے احکام پر عمل کیے بغیر معانی ثوانیہ کا عرفان ممکن نہیں ہے۔ جس کے مطابق آیاتِ قرآنیہ کے یہ دو مفہوم علم وعمل اور اخلاص کے حوالہ سے باہم سبب ومسبب کا ارتباط رکھتے ہیں کہ جس کو معانی اولیہ کا جتنا زیادہ علم ہوگا اور جتنا زیادہ اخلاص کے ساتھ اُن پر عمل ہوگا اُسی تناسب سے اُسے معانی ثوانیہ کا عرفان نصیب ہوگا۔ اِن کی مثالوں کے لیے بھی ﴿بسم الله الرحمن الرحيم﴾ کی ترتیب لفظی کی لپیٹ میں پوشیدہ رُموز واسرار اور حقائق ومعارف پر غور کیا جاسکتا ہے جو مختلف وقتوں میں خواص اہل اللہ کے قلوب پر منکشف ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی جب تک اربعہ عناصر کے اِس عالم ناسوت کا نظام قائم ہے اُس وقت تک منکشف ہوتے رہیں گے جس کے کچھ مرموزات سے میں نے تفسیر **"مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن"** کی پہلی جلد میں پردہ اُٹھایا ہے۔ اِسی طرح آیت کریمہ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾(۳) کی ترتیب سے لے کر اُس کے مفردات میں پوشیدہ رُموز ومعارف پر بھی غور کیا جاسکتا ہے جنھیں الٰہیات کے ماہرین "اسرار الصلوٰۃ والزکوٰۃ" کے عنوان سے یاد کرتے ہیں اور طبقۂ مفسرین سے لے کر اہل کشف صوفیاءِ کرام بھی اشاراۃ کے عنوان سے انکشافات کرتے ہیں۔ بہر حال اِن کی حقیقت وہی ہے جسے آیاتِ قرآنیہ کے معانی اولیہ کے بعد دوسرے درجہ میں معانی ثوانیہ، مفہومِ ثانی اور ثمرۃ العمل بالعلم جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

۲ معانی اولیہ کا علم وادراک اور اُن پر عمل ہر دورِ تاریخ کے لیے برابر ہیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ

---

(۱) مواقع النجوم، ص:86، مطبوعہ انتشارات مولیٰ طهران۔

(۲) ابراهيم:7۔

(۳) البقرۃ:43۔

ان کی فہم وادراک کسی خاص وقت یا کسی خاص ماحول کے ساتھ مختص ہو یا کسی وقت اُن پر عمل کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پابندی ہو بلکہ قرآن کریم کے نزول سے اصل مقصد ہی ان کے مطابق علم وعمل کا اجراء ہے جس میں توقف ایک لحظہ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔

اِن کے برعکس معانی ثوانیہ کا علم وادراک اور اُن کے مطابق عمل مختلف اوقات و ماحول کے ساتھ مختص ہے۔جو اپنے وقت سے ذرہ برابر آگے پیچھے نہیں ہو سکتے جس کی تحدید وتعیین فرمانِ الٰہی ﴿وَکُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ﴾(۱) کے عین مطابق جانبِ ازل سے اور ظہور میں آنا جانب ابد سے مربوط ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ﴾(۲) ظاہر ہے کہ یہاں پر لفظ ﴿شیء﴾ اپنے عموم وشیوع کی بنا پر جملہ اعیان وحوادث کو شامل ہونے کی طرح تمام معارف قرآنی کو بھی شامل ہے جن کا ادراک و انکشاف مختلف اَدوار تاریخ میں علمِ الٰہی کے عین مطابق ہوتا ہے۔

❸ معانی اولیہ کا دائرہ کار محدود ہے کہ اُمورِ مذہبیہ اور شرعی احکام اور علم وعمل تک منحصر ہیں کیوں کہ ان کے نزول سے اصل مقصد علم وعمل کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ معانی ثوانیہ کا دائرہ کار لامحدود ہے کہ شرعی احکام کے ساتھ مربوط ہوتے ہوئے اُمورِ تکوینیہ سے بھی مربوط ہوتے ہیں جن کی کوئی حد ہی نہیں ہے اِسی اعتبار سے حدیث شریف میں قرآن شریف کو ﴿حبل اللہ الممدود من السماء الی الارض﴾(۳) قرار دیا گیا ہے ایک اور حدیث میں اِن دونوں مفہوموں کی جدا جدا حد بندی کی گئی ہے اور ہر ایک کے ماحول اور وقتِ ظہور کے اختلاف کا اشارہ دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے ﴿ان لکل آیۃ ظھرا وبطنا ولکل حرف

---

(۱) الرعد:8۔

(۲) الحجر:21۔

(۳) ترمذی شریف، ج:2، ص:220، مطبوعہ میر محمد کراچی۔

حدا و مطلعا﴾(۱)

یہ حقائق خبر احادیث کے اِن اشارات تک محدود نہیں ہیں بلکہ قرآن شریف کے متعدد مقامات میں بھی اِن دونوں معانی کا افادہ کیا گیا ہے۔مفہومِ اول کے سہل الفہم اور عام ہونے سے متعلق فرمایا﴿وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ﴾(۲)

اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ ذکر و نصیحت اور علم کے لیے قرآن شریف کا آسان ہونا اُس کے مفہومِ ثانی اور معارف غامضہ کے اعتبار سے ہرگز نہیں بلکہ صرف مفہومِ اول کے اعتبار سے ہے مفسرین نے بھی یہی کہا ہے جو اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔نیز فرمایا:

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًی وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ﴾(۳)

نیز فرمایا:﴿مَا کَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَلٰکِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ﴾(۴)

ظاہر ہے کہ اِن آیات میں﴿کل شیء﴾اپنے عموم واطلاق کی بنا پر مایحتاج الیہ فی الدین والدنیا سے لے کر کائنات کے جملہ مادیات ومعنویات تک سب کو شامل ہیں اور ظاہری دلالت کے اِس عموم میں تخصیص کے لیے کوئی واضح دلیل وقرینہ موجود نہیں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن شریف کے معانی اولیہ اپنی محدودیت کی وجہ سے اُن سب کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ایسے میں قرآن شریف کو ہر شے کے لیے بیان وتفصیل کہنے سے مقصد اِس کے سوا اور کچھ نہیں رہتا کہ یہ سب کچھ اُس کے مفہوم ثانی کے اعتبار سے ہے یعنی جس اعتبار سے حدیث میں اسے﴿حبل

(۱) مشکوٰۃ شریف،ص:35،کتاب العلم،فصل الثانی۔

(۲) القمر:40۔

(۳) النحل:89۔

(٤) یوسف:111۔

اللہ المدود من السمآء الی الارض ﴾ کہا گیا ہے اُسی اعتبار سے قرآن شریف میں بھی ہر شے کا بیان و تفصیل کہا گیا ہے۔

❷ دوسرے انسانوں کو قرآن شریف کا ابلاغ مسلم اُمت پر جو فرض قرار دیا گیا ہے یہ ذمہ داری قرآن شریف کے معانی اولیہ کے اعتبار سے ہے معانی ثوانیہ کے ساتھ اِس عمومی دعوتِ تبلیغ کا تعلق نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَاُوحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرآنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ ﴾(۱) ظاہر ہے کہ اِس آیت کریمہ میں لفظ ﴿وَمَنْ بَلَغَ ﴾ کا عموم دُنیا بھر کے تمام انسانوں کو شامل ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن مجید اپنے مبلغ کے بغیر آپ ہی کسی کو نہیں پہنچ سکتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اِس کے لیے اپنے رسول سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے جس کے لیے ارشاد فرمایا ﴿فَذَکِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ یَخَافُ وَعِیْدِ ﴾(۲)

نیز فرمایا: ﴿لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ﴾(۳)

نیز فرمایا: ﴿یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ﴾(۴)

اور نائبین سے متعلق فرمایا: ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتَابَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَیْرَاتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِکَ هُوَ الْفَضْلُ الْکَبِیْرُ ﴾(۵)

---

(۱) الانعام:19۔

(۲) قٓ:45۔

(۳) النحل:44۔

(۴) المائدۃ:67۔

(۵) فاطر:32۔

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَلَعَلَّ بَعْضَ مَنْ يَبْلُغُهُ يَكُونُ أَوْعَى لَهُ مِنْ بَعْضِ مَنْ سَمِعَهُ﴾(۱) اور یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ کسی بھی عجمی قوم کو ابلاغ القرآن یعنی قرآن شریف کی دعوت و تبلیغ پہنچانا تب ہی موثر اور با مقصد ہو سکتا ہے جب اُس کی زبان میں ہو جو آیت کریمہ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾(۲) کا فلسفہ ہونے کے ساتھ مقتضائے عقل بھی ہے، جس کی واحد سبیل یہی ہے کہ اُن کی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ اُنہیں پہنچایا جائے جس سے ابلاغ القرآن کا بنیادی فریضہ انجام پانے کے ساتھ فرمانِ الٰہی ﴿أُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾(۳) پر عمل کرنے کے لیے بھی راہ ہموار ہو سکتی ہے خاص کر اُن عجمی اقوام یا ایسی جماعتوں کے لیے جو کسی اسلامی مبلغ کی ذاتی رائے اور کسی کی تفسیر و تاویل کے دخل عمل کے بغیر صرف اور صرف قرآن مجید کا نتھرا ترجمہ سننے کی خواہش یا فرمائش کرتی ہوں۔

اساسی خطوط اور حاصل الکلام:۔ حسبِ ضرورت کسی بھی عجمی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ وجود میں لانا ابلاغ القرآن کی خاص صورت ہے جو مقتضائے وقت کے مطابق مسلم اُمہ کی مسئولیت ہے اور اِس کا تعلق صرف اُس کے معانی اولیہ سے ہے کیوں کہ اِس سے مقصد لوگوں کی اصلاحِ احوال کرنا ہوتا ہے کہ قرآن اُنہیں جس عقیدہ و عمل کی ترغیب دیتا ہے اُسے اپنائیں اور جس عقیدہ و عمل سے ترہیب کرتا ہے اُس سے اجتناب کریں۔ یہ سب کچھ قرآن شریف کے معانی اولیہ کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے جبکہ معانی ثوانیہ عام لوگوں کے علم و عمل سے ماوراء ہونے کی بنا پر اِس مقصد سے میل نہیں رکھتے۔ ایسے میں ترجمۃ القرآن کا تعلق صرف معانی اولیہ سے ہونے میں کس کو

---

(۱) بخاری شریف، ج:2، ص:631، باب حجۃ الوداع، مطبوعہ سعید اینڈ کو کراچی۔

(۲) ابراھیم:4

(۳) النحل:125۔

شک ہوسکتا ہے لیکن اِس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ترجمۃ القرآن میں ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ استعمال کرنا یا ایسا انداز اختیار کرنا جائز ہو جو آیاتِ قرآنیہ کے دوسرے درجہ کے مفہوم یعنی معانی ثوانیہ کے منافی ہو۔نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ترجمۃ القرآن سے مقصد اُس کے معانی اولیہ کی تبلیغ کرنا اور اُن سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے جس کے حصول کے لیے تین چیزوں کا اکٹھے پائے جانا ضروری ہے:

پہلی چیز:۔ ترجمہ کا یہ عمل ترجمۃ القرآن کی تعریف کے مطابق ہو ورنہ تعریف سے خلاف ہونے والے ترجمہ کو ترجمۃ القرآن کہنا ہی درست نہیں ہے چہ جائیکہ مفید مقصد ہوسکے۔

دوسری چیز:۔ ترجمہ دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو ورنہ تین صورتوں سے خالی نہ ہوگا:

پہلی صورت: ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے مطابق لیکن لِسانِ قرآنی کے محاورہ سے خلاف ہوگا۔

دوسری صورت: اِس سے برعکس یعنی لِسانِ قرآنی کے محاورہ کے مطابق لیکن ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہوگا۔

تیسری صورت: دونوں کے محاورہ سے خلاف ہوگا، ظاہر ہے کہ اِن میں سے ہر ایک بے محاورہ کہلاتا ہے جبکہ بے محاورہ ترجمہ مفیدِ مقصد نہیں ہوتا۔

تیسری چیز:۔ ترجمہ کا عمل اُس کی صحت کے لیے تمام فطری شرائط کے مطابق ہو ورنہ کسی ایک شرط سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی درست نہیں ہوسکتا جب درست ہی نہیں ہے تو پھر مفیدِ مقصد ہونے کا تصور ہی باقی نہیں رہتا اور یہ تینوں باہم متلازم ہیں یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ ترجمہ کا عمل اُس کی تعریف کے مطابق ہو لیکن کسی شرط سے خلاف ہو یا بے محاورہ ہو بلکہ یہ دونوں تعریف کے مطابق ہونے کو لازم ہیں کہ انفکاک کا تصور نہیں ہوسکتا۔

ترجمہ کے ذریعہ ابلاغ القرآن کا فریضہ ادا کرنے کے لیے اور ترجمہ کو با مقصد اور منشاء

الٰہی کے مطابق کرنے کے لیے یہ تین چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں جنہیں ترجمہ کو با مقصد بنانے کے لیے اساسی خطوط بھی کہا جاسکتا ہے۔ اِن کی پابندی کرنے والے مترجم سے کبھی غلطی نہیں ہوسکتی۔قرآن شریف کی تفسیر وترجمہ میں طویل تجربہ مجھے یہ احساس دِلا رہا ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ میں جن حضرات سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں اِن چیزوں سے غفلت کی بنا پر ہوئی ہیں۔اِن کے علاوہ ترجمہ کے عمل کو تفسیر پر قیاس کرنے اور اِسے آسان سمجھ کر بے احتیاطی کرنے اور ترجمہ کے عرفی ولُغوی مفہوم میں تمیز نہ کرنے اور ترجمہ وترجمانی میں تفریق نہ کرنے جیسے اُمور کو بھی غلط تراجم میں بڑا دخل ہے جبکہ حقیقت میں یہ سب کے سب اُن تینوں سے غفلت کے فروع وتلخ نتائج ہیں۔اِس سلسلہ میں طویل دورانیہ کا تجربہ مجھے یہ بھی بتا رہا ہے کہ غالب اکثریت میں مترجمین کی غفلت کی طرح تراجم پر تبصرہ کرنے والوں کی واضح اکثریت بھی اِن اُمور کی حقیقت واہمیت سے بے خبر رہی ہے ورنہ حقائق سے آگاہ کوئی شخص بھی ترجمۃ القرآن کو لفظی ترجمہ تحت اللفظ ترجمہ اور با محاورہ ترجمہ یا لفظ بہ لفظ ترجمہ اور معنوی ترجمہ یا الترجمۃ الحرفیہ اور الترجمۃ التفسیریۃ جیسی مہمل تقسیمات کی طرف منقسم نہیں کرسکتا جبکہ مترجمین کی غالب اکثریت کی طرح اِن پر تبصرہ وتقابلی گفتگو کرنے والوں کی واضح اکثریت نے بھی یہ سب کچھ کیا ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے برصغیر پاک وہند سے تعلق رکھنے والے شیخ محمود الحسن سے لے کر السید ابوالاعلیٰ المودودی، پیر محمد کرم شاہ الازہری جیسے مشاہیر تک اور السعودیہ العربیہ کے الشیخ المناع القطان سے لے کر حافظ یوسف صلاح الدین، حافظ عتیق الرحمٰن کیلانی، عبدالرحمٰن کیلانی جیسے معترّبین ومقبولین عند العلماء السعودیہ اور دکتور عبداللہ ابن عبدالمحسن الترکی وزیر الشؤن الاسلامیہ والاوقاف والدعوۃ والارشاد جیسے حضرات کی اِس قسم بے مصرف تقسیم اور مہمل گفتگو جو بالترتیب اُن کی درج ذیل تحریروں میں موجود ہیں۔(مقدمہ موضح الفرقان مع ترجمۃ القرآن وتفسیر عثمانی مطبوعہ تاج کمپنی لمٹیڈ لاہور پاکستان، دیباچہ تفہیم القرآن، ص6،7، مع تفہیم القرآن، جلد اول، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور، ضیاء القرآن، ص12، جلد اول، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلیکیشنز لاہور پاکستان، مباحث فی علوم القرآن، ص85 تا 290،

مطبوعہ المکتبۃ الرشیدیہ قصہ خوانی پشاور پاکستان، ترجمہ معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اُردو ترجمہ ص 9 تا 11، مطبوعہ دارالسلام کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ، مقدمہ تیسیر القرآن، ص 1، 2 مع تیسیر القرآن مطبوعہ دارالسلام وسن پورہ لاہور پاکستان) جبکہ اِن سب سے زیادہ قابلِ تعجب دکتور عبداللہ ابن عبدالمحسن الترکی وزیر الشؤن الاسلامیہ والاوقاف والدعوۃ والارشاد السعودیہ العربیہ کا مندرجہ ذیل کلام ہے:

"اننا لندرک ان ترجمة معاني القرآن الكريم مهمابلغت دقتها فانها ستكون قاصرة عن اداء المعاني العظيمه التي يحويها النص القرآني المعجز وان المعاني التي تؤديها الترجمة انما هي حصيلة ما بلغه علم المترجم في فهم كتاب الله الكريم وانه يعتريهاما يعترى عمل البشر كله من خطاء ونقص" حوالہ کے لیے سعودیہ عربیہ سے تقسیم ہونے والے اُن مصاحف کو دیکھا جاسکتا ہے جو اُردو، فارسی، پشتو، گجراتی زبانوں میں کیے گئے تراجم کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں شائع کر کے مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اِن سب کے ابتدائی صفحہ پر بطورِ تصدیق و توثیق وزیرِ موصوف کی طرف سے لکھا گیا ہے۔

سعودی عرب کے وزیرِ اُمورِ مذہبیہ کا یہ کلام قابلِ تعجب اِس لیے ہے کہ اِس میں ترجمۃ القرآن کی تعبیر ترجمۃ معانی القرآن سے کی گئی ہے جسے کوئی بھی واقفِ حال مضحکۃ خیز کہے بغیر نہیں رہ سکتا کیوں کہ قرآن شریف کے معانی کی طرف ترجمہ منسوب کرنے کو روایت تسلیم کرتی ہے نہ درایت۔ ترجمۃ القرآن کی یہ انوکھی تعبیر خلافِ روایت اِس لیے ہے کہ جب سے قرآن شریف کی حکمرانی جزیرۃ العرب سے ترقی پا کر عجم کو اپنے دائرہ اقتدار میں لانے لگی اور مختلف زبان کی عجمی اقوام کو اسلام کی دعوت دینے کی ضرورت محسوس ہوئی اُس وقت سے قرآن شریف کے ترجمہ کا سلسلہ شروع ہوا ہے کیوں کہ ابلاغ قرآن کے سلسلہ میں کچھ ایسے حالات اور ایسے ماحول سے بھی واسطہ پڑتا ہے جس میں قرآن شریف کا ترجمہ پیش کرنا وقت کی ضرورت اور ناگزیر فریضہ

قرار پاتا ہے جس پر عہد صحابہ سے لے کر تابعین و تبع تابعین اور پیشروانِ اسلام کے مبلغین نے بالیقین عمل کیا ہوگا۔اُس کا دستاویزی ثبوت اگر چہ کثیر تعداد میں نہیں ملتا تاہم کچھ نہ کچھ دستیاب ہے۔مثال کے طور پر نو مسلم اہل فارس کی ضرورت کے مطابق حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا سورۃ الفاتحہ کا ترجمہ کرنے کا تذکرہ حضرت شمس الائمہ السرخسی المتوفی 483ھ نے کیا ہے جو المبسوط میں موجود ہے جس کے الفاظ اِس طرح ہیں:

"روی ان الفرس کتبوا الی سلمان رضی اللہ عنہ ان یکتب لھم الفاتحۃ بالفارسیۃ فکانوا یقرؤن ذٰلک فی الصلوۃ حتی لانت السنتھم للعربیہ"(۱)

اِسی طرح امام محی الدین النووی المتوفی 676ھ نے دوسرے انداز سے اِسے ذکر کیا ہے اُن کے الفاظ اِس طرح ہیں:

"وعن سلمان الفارسی ان رضی اللہ عنہ قومامن الفرس سئلوہ ان یکتب لھم شیاء من القرآن فکتب لھم فاتحۃ الکتاب بالفارسیۃ"(۲)

اِسی طرح ماضی بعید سے لے کر ماضی قریب تک مختلف خطوں کے اسلاف نے دُنیا کی متعدد زبانوں میں قرآن شریف کے جو تراجم لکھے ہیں اُن میں سے کسی ایک سے بھی ترجمۃ معانی القرآن کہنا ثابت نہیں ہے بلکہ سب ہی نے ترجمۃ القرآن ہی کہا ہے۔مثال کے طور پر شیخ مصلح الدین سعدی الشیرازی المتوفی 691ھ نے جو ترجمہ لکھا ہے اُسے بھی ترجمۃ القرآن ہی کہا ہے اور دیارِ ہند میں اولین مترجمِ قرآن مشہور ہونے والے شاہ ولی اللہ (رَحْمَةُ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلَیْهِ) المتوفی 1176ھ نے بھی ترجمۃ القرآن ہی کہا ہے جو اُس کے نام فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن سے ہی ظاہر ہے کہ ترجمۃ معانی القرآن نہیں کہا ہے۔اُن کے بعد اُن کے دو بیٹے شاہ رفیع الدین المتوفی 1233ھ اور شاہ عبد القادر المتوفی 1230ھ نے بھی اپنے لکھے ہوئے ترجموں کو

(۱) المبسوط فی الفقہ الحنفی، ج:1،ص:37،مطبوعہ عباس احمد البازمکۃ المکرمہ۔

(۲) المجموع فی شرح المھذب، ج:3،ص:380،مطبوعہ دار الفکر بیروت۔

ترجمۃ القرآن کے نام سے ہی یاد کیا ہے اِس کے علاوہ قرآن شریف پڑھنے سے عاجز انسان قرأت قرآن کی جگہ ترجمۃ القرآن سے اگر نماز پڑھے اُس کے جواز وعدم جواز سے بحث کرتے ہوئے جملہ فقہاء اسلام نے بھی ترجمۃ القرآن ہی کہا ہے۔مثال کے طور پر ساتویں صدی ہجری کے شافعی المذہب فقیہ ومحدث ومفسر امام محی الدین النووی المتوفی 676ھ نے لکھا ہے:

”ترجمۃ القرآن لیست قرآنا باجماع المسلمین“(۱)

اِسی طرح حنبلی المذہب فقیہ ومحدث ومفسر حافظ ابن تیمیہ المتوفی 728ھ نے بھی لفظِ ترجمۃ القرآن ہی استعمال کیا ہے اُن کے الفاظ اِس طرح ہیں:

”واما الاذکار الواجبۃ:فاختلف فی منع ترجمۃ القرآن“(۲)

درایۃ سے خلاف اِس لیے ہے کہ لفظِ ترجمہ کو معانی قرآن کی طرف نسبت کرکے ترجمۃ معانی القرآن کہنے کی مثال لُغت میں ملتی ہے نہ بلاغت میں اور نہ مفسرین کے کسی طبقہ میں اسے معقول ومستحسن سمجھا جاتا ہے۔اِس کی تفصیل اِس طرح ہے کہ قرآن شریف محض الفاظ یا صرف معانی سے نہیں بلکہ الفاظ ومعانی دونوں کے مجموعہ سے عبارت ہے جس کے متعلق اُصولِ دین سے لے کر اُصولِ فقہ تک تمام اسلاف کی ایک آواز ہے کہ ”ھو اسم للنظم والمعنی جمیعا“ یعنی قرآن شریف الفاظ من حیث الدال اور معانی من حیث المدلول کے مجموعہ سے عبارت ہے۔ ایسے میں قرآن شریف کے معانی کی طرف نسبت کرنے کا کیا جواز ہے جسے لُغت تسلیم کرتی ہے نہ عُرف کیوں کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف کا تعلق قرآن شریف کے انفرادی اجزاء ”الفاظ فقط یا معانی فقط“ سے نہیں ہے بلکہ خود قرآن سے ہے جو اِن دونوں سے مجموع مرکب ہے۔ایسے میں اِس ناقابلِ فہم تعبیر کو مضحکۃ خیز کہے بغیر کون رہ سکتا ہے؟ اور اِس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ قرآن شریف کی تعلیم وتعلم کے حوالہ سے اہلِ علم کے ماحول میں استعمال ہونے والے درج ذیل الفاظ بنیادی

(۱) المجموع المھذب،ج:3،ص:380،مطبوعہ دارالفکر بیروت۔

(۲) اقتضاء الصراط المستقیم،ص:203،مطبوعہ المکتبۃ السلفیہ لاھور پاکستان۔

حیثیت رکھتے ہیں:

(۱) تفسیر القرآن (۲) تفہیم القرآن (۳) تاویل القرآن (۴) تشریح القرآن

(۵) فہم القرآن (۶) ترجمانی قرآن (۷) ترجمۃ القرآن۔

قرآن شریف کی طرف اِن سب کی نسبت متعارف ومعقول ہونے کے بعد ان میں سے بعض وہ ہیں جن کی نسبت قرآن شریف کے الفاظ ومعانی کی طرف انفرادی طور پر بھی جائز و متعارف ہے جیسا کہا جا سکتا ہے (تفسیر الفاظ القرآن، تفسیر معانی القرآن، تفہیم الفاظ القرآن، تفہیم معانی القرآن) اور بعض وہ ہیں جن کی نسبت الفاظ کی طرف غیر معقول ہوتی ہے کیوں کہ اُس سے مقصد صرف معانی کی فہم ہوتا ہے جیسا (ترجمانی الفاظ القرآن) کہنے کا نہ کوئی محاورہ ہے نہ اُسے معقول کہا جا سکتا ہے بلکہ ''ترجمانی قرآن'' کہنے سے واحد مقصد معانی کی فہم وتفہیم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جس کے مطابق ''ترجمانی قرآن'' جیسی نسبت استعمال کرنے والے کی توجہ صرف معانی کی طرف ہوتی ہے اور یہی اِس سے مُلتفت الیہ بالذات ہوتے ہیں ایسا ہی جیسا ترجمان کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔

اور بعض وہ ہیں جن کی نسبت معانی کی طرف غیر متعارف اور غیر معقول ہے جیسا (ترجمۃ معانی القرآن) کہنا غیر متعارف اِس لیے ہے کہ سلف صالحین کے طبقۂ فقہاء سے لے کر طبقۂ مفسرین اور مفسرین کے متعدد طبقات میں بھی اِس قسم نسبت کی کوئی مثال اور کوئی محاورہ موجود نہیں ہے بلکہ سب نے ترجمۃ القرآن ہی کہا ہے یا ترجمہ کے لُغوی مفہوم کے اعتبار سے ترجمۃ الفاظ القرآن کہنے کی بھی کچھ مثالیں ملتی ہیں لیکن ترجمۃ معانی القرآن کہنے کی بعید سے بعید مثال بھی کہیں نہیں ہے اور غیر معقول اِس لیے ہے کہ یہ ترجمہ کی حقیقت اور اُس کی تعریف کے منافی ہے اِس لیے کہ ترجمہ اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنے سے عبارت ہے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں یعنی اُن کی تمام متعارف وقابلِ فہم حیثیات کے مطابق ہوں اور ظاہر ہے کہ ترجمۃ القرآن کی حقیقت بھی اِس سے مختلف نہیں ہے بلکہ اِس کے عرفی مفہوم میں بھی اس کے

الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جاتا ہے جو اُن کے قائم مقام ہوں اور اُن کی تمام قابلِ فہم حیثیات کے مطابق ہوں جس میں اُن کے لُغوی معنی سے لے کر مرادی معنی تک اور اشتقاقی وصرفی اور بلاغی حیثیات سے لے کر ترکیبی حیثیات تک سب شامل ہیں جس کے مطابق ترجمہ والی زبان کے یہی الفاظ حاصل بالمصدر المعلوم اور کبھی حاصل بالمصدر المجہول کے انداز پر عرفِ عام میں ترجمۃ القرآن کہلاتے ہیں اور اِن ہی کی صحت وسقم اور مطابقت وعدم مطابقت سے بحث کی جاتی ہے جس وجہ سے یہی ترجمۃ القرآن کی مِن حیث الفن موضوع بھی کہلاتے ہیں کیوں کہ کسی بھی فن کا موضوع وہی چیز ہوتی ہے جس کے عوارضاتِ ذاتیہ سے اُس میں بحث ہوتی ہے اور قرآن شریف کی طرف ترجمہ منسوب کرنے کی ممکنہ صورتیں بھی صرف دو ہیں:

پہلی صورت:۔ ترجمہ کے مصدری معنی میں جو"ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها"سے عبارت ہے۔

دوسری صورت:۔ عرفی مفہوم میں جو ترجمہ کے الفاظ سے عبارت ہے۔

جبکہ اِن میں سے کسی ایک کی حقیقت بھی اِس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ اُسے معانی کی طرف منسوب کر کے ترجمۃ معانی القرآن کہا جائے۔ ایسے میں سعودی عرب سے اُٹھ کر عجم کی یونیورسٹیوں میں پھیلنے والی اِس جدید اصطلاح کو خلاف درایۃ وغیر معقول نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔ اور یہ چونکہ قرآن شریف کے ترجمہ سے متعلق ہے جسے اگرچہ حقیقتاً قرآن نہیں کہا جاسکتا تاہم کلام اللہ کی سفارت اور اُس کا ابلاغ ضرور ہے جس کے لیے مسلم اُمہ کو مکلّف ومسئول قرار دیا گیا ہے جس میں آیت کریمہ ﴿وَمَنۢ بَلَغَ﴾(۱) سے مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے جو کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہے جس میں قدرے بے احتیاطی کا انجام بھی متنوع خرابیوں کا حامل ہوسکتا ہے اِس لیے یہاں پر مشہور اُصول"لا مناقشة في الاصطلاح"سے سہارا لے کر گلو خلاصی نہیں کی جاسکتی کیوں کہ یہ ابلاغ قرآن کا مسئلہ ہے، سفارت بین اللہ وبین العباد کا انداز ہے اور ابلاغ القرآن کی مشکل

---

(۱) الانعام:19۔

ترین قسم ہے۔ دوسرے فنون کی طرح نہیں ہے جن میں ہر طبقہ کو اپنی صوابدید کے مطابق اصطلاح وضع کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ حقائق کی اِس روشنی میں ترجمۃ القرآن کی متعارف اور واقعی اضافت کی جگہ ترجمۃ معانی القرآن جیسی خلافِ حقیقت اصطلاح گھڑنے کی حیثیت بدعت فی القرآن کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ (أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ) سعودی عرب اور خاص کر اُمورِ مذہبیہ کے شعبہ اشاعت ترجمة القرآن مع الترجمه فى الالسنة المختلفه سے مربوط علماء کی اِس بدفہمی سے متاثر ہو کر کچھ عجمی علماء بھی اِسے وردِ زبان بنا رہے ہیں اور کچھ یونیورسٹیاں بھی اِس سے رنگ لے رہی ہیں جس کی ایک جھلک حافظ عتیق الرحمٰن کیلانی ولد مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لیکچرار کنگ سعود یونیورسٹی الریاض کی درج ذیل عبارت ہے:

''مختلف زبانوں کا طالب علم ہونے کے ناطے میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی بھی نص کا بعینہٖ ترجمہ کسی دوسری زبان میں پیش کرنا انسانی بساط سے باہر ہے۔ انتہائی کامیاب مترجم بھی صرف قریب ترین مفہوم پیش کر سکتا ہے جس سے گزارا چل جاتا ہے یہ تو عام عبارات کا حال ہے قرآن کریم کی آیات تو ویسے بھی معجزہ ہیں اُن کا ترجمہ کیسے ممکن ہے؟ یہی وجہ ہے کہ علماء نے (ترجمہ قرآن) کو غلط عبارت قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ درست عبارت (ترجمہ معانی القرآن) ہے۔''(۱)

کنگ سعود یونیورسٹی الریاض السعودیہ کے معلم لسانیات کا یہ کلام تین وجوہ سے قابلِ افسوس ہے:

پہلی وجہ:۔ اِس میں جن علماء کے حوالہ سے یہ کہا ہے کہ اُنہوں نے (ترجمۃ القرآن) کہنے کو غلط تعبیر قرار دے کر ترجمۃ معانی القرآن کہنے کو درست کہا ہے اُن کا مصداق سعودیہ کے کچھ علماء کے سوا اور کوئی نہیں ہے بلکہ ترجمۃ القرآن کی پوری تاریخ اور کسی بھی خطے کے علماء سے ایسا ثابت نہیں ہے بلکہ اِس خلاف روایت ومنافی درایۃ اندازِ تعبیر کے موجد سعودیہ عربیہ کے اُمورِ مذہبیہ کے چند علماء کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

---

(۱) مقدمہ تیسیر القرآن، ص:2، مطبوعہ اسلامک پریس وسن پورہ لاہور پاکستان۔

دوسری وجہ:۔ اِس میں قرآن شریف کے معیاری اور درست ترجمہ کرنے کو لاممکن کہا گیا ہے جو خلافِ حقیقت ہے، ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے معروضی حالات کے منافی ہے اور نبی اکرم سیدِ عالم ﷺ کی رسالت کے عموم للعرب والعجم کے بھی منافی ہونے کے ساتھ آیت کریمہ ﴿وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَـٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ﴾(۱) سے مقصدِ عموم کے بھی منافی ہے کیوں کہ اسلامی روایات اور کل مکاتب فکر اہل اسلام مفسرین کے مطابق اقوامِ عجم کو قرآن شریف پہنچانے سے مقصد اُس کا ترجمہ پہنچانا ہے خاص کر ایسے عجمیوں کو جو قرآن شریف کی کسی سورۃ، آیت یا کسی بھی حصہ کا نفس ترجمہ سننے اور سمجھنے کی خواہش رکھتے ہوں تو ناممکن ہونے کی صورت میں قرآن اُنہیں پہنچانے اور اُنہیں ابلاغ القرآن کرنے کی راہ ہی مسدود ہوگی ایسے میں عمومِ رسالت للعرب والعجم کا تصور باقی رہتا ہے نہ آیت کریمہ ﴿وَمَن بَلَغَ﴾ سے عموم کا تصور۔ ایسے میں اِس قول کو غلط محض کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

تیسری وجہ:۔ اِس میں معیاری ترجمہ کو علی العموم ناممکن کہہ کر متن کے قریب مفہوم کا قول کیا گیا ہے کہ اِس سے گزارا چل جاتا ہے یہ ترجمہ کے حوالہ سے معروضی حالات اور مشاہدہ سے خلاف ہونے کے ساتھ تین خرابیوں سے خالی نہیں ہے:

پہلی خرابی:۔ معیاری ترجمہ کرنے سے مسلم اُمت کی ناتوانی و عاجزی کو جانتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اُس کے صرف قریب مفہوم دوسروں کو پہنچانے پر مکلف کیا ہوگا یعنی آیت کریمہ ﴿وَمَن بَلَغَ﴾ سے مراد معیاری ترجمہ نہیں بلکہ قرآن شریف کے مفہوم سے قریب مفہوم پہنچانا مراد ہوگا۔

دوسری خرابی:۔ ترجمۃ القرآن کے واسطہ سے ابلاغ القرآن کو صرف مسلم عجم کے لیے خاص قرار دیا جائے گا یعنی آیت کریمہ ﴿وَمَن بَلَغَ﴾ کا غیر مسلم عجم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا بلکہ اِس کا مظہر صرف مسلم عجم اور مسلم معاشرہ ہوگا کہ آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم کے قریب مفہوم اُنہیں پہنچا کر گزارا چلایا جائے کیوں کہ وہ مسلمان ہونے کے ناطے اِسے تسلیم کریں گے جبکہ غیر مسلم

---

(۱) الانعام:19۔

نتھرا ترجمہ کے بغیر کسی مسلم مبلغ کی تفسیر، تاویل، تشریح، ترجمانی جیسے کسی بھی عمل دخل کو سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔

تیسری خرابی:۔ معیاری ترجمہ ناممکن ہونے کے باوجود یہ عقیدہ کیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اِس ناممکن کو ممکن بنانے پر مسلم اُمت کو مکلف کیا ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اِن میں سے کسی ایک کو بھی قرآن وسنت کے مطابق نہیں کہا جا سکتا بلکہ ہر ایک اہل اسلام کے متفقہ مسلمات سے خلاف ونامعقول ہے۔ ایسے میں علماء سعودیہ کی اِن باتوں کو غلط محض کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا جو ابلاغ القرآن کو مشکوک کرنے، دعوت ورسالت کو محدود اور مسلم معاشرہ کے ساتھ مختص کرنے اور قرآن شریف کے فطری وآسان پیغام کو ناقابلِ فہم قرار دینے کی موجب ہیں۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ علماء کرام کا یہ طبقہ اگر قرآن شریف کو اُس کی آفاقیت کے تناظر میں دیکھتا کہ اُس کا پیغام پوری دُنیا کے لیے ہے، اسود واحمر اور عرب وعجم سب کو روشنی دینے کے لیے ہے جو مسلم معاشرہ کو اُس کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر اور غیر مسلم عجم کو اُس کے ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر پہنچانا ہوتا ہے جو فرمانِ الٰہی ﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾(۱) کا مقتضاء ہے تو ایسی غلط باتیں کبھی نہ کہتے یا اگر ترجمۃ القرآن کی تعریف، اس کے لوازمات اور شرائط کو پیشِ نظر رکھتے پھر بھی ایسی باتیں نہ لکھتے۔

محرکاتِ ثلاثہ:۔ اِس کتاب کے لکھنے کے لیے جو چیزیں باعث اور محرک بنیں اُن میں سعودی عرب کے علماء کرام کی اِس قسم کی باتیں سرفہرست ہیں جنہیں **محرک اول** اور بنیادی بواعث کہا جا سکتا ہے۔

محرک دوم:۔ برصغیر پاک وہند کے مختلف مکاتب فکر مشاہیر کے 34 عدد تراجم قرآن جو اُردو زبان میں لکھے ہوئے ہیں کے مابین تقابلی جائزہ کیا اور ترجمۃ القرآن کی تعریف وشرائط کے میزان

---

(۱) النحل:125۔

میں دیکھا تو اکثر کو غلطیوں سے بھرا ہوا پایا۔ اور سورۃ الفاتحہ، البقرہ، آلِ عمران کے تراجم کا یہ تقابلی جائزہ تین ضخیم مجلدات میں مکمل ہونے کے ساتھ میری حیرت کی انتہا ہونے لگی اور قرآن شریف کے نادان دوستوں کے ہاتھوں اُس پر ہونے والے مظالم پر بیٹھ کے ماتم کرنے لگا جس کی تفصیل تفسیر "**مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن**" کی تینوں مجلدات میں پھیلی ہوئی ہے اور عرصہ چھ سال سے اہل علم کے مطالعہ میں ہے، تخمین و اندازہ سے نہیں بلکہ حق الیقین کے ساتھ میں نے محسوس کیا کہ ترجمہ کے نام سے قرآن شریف پر ہونے والے مظالم، انجانے میں ہونے والی اِن تحریفات اور فحش اغلاط کی اِس داستانِ غم کی اصل وجہ من حیث الفن ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع سے بے خبری ہے اور اس کے لوازمات و تقاضوں سے غفلت ہے اور شرائط سے بے توجہی ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مترجمین کو اُن کی علمی شہرت کے باوجود عمومی معنی میں فنِ ترجمہ کو دوسرے فنون سے ممتاز کرنے والی تعریف، غرض و موضوع کا بھی احساس نہیں تھا، اُس کے اُصول و شرائط کا اِدراک بھی نہیں تھا۔ تراجم کی غلطیوں اور اغلاط کے پسِ منظر و اسباب کی تشخیص کے بعد میں نے ترجمہ کے عمل کو اور خاص کر ترجمۃ القرآن کو ایسی غلطیوں سے بچانے کے لیے اور اِس حوالہ سے آئندہ نسل کو روشنی دینے کی غرض سے یہ کتاب لکھنے کا عزم کیا۔ اِسی اثناء میں **تیسرا محرک** اِس طرح پیش آیا کہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں بتاریخ 29 اپریل 2013ء ترجمۃ القرآن کی اہمیت اور غلطی سے محفوظ ترجمہ وجود میں لانے کے لیے ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا گیا جس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اُس میں اِس موضوع سے متعلق جو مقالہ میں نے پیش کیا اُس میں ترجمۃ القرآن کی صحت کے لیے ناگزیر شرائط پر میں نے روشنی ڈالی تھی اور واضح کیا تھا کہ اِن میں سے کسی ایک شرط سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی درست نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ فوق الواحد منحرف ترجمہ کو معیاری کہا جا سکے۔ اِس کے بعد یونیورسٹی کے ایک دانش جُو نے اِس موضوع سے متعلق خاص سوال پیش کیا جو سابقہ عزائم کے لیے مؤید بنا اور اِس عمل میں آنے کے لیے پہلے سے موجود دو سے مل کر "ثالث ثلاثۃ" بنا۔

مسئلہ یہ ہے کہ بین الاقوامی اسلامی یونیوسٹی اسلام آباد کے زیراہتمام بتاریخ 29 اپریل 2013ء مشکلات ترجمۃ القرآن کے نام سے جو کانفرنس ہوئی اُس میں آپ نے جو مقالہ پڑھا اُس کے مطابق قرآن شریف کا درست ترجمہ کرنا ممکن ہی نہیں ہے کیوں کہ آپ نے عام ترجمہ کے لیے دس (10) شرائط سمیت قرآن شریف کے ترجمہ کے لیے مزید دس (10) شرائط جو پیش کی ہیں اُن کا احاطہ کرنا خاص علماء کے لیے بھی ممکن نہیں ہے چہ جائیکہ عام لوگ اُنہیں سمجھ سکیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ عربی زبان سے ناواقف لوگ قرآن شریف کے معانی کو سمجھنے سے محروم رہیں گے جس سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ کے لیے شرائط کو کم سے کم اور آسان کیا جائے۔

منجانب:۔ یکی دانش جُو، انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

جواب:۔ سوال کے انداز سے معلوم ہو رہا ہے کہ سائل کو فنِ ترجمہ کی اہمیت کا احساس نہیں ہے اور نہ ہی ترجمۃ القرآن کے احتیاطی تقاضوں کا اِدراک ہے۔ اِس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ سب سے پہلے شرط کے مفہوم سے پردہ اُٹھادیں یہ عربی زبان کا لفظ ہے جو اُردو میں بھی استعمال ہوتا ہے ہر دو زبانوں میں اِس کا استعمال ایک عمل کو دوسرے عمل پر موقوف کرنے یا اِس طرح مربوط کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ اُس کے بغیر اِس کا وجود نہیں ہوتا چاہے اِس کی نوعیت جیسی بھی ہو۔ مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں ہے؛

"اَلشَّرْطُ کُلُّ حُکْمٍ مَعْلُوْمٍ یَتَعَلَّقُ بِاَمْرٍ یَقَعُ بِوَقُوْعِهٖ" (۱)

یعنی ہر وہ معلوم حکم جو کسی ایسی چیز کے ساتھ متعلق ہو جائے کہ اُس کے واقع ہونے کے سبب سے یہ بھی واقع ہو جائے۔

---

(۱) مفردات القرآن، مادہ: (ش، ر، ط)۔

اِن میں سے موقوف کو مشروط اور موقوف علیہ کو شرط کہا جاتا ہے اور مشروط کا وجود بغیر شرط کے نہ ہونے کی طرح شرط کا تصور بھی مشروط کے تصور کے بغیر نہیں ہوتا۔ نیز شرط کے اِس عمل کی دو قسمیں ہیں؛

پہلی قسم:۔ اُسے وجود میں لانے کے لیے انسانی عمل دخل ہوتا ہے یعنی جب تک انسان اُس کا ارتکاب نہ کرے اُس وقت تک اللہ تعالیٰ بھی اُس کی تخلیق نہیں فرماتا چاہے انسان کا یہ عمل جائز ہو یا ناجائز فرق صرف یہ ہے کہ ناجائز ہونے کی صورت میں وہ عند اللہ وعند الرسول کالعدم قرار پاتی ہے یعنی غیر موثر ہوتی ہے یا کراہت کے درجہ میں رہ جاتی ہے جس کی مثالوں میں انسانوں کے مابین ہونے والے معاملات میں مقرر کی جانے والی ناروا اور شروط فاسدہ کی تمام شکلیں شامل ہیں اور جائز ہونے کی صورت میں انسان اُن کی تکمیل سے متعلق مسئول وذمہ دار ہوجاتا ہے اِس کی مثالوں میں مختلف عقود ومعاملات میں لگائے جانے والی تمام شرطیں شامل ہیں۔

دوسری قسم:۔ اُس کے وجود واعتبار میں اور اُس کا کسی کام کے لیے موقوف علیہ ہونے میں انسانی عمل کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ خالصتاً تکوینِ الٰہی کا حصہ اور اُمورِ تکوینیہ کے قبیل سے ہوتی ہے اِس کی مثالوں میں شرعی احکام کے ساتھ مکلف وذمہ دار ہونے کے لیے عقل کا شرط ہونا، بلوغ کا شرط ہونا، وجوبِ زکوٰۃ کے لیے نصاب کا نامی اور حولی ہونے کا شرط ہونا اور نماز کی صحت کے لیے طہارت کی شرط ہونے جیسی انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں پائی جانے والی ہزاروں شرطیں شامل ہیں اِسی طرح مختلف علوم وفنون میں اور لسانیات میں فصاحت و بلاغت کے حوالہ سے پائی جانے والی وہ شرائط جن کی نشان دہی ان فنون کے ماہرین نے کی ہیں، بھی اُمورِ تکوینیہ کے حصے ہیں جس میں انسانوں کے کسب وعمل کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے بلکہ ہر فن کے لوگ اور لسانیات کے ہر شعبہ سے وابستہ حضرات اُنہیں پیشِ نظر رکھنے کے پابند ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کلام کے بلیغ ہونے کے لیے فصاحت کا شرط ہونا محض تکوینِ الٰہی ہے کہ جب تک کلام کے جملہ مفردات سے لے کر اُن کے ارتباطی انداز تک سب کے سب فصیح نہیں

ہوں گے اُس وقت تک بلیغ کلام وجود میں لانا ممکن نہیں ہوگا اِسی طرح فصاحت کے لیے کلام کے تمام مفردات کا غرابت اور سمعی کراہت سے محفوظ ہونے کی شرط ہونا بھی محض امرِ تکوینی ہے جس میں انسانوں کے کسب وعمل کا کوئی دخل نہیں ہے یہ الگ بات ہے کہ فن کے ماہرین نے موقوف وموقوف علیہ اور شرط ومشروط کے اِس تکوینی ارتباط کی نشان دہی کی ہے تا کہ اُصولِ فطرت کے اِس ارتباط کی پابندی کی جائے اِسی طرح علم نحو میں بتایا گیا یہ اُصولِ فطرت کہ نو (9) اسباب منع صرف میں سے وصف کے لیے شرط یہ ہے کہ محض استعمال وترکیبی وصف نہ ہو بلکہ اصل وضع کے اعتبار سے وصف ہو یہ سب کچھ لسانِ عربی کے حوالہ سے تکوینِ الٰہی کے حصے ہیں جس میں نحاۃ کے کسب وعمل کو دخل ہے نہ بُلغاء کے کسب وعمل کو بلکہ اِن حضرات نے تکوینِ الٰہی کے اِن اُصولوں کی نشان دہی کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے۔ یہی حال فنِ ترجمہ کا بھی ہے کہ مستقل فن ہونے کی حیثیت سے اُس کی صحت کے لیے جتنی شرطیں بھی ضروری ہیں وہ سب کے سب تکوینِ الٰہی کے حصے ہیں انسان کو اُن میں قطعاً کوئی عمل دخل واختیار نہیں ہے کہ کمی بیشی کر سکے۔

عام ترجمہ کے لیے یعنی دُنیا کی کسی بھی زبان میں لکھی گئی کسی بھی فصیح وبلیغ کتاب کا معیاری ترجمہ وجود میں لانے کے لیے ہم نے جن دس (10) شرائط کی نشان دہی کی ہے اُن میں کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جس میں ہمارے کسب واختیار کو دخل ہو یا مقتضائے فطرت اور تکوینِ الٰہی کا مظہر نہ ہو یا اُس کے بغیر ترجمہ کی صحت کا تصور ہو سکے۔ مثال کے طور پر ہم نے عام ترجمہ کی صحت کے لیے جن دس (10) شرائط کی نشان دہی کی ہیں، اُن میں؛

❶ متن سے اصل صاحبِ کلام کے مقصد سمیت اُس کے جملہ لوازمات اور لسانی حیثیات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہے کہ جب تک ترجمہ کرنے والے کو اُس سے متعلق اِن تمام چیزوں کا احاطہ نہیں ہوگا اُس کے مطابق ترجمہ وجود میں لانا ممکن نہیں ہوگا۔ چاہے مترجم کو ترجمہ والی زبان کے جملہ گوشوں کا احاطہ ہی کیوں نہ ہو وہ کون سا سلیم الفطرت انسان ہو سکتا ہے جو اِس کے بغیر

درست ترجمہ کا تصور کر سکے یا اِس شرط کو تکوینِ الٰہی کا حصہ کہنے میں تردّد کرے یا کسی مترجم کے لیے اِس سے بے اعتنائی برتنے کو جائز کہہ سکے۔

عام ترجمہ میں اِس کی خلاف ورزی پر مشتمل تراجم کے سلسلہ دراز میں مندرجہ ذیل کو دیکھا جاسکتا ہے:

❶ فتاویٰ رضویہ شریف کی عربی عبارات کا اُردو میں ترجمہ کرتے ہوئے مولانا محمد احمد مصباحی نے لفظ "ما بين العذارين والاذن" کا ترجمہ "رخساروں اور کان کا درمیانی حصہ" لکھا ہے جو اصل کے مطابق نہیں ہے کیوں کہ عربی زبان میں "عِذار" بمعنیٰ "رُخسار" کی کوئی مثال موجود نہیں ہے بلکہ مَردوں میں استعمال ہونے والا یہ لفظ چاہے مفرد ہو یعنی "عِـــذار" یا تثنیہ یعنی "عِذارین" اِس کے صرف دو مصرف ہوتے ہیں؛

پہلا:۔ داڑھی نکلنے سے پہلے چہرے کا وہ حصہ جو رُخسار اور کان کے ساتھ متصل سفید حصے کے درمیان ہوتا ہے۔

دوسرا:۔ اُسی جگہ پر اُگنے والے بال جو نوجوانی کے اوائل میں باریک ریشمی شکل میں ہوتے ہیں بعد میں آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے داڑھی کا مستقل حصہ بن جاتے ہیں۔

جس کی جغرافیائی حدود اِس طرح ہیں کہ اِس کے نچلے حصہ میں داڑھی ہوتی ہے اور اُوپر والے حصہ میں سر کے بال ہوتے ہیں اور ہر دو برابر کی جانب میں ایک طرف رُخسار ہوتا ہے جبکہ دوسری طرف کان کے ساتھ متصل وہ سفید جگہ ہوتی ہے جس پر بال قطعاً نہیں ہوتے۔ گویا عِذار کا دوسرا مفہوم مذکورہ حدود اربعہ میں محدود بالوں کی وہ قلمی شکل ہے جو عرض میں ایک طرف رُخسار کے ساتھ متصل ہے۔ دوسری طرف چہرہ کی سمت سے کان کے ساتھ متصل بالوں سے خالی اور سفید حصہ کے ساتھ متصل ہے جبکہ طول میں داڑھی کے فوقانی حصہ کے ساتھ اور سر کے کان اور چہرے کی طرف تحتانی حصہ کے ساتھ متصل ہے عربی لُغت کی نہایت مشہور کتاب لسان العرب میں لکھا ہے:

"وعِذار الرجل شعره النابت فی موضع العذار"(۱)

(۱) لسان العرب، ج:4، مادہ:(ع،ذ،ر)۔

یعنی مَردوں میں استعمال ہونے والاعِذار وہ بال ہیں جو عِذار کی جگہ میں اُگتے ہیں۔

جس سے صاف معلوم ہورہا ہے کہ مَردوں میں استعمال ہونے والے اِس لفظ کا اصل اور وضعی استعمال اُس خارجی جگہ کے لیے ہے جس کی حدود اربعہ ہم نے بتائے ہیں اور دوسرا محاوراتی استعمال ہے جو اُس جگہ پر اُگنے والے بالوں کے لیے ہوتا ہے۔ فقہاء کرام کی پیشِ نظر عبارت ''ما بین العذارین ''میں یہی چیز تثنیہ استعمال ہوئی ہے کیوں کہ ہر مرد میں ایک نہیں بلکہ دو عِذار ہوتے ہیں۔ فقہاء کرام کی یہ عبارت دراصل چہرے کی حدود اربعہ کی تعیین کے سلسلہ میں نتیجہ کے طور پر استعمال ہوئی ہے کہ جب طول میں چہرہ کی حد اسفل الذقن سے لے کر پیشانی کے اوپر والے حصہ کے ساتھ متصل سر کے بال شروع ہونے والی جگہ تک ہے اور عرض میں ''مِنْ شَحْمَةِ الْاُذُنِ اِلٰی شَحْمَةِ الْاُذُن '' ہے جس کا دُھونا وضو میں فرض ہے تو اِس کا لازمی نتیجہ ہے کہ عِذار اور شحمۃ الاذن کے مابین بالوں سے خالی جگہ کا دُھونا بھی فرض میں شامل ہوگا کیوں کہ وہ بھی چہرے کی حدود اربعہ کے ماتحت ہے لیکن عبارت کا ظاہری انداز اِس واحد مقصد پر دلالت کرنے میں سہل الفہم نہیں ہے کیوں کہ یہ دراصل باب ''تَغْلِیْب '' کے قبیل سے ہے جس کے مطابق چہرے کے ہر دو جانب موجود اِن قلموں کو جو درحقیقت ایک ایک ہیں ''شحمۃ الاذن ''پر غلبہ دے کر مذکورہ لفظ ''ما بین العِذارین '' کہا گیا ہے جو کمالِ ایجاز و اختصار میں چھ الگ الگ چیزوں پر دلالت کررہا ہے جن میں سے دو چہرے کی دونوں اطراف میں انفرادی طور پر موجود عِذار ہیں جنہیں اُردو محاورہ میں قلم کہا جاتا ہے اور دو ہر دو کانوں کے ساتھ انفرادی طور پر موجود ''شحمۃ الاذن ''ہیں اور دو ہر دونوں جانب انفرادی طور پر موجود ''مابین شحمۃ الاذن والعِذار '' وہ جگہ ہیں جن میں بال نہیں ہوتے۔ ہزار رحمت فقہاء کرام کی بلاغت شناسی پر کہ اُنہوں نے باب ''تَغْلِیْب '' کے اِس اختصار میں کمال کیا ہے لیکن مترجمین پر افسوس کہ اِس حقیقت کے اِدراک سے قاصر رہ کر فقہاء کرام کے دل زخمی کر دیے، کیا سے کیا بنا دیا۔ اور فقہاء کرام کی اِس حوالہ سے متعدد عبارات جیسی ''فَمَابَیْنَ الْعِذَارَیْنِ یَجِبُ غُسْلُهٗ، فَمَابَیْنَ الْعِذَارَیْنِ دَاخِلٌ فِی الْوَجْهِ، مَابَیْنَ الْعِذَارَیْنِ وَالْاُذُن

یَجِبُ غُسْلُه لانه من الوجهه ''میں عِذار کا ترجمہ ''خط، قلم، شحمۃ الاذن اور داڑھی کے قلم والے حصہ کے درمیان'' جیسے کسی بھی درست انداز میں کرنے کے بجائے ''عِذار'' کا ترجمہ ''رُخسار'' میں کرنا اُلٹی منطق ہے جس کی اصل وجہ ترجمہ کی مذکورہ شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ فتاوٰی رضویہ جیسے عظیم سرمایہ ایمان کی عربی عبارات کے تراجم میں اِس قسم غلط تراجم پر نظر ثانی کرانا ناشر ادارے پر فرض لازم بنتا ہے۔

دوسری مثال:۔ ابتدائے وحی سے متعلق بخاری شریف کی حدیث کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نبی اکرم سید عالم ﷺ کے پاس جب غار حراء میں سورۃ علق شریف کی ابتدائی چند آیات لے کر آئے اور کہا ''اِقْرَاء'' جس کے جواب میں اللہ کے رسول سید عالم ﷺ نے کہا ''مَااَنَابِقَارِءٍ'' اِس کے اکثر تراجم مذکورہ اُصول سے خلاف کیے گئے ہیں من جملہ اُن میں سے جمعیت الغرباء دہلی کے رہنما مولانا عبدالستار صاحب دہلوی کا ترجمہ بھی ہے جو نصرۃ الباری ترجمہ صحیح البخاری کے نام سے مشہور ہے۔ اِس میں حدیث کے مذکورہ الفاظ ''فَقُلْتُ مَااَنَابِقَارِءٍ'' کا ترجمہ اِس طرح کیا گیا ہے؛

''میں نے کہا کہ کیسے پڑھوں میں پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں''(۱)

اہل علم جانتے ہیں کہ ترجمہ کے اِس انداز کو اُس کے مطابق نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ یہ اُس کی لسانی حیثیت کے منافی ہے کہ اُس میں لفظ ''مَـا'' حرف نفی مشابہ بلیس ہے اور ''اَنَـا'' محلاً مرفوع ہو کر اُس کا اسم ہے اور حرف ''ب'' زائد ہے جس کے بعد ''قَارِءٍ'' محل قریب کے مطابق لفظاً مجرور ہے جبکہ محل بعید کے مطابق محلاً منصوب ہے۔ اِس جملہ اسمیہ سے حاصل مفہوم اور اِس کے مطابق ترجمہ ''میں پڑھنے والا نہیں ہوں، میں نہیں پڑھتا، میں نہیں پڑھوں گا'' جیسے انداز کے سوا اور کچھ ممکن نہیں ہے چہ جائیکہ دو متضاد جملوں میں کیا جائے جیسا اِس ترجمہ میں کیا گیا کہ پہلے ''کیسے پڑھوں'' جیسے جملہ انشائیہ میں کرنے کے بعد ''میں پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں'' جیسے جملہ خبریہ میں کیا

(۱) نصرت الباری، ج:1، ص:32۔

گیا ہے جسے فحش غلطی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ متن کے ایک جملہ کا ترجمہ بھی اُس کے مطابق ایک ہی جملہ میں ہونا ضروری ہے وہ اگر انشائیہ ہے اُس کا ترجمہ بھی انشائی انداز میں اگر خبریہ ہے ترجمہ بھی خبری انداز میں ورنہ ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوگا کیوں کہ ترجمہ کی تعریف ہی یہی ہے کہ ''اِبْدَالُ لَفْظَةٍ تَقُوْمُ مَقَامَهَا ''(۱) یعنی متن کے لفظ کو ترجمہ والی زبان کے لفظ میں اس طرح بدلا جائے کہ اُس کے لوازمات وتقاضے متاثر نہ ہونے پائیں ورنہ اصل کا کوئی ایک لازمہ یا ایک ضروری تقاضا سے خلاف ہونے کی صورت میں بھی محض لفظی تبدیلی ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوتی چہ جائیکہ ایک جملہ والے متن کا ترجمہ دو متضاد جملوں میں کرنے کو اصل کے مطابق کہا جائے۔ تو پھر ترجمہ کے اِس انداز کو غلط فحش کے سوا اور کیا کہا جائے جس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ مترجم نے متن کی لسانی حیثیت والی شرط کو پیشِ نظر نہیں رکھا ورنہ ایسی ٹھوکر کبھی نہ کھاتا۔

یہ المیہ متن کے صرف ایک جزو ''مَا اَنَا بِقَارِءٍ'' کے ترجمہ کا ہے جبکہ اِس کے متصلاً قبل والا جملہ فعلیہ ''فَقُلْتُ'' کے ترجمہ میں فائے تعقیبیہ کو نظر انداز کرنے کا المیہ اِس کے علاوہ ہے کہ اُس کی لسانی حیثیت کے مطابق ترجمہ ''پھر میں نے کہا'' لکھنے کے بجائے فائے تعقیبیہ کو ہیچ سمجھ کر ''میں نے کہا'' لکھ دیا ہے حالاں کہ یہ ''فا''، فائے تعقیبیہ اور حرفِ عطف ہونے کی بنا پر نہایت اہمیت کی حامل ہے جسے بلاغت کی زبان میں حرفِ واصل بھی کہا جاتا ہے کہ جس جملہ پر داخل ہوتا ہے اُسے ماقبل یعنی معطوف علیہ والا جملہ کے ساتھ موصول ومتصل کر دیتا ہے اور اسے نظر انداز کرنے کی صورت میں ماقبل ومابعد والے دونوں جملے وصل کے زمرے سے نکل کر فصل کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں جو مقتضائے مقام سے خلاف اور بلاغت کے منافی ہے جس کے لیے تلخیص المفتاح میں کہا ہے ''وَمَقَامُ الْوَصْلِ يُبَايِنُ مَقَامَ الْفَصْلِ ''(۲)

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج1، ص111، مطبوعہ قاھرہ مصر۔

(۲) تلخیص المفتاح، ص:5۔

ترجمہ قرآن سے قطع نظر عام ترجمہ کی مذکورہ شرط یعنی متن کی لسانی حیثیت اور اُس کے جملہ لوازم و تقاضوں کو پیشِ نظر رکھنے کی اہمیت اور اس سے خلاف ہونے کی مذکورہ عمومی مثالوں کے علاوہ قرآنی مثالوں کی ایک جھلک اشرف علی تھانوی کا مندرجہ ذیل ترجمہ ہے جو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" شریف کے ترجمہ میں اُس نے لکھا ہے؛

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔"

ترجمہ کا یہ انداز مذکورہ شرط سے خلاف ہے۔ اوّلاً اِس لیے ہے کہ اِس میں بسم اللہ شریف کے دوسرے حصہ یعنی اسم جلالت اور اُس کی یکے بعد دیگرے دونوں صفات کے مجموع مرکب کا ترجمہ جملہ میں کیا گیا ہے۔ جو لفظ "ہیں" سے ظاہر ہے اور علم نحو و بلاغت سے شناسائی رکھنے والے جانتے ہیں کہ صفت و موصوف کا مجموع مرکب جملہ ہرگز نہیں بلکہ جملہ کے مقابلہ میں مفرد اور مرکب غیر تام ہوتا ہے تو پھر متن سے متضاد اِس جملہ کو اُس کا معیاری ترجمہ کہنے کا کوئی جواز ہی نہیں رہتا۔ لُغت کے اعتبار سے نہ علم نحو کی رو سے، علم بلاغت کی روشنی میں نہ مفسرین کرام کی تصریحات میں۔ لسانِ قرآنی کے ہر شعبہ سے مسترد و مکروہ سمجھے جانے والے اِس انداز کو کسی بھی عربی کتاب کا معیاری ترجمہ نہیں کہا جا سکتا چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کے مقدس و معجز کلام کا معیاری ترجمہ کہا جائے۔ مقامِ تعجب ہے کہ متن کی لسانی حیثیت اور اُس کے اپنے محاورہ کے مطابق ترجمہ؛

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا

اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا

جیسے کسی بھی انداز سے جب درست ہو سکتا ہے تو پھر اُسے چھوڑ کر اِس بے ڈھنگے انداز پر چلنے کی کیا ضرورت تھی جو متن کی لسانی حیثیت اور اُس کے محاورہ سے سراسر خلاف ہے۔ نیز حضرت شیخ سعدی سے لے کر شاہ عبد القادر تک جن اسلاف سے تراجم ثابت ہیں اُن سب نے بھی "بِسْمِ اللّٰهِ

(۱) نصرت الباری، ج:1، ص:32۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ''شریف کا ترجمہ اُس کی لسانی حیثیت کے مطابق ہی کیا ہے۔ مثال کے طور پر؛

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ (شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا۔)

جو متن کی لسانی حیثیت کے عین مطابق اور بے غُبار ہے یہ الگ بات ہے کہ ایجاز و اختصار اور دوسری شرائط کی روشنی میں اِس سے بھی بہتر کی گنجائش ہوسکتی ہے جبکہ لفظ'' ہے'' لگا کر متن کی لسانی اور اُس کی محاورتی حیثیت کو مجروح کرنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے جس کا ارتکاب تھانوی نے کیا ہے یا اُس کی اندھی تقلید میں مبتلا کچھ اور حضرات نے کیا ہے۔ جس کی واحد وجہ مذکورہ شرط سے بے توجہی ہے ورنہ متن کی لسانی حیثیت کو پیشِ نظر رکھ کر ترجمہ کرنے والوں سے ایسی غلطی کبھی نہیں ہوسکتی۔

ثانیاً:۔ اِس میں شانِ الٰہی کی تعظیم و آداب کو انسانوں کے آداب و تعظیم پر قیاس کر کے اُس وحدہ لاشریک کے لیے جمع کے الفاظ ''ہیں'' استعمال کیے گئے ہیں جو متن کی لسانی و محاورتی حیثیت کے منافی ہونے کے ساتھ پیغمبری طریقے سے بھی خلاف ہے کیوں کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے لیے جمع کے الفاظ کہیں ثابت نہیں ہیں حالاں کہ شانِ الٰہی کی تعظیم و ادب کے حوالہ سے کوئی اور شخص پیغمبر سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔

الغرض ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ''شریف کے ترجمہ میں تھانوی صاحب نے یہ دو غلطیاں ایسی کی ہیں کہ اُس سے قبل ان کی مثال نہیں ملتی اور ان دونوں کی اصل وجہ مذکورہ شرط سے بے خبری ہے۔ ایسے میں متن کی لسانی حیثیت کی پابندی کو ترجمہ کے لیے ناگزیر شرط کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔

دوسری مثال:۔ آیت کریمہ ''قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَۃٌ صَفْرَآءُ '' کا اشرف علی تھانوی نے ترجمہ کیا ہے'' حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو'' جو متن کی لسانی حیثیت سے خلاف اور غلط فحش ہے کیوں کہ لفظ'' بَقَرَۃٌ صَفْرَآءُ '' لسانِ قرآنی میں'' زرد رنگ کی گائے'' کے سوا

اور کچھ نہیں ہے چہ جائیکہ "زرد رنگ کا بیل" ہو کیوں کہ نحوی اُصولوں کے مطابق اِس پر آیا ہوا الف تانیث جس اسم پر بھی آتا ہے وہ ہمیشہ مونث ہوتا ہے جس کے متعلق علم نحو کی کتابوں میں کہا گیا ہے:

"ممتنع صرفهما البتةً لان الالف قائم مقام السببين التانيث ولزومه"(۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ الف تانیث ممدودہ ہو جیسے لفظ "حمرآء" میں ہے یا مقصورہ ہو جیسے لفظ حُبلٰی میں ہے اِن میں سے جو بھی کسی اسم پر آیا ہوا ہو تو اُس اسم کا منصرف ہونا ممکن نہیں ہے کیوں کہ یہ الف منع صرف کے دو سببوں کے قائم مقام ہے کہ ایک تانیث ہے اور دوسرا لزوم تانیث ہے کہ یہ جس اسم پر بھی آئے اُس کا مذکر ہونا ممکن نہیں ہے بلکہ ہمیشہ مونث ہی ہوتا ہے۔

ایسے میں آیت کریمہ "بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ" کا ترجمہ زرد رنگ کے بیل میں کرنے کی مثال اس جہالت سے مختلف نہیں ہے کہ کوئی شخص "امرئة صفرآء" کے ترجمہ میں زرد رنگ کا مرد کہے یا "امرئة حُبلٰی" کے ترجمہ میں حاملہ مرد کہے۔ متن کی لسانی حیثیت کے خلاف ایسے غلط تراجم لکھنے والوں پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ یہ لکھتے وقت اتنا بھی نہیں سوچا کہ آیت کریمہ کے لفظ "صَفْرَآءُ" پر آئی ہوئی الف تانیث کو اُس کے مصداق کا مونث ہونا لازم ہے کہ بغیر مونث کے اِس کے استعمال کی قطعاً کوئی مثال عربی زبان میں موجود نہیں ہے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ فحش غلطی کی اِس بدترین مثال کو لکھتے وقت اگر اِن کو الف تانیث کے لازم التأنیث ہونے کا خیال ہوتا یا کم از کم مذکر کے لیے اِس کے استعمال کو لسانِ قرآنی کے منافی ہونے کا تصور ہوتا یا لفظ "صَفْرَآءُ" اور بیل کے مابین تضاد پر نظر ہوتی یا علم نحو کی درجنوں کتابوں میں پڑھا ہوا سبق "ممتنع صرفهما البتةً لان الالف قَائِم مَقَام السَّببين التَانِيث وَلُزُومه"(۲) یاد ہوتا تو اِس شرمناک غلطی کا ہرگز ارتکاب نہ کرتے۔

متن کی لسانی حیثیت کو پیشِ نظر رکھنے کی شرط سے غفلت کی وجہ سے غلط ہونے والے

---

(۱) هداية النحو، بحث غير منصرف۔

(۲) هداية نحو بحث اسباب منع صرف۔

ترجمہ کی اِس مثال میں صرف ایک بار غلطی نہیں کی گئی بلکہ یہاں پر متن کی لسانی حیثیت کو پامال کرنے کی ایک درجن مثالیں قائم کی گئی ہیں۔ایک آیت کریمہ"اِنَّ اللّٰہَ یَامُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً" کے ترجمہ میں۔دوسری"اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَۃٌ صَفْرَآءُ" کے ترجمہ میں اوردس بارگاے کی طرف راجع ہونے والے ضمائر کے ترجمہ میں۔

عام ترجمہ کی مذکورہ شرط یعنی متن کی عبارۃ النص اوراُس کی لسانی حیثیت کا ایک پہلو اصل لُغت کا بھی ہے جسے متن لُغت بھی کہا جاتا ہے اِس میں اور لُغت میں عموم وخصوص کا فرق ہے کیوں کہ لُغت ہر زبان کے الفاظ مفردہ ومواد سے لےکر اُس کی جملہ فنی حیثیات ومحاورہ تک سب کو شامل ہے جبکہ متنِ لُغت الفاظ مفردہ ومواد کے سوا کسی اور حیثیت کو شامل نہیں ہے جس کے مطابق ہر متنِ لُغت کو لُغت کہا جاسکتا ہے لیکن ہر لُغت کو متنِ لُغت نہیں کہا جاسکتا۔اِسی وجہ سے اِسے لُغت کی ایک شاخ کے طور پر مستقل علم شمار کیا گیا ہے جس کے ذریعہ زبان کے مانوس الاستعمال الفاظ کی غیر مانوس الاستعمال اورغریب وشاذ الفاظ سے تمیز کی جاتی ہے جس کے متعلق تلخیص المفتاح میں کہا گیا ہے"مِنْہُ مَایُبَیَّنُ فِی علم مَتنِ اللغۃ"۔

جس کی تشریح کے سلسلہ میں امام التفتازانی نے کتاب المطول علی التلخیص میں کہا ہے؛

"لان اللغۃقد تطلق عَلٰی جَمِیْعِ اَقْسَامِ الْعَرَبِیَہ"(۱)

عام ترجمہ کی پہلی شرط یعنی متن کی عبارۃ النص کے ساتھ اُس کی لسانی حیثیات کے جملہ پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھنے کی ذیلی شاخ ہونے کی حیثیت سے اِس کی مستقل اہمیت ہے۔اِس سے بے اعتنائی کے غلط نتائج کی **پہلی مثال** فتاویٰ رضویہ کی مندرجہ ذیل عبارۃ"ولذاردالمحقق ابن الھمام علی بعض المشائخ حیث افتوا بقول الامامین بانہ لا یعدل عن قول الامام الا لِضُعفِ دَلِیْلِہٖ" کا کیا گیا درج ذیل ترجمہ ہے جو مولانا محمد احمد مصباحی نے کیا ہے۔"اِسی

(۱) کتاب المطول مع حاشیہ میرالسیدالسند،ص:33،مکتبہ الداوری قم ایران۔

طرح محقق ابن ہمام نے بعض مشائخ کے اُس فتویٰ پر اعتراض کیا ہے جو اُنہوں نے صاحبین کے قول پر دیا اور فرمایا کہ امام کے قول سے صرف اُسی وقت عدول کیا جائے گا جب اُن کی دلیل کا ضعف ظاہر ہو"(۱) اِس میں متنِ لُغت کے حوالہ سے پانچ جگہوں میں اصل سے خلاف کیا گیا ہے؛

اول:۔ متن کے لفظ "لِذَا" کے ترجمہ میں "اِسی طرح" کہنے میں حالاں کہ عربی زبان کے متن لُغت میں لفظ "لِـــذَا" کا تشبیہ کے لیے استعمال ہونے کی قطعاً کوئی مثال موجود نہیں ہے جبکہ ترجمہ کا یہ لفظ "اِسی طرح" تشبیہ میں صریح وظاہر ہے تو پھر اُس کے مطابق کیوں کہلائے۔

دوم:۔ متن کے لفظ "ردّ" کے ترجمہ میں "اعتراض کیا ہے" کہنے میں حالاں کہ عربی زبان کے متنِ لُغت میں لفظ "ردّ" اور اس سے اشتقاق پا کر استعمال ہونے والے الفاظ جس چیز سے بھی متعلق ہوتے ہیں اُس سے انکار اور عدم تسلیم پر ہی دلالت کرتے ہیں جس میں مخالف کے لیے نرم گوشے کا احتمال ہی باقی نہیں رہتا۔ اِس سے برعکس اعتراض کرنے میں بڑی وسعت ہے جس کے مطابق نہ ہر "ردّ" اعتراض ہے اور نہ ہر اعتراض "ردّ" ہے اور کبھی دونوں جمع بھی ہو سکتے ہیں جسے علم کی زبان میں عموم وخصوص من وجہٍ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ متنِ لُغت کے حوالہ سے حقائق کی اِس روشنی میں مولانا محمد احمد مصباحی کے مذکورہ ترجمہ کو اصل کے مطابق کیوں کہا جائے۔

سوم:۔ متن کے لفظ "حیــث" کے ترجمہ میں "جو" کہنے میں جیسا ترجمہ کے الفاظ "جو اُنہوں نے صاحبین کے قول پر دیا" سے صاف ظاہر ہے حالاں کہ عربی زبان کے متنِ لُغت میں لفظ "حیث" کا اس قسم معانی ومفہوم کے لیے استعمال ہونے کی قطعاً کوئی مثال موجود نہیں ہے۔

چہارم:۔ متن کے لفظ "بِاَنَّہ" کے ترجمہ میں "فرمایا" کہنے میں جیسا ترجمہ کے مذکورہ الفاظ "اور فرمایا کہ امام کے قول سے معلوم ہو رہا ہے" یہاں پر بھی ایسا ہی ہے کہ عربی زبان کی متنِ لُغت میں لفظ "بِـــاَنّـــہ" کا فرمانے میں استعمال ہونے کی قطعاً کوئی مثال موجود نہیں ہے تو پھر یہ اُس

---

(۱) فتاویٰ رضویہ،ج:،ص:،مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور۔

کے مطابق کیوں کہلائے۔

پنجم:۔ متن کے لفظ "اِلَّا" کے ترجمہ میں "صرف اُسی وقت" کہنے میں جیسا ترجمہ کے مذکورہ الفاظ "امام کے قول سے صرف اُسی وقت عدول کیا جائے گا جب اُن کی دلیل کا ضعف ظاہر ہو" سے صاف معلوم ہورہا ہے حالاں کہ عربی زبان کے متنِ لُغت میں لفظ "اِلَّا" کا استعمال استثناء کے لیے یا کبھی کبھی لفظ "غیر" کے اسمی معنی کے لیے استعمال ہونے سے خالی نہیں ہوتا جو عربی زبان کی لُغت سے قدرے مناسبت رکھنے والوں سے بھی مخفی نہیں ہے چہ جائیکہ ترجمہ کے اِس انداز میں استعمال ہونے کی کوئی مثال یا کوئی محاورہ موجود ہو۔

الغرض مترجم کی اِن پانچوں غلطیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اُنہوں نے ترجمہ کی مذکورہ شرط سے یعنی متن کے مفردات کی متنِ لُغت والی حیثیت سے بے اعتنائی کی ہے جس کے نتیجہ میں متن کا مفہوم ہی مسخ ہورہا ہے جو نہ صرف فتاویٰ رضویہ کے مصنف کے لیے بلکہ جن سے اُنہوں نے نقل کیا ہے اُن کے لیے بھی روحانی اذیت کا سامان بن رہا ہے جبکہ اُن کے منشاء کے مطابق ہونے کے ساتھ متن کی لُغوی حیثیت کے بھی مطابق ترجمہ یوں ہوسکتا ہے "اور اِسی وجہ سے محقق ابن ہمام نے بعض مشائخ پر ردّ کیا ہے جہاں اُنہوں نے صاحبین کے قول پر اِس تصور کے سبب فتویٰ دیا ہے کہ بے شک وہ امام کے قول سے متجاوز نہیں ہوتا مگر اُس کی دلیل ضعیف ہونے کی وجہ سے" جو نہ صرف متن کے جملہ مفردات کی لُغوی حیثیت کے مطابق اور بے غُبار ہے بلکہ اُس کی لسانی حیثیت کے تمام پہلوؤں پر بھی منطبق ہے جس سے بے راہ ہوکر مذکورہ اغلاط کی راہ اختیار کرنے کی واحد وجہ اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ عام ترجمہ کی مذکورہ شرط سے بے اعتنائی کی گئی ہے۔ اِس غلطی میں فتاویٰ رضویہ کی جلد اول کے مترجم کے ساتھ جلد دوازدہم کے مترجم بھی کافی حد تک شریک ہیں جو اس کے صفحہ نمبر 117 پر فقہاء کی مذکورہ عبارت کے ترجمہ پر غور کرنے والوں سے مخفی نہیں رہ سکتا۔ دونوں مترجموں کی اِس غلطی کی وجہ سے حضرت ابن ہمام سے لے کر ابن عابدین اور فتاویٰ رضویہ کے مصنف تک سب کو عالَم برزخ میں کوفت محسوس ہورہی ہوگی۔ (فَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکٰی)

دوسری مثال:۔ بخاری شریف کی ابتدائی حدیث ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیّٰتِ '' سے متعلق امام بخاری نے اپنی سند بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے جو ''حَدَّثَنَا الْحُمَیْدِیُّ'' سے لے کر عمر ابن الخطاب تک جارہا ہے اِس کے ابتدائی حصہ ''حَدَّثَنَا الْحُمَیْدِیُّ'' کا ترجمہ نُصرت الباری ترجمہ صحیح بخاری کے مترجم مولانا عبدالستار نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے''اِس کی تفسیر ہم سے بیان کی حُمیدی نے'' جو متنِ لُغت کے حوالہ سے ''حَدَّثَنَا'' پر منطبق نہیں بلکہ خلاف ہے کیوں کہ متنِ لُغت کے مطابق ''حَدَّثَنَا، اَخْبَرَنَا، اَنْبَئَنَا'' جیسے الفاظ کا تعلق سند کے بعد مذکور ہونے والے کلام کے سوا کسی اور چیز کے ساتھ نہیں ہوتا چہ جائیکہ تفسیر سے متعلق ہو۔

محدثین نے بھی عربی زبان کے متنِ لُغت کے عین مطابق انہیں بعدالسند مذکور ہونے والے متنِ حدیث سے متعلق استعمال فرمایا ہے۔حقیقت کی اِس روشنی میں مترجم کا یہ کہنا کہ ''اِس کی تفسیر ہم سے بیان کی حمیدی نے'' اُس کے مطابق کیوں کہلائے مترجم کی اِس غلطی کی اصل وجہ ترجمہ کی مذکورہ شرط سے بے اعتنائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔اِس پر مستزاد یہ کہ یہ لکھتے وقت مترجم نے ترجمہ کی حقیقت کو بھی پیشِ نظر نہیں رکھا کہ وہ ''اِبْدَالُ اَلْفَاظِ الْمتن بِاَلْفَاظِ اللِّسَانِ الْآخرِ الَّتِی تَقُوْمُ مَقَامَھَا '' سے عبارت ہے(۱) یعنی متن کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ کے ساتھ بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہو جائیں یعنی اُن سے متکلم کے مقصد اور اُن کی لسانی حثیت کے عکس ہو جائیں۔یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ امام بخاری کے مذکورہ الفاظ کے مترجم اِس حقیقت کو ہی پیشِ نظر رکھتے تو ایسی غلطی کبھی نہ کرتے کیوں کہ ''اِبْدَالُ اَلْفَاظِ الْاَصْلِ بِاَلْفَاظِ اللِّسَانِ الْآخرِ الَّتِی تَقُوْمُ مَقَامَھَا'' کے لیے یہاں پر متن میں صرف تین الفاظ ہیں؛

اول:۔ ''حَدَّثَ'' ہے جو فعل کہلاتا ہے۔

دوم:۔ لفظ ''نَا'' ہے جو ضمیر منصوب متصل مفعول بہ کہلاتا ہے۔

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج1، ص111، مطبوعہ دارالحدیث قاھرہ مصر۔

سوم:۔لفظ ''الحُمَیْدِی '' ہے جو اسم ظاہر اور فاعل کہلاتا ہے۔

اِس کے مطابق اُس کا حقیقی ترجمہ ''حدیث بیان کی ہم سے حمیدی نے ،حمیدی نے ہم سے حدیث بیان کی ،ہم کو حمیدی نے حدیث بیان کی'' جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا تھا جو ترجمہ کی تعریف کے مطابق ہونے کے ساتھ متن سے متکلم کی مراد کے بھی مطابق ہے جسے چھوڑ کر ترجمہ کے نام سے اِس بے ڈھنگا پن میں پڑنے کی وجہ ترجمہ کی مذکورہ شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اصل سوال نامہ کا بقدرِ ضرورت جواب دینے کے بعد مناسب سمجھتا ہوں کہ ترجمہ کی حقیقت اور اس کے پسِ منظر و پیشِ منظر سے مکمل پردہ اُٹھاؤں جو تین بابوں پر مشتمل ہوگا۔

پہلا باب:۔عام ترجمہ سے متعلق ہوگا جس میں لفظِ ترجمہ اور اُس سے اشتقاق پا کر مختلف معانی کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ اور اُن کے مواقعِ استعمال کی وضاحت کی جائے گی اور ترجمہ کے لُغوی مفہوم اور عرفِ عام میں متعارف مفہوم کی تفریق بتانے کے ساتھ مستقل فن کی حیثیت سے اُس کی تعریف ،غرض ،موضوع بھی بیان کیے جائیں گے اور عام ترجمہ یعنی کسی بھی کتاب کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے ناگزیر شرائط کی تفصیل بتائی جائے گی اور مثالوں سے واضح کیا جائے گا کہ اُن میں سے کسی ایک شرط کی خلاف ورزی کی صورت میں بھی ترجمہ بے مقصد، غیر معیاری اور غلط ہوسکتا ہے چہ جائیکہ ایک سے زیادہ کے خلاف ترجمہ کو درست کہا جائے۔ترجمۃ الالفاظ اور ترجمۃ الکلام کے مابین فرق بتانے کے ساتھ بے محاورہ اور بامحاورہ ترجمہ کے نام سے پھیلنے والے غلط تاثرات کا قلع قمع کیا جائے گا۔

دوسرا باب:۔ترجمۃ القرآن سے متعلق ہوگا جس کی عظمت شان کی بنا پر تعریف ،غرض ،موضوع بتانے کے ساتھ اُس اندازِ تعریف کے گوشوں سے بھی پردہ اُٹھایا جائے گا جو حافظ ابن تیمیہ اور کچھ علماءِ مصر سے منقول ہیں۔اِس کے بعد قرآن شریف کے ترجمہ کے لیے خصوصی شرائط کی تفصیل بتائی جائے گی جو عام ترجمہ کی شرائط سے اضافی شرائط ہیں اور مثالوں سے واضح کیا

جائے گا کہ اِن میں سے کسی ایک شرط سے خلاف ہونے پر بھی قرآن شریف کا ترجمہ بے مقصد، غیر معیاری اور غلط ہوسکتا ہے چہ جائیکہ ایک سے زیادہ شرائط کی خلاف ورزی پر مشتمل ترجمہ درست کہلائے۔

تیسرا باب:۔ اِس میں تراجم کے حوالہ سے قرآن شریف کی مظلومیت سے پردہ اُٹھایا جائے گا اور مثالوں سے واضح کیا جائے گا کہ ترجمۃ القرآن کے نام سے ایسی ایسی تحریریں وجود میں لائی جارہی ہیں جنہیں قرآن شریف کا مفہوم یا تفہیم اور تفسیر وتشریح بھی نہیں کہا جاسکتا چہ جائیکہ ترجمہ کہلانے کے قابل ہوں۔ سب سے آخر میں منبع اسلام کے اِس کردار کا دُنیا کی مختلف زبانوں میں معیاری ترجمہ پیش کرنے کے لیے قابلِ عمل طریقہ بتایا جائے گا۔(وَاللّٰہُ الْھَادِیْ اِلٰی سَبِیْلِ الرَّشَادِ)

پہلا باب

عربی زبان کا یہ لفظ علم تصریف کے مطابق رباعی مجرد یعنی باب ''فَـعْـلَـلَةٌ'' سے استعمال ہو کر متعدد معانی و مقاصد کا فائدہ دیتا ہے۔

پہلا:۔ ''پیغام رسانی'' ہے جس کے مطابق ذوات قدسیہ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو تراجمۃ اللہ کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام و پیغام اور اُس کی تعلیمات عام بندوں کو پہنچاتے ہیں۔

حضرت شیخ اکبر محی ابن عربی نے لکھا ہے؛

''ثُمَّ قَالَ عَنْهُ التَرَاجَمَةُعَلَيْهِمُ السَّلَامُ فِي بَابِ الشَّفَاعَةِ''(۱)

حضرت علی المرتضیٰ نور اللہ وجہہ الکریم نے فرمایا؛

''رَسُوْلُكَ تَرْجُمَانُ عَقْلِكَ وَ كِتَابُكَ اَبْلَغُ مَايَنْطِقُ عَنْكَ''(۲)

دوسرا:۔ کسی چیز کی حقیقت بتانے اور اصلیت ظاہر کرنے کے لیے ہے المقامات الحریریہ میں ہے؛

''وَاَحُلُّ مُتَرجَمَهٌ''(۳)

تیسرا:۔ کسی کے کوائف اور سوانح بیان کرنا جیسا کہا جاتا ہے (ترجمۃ الشیخین، ترجمۃ الخلفاء الراشدین، ترجمہ امام ابو حنیفہ یا ترجمہ خواجہ معین الدین حسن)

چوتھا:۔ کسی مسئلہ یا کسی بھی صورت علمیہ کو خاص عنوان دینا جیسا امام بخاری نے صحیح البخاری میں

---

(۱) الفتوحات المکیہ، ج:4، ص:7، مطبوعہ دار صادر بیروت۔

(۲) نہج البلاغہ، خطبہ نمبر:301۔

(۳) المقامات الحریریۃ، نمبر 41، مطبوعہ دار الطباعۃ المکیہ سورہا۔

اپنی سوچ کے مطابق ہر مسئلہ کو خاص عنوان سے تعبیر کیا ہے جو بخاری کے تراجم ابواب کے نام سے مشہور ہیں جو مفرد بھی ہوتے ہیں اور متعدد چیزوں سے مرکب بھی بہر حال یہ سب کے سب ترجمۃ الباب کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں جن کی حقیقت عنوان یا تعیین عنوان سے مختلف نہیں ہیں۔

پانچواں:۔ کسی ایک زبان کے کلام کا مفہوم و منطوق دوسری زبان والوں کو اُن کی زبان میں شفاہۃً ومواجہۃً ادا کرنا یہ کبھی ایک طرف سے ہوتا ہے اور کبھی دونوں طرف سے فعل کے طور پر اس کا استعمال چاہے ماضی میں ہو جیسا کہا جاتا ہے "تَرْجَمَ لَهُ الْكَلَامَ" یا مستقبل میں جیسا کہا جاتا ہے "يُتَرْجِمُ لَهُ الْكَلَامَ" یا اسم فاعل کی صورت میں جیسا کہا جاتا ہے "فُلَانٌ مُتَرْجِمٌ" بہر تقدیر ایسا کردار انجام دینے والے شخص کے لیے غالب استعمال میں ترجمان ہی کہا جاتا ہے جو اسم فاعل یعنی ترجمانی کرنے والے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ عمدۃ القاری شرح بخاری شریف میں اس کی تفہیم کرتے ہوئے لکھا ہے؛

"اَلتَّرْجُمَانُ هُوَ الْمُعَبِّرُ عَنْ لُغَةٍ بِلُغَةٍ"(۱)

بخاری شریف کی حدیث ہرقل میں ہے؛ "دُعَا بِتَرْجُمَانِهِ"

اِس کے بعد ہے؛ "فَقَالَ لِلتَّرْجُمَانِ"(۲)

چھٹا:۔ کسی فن یا کسی کلام کی تشریح و توضیح کرنا اِسی کے مطابق الافصاح فی فقہ اللغۃ میں لکھا ہے؛

"تَرْجَمَ فُلَانٌ كَلَامَهُ اِذَا اَوْضَحَهُ وَبَيَّنَهُ"(۳)

یہی چیز المصباح المنیر میں بھی ترتیب کی تغیر کے ساتھ اِس طرح لکھی ہے؛

"وَتَرْجَمَ فُلَانٌ كَلَامَهُ اِذَا بَيَّنَهُ وَاَوْضَحَهُ"(۴)

---

(۱) عینی علی البخاری،ج:1،ص:85،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت۔

(۲) بخاری باب کیف کان بدء الوحی،ج:1،ص:2۔

(۳) الافضاح فی فقهه اللغة،ماده:(ت،ر،ج،م)۔

(٤) المصباح المنیر،ماده:(ت،ر،ج،م)۔

اور اِسی کے مطابق میر باقر داماد کو ترجمان المنطق کہا جاتا ہے کہ اُس نے منطق کی دورِ متاخرین میں سب سے زیادہ اور نمایاں تشریح کی ہے۔ اور حضرت عبداللہ ابن عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمَا کو ترجمان القرآن کہنا بھی اسی بنیاد پر ہے کہ قرآن شریف کی تفسیر و توضیح کرنے میں فائق تھے۔ اُن کے ہم عصر صحابی حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان سے متعلق فرمایا:

"نِعْمَ تَرْجُمَانِ الْقُرْآنِ ابْنُ عَبَّاسٍ" (۱)

ساتواں:۔ کسی بھی کتاب کا دیباچہ اور ابتدائی حصہ جسے فاتحۃ الکتاب بھی کہا جاتا ہے۔ المنجد میں لکھا ہے:

"تَرْجَمَةُ الْكِتٰبِ فَاتِحَتُهٗ" (۲)

آٹھواں:۔ کسی کتاب یا کسی بھی تحریر کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا اِس کتاب میں ہمارے پیشِ نظر یہی مفہوم ہے، ہماری بحث کا محور بھی یہی ہے اور فارسی، اُردو، پنجابی، کھوار جیسی متعدد زبانوں میں استعمال ہونے والے ترجمہ، تراجم، ترجمۃ الکتاب، ترجمۃ القرآن، دارالتراجم اور شعبہ تراجم جیسے الفاظ اِسی سے متعلق ہیں اور عُرفِ عام میں بھی یہی مفہوم مشہور و متعارف ہے۔ اِسی کو مستقل فن کی حیثیت حاصل ہے جبکہ اِس کے مقابلہ میں سابق الذکر مفہومات میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے کہ اُسے فن کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہو یا فن کی افادیت اور عموم و بقا کے رنگ میں لیا جاتا ہو بلکہ اُن کی حیثیت مخصوص افعال اور وقتی کردار کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ترجمہ کے دوسرے غیر متعارف مفہومات کے مقابلہ میں صرف اِسی ایک مفہوم کو مستقل فن کی حیثیت حاصل ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ فن کی تعریف اُن پر نہیں بلکہ صرف اِسی پر صادق آتی ہے۔

---

(۱) التبحیر فی علم التفسیر للسیوطی، ص: 335، مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاھور پاکستان۔

(۲) المنجد، مادہ: (ت، ر، ج، م)۔

ترجمہ اور مستقل فن:۔ انسانی زندگی کے مختلف شعبہ ہائے حیات کے کسی بھی زاویہ سے متعلق علم کا وہ رنگ، وہ انداز اور تعلیم و تعلّم کی وہ سبیل فن کہلاتی ہے جو اُمورِ ثلاثہ یعنی تعریف، غرض، موضوع پر مشتمل ہو۔

تعریف سے مراد اُس کی ایسی پہچان کہ دوسرے فنون سے نکھر کر جدا و ممتاز ہو جائے۔

غرض سے مراد اُسے ایجاد کرنے اور وجود میں لانے سے یا اُس کے مندرجات کو پڑھنے اور حاصل کرنے سے خاص مقصد پیشِ نظر ہو جسے علّت غائی بھی کہا جا سکتا ہے۔

موضوع سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے عوارضات ذاتیہ سے بحث کی جائے۔ مثال کے طور پر علُوم لسانیہ کے سلسلۂ دراز میں علم تصریف ایک مستقل فن ہے کیوں کہ وہ تعریف، غرض، موضوع سے پہچانا جاتا ہے یعنی کہا جاسکتا ہے کہ ''هُوَ عِلْمٌ يُبْحَثُ فِيهِ عَنْ اَحْوَالِ الْكَلِمَةِ مِنْ حَيْثُ الصِّيْغَةِ'' جس سے وہ دوسرے تمام علوم لسانیہ سے جدا و ممتاز ہو جاتا ہے اور ''كَلِمَةٌ مِنْ حَيْثُ الصِّيْغَةِ'' اُس کا موضوع اور صیغوں کی پہچان اُس کے ایجاد سے اور پڑھنے سے مقصود قرار پا رہا ہے۔ اِسی طرح لفظ ''ترجمہ'' کا متعارف مفہوم کہ وہ کسی کتاب یا کسی بھی تحریر کو دوسری زبان میں منتقل کرنا اس لیے مستقل فن ہے کہ تعریف، غرض، موضوع سے پہچانا جاتا ہے۔

مستقل فن کی حیثیت سے ترجمہ کی تعریف:۔ وہ ایسا فن ہے جس میں اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے اُن الفاظ میں بدل دیا جاتا ہے جو اصل کے قائم مقام ہو سکیں یعنی ''هُوَ الْعِلْمُ الَّذِىْ تُبَدَّلُ فِيهِ اَلْفَاظُ الْاَصْلِ بِالْفَاظِ اللُّغَةِ الْاُخْرٰى الَّتِى تَقُوْمُ مَقَامَهَا''۔

فنِ ترجمہ سے غرض وغایت:۔ اِس عمل سے مقصد ایک زبان میں لکھے گئے علوم و مضامین کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ہے تاکہ اِس کے جاننے والے بھی اُن سے مستفید ہو سکیں بالفاظ دیگر یوں بھی کہا جا سکتا ہے ''دوسری زبان والوں کو اصل کے مقاصد سے مستفید ہونے کا موقع دینا۔

فنِ ترجمہ کا موضوع:۔ مافیہ الترجمہ والی زبان کے وہ الفاظ ہیں جنہیں متن کے الفاظ کے متبادل استعمال کیا گیا ہو کیوں کہ ہر فن کا موضوع وہی چیز ہوتی ہے جس کے عوارضات ذاتیہ یعنی اُس کی ذات کو لاحق ہونے والی صفات سے بحث کی جاتی ہو اِس فن میں بھی ترجمہ کے الفاظ سے ہی ''مِنْ حَیْثُ الصَّحِیْحِ وَالسَّقِیْمِ'' اور معیاری وغیر معیاری اور اصل کے موافق یا مخالف ہونے جیسی باتوں سے بحث کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ جس ترجمہ کے الفاظ اصل کے موافق ہوں وہ معیاری اور جس کے الفاظ اصل سے خلاف ہوں وہ غیر معیاری ترجمہ کہلاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس ترجمہ کے الفاظ اصل الفاظ کے قائم مقام ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں اُسے معیاری کہا جاتا ہے اور جو ایسا نہ ہو اُسے غیر معیاری اور غلط کہا جاتا ہے۔

الغرض لفظِ ترجمہ اور اِس سے اشتقاق پا کر استعمال ہونے والے تراجم، مُترجِم، مُترجَم جیسے الفاظ کے صرف اِسی متعارف مفہوم کو فن کی حیثیت حاصل ہے جبکہ اِس کے علاوہ دوسرے استعمالات و مفہومات میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس پر فن کی تعریف صادق آ سکے۔ یہاں پر اِس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ترجمہ اور ترجمانی جدا جدا چیز ہیں کیوں کہ ترجمہ ایک مستقل فن ہے جبکہ ترجمانی اِسم منسوب ہے یعنی ترجمان کی طرف منسوب ہے اور ترجمانی اِسم فاعل کے معنیٰ میں ہے جو ایک زبان کے کلام کو دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کرنے والے کو شامل ہونے کی طرح ایک زبان کے کلام کی تعبیر دوسری زبان میں کرنے اور ایک زبان کے کلام کی دوسری زبان میں تفسیر کرنے کو بھی شامل ہے نہ صرف اتنا بلکہ تحریری کلام کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کو شامل ہونے کے ساتھ زبانی کلام کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کو بھی شامل ہے۔ نیز الفاظِ مفردہ کے معانی کو منتقل کرنے والے کو شامل ہونے کے ساتھ مجموعۂ کلام کو دوسری زبان میں منتقل کرنے والے کو بھی شامل ہے۔ فتح الباری شرح البخاری میں اِس کا مفہوم بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''وَالتَرجُمَانُ الْمُعَبِّرُعَنْ لَفْظَةٍ بِلَفْظَةٍ''(۱)

اہل علم جانتے ہیں کہ یہاں پر''عَنْ لَفْظَةٍ بِلَفْظَةٍ ''کے دونوں جگہوں میں حرف''تا''وحدۃ کے لیے ہے حالاں کہ مستقل فن کی حیثیت سے ترجمہ کا متعارف مفہوم تعبیر''عَنْ لَفْظَةٍ بِلَفْظَةٍ ''میں نہیں بلکہ کتابی شکل کے پورے کلام کو اُس کے تمام مفردات سمیت دوسری زبان میں منتقل کرنا ضروری ہے ورنہ صرف ایک لفظ کو دوسری زبان کے لفظ کے ساتھ بدلنے کو ترجمہ کہنے کا کوئی عرف متعارف نہیں ہے اسی طرح بعض اسلاف نے اِسے زبانی کلام کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کو شامل کرنے کے ساتھ تفسیر کو بھی شامل قرار دیا ہے جیسا کرمانی شرح بخاری میں مذکورہ حدیث میں استعمال ہونے والے لفظ''ترجمان''کا مفہوم بتاتے ہوئے لکھا ہے؛

''وَهُوَالْمُعَبِّرُبِلُغَةٍ عَنْ لُغَةٍ وَالْمُفَسِّرُ بِلَسَانٍ عَنْ لِسَانٍ''(۲)

ظاہر ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں تفسیر کرنا کتابی کلام میں متعارف ہونے کے بجائے ہر دو جانب سے زبانی کلام کو بھی شامل ہے اور اصل کی تشریح وتوضیح اور تفسیر کرنے کو بھی حالاں کہ تفسیر فنِ ترجمہ سے جدا اور مستقل فن ہے جس کی تعریف ،غرض ،موضوع بھی فنِ ترجمہ کے اِن اُمور ثلاثہ سے مختلف ہیں۔

حقائق کی اِس روشنی میں ترجمانی کو ترجمہ کہنا درست ہے نہ ہر ترجمان کو مترجم کہنا بلکہ اِن کے حقائق عام وخاص کی تفریق کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ایسے میں اِن سب کو ترجمہ کے قبیل سے قرار دینے کے تصور کو درست نہیں کہا جا سکتا۔

ایک مغالطہ کا ازالہ:۔ ترجمۃ الکتاب اور ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے ایک قابلِ افسوس مغالطہ دیکھنے کو یہ بھی ملتا ہے کہ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے تراجم سے اور خاص کر ترجمۃ القرآن کے

---

(۱) فتح الباری،ج:1،ص:34،باب بدء الوحی،مطبوعہ مکتبۃ الغزالی دمشق شام۔

(۲) کرمانی شرح بخاری،ج:1،ص:54،مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت۔

حوالہ سے ترجمانی وترجمہ کے مابین تمیز نہیں کی جاتی جس میں نہ صرف ترجمہ وترجمانی سے استفادہ کرنے والے حضرات اشتباہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں بلکہ عدمِ تفریق کا یہ تصور لے کر ترجمہ لکھنے والوں نے ترجمہ کے فن کو ہی شرمایا ہے خاص کر ترجمۃ القرآن کے نام سے قرآن شریف کی جو ترجمانی کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں اُنہیں ترجمہ کہنے کا قطعاً کوئی جواز ہی نہیں ہے۔ اِن کی مثالوں کو ہم نے تفسیر **''مدارج العرفان فی مناھج کنز الایمان''** میں علی وجہ الاتم قارئین کے سامنے پیش کیا ہے یہاں پر ہم صرف اُصولِ بیان کریں گے اس لیے اُن کا اعادہ کرنے یا مُترجمین کی اِس غفلت کے گوشوں سے پردہ اُٹھانے کو مناسب نہیں سمجھتے ہیں۔ بلکہ یہاں پر مترجمین کی اِس غفلت کا اصل منشاء بتانے پر ہی اکتفا کریں گے وہ یہ ہے کہ ترجمانی کو ترجمہ کا نام دینے والے اِن حضرات کو شاید اُن عبارات سے مغالطہ لگا ہو جو کچھ لُغت کی کتابوں میں اور بعض شروح حدیث میں لکھی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً لُغت کی مشہور کتاب ''لسان العرب'' میں ہے؛

''اَلتَّرْجُمَانُ هُوَالَّذِیْ یُتَرْجِمُ الْکَلَامَ اَیْ یَنْقُلُهُ مِنْ لُغَةٍ اِلَی لُغَةٍ اُخْرٰی''(۱)

اِسی طرح المصباح المنیر میں ہے: **''وَتَرْجَمَ کَلَامَ غَیْرِهٖ اِذَاعَبَّرَعَنْهُ بِلُغَةٍ غَیْرِلُغَةِ الْمُتَکَلِّمِ''**(۲)

صراح میں ہے: ''یعنی بیان کنندہ زبانی بزبانی دیگر **وَقَلْتَرْجَمَهٗ وَتَرْجَمَ عَنْهُ**''(۳)

الکواکب الدراری فی شرح البخاری للکرمانی میں ہے: **''تَرْجَمْتُ الشَّیْءَ اِذَابَیَّنْتَهٗ وَوَقَفْتَ عَلَیْهِ غَیْرَکَ مِمَّنْ لَایَقِفُ عَلَیْهِ بِنَفْسِهٖ''**(۴)

---

(۱) لسان العرب، مادہ: (ت، ر، ج، م)۔

(۲) المصباح المنیر، ج:1، مادہ: (ت، ر، ج، م)۔

(۳) صراح، مادہ: (ت، ر، ج، م)۔

(٤) الکواکب الدراری، ج:1، ص:54، مطبوعہ داراحیاء التراث بیروت۔

عمدۃ القاری شرح بخاری میں ہے: ''اَلتَّرْجُمَان اَلَّذِیْ یُبَیِّنُ الْکَلَامَ''(۱)

کتابوں میں پائے جانے والی اِس قسم کی عبارات کو دیکھ کر حضرات ترجمانی کو ترجمان اور ترجمان کے مفہوم کو ترجمہ سمجھ بیٹھے، ترجمہ کے متعارف مفہوم کو پسِ پشت ڈال دیا، اُس کی فنی حیثیت کو نظر انداز کیا خاص کر قرآن شریف کے ترجمہ جیسے کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط عمل کو جیسا چاہا ویسا عربی سے عجمی زبان میں منتقل کیا جو فنِ ترجمہ کی شرائط پر بھی منطبق نہیں چہ جائیکہ ترجمۃ القرآن کی مخصوص شرائط پر پورا اُترے۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر یہ حضرات لفظِ ترجمہ کے لُغوی اطلاقات اور عرفی مفہوم کی فنی حیثیت کو پیشِ نظر رکھ کر مذکورہ عبارات پر غور کرتے تو اِس مغالطہ میں مبتلا نہ ہوتے، ترجمانی کے مفہوم کو ترجمان کا مفہوم سمجھنے کی غلطی کرتے نہ ترجمان کے مفہوم کو ترجمہ تصور کرنے کی کج فہمی میں پڑتے اور نہ ہی ترجمہ کے لُغوی مفہوم کو عرفی مفہوم پر محمول سمجھتے کیوں کہ اہلِ لُغت سے لے کر شارحینِ حدیث تک حضرات کی جن عبارات سے بھی انہیں یہ مغالطہ ہو رہا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں ہیں کہ اُن میں سے بعض لفظ ترجمان کے مفہوم سے متعلق ہیں کہ ترجمان وہ ہوتا ہے جو دوسرے کا کلام ایک لُغت سے دوسری لُغت میں تعبیر کرے جیسا لسان العرب کی مذکورہ عبارت ''ھُوَالَّذِیْ یُتَرْجِمُ الْکَلَامَ اَیْ یَنْقُلُہٗ مِنْ لُغَۃٍ اِلٰی لُغَۃٍ اُخْرٰی'' سے صاف معلوم ہو رہا ہے جبکہ اُن میں سے بعض لفظ ترجمہ کے لُغوی معنٰی سے متعلق ہیں یعنی لُغت کی زبان میں ترجمہ اِسے کہتے ہیں کہ تو کسی کے کلام کو دوسری زبان میں بیان کرے جیسا شرح کرمانی علی البخاری، فتح الباری علی البخاری، عمدۃ القاری علی البخاری، المصباح المنیر، الافصاح فی فقہ اللغۃ وغیرہ کی عبارات سے معلوم ہو رہا ہے کہ اِن سب نے لفظِ ترجمہ کے لُغوی مفہوم بیان کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے۔ ایسے میں ہم مترجمین کی اِس غفلت پر تنبیہ کرنے کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں۔ مذکورہ عبارات سے مغالطہ کھانے کی مثال ایسی ہی ہے جیسا حدیث ''صَلّٰی عَلٰی قَتْلٰی

---

(۱) عمدۃ القاری، ج:1، ص:84، مطبوعہ دارالتراث العربی بیروت۔

اُحُدٍ بَعْدَ مَقْتَلِهِمْ بِثَمَانِ سِنِيْنَ ''(۱) میں لُغوی مفہوم بمعنی دُعا میں استعمال ہونے والے لفظ ''صلوٰۃ'' کو صلوٰۃِ جنازہ پر محمول سمجھنے کی بے اعتدالی کی گئی ہیں۔

اِس کی تفصیل اِس طرح ہے کہ معرکہ اُحد کے آٹھ سال بعد اللہ کے رسول سیدِ عالم ﷺ نے خُصوصی اہتمام کے ساتھ شہدآءِ اُحد کے لیے دُعا فرمائی۔ حدث شریف کے الفاظ ہیں ''اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمًا فَصَلّٰى عَلٰى اَهْلِ اُحُدٍ صَلَاتَهُ عَلَى الْمَيِّتِ '' دوسری روایت کے الفاظ ہیں ''صَلّٰى عَلٰى قَتْلٰى اُحُدٍ بَعْدَ مَقْتَلِهِمْ بِثَمَانِ سِنِيْنَ '' جس میں لفظ ''صلوٰۃ'' اپنے لُغوی مفہوم بمعنی دُعا میں استعمال ہوا ہے یعنی اللہ کے رسول سیدِ عالم ﷺ نے ایسے اہتمام کے ساتھ اُن کے لیے دُعا فرمائی جیسے نمازِ جنازہ کی دُعا کا اہتمام کیا کرتے تھے۔

اِس قسم حدیثوں میں ''صلوٰۃ'' اپنے لُغوی مفہوم یعنی دُعا میں واضح استعمال ہونے کے باوجود بعض اہل علم نے اُسے صلوٰۃ کے عرفی مفہوم میں ہونے کا تصور کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے آٹھ سال بعد شہدآءِ اُحد پر نمازِ جنازہ پڑھی۔ مذہبی عصبیت کی آلودگی سے پاک وصاف ذہن سے اِس پر غور کرنے والے حضرات اِس مغالطہ سے پیدا ہونے والے شکوک وشبہات پر افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے جیسا مترجمین کی مذکورہ کج فہمی پر تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مذکورہ عبارات سے مرادِ ترجمہ کے متعارف مفہوم نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان سب کا مفاد مطلق نقل ہے یعنی ''نَقْلُ الْكَلَامِ مِنْ لُغَةٍ اِلٰى لُغَةٍ اُخْرٰى كَيْفَ مَا اتَّفَقَ ''یعنی عام اِس سے کہ شِفاہی ہو یا تحریری اصل کے موافق ہو یا مخالف اور اصل سے زیادہ اور طویل کلام میں ہو یا اُس کے الفاظ کے مطابق نپے تلے الفاظ میں۔ نیز تفسیر وتفہیم اور ترجمانی کو بھی شامل ہے جبکہ ترجمہ کے عرفی مفہوم مطلق نہیں بلکہ شرائط واُصول کی قید میں مقید ہے یعنی ''اِبْدَالُ الْفَاظِ اَصْلِ الْكَلَامِ بِاَلْفَاظِ اللِّسَانِ الْآخَرِ الَّتِيْ تَقُوْمُ مَقَامَهَا '' سے عبارت ہے جس میں لُغوی مفہوم کے اطلاق سے

---

(۱) شرح معانی الآثار، ج:1، ص:243، مطبوعہ مکتبہ میر محمد آرام باغ کراچی۔

امتیاز لانے والی چیز یعنی معیارِ ممیّز "تَقُوْمُ مَقَامَهَا" والا کردار ہے۔ امام جلال الدین السیوطی نے اپنے سے پیش رو امام قفال رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے کی گئی تعریف کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے؛

"اَلتَّرْجَمَةُ اِبْدَالُ لَفْظَةٍ تَقُوْمُ مَقَامَهَا"(۱)

علم بلاغت سے آ گاہ حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ترجمہ کی تعریف کے سلسلہ میں یہ عبارت صنعت استخدام کے قبیل سے ہے جس میں فعل "تَقُوْمُ" کے ضمیر فاعل سابق الذکر "لَفْظَةٍ" کی طرف نہیں بلکہ اُس کے لازم کی طرف راجح ہو رہی ہے جو ترجمہ والے الفاظ ہیں وہ اِس مذکور "لَفْظَةٍ" کو لازم اِس لیے ہیں کہ یہ مُبدل منہ ہیں اور مُبدل منہ کا وجود بدل کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اِس کے علاوہ "مَقَامَهَا" میں ضمیر مجرور مضاف الیہ "ہا"، "لَفْظَة" کی طرف نہیں بلکہ اُس کے ضمن میں موجود اِسم جنس جمعی کی طرف راجع ہے جو لفظ بمعنی الفاظ ہے یہ ایسا ہی ہے جیسا آیت کریمہ "اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا"(۲) میں لفظ "بقرہ" سے مراد اِسم جنس جمعی ہے جیسا تفسیروں میں لکھا ہوا موجود ہے گویا ترجمہ کی تعریف کے سلسلہ میں یہ مختصر سی عبارت ایک نہ بلکہ دو استخدام پر مشتمل ہے جو ایجاز و اختصار کے حوالہ سے بلاغت کی اعلیٰ مثال ہے اور جملہ خوبیوں کے ساتھ اِس کی مکمل پہچان کے لیے ہم نے عام فہم انداز میں اِس سے حاصلِ مقصد سطورِ بالا میں بیان کر دیے یعنی "اَلتَّرْجَمَةُ اِبْدَالُ الْفَاظِ اَصْلِ الْكَلَامِ بِاَلْفَاظِ اللِّسَانِ الْاٰخَرِ الَّتِي تَقُوْمُ مَقَامَهَا" یعنی عرف عام میں متعارف ترجمہ اسے کہتے ہیں کہ اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جائے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں۔

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج:1، ص:111، مطبوعہ حجازی بالقاہرہ۔

(۲) البقرہ:70۔

ترجمہ کی تعریف کا تجزیہ:۔ امام قفال اور جلال الدین السیوطی کی طرف سے ترجمہ کی کی گئی مذکورہ تعریف کا تجزیہ اِس طرح ہے کہ اِسے علمی زبان میں حدِ تام کہا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ جنسِ قریب اور فصلِ قریب پر مشتمل ہے اور اِن دونوں پر مشتمل ہر تعریف حدِ تام کے قبیل سے ہوتی ہے۔ جنسِ قریب پر اِس لیے مشتمل ہے کہ اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ کے ساتھ بدلنے کے بعد مافیہ الترجمہ والی زبان کے الفاظ کا یہ اجتماع اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے ترجمہ کے عرفی مفہوم کے لیے جنسِ قریب قرار پاتا ہے جبکہ ترجمہ کا عرفی مفہوم یعنی ترجمہ والے الفاظ کی اجتماعی حیثیت اُس کی نوع ہے اور اصل کے الفاظ کے قائم مقام ہونے والا کردار اِسی نوع کے لیے معیارِ ممیز ہے جسے فصل ممیز اور فصلِ قریب بھی کہتے ہیں جو جنسِ قریب میں اس کے ساتھ شریک ہونے والے دوسرے تمام انواع سے اِسے ممتاز کرتا ہے ورنہ اِس سے پہلے یعنی ''تَقُوْمُ مَقَامَهَا'' والی صفت کے بغیر تفسیر، توضیح، مفہوم تفہیم اور ترجمانی جیسے مختلف انواع پر بھی الفاظ کی تبدیلی کا مفہوم صادق آتا ہے جو کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جسے کلیات خمسہ عقلیہ کی تمیز ہو۔ الغرض تفسیر، توضیح، تفہیم اور ترجمانی جیسی تمام انواع سے ترجمہ کے اِس عرفی مفہوم کو ممتاز کرنے والی چیز الفاظِ مبدلہ کی صفت یعنی ''تَقُوْمُ مَقَامَهَا'' والی صفت کے سوا کوئی اور شے نہیں ہے۔

باقی رہا یہ تصور کہ اصل الفاظ کے قائم مقام ہونے والی یہ صفت ترجمہ کے عرفی مفہوم کے لیے فصلِ قریب کس طرح ہے؟

اِس کی وضاحت اِس طرح ہے کہ کسی بھی نوع کے لیے فصلِ قریب اُس کا وہ اندرونی اور ذاتی کمال ہوتا ہے جو جنسِ قریب میں اُس کے ساتھ شریک تمام انواع سے اُسے ممتاز کرے اور ''تَقُوْمُ مَقَامَهَا'' والی صفت بھی ترجمہ والے الفاظ کی ایسی ہی کمال ہے جو الفاظِ مبدلہ میں ترجمہ کے عرفی مفہوم کے ساتھ شریک ہونے والے دوسرے تمام انواع سے اِسے ممتاز کرتی ہے ورنہ اِس کے بغیر دوسری زبان کے الفاظ مبدلہ پر جیسا ترجمہ صادق آتا ہے ویسا تفسیر، توضیح، مفہوم، تفہیم اور ترجمانی

جیسے تمام انواع صادق آتے ہیں جس میں ذرہ برابر تفریق نہیں ہے تو پھر اِسے فصلِ قریب کیوں نہ کہا جائے اور صفت وموصوف کے اِس مجموعۂ مرکب کو یعنی ترجمہ والی زبان کے الفاظ اور ''تَـقُـوْمُ مَقَامَهَا'' والی صفت کی اجتماعی حیثیت کو مستقل عمل کیوں نہ کہا جائے۔

الغرض ترجمہ کے متعارف مفہوم اور مستقل فن ہونے کی حیثیت سے اس کی مذکورہ تعریف کی حقیقت حدتام کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس میں مُعرَّف یعنی فنِ ترجمہ کو تفہیم، تفسیر، توضیح اور ترجمانی جیسے تمام اصناف سے جدا اور ممتاز کرنے والا کردار ''تَـقُـوْمُ مَـقَامَهَا'' والی صفت ہے جس کے بغیر ترجمہ کے عرفی مفہوم کا وجود ہے نہ تفسیر وتفہیم اور ترجمانی جیسی توضیحات سے امتیاز کا تصور جس کا واضح نتیجہ یہی ہے کہ ترجمہ کے نام سے وجود میں لائی جانے والی ہر وہ تحریر حقیقی ترجمہ کہلاتی ہے جس میں ترجمہ والے الفاظ متن کے الفاظ کے قائم مقام ہوسکیں ورنہ ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوتی۔

باقی رہا یہ سوال کہ جب اصل کے قائم مقام اور اُس کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ کہلانے کے قابل نہ ہوئی تو پھر اُسے کیا کہا جائے اور کس نام سے پکارا جائے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ اِس کے لیے کوئی خاص نام یا خاص دفعہ مقرر کرنے سے پہلے متن سے مخالفت کی نوعیت اور اُس کی کیفیت وکمیت معلوم کرنا ضروری ہے کیوں کہ ''تَـقُـوْمُ مَـقَامَهَا'' سے خلاف ہونے کا مطلب متن سے خلاف ہونا ہے اور خلاف کی نوعیت مختلف ہے کہ کسی ایک لفظ کا بھی خلاف ہوسکتا ہے زیادہ کا بھی اور لُغوی معنی کے اعتبار سے بھی ہوسکتا ہے مرادی معنی کے اعتبار سے بھی۔ نیز فصاحت کے حوالہ سے بھی ہوسکتا ہے حلاوت وجاذبیت کے حوالہ سے بھی علی ہٰذا القیاس متن کی مخالفت کا واضح ثبوت اور اس کی نوعیت وکمیت کا تعین ہوئے بغیر کچھ نہیں کہا جاسکتا بلکہ معنوی تحریف سے لے کر التباس الحق بالباطل تک اور حرام سے لے کر مکروہ تحریم واسائت تک اور مکروہ تنزیہ سے لے کر لایعنی ونامناسب کی ہر شکل کو شامل ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر متن کے مذکر لفظ کا ترجمہ مؤنث میں کیا جائے یا اِس سے برعکس، متن میں ایک لفظ فاعل کے طور پر مذکور ہے اُس کا

ترجمہ مفعول بہ میں کیا جائے یا اِس سے برعکس، متن کے مفرد لفظ کا ترجمہ جمع میں کیا جائے یا اِس سے برعکس، متن لفظاً و معناً ہر طرح سے جملہ خبریہ ہے اُس کا ترجمہ جملہ انشائیہ میں کیا جائے یا اِس سے برعکس، مرکب تام متن کا ترجمہ مفرد میں کیا جائے یا اِس سے برعکس، پورے متن کا یا اُس کے کسی حصہ کا ترجمہ اصل متکلم یا مصنف کی منشاء سے خلاف کیا جائے جس کے پیچھے مترجم کی ذہنی ترجیح یا عصبیت کارفرما ہو۔

اِس قسم کی تمام صورتوں میں ترجمہ کو معنوی تحریف، حرام اور خیانت کہا جاسکتا ہے۔جس کی مثالوں سے کچھ پردے ہم نے اِس تحریر کے آغاز میں اُٹھائے ہیں۔قارئین کو چاہیے کہ پیچھے مڑکر اُنہیں دیکھیں تا کہ ترجمہ کی تعریف میں مذکور لفظ ''تَـقُـوْمُ مَقَامَهَا'' سے خلاف ہونے کے ہولناک نتائج سے آگاہی پائیں اور مزید تفصیل کے لیے **''تفسیر مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن''** کا مطالعہ کریں۔جس کی تینوں جلدوں میں ہم نے اِن کی افسوس ناک مثالوں کی تفصیل پیش کی ہے۔جن کا کچھ حصہ بطور مشتے نمونہ از خروارے اِس کتاب کے باب الشرائط میں بھی بیان ہوگا آگے چل کر وہاں بھی دیکھا جائے۔

اِس کے علاوہ جن تراجم کے الفاظ و انداز ''تَـقُوْمُ مَقَامَهَا'' کی صفت سے خلاف ہوں اُن کی قدرے تفصیل اِس طرح ہے کہ متن کے ایجاز و اختصار کے برعکس تطویل کی جائے، ترجمہ والی زبان کی طرف سے مجبوری کے بغیر متن کی ترتیب سے خلاف کیا جائے، متن کا کوئی لفظ ترجمہ والی زبان میں بھی کثیر الاستعمال و مشہور ہونے کے باوجود اُس کی جگہ ترجمہ والی زبان سے کوئی غیر مانوس الاستعمال لفظ استعمال کیا جائے، ایک سے زیادہ جائز المراد معانی پر مشتمل اصل لفظ کے ترجمہ کے لیے ترجمہ والی زبان میں لفظ دستیاب ہونے کے باوجود اُس کی جگہ صرف ایک معنی پر منطبق ہونے والا لفظ استعمال کیا جائے، دو مفہوموں پر یکساں مشتمل ہونے والا اصل لفظ کے ترجمہ کے لیے متعارف و معقول طریقہ موجود ہونے کے باوجود اُس کے ترجمہ کے لیے صرف ایک احتمال پر منطبق ہونے والا لفظ استعمال کیا جائے، اِسی طرح متن کے محاورہ سے خلاف کیا جائے یا ترجمہ والی زبان

کے محاورہ سے خلاف کیا جائے یا دونوں کے محاورہ سے خلاف کیا جائے یا ترجمہ کی فطری شرط سے خلاف کیا جائے یا ترجمہ کے احتیاطی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھے بغیر پورے متن یا اُس کے کسی حصہ کے ترجمہ کو من پسند روایت پر بِنا کی جائے اور اُس کے مطابق الفاظ استعمال کیے جائیں، ترجمہ کی تمام ناگزیر شرائط پر حاوی ہوئے بغیر اور جملہ شرائط کے حوالہ سے خود اعتمادی و بصیرت پائے بغیر من پسند اکابرین سے منقول انداز و الفاظ میں کیا جائے۔ اِس قسم کے تمام تراجم پر مکروہ تحریم سے لے کر اسائت تک اور مکروہ تنزیہ سے لے کر خلافِ اولیٰ تک دفعات لگائی جاسکتی ہیں۔

پہلی قسم کی طرح اِس کی تفصیلی مثالوں کو بھی ہم **"تفسیر مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن"** کے تینوں حصوں میں بیان کر چکے ہیں تاہم اِس کتاب کے باب الشرائط میں بھی اُن سے اقتباسات لے کر قارئین کی نذر کریں گے مطالعہ جاری رکھ کر باب الشرائط کی آمد کا انتظار کریں جس میں ترجمہ کے حوالہ سے قرآن شریف پر کیے جانے والے مظالم اور معنوی تحریفات کی عجیب وغریب مثالیں ملیں گی لیکن کریں کیا جبکہ علماء کرام کی غالب اکثریت اِس سے غافل ہے اور شرائط کے بغیر قرآن شریف کا ترجمہ لکھنے کا گناہ رواج پا رہا ہے اور احتیاطی تقاضوں سے غافل ہوکر ترجمۃ القرآن کے نام سے نقل در نقل کا بازار گرم ہوتا جا رہا ہے اور ایسے حضرات ترجمۃ القرآن کے نام سے تحریریں وجود میں لا رہے ہیں کہ الٰہیات کے حوالہ سے اُن کا مایہ علم صفر ہے، عام ترجمہ کی شرائط سے ہی بے خبر ہیں چہ جائیکہ ترجمۃ القرآن کی مخصوص اور سخت شرائط کی خوشبو سے مانوس ہوں۔ ہم اِس کتاب کے ذریعہ ترجمہ کی عام شرائط سے لے کر ترجمۃ القرآن کی خصوصی شرائط سے اور اس کے احتیاطی تقاضوں سے آگاہی دینے کے ساتھ غیر معیاری تراجم کا انسداد چاہتے ہیں جو جہد المقل کے فریضہ سے مختلف نہیں ہے۔

ترجمہ کی تعریف کا ایک کمال:۔ حضرت امام قفال اور جلال الدین السیوطی سے ترجمہ کی جو تعریف منقول ہوئی ہے اُس کی جامعیت اور مانعیت کے اِس کمال کا راز بھی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ

سب کچھ اُس کی فصلِ قریب اور معیارِ ممیّز کا کرشمہ ہے جو لفظ ''تَقُوْمُ مَقَامَهَا'' والی صفت ہے۔ اِس کے علاوہ ایک اور کمال یہ بھی ہے کہ ترجمہ والے الفاظ اصل الفاظ کے قائم مقام ہوں یعنی اُن کی لُغوی حیثیت سے لے کر مرادی حیثیت تک جملہ لسانی زاویوں کے مطابق ہونا ہی معیاری اور غیر معیاری ترجمہ کے مابین حدِ فاصل ہے کہ جس ترجمہ کے الفاظ، انداز اور محاورہ اصل کے مطابق ہو وہی معیاری کہلاتا ہے اُسی سے ترجمہ سے متعلق غرض وغایت حاصل ہوسکتی ہے ورنہ ترجمہ کے نام سے اصل کے الفاظ و انداز اور محاورہ سے خلاف لکھی گئی تحریر اِفادہ کے بجائے مغالطہ کا سبب بن سکتی ہے خاص کر قرآن شریف کے ترجمہ کے نام سے ایسی تحریریں طرح طرح کے قبائح پر منتج ہوسکتی ہیں۔ معیاری اور غیر معیاری ترجمہ کے مابین یہی حدِ فاصل یعنی ''تَقُوْمُ مَقَامَهَا'' ترجمہ کی اُن تمام فطری شرائط کے لیے بھی اصل الاصول اور بنیاد ہیں جن کے بغیر کسی بھی کتاب کا معیاری ترجمہ وجود میں لانا ممکن نہیں ہے جس کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ ''تَقُوْمُ مَقَامَهَا'' والی صفت اجمال اور جملہ شرائط اِس کی تفصیل ہیں۔ ایسے میں امام قفال اور محدث سیوطی جیسے اکابرین کو دادِ تحسین دیئے بغیر کون رہ سکتا ہے کہ اُنہوں نے ترجمہ کی تعریف میں صنعتِ استخدام کے انداز پر ایجاز و اختصار کا کمال کیا ہے، دریا کو کوزے میں بند کیا ہے اور ترجمہ کی شرائط کی طرف اشارہ کر کے اُس کی جامع و مانع تعریف کا حق ادا کیا ہے۔

خلاصۃ التحقیق بعد التفصیل:۔ مستقل فن کی حیثیت سے ترجمہ کے متعارف مفہوم کی مذکورہ تعریف ''اِبْدَالُ اَلْفَاظِ الْاَصْلِ بِاَلْفَاظِ اللِّسَانِ الْآخَرِ الَّتِی تَقُوْمُ مَقَامَهَا'' دُنیا کی کسی بھی کتاب، کسی بھی فن اور کسی بھی صنعت وحرفت اور کسی بھی علم سے متعلق کتاب کے ترجمہ کو جامع ہونے کے ساتھ قرآن شریف کے ترجمہ کو بھی شامل ہو رہی ہے کہ کسی بھی کتاب اور کسی بھی تحریر کا ترجمہ اِس سے خارج نہیں ہو رہا جو اِس کی جامعیت کا کمال ہے۔ اِسی طرح ایک زبان کی کسی بھی کتاب کے الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ میں تشریح کرنے، تفہیم کرنے، توضیح کرنے اور تفسیر

کرنے جیسی لفظی تبدیلی کی کوئی ایک صورت بھی ترجمہ کی حد میں داخل نہیں ہو رہی جو اس کی مانعیت کا کمال ہے جس کا اصل راز ''تَقُوْمُ مَقَامَهَا'' کی صفت میں پوشیدہ ہے کہ تفسیر کے الفاظ کا متن کے الفاظ کے قائم مقام ہونا ضروری ہے نہ تفہیم وتوضیح والے الفاظ کا جبکہ ترجمہ والے الفاظ کو ترجمہ کہلانے کا استحقاق اِس صفت کے بغیر کبھی حاصل نہیں ہوتا حالاں کہ متن کے الفاظ کے مقابلہ میں دوسری زبان کے یہ تمام الفاظ بدل الفاظ کہلاتے ہیں چاہے تفسیر وتفہیم کی شکل میں ہو یا ترجمہ کی شکل میں۔ نیز متن پر متفرع اوراُس کے تابع ہونے میں بھی سب یکساں ہیں ورنہ متن کے بغیر جیسے ترجمہ کا تصورنہیں ہے ویسے ہی تفسیر وتفہیم اورتشریح وتوضیح کا تصور بھی نہیں ہے۔ ایسے میں ترجمہ کی اِس تعریف کے کمال سے کون انکار کرسکتا ہے۔

ترجمہ کی مذکورہ تعریف کا ایک اور کمال:۔ یہ ترجمہ کی دونوں قسموں کو یعنی شفاہی ترجمہ جسے کلامی ترجمہ بھی کہا جاسکتا ہے جو دوفریقوں کے مابین ترجمان کے واسطہ سے ہوتا ہے اوروقتی چیز ہے اِس کے مقابلہ میں کتابی ترجمہ ہے جسے تحریری ترجمہ بھی کہا جاسکتا ہے جو پہلے سے موجود کسی کتاب یاکسی بھی تحریر کو دوسری زبان کے الفاظ میں تحریراًوکتاباً منتقل کرنے سے عبارت ہے اورعرفِ عام میں متعارف بھی یہی ہے اورفن کی حیثیت بھی اِسی کو حاصل ہے۔ جوایک زبان میں لکھے گئے علوم ومعارف اورمعلومات وانکشافات کو دوسری زبان والوں کو پہنچانے کا متعارف ومعتاد اورمشہور طریقہ ہے ترجمہ کی مذکورہ تعریف کا امتیازی کمال اوراضافی حسن ہے کہ ترجمہ کی اِن دونوں قسموں کو شامل ہورہی ہے اگرچہ شمول کا انداز مختلف ہے کہ شفاہی ترجمہ کو شامل ہونا حقیقت لُغوی کے انداز سے ہے کیوں کہ ترجمہ کی یہ قسم اُس کے لُغوی مفہوم میں شامل ہے جس میں اِس کا استعمال اوراُس پر لفظِ ترجمہ کا اطلاق بھی مجاز اورکنایہ کے قبیل سے نہیں بلکہ حقیقت ہے جبکہ پہلے سے لکھی گئی کسی کتاب کے تحریراًوکتاباً دوسری زبان کے مناسب الفاظ میں بدلنے پر اِس کا اطلاق حقیقتِ عرفیہ کے انداز پر ہے کیوں کہ عرفِ عام میں وہ اِسی مفہوم کے لیے موضوع ہے اوراہل عرف

بھی یہی معنی مراد لیتے ہیں اور مشہور، معروف اور کثیر الاستعمال بھی یہی ہے۔ عام اِس سے کہ اشتراکِ لفظی کے طور پر ہو یا منقول عرفی کے طور پر متبادر اور غالب یہ ہے کہ منقولِ عرفی کے انداز پر ہو اور کسی بھی منقول لفظ کے استعمال کے تین طریقے ہیں؛

❶ خالص لُغت کی زبان میں اِس صورت میں اِس سے مراد عرفی مفہوم نہیں لُغوی مفہوم مراد ہوتا ہے جیسا آیت کریمہ ''وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ''(۱) ظاہر ہے کہ یہاں پر لفظ صلٰوۃ دُعا کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے جو صلٰوۃ کے عرفی مفہوم کے لیے منقول عنہ ہے اور لُغوی مفہوم ہے جبکہ منقول الیہ یعنی عرفی مفہوم مراد ہونے کا یہاں پر تصور ہی نہیں ہے۔

❷ صرف منقول الیہ یعنی عرفی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے کیوں کہ اِس کے ساتھ مخاطب اہل عرف ہوتے ہیں جو اِسے تسلیم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ''(۲) ظاہر ہے کہ یہاں پر صلٰوۃ سے مراد اس کے عرفی مفہوم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

❸ منقول عنہ و منقول الیہ یعنی لُغوی اور عرفی دونوں مفہوم مراد ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''مَاسَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوْالَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ''(۳) اہل علم جانتے ہیں کہ یہاں پر صلٰوۃ کے دونوں مفہوم مراد ہو سکتے ہیں۔

لُغوی مفہوم ''نیاز مندگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا'' مراد ہونے کی صورت میں یہ کہنے والوں کا مقصد ہوگا کہ وہ اپنے خالق و مالک جَلَّ جَلَالُہٗ کی طرف نیاز مندی کے ساتھ توجہ کرنے والے خوش نصیبوں میں نہیں تھے جس وجہ سے جہنم جانا ہوا۔

عرفی مفہوم مراد ہونے کی صورت میں کہنے والوں کا مقصد یہ ہوگا کہ ''وہ نماز پڑھنے والوں کے زمرہ

---

(۱) التوبة:103۔

(۲) البقرة:43۔

(۳) المدثر:43تا44۔

میں نہیں تھے'' جس وجہ سے جہنم جانا پڑا۔ یہاں پر لُغوی مفہوم سے انکار کی گنجائش ہے نہ عرفی مفہوم مراد ہونے سے مجال بلکہ دونوں درست ہیں اور لفظِ صلوٰۃ کا استعمال دونوں میں حقیقت ہے۔ اول میں حقیقت لُغوی کے طور پر دوسرے میں حقیقتِ عرفی کے طور پر۔ یہی حال زکوٰۃ کا بھی ہے کہ صفائی اور پاکیزگی کے مفہوم میں حقیقتِ لُغوی اور منقول عنہ ہے جبکہ مالِ حولی نصابی میں سے مخصوص حصہ اسلامی حکومت کو دینے کے مفہوم میں منقول الیہ ہے اور اِس کا استعمال بھی دونوں پر حقیقت ہے ،اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکَاۃَ ''(۱) یہاں پر جمہور مفسرین کے مطابق اِس کا عرفی مفہوم مراد ہے۔ جبکہ دوسرے مقام ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا ''(۲) میں صرف لُغوی مفہوم مراد ہے اور تیسرے مقام ''وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فَاعِلُوْنَ ''(۳) میں دونوں کو شامل ہے کہ ایک سے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

اِسی طرح ترجمہ کی مذکورہ تعریف ''اصل متن کے الفاظ کو دوسری زبان کے اُن الفاظ میں بدلنا جو اصل کے الفاظ کے قائم مقام ہوسکیں'' بھی دونوں مفہوموں کو اُن کے اپنے اپنے انداز میں شامل ہورہی ہے اور دونوں میں حقیقت ہے فرق صرف اتنا ہے کہ عرفی مفہوم ''کسی کتاب یا کسی دستاویز وتحریر کے الفاظ کو دوسری زبان کے اُن الفاظ میں کتابۃً وتحریراً بدلنا جو اصل الفاظ کے قائم مقام ہوسکیں'' میں عبارۃ النص ہے کہ اُسی کے لیے اِسے وجود میں لایا گیا ہے اور اِس تصوراتی عبارت سے اصل مقصداُسی کو بیان کرنا ہے جبکہ لُغوی مفہوم یعنی شفاہی ترجمہ بواسطۂ ترجمان اشارۃ النص کے طور پر ضمناً سمجھا جارہا ہے۔

دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ لفظِ ترجمہ کا غالب استعمال عرفی مفہوم کے لیے ہوتا ہے جبکہ لُغوی مفہوم یعنی ترجمان کے ذریعہ شِفاہی ترجمہ کا استعمال اگرچہ حقیقت ہے تاہم عرفی کے مقابلہ میں قلیل ہے۔

---

(۱) البقرۃ:43۔

(۲) الشمس:9۔

(۳) المومنون:4۔

ترجمہ کی مذکورہ تعریف کے فوائد:۔ جامع ومانع ہونے کے مقاصد پر پورا ہونے کے ساتھ سب سے بڑا فائدہ اِس کا یہ ہے کہ اِس سے اُن تمام اعتراضات کا قلع قمع ہو جاتا ہے جو قرآن شریف کے کیے گئے غلط تراجم کی وجہ سے اسلام کے خلاف اُٹھائے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر؛ سورۃ البقرہ، آیت نمبر 197 کے حصے ''وَمَاتَفْعَلُوْامِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ'' کا جو ترجمہ:

❶ **اشرف علی تھانوی** نے کیا ''اور جو نیک کام کرو گے خدائے تعالیٰ کو اُس کی اطلاع ہوتی ہے۔''

❷ **ڈپٹی نذیر احمد دہلوی** نے کیا ''اور نیکی کا کوئی سا کام بھی کرو وہ خدا کو اُسی وقت معلوم ہو جائے گا۔''

❸ **عاشق الٰہی میرٹھی** نے کیا ''اور جو کچھ تم کرو گے نیکی اُس کو اللہ جان لے گا۔''

❹ **وحید الزمان** نے کیا ''اور نیک کام تم کرو گے اللہ کو معلوم ہو جائے گا۔''

❺ **فتح محمد خان جالندھری** نے کیا ''اور جو نیک کام تم کرو گے وہ خدا کو معلوم ہو جائے گا۔''

❻ **عبدالماجد دریا آبادی** نے کیا ''اور کوئی بھی نیک کام کرو گے اللہ کو اُس کا علم ہو کر رہے گا۔''

اِن میں سے اول الذکر اللہ تعالیٰ کے علم کو کسی اور سے مستفاد بتارہا ہے کیوں کہ اُردو محاورہ میں اطلاع ہونا ذاتی علم اور اللہ تعالیٰ کے قدیم وازلی علم کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ غیر سے مستفاد ہونے اور کسی اور کے بتانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ اتنا واضح مسئلہ ہے کہ اُردو محاورہ سے قدرے آگاہ ہر شخص اِسے سمجھتا ہے جبکہ اِس کے بعد والے پانچوں اللہ تعالیٰ کے علم کو حادث بتا رہے ہیں کہ پہلے نہیں تھا اب جانے گا جیسا ان کے بالترتیب مذکورہ الفاظ ''وہ خدا کو اُسی وقت معلوم ہو جائے گا، اُس کو اللہ جان لے گا، اللہ کو معلوم ہو جائے گا، وہ خدا کو معلوم ہو جائے گا، اللہ کو اُس کا علم ہو کر رہے گا'' سے صاف معلوم ہو رہا ہے۔ ایسے میں کوئی مستشرق یا کوئی بھی دشمنِ اسلام قرآن شریف پر اعتراض اُٹھا سکتا ہے کہ مذہب اسلام اللہ تعالیٰ کے علم ازلی وقدیم سے خلاف عقیدہ رکھتا ہے

اور جس مذہب میں اپنے خالق و مالک اور رب الناس کے بارے میں یہ عقیدہ ہو کہ وہ بندوں کے کاموں کو پہلے سے نہیں جانتا بلکہ بندوں کے ہاتھوں کام ہونے کے بعد اُسے علم ہوتا ہے یا اِس کے بارے میں کوئی اور اُسے اطلاع دیتا ہے۔ ایسے مذہب کا سارا نظام اور پورا ڈھانچہ غلط ہوتا ہے کیوں کہ مذہبی نظام کی صحت، اس کے ایجاد اور آسمانی مذہب ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ کے محیط وازلی اور قدیم علم اولین بنیاد ہے جب مذہبِ اسلام کی اولین بنیاد ہی غلط ہے تو پھر اُسے آسمانی مذہب کہنے کا کیا جواز ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دشمنانِ اسلام کی طرف سے کسی وقت بھی اُٹھائے جانے والے اِس متوقع اعتراض کا جواب یہ تمام مترجمین اور اِن کے مقلدین مل کر بھی نہیں دے سکتے ہیں۔ انجامِ کار بغیر شرائط کے ترجمۃ القرآن لکھنے والے مجرموں کی سزا پوری اُمت کو ملے گی، معصوم اسلام کی بدنامی ہوگی اور تمام روئے زمین پر رہنے والے مسلمانوں کے لیے پریشانی واضطراب کا سامان ہوگا۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے حضرت امام قفال اور جلال الدین السیوطی جیسے پیش روانِ اسلام کو کہ اُنہوں نے قرآن شریف کے غلط تراجم کی وجہ سے اسلام کے خلاف اعتراض کرنے والوں کو سر اُٹھانے کا موقع ہی نہیں دیا کیوں کہ اِس قسم کے غلط تراجم کو بنیاد بنا کر اعتراض کے لیے سر اُٹھانے والا شخص ترجمہ کی تعریف اور اس کی حقیقت معلوم کرنے کی بھی کوشش کرے گا اور اِس سلسلہ میں تعریف کی اِس حقیقت کہ **"وہ اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو اصل کے قائم مقام ہوسکیں"** خود ہی سمجھ جائے گا کہ قرآن شریف کے ترجمہ کے نام سے لکھی گئی یہ تحریریں اور یہ اوراق ترجمہ کہلانے کے قابل ہی نہیں ہیں بلکہ ترجمۃ القرآن کے نام سے خودفریبی ہے اور قرآن شریف کے نادان دوستوں کی کارستانی ہے کیوں کہ اِن میں متنِ قرآن کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں نہیں بدلا گیا ہے جو اصل کے مطابق اور ترجمہ کی شرائط پر منطبق ہوں جبکہ معیاری ترجمہ کے لیے ترجمہ کے الفاظ کا اصل کے مطابق ہونا ضروری ہے جو تعریف کے الفاظ

"تَقُوْمُ مَقَامَهَا" سے معلوم ہو رہا ہے جب اِن تراجم میں یہ نہیں تو پھر ترجمہ کی حقیقت بھی نہیں ہے۔ ایسے میں اسلاف سے منقول اس تعریف کو عظیم الافادہ کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔ (وَاللّٰهُ الْهَادِی اِلٰی سَبِیْلِ الرَّشَادِ)

باقی رہی یہ بات کہ اِن تراجم کے مذکورہ الفاظ قرآن شریف کے مذکورہ الفاظ کے قائم مقام اور اُن کے مطابق کیوں نہیں اِس لیے کہ متن کے لفظ "یَعْلَمَهُ اللّٰهُ" کی دلالت کسی اور کی طرف سے اطلاع ہونے پر نہیں، اِسی طرح پہلے سے اُس کا علم نہ ہونے پر نہیں اور اللہ تعالیٰ کا علم حادث ہونے پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو اُس کام سے متعلق ازلی وابدی اور قدیم ومحیط علم کے ثبوت پر ہے جس کے قائم مقام ہونے کے قابل ترجمہ "اللہ تعالیٰ اُسے جانتا ہے، اللہ کو اُس کا علم ہے، اللہ تعالیٰ پہلے سے اُسے جانتا ہے" جیسے الفاظ میں کیا جاسکتا ہے جو ہر اعتبار سے اُس کے مطابق اور اُس کے قائم مقام ہونے کی بدولت معیاری ترجمہ کہلا سکتا ہے جسے چھوڑ کر مذکورہ غلط، بے ڈھنگا اور اصل کے مفہوم سے خلاف انداز کو ترجمہ کہنے کا پسِ منظر اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ یہ حضرات ترجمہ کی حقیقت معلوم کیے بغیر ترجمہ لکھنے بیٹھ گئے ورنہ عام ترجمہ کی بنیادی شرائط کا ادراک رکھنے والا کوئی شخص بھی ایسی غلطی نہیں کرسکتا چہ جائیکہ ترجمۃ القرآن کی اضافی شرائط اور اس کے احتیاطی تقاضوں سے آگاہ شخص سے ایسی غلطی ہوجائے۔

خلاصۃ الخلاصہ: کسی بھی کتاب یا کسی بھی تحریر کا ترجمہ کرنے والے کے لیے مندرجہ ذیل اُمور کی پہچان ضروری ہے:

1. سب سے پہلے ترجمہ کے عمل کی نوعیت کو کہ یہ ایک فن ہے جو تعریف، غرض، موضوع رکھتا ہے، تعریف یہ کہ وہ اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ کے ساتھ بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہوسکیں۔
2. ترجمہ کی یہ تعریف ذہن میں آتے ہی اُس کے موضوع کا تصور آپ ہی حاصل ہوجاتا ہے

کہ وہ ترجمہ والے الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

❸ ترجمہ کرنے والے کے ذہن میں اِس سے مقصود اور اِس کی غرض وغایت کا تصور پہلے سے حاصل ہے کہ میرے اِس عمل سے دوسری زبان والوں کو اصل کتاب کے مقاصد کا علم حاصل ہو جائے۔ گویا کسی کتاب کا ترجمہ کرنے کے لیے اصل محرک اِفادہ کا یہی تصور ہے ورنہ جذبۂ افادیت کا یہ عنصر اگر پہلے سے کارفرما نہ ہوتا تو ترجمہ نام کی کوئی تحریر وجود میں نہ آتی اور نہ کوئی شخص کسی کتاب کے مترجم کے طور پر پہچانا جاتا کیوں کہ اُصولِ فطرت ''یَسْتَحِیْلُ وُجُوْد الْمَعْلُوْلِ بِدُوْنِ عِلَّته'' سے خلاف ممکن نہیں ہے۔

❹ کسی بھی خاص وصف اور صفتِ خاص والے عمل سے اصل مقصد وہی وصف ہوتا ہے جیسے ''تکملہ عبد الغفور'' میں عبد الحکیم السیالکوٹی نے شیخ عبد القاہر جرجانی سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اِنَّ کُلَّ کَلَامٍ فِیْهِ قَیْدٌ زَائِدٌ عَلَی النَّفِی وَالْاِثْبَاتِ یَکُوْن ذٰلِكَ الْقَید محط الفائدة''(۱)

اِس مسلمہ اُصول کے مطابق مترجم کی نظر بھی الفاظِ ترجمہ کے مذکورہ وصف یعنی ''تَقُوْمُ مَقَامَهَا'' پر مرتکز ہونا ناگزیر ہے کیوں کہ الفاظِ مبدلہ یعنی ترجمہ کے الفاظ کی صفت اور اُن کے لیے معیار ممیّز ہونے کی بنا پر ترجمہ کو با مقصد بنانے والا جوہر یہی ہے اِسی وجہ سے ترجمہ کے ایک ایک لفظ میں اِسے پیشِ نظر رکھنا ترجمہ کو با مقصد بنانے کی ضمانت ہے ورنہ متن کے ترجمہ کے الفاظ میں صرف ایک لفظ کا اِس سے خلاف ہونے پر بھی متن کے اُس حصے کا ترجمہ بے مقصد ہو سکتا ہے جسے معیاری اور اصل کے مطابق نہیں کہا جا سکتا چہ جائیکہ ایک سے زیادہ الفاظ سے خلاف ہونے پر با مقصد ہو سکے۔

❺ ترجمہ کو با مقصد بنانے کے لیے مترجم کی نظر ترجمہ کے ایک ایک لفظ کی صفت ''تَقُوْمُ مَقَامَهَا'' پر مرتکز ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اصل کے الفاظ دوسری زبان کے الفاظ میں بدلنے سے قبل متن کے ایک ایک لفظ کو اصل کی زبان کی لُغوی حیثیت سے لے کر محاورتی حیثیت

(۱) تکملہ عبد الغفور، ص:495، مطبوعہ مجتبائی قدیم۔

تک اور استعمالی حیثیت سے لے کر بلاغی حیثیت تک۔ الغرض اُس کی جملہ لسانی حیثیات کو پوری طرح سمجھ جائے ورنہ کسی ایک پہلو سے غفلت کی صورت میں بھی ترجمہ والی زبان میں اُس کے مطابق لفظ استعمال کرنا ممکن نہیں ہوگا کیوں کہ ترجمہ والے لفظ کا اُس کے مطابق ہونا اور وصفِ ''تَقُوْمُ مَقَامَهَا'' کے تقاضوں پر عمل ہونا اُسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب متن کے تمام الفاظ کی جملہ حیثیات سے مطمئن ہو ورنہ اصل سے ناواقف شخص سے یہ توقع کرنا کہ وہ ان کے مطابق الفاظ استعمال کر کے ترجمہ کو بامقصد بنائے گا ''بیل سے دودھ ملنے'' کی توقع کرنے سے مختلف نہیں ہوگا۔

❻ اصل کے جملہ الفاظ کے تمام لسانی اور محاورتی پہلوؤں کو پوری طرح سمجھنے کے بعد مترجم پر لازم ہے کہ ترجمہ والی زبان میں اُن کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرے تا کہ وصف ''تَقُوْمُ مَقَامَهَا'' پر عمل ہو سکے۔

❼ اصل اور فرع یعنی متن اور ترجمہ کے الفاظ کے مابین اِس انفرادی حیثیت پر اطمینان پانے کے بعد مترجم کے لیے ضروری قرار پاتا ہے کہ ترجمہ کے الفاظ کی اجتماعی حیثیت پر بھی غور کرے کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے تنگیٔ دامن اور ناگزیر مجبوری کے بغیر اِس کا حجم اصل کے حجم سے نہ بڑھے ورنہ ترجمہ کی اجتماعی حیثیت وصفِ ''تَقُوْمُ مَقَامَهَا '' سے خلاف ہوگی جبکہ ترجمہ کے معیاری ہونے کے لیے یہ بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسا انفرادی حیثیت میں الفاظ کی موافقت ضروری ہے کیوں کہ ایجاز یا مساوات والے متن کا ترجمہ بھی بالترتیب ایجاز و مساوات میں ہونا ضروری ہے ورنہ اِطناب وتطویل والے ترجمہ کو اصل کے مطابق نہیں کہا جا سکتا۔

❽ **ایک مغالطہ کا ازالہ:۔** مستقل فن کی حیثیت سے ترجمہ کی تعریف کہ وہ ''اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو اصل الفاظ کے قائم مقام ہوسکیں'' کو دیکھ کر ممکن ہے کہ کسی کو اشتباہ ہو جائے کہ اصل کے ہر لفظ کو دوسری زبان کے لفظ میں بدلنا ضروری

ہے ورنہ ترجمہ کا حق ادا نہیں ہوگا اِس تصور کو مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ ایسا کرنا ہر جگہ درست نہیں ہوتا۔ مثلاً متن کے متعدد الفاظ میں سے اگر کوئی لفظ ایسا ہے جو ترجمہ والی زبان میں بھی کثیر الاستعمال اور مشہور ہو اور زبان پر ثقیل بھی نہ ہو اور اُس کا مفہوم بھی دونوں زبانوں میں یکساں مشہور و متعارف ہو۔ ایسے مقامات پر اُس کی جگہ ترجمہ والی زبان کا لفظ استعمال کرنا غیر معقول اور نامناسب ہوگا کیوں کہ کسی ضرورت کے بغیر اصل کی جگہ فرع لانے کو معقول نہیں کہا جا سکتا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ متن کا کوئی لفظ ترجمہ والی زبان میں زیادہ مشہور و متعارف ہوتا ہے اور ترجمہ والی زبان کے الفاظ کے مقابلہ میں سہل اللسان ہونے کے ساتھ زیادہ مانوس الاستعمال بھی ہوتا ہے ایسے مواقع پر اُسے ترجمہ والی زبان کے اُس لفظ میں بدلنا نہ صرف نامناسب اور غیر معقول ہوتا ہے بلکہ ترجمہ کے مقصد سے بھی بعید ہوتا ہے اِس لیے مذکورہ تصور کو اشتباہ کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا بلکہ ایسے ہر مقام پر ترجمہ میں اصل لفظ کا اعادہ کرنا ہی معقول ہے، مناسب بھی اور ترجمہ کے مقصد کے قریب بھی ہے۔

٩ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ متن کے ایک مضمون، ایک جملہ یا ایک لفظ میں متکلم کے بنیادی مقصد کے علاوہ کچھ اضافی مقاصد اور اشارات بھی ہوتے ہیں ایسے مقامات کے ترجمہ کو بامقصد بنانے کے لیے مترجم پر لازم ہے کہ ترجمہ والی زبان سے بھی اُس کے مطابق جامع لفظ استعمال کرے جس کے لیے ترجمہ والی زبان کے ذخیرۂ الفاظ اور اُس کے محاورات کا تجربہ ضروری ہے اور ترجمہ والی زبان میں ایسا جامع لفظ دستیاب نہ ہونے کی صورت میں صرف وہی لفظ اور وہی انداز اختیار کرے جو متن کے بنیادی مقصد پر منطبق ہو سکے کیوں کہ ترجمہ والی زبان کی تنگی دامن اور اُس کی طرف سے مجبوری کی ہر صورت میں الاہم فالاہم کو ترجیح دینا مترجم کے فرائض میں سے ہے۔

١٠ کلام کی ممکنہ اقسام صرف تین ہیں؛ حقیقت، مجاز، کنایہ۔

حقیقت:۔ ہر وہ کلام اور لفظ ہے جسے اُس کے اپنے ماوضع لہ مفہوم میں استعمال کیا جائے۔

مجاز:۔ ہر وہ کلام اور لفظ ہے جسے غیر ماوضع لہ میں استعمال کیا جائے اور اُس کا اپنا مفہوم متکلم کی مراد نہ ہونے پر قرینہ بھی موجود ہو۔

کنایہ:۔ ہر وہ کلام اور لفظ ہے جسے غیر ماوضع لہ میں استعمال کیا جائے اور ماوضع لہ مراد نہ ہونے پر کسی قسم کا قرینہ بھی موجود نہ ہو۔

مترجم کے لیے ضروری ہے کہ متن کے الفاظ کو اِن اقسام کے تناظر میں دیکھے پھر اُس کے مطابق ترجمہ والی زبان سے الفاظ استعمال کرے ورنہ مجاز کا ترجمہ حقیقت اور کنایہ والے متن کا ترجمہ صریح میں کرنے سے ترجمہ کی اِفادیت رہے گی نہ اُسے اصل کے مطابق یعنی "**تَقُوْمُ مَقَامَهَا**" کہا جاسکتا ہے۔ اِس سلسلہ میں یہ تصور بے حقیقت اور غلط ہے کہ کلام کی ان قسموں کا لحاظ رکھنا عربی زبان اور خاص کر قرآن شریف کے ترجمہ کے ساتھ خاص ہے جو کنایات کی لطافتوں اور مجاز وتشبیہات کی اُن حلاوتوں پر مشتمل ہے جو عجمی زبانوں میں نہیں پائی جاتی اِس تصور کو ہم مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں کیوں کہ کلام کی اِن بنیادی قسموں کو عربی زبان کے ساتھ مختص کہنا دوسری زبانوں کے معروضی حالات سے آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہے جبکہ کلام کی حقیقت یعنی الفاظ کے ذریعہ مافی الضمیر کو ظاہر کرنا اور افہام وتفہیم کرنے کے یہ طریقے عربی کی طرح تمام عجمی زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں نہ صرف مشہور و متداول زبانوں میں بلکہ علاقائی اور چھوٹی چھوٹی زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں نہ صرف اتنا بلکہ محدود علاقوں میں بولی جانے والی اُن بولیوں میں بھی مروج ہیں جن کا کوئی تحریری اور کتابی پسِ منظر ہی نہیں ہے یہ اتنی واضح بات ہے جو ان زبانوں کے بولنے والے حضرات سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تو پھر انہیں عربی زبان کے ساتھ مختص کہنے کا کیا جواز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کلام کی اِن بنیادی قسموں پر مشتمل ہونے میں عربی و عجمی کی قطعاً کوئی تفریق نہیں ہے مگر

یہ کہ قرآن شریف کا معاملہ نہ صرف عجمی زبانوں سے مختلف ہے بلکہ خود عربی کی بھی تمام علاقائی زبانوں سے اعلیٰ وارفع وابلغ ہے جس میں پائے جانے والی اِن تینوں قسموں اور قسم در قسم وشاخ در شاخ کی حلاوتوں اور لطافتوں کی نہ کوئی حد ہے نہ نہایت۔ جس کے متعلق حدیث شریف میں حضرت علی المرتضیٰ نور اللہ وجہہ الانور کی روایت سے آیا ہے؛

''لَا تَنْقَضِیُ عَجَائبه''(۱)

یعنی اِس کے عجیب معارف واسرار ختم ہونے کے نہیں ہیں۔

جب اِس کے معارف عجیبہ بھی ہیں اور لانہایت بھی تو پھر اِس کے ترجمہ کا پورا حق کون ادا کرسکتا ہے۔ اِسی فلسفہ کی بنیاد پر کل مکاتب فکر اہل اسلام کے سکالرز اس بات پر متفق نظر آ رہے ہیں کہ قرآن شریف کا ایسا ترجمہ پیش کرنا دنیا کی کسی زبان میں بھی ممکن نہیں ہے جو اُس کے تمام مقاصد ومعارف پر مشتمل ہو سکے لیکن اِس سے یہ مطلب سمجھنا غلط ہوگا کہ اِس کے مفہوم اول اور بنیادی مقاصد پر مشتمل ترجمہ بھی ممکن نہیں ہے یہ تصور اِس لیے غلط ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ سے مقصد ترجمہ والی زبان کے سمجھنے والوں کو اُس کے جملہ معارف واسرار سے نہیں بلکہ صرف بنیادی مقاصد سے آگاہ کرنا ہے جو ترجمہ کے الفاظ وانداز کو اُس کے الفاظ وانداز کی لسانی حیثیت پر منطبق کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے جس میں حقیقت، مجاز اور کنایہ کا بنیادی کردار ہے اور یہ تینوں جیسے عربی زبان میں پائے جاتے ہیں ویسے عجمی زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اِس حوالہ سے حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے اعجاز اور اللہ تعالیٰ کے بے مثل کلام ہونے سے قطع نظر کلام کی اِن تینوں بنیادی قسموں پر شامل ہونے میں عربی وعجمی کی قطعاً کوئی تفریق نہیں ہے اِس لیے مترجم چاہے کسی عربی کتاب کا عجمی میں ترجمہ کرے یا اِس سے برعکس یا ایک عجمی زبان میں لکھی گئی کتاب کا ترجمہ دوسری عجمی زبان میں کرے بہر صورت ترجمہ کی درستی کے لیے اُس پر لازم ہے کہ اولاً اِن تینوں کے حوالہ سے متن کی حیثیت معلوم کرے اُس کے

---

(۱) التفسیر القرطبی، ج:1، ص:5، مطبوعہ دار المعارف بیروت۔

بعد ترجمہ والی زبان سے اُس کے مطابق الفاظ اور انداز اختیار کرے یہ عام ترجمہ کے لیے بنیادی اُصول ہے جسے اصل الاُصول کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیوں کہ دونوں زبانوں کے حوالہ سے عام ترجمہ کی ناگزیر شرائط کا تصور اِن کے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہ سب کچھ ترجمہ کی تعریف میں مذکور لفظ ''تَقُوْمُ مَقَامَهَا'' کے ناگزیر تقاضے ہیں جن کے بغیر ترجمہ کے نام سے لکھی گئی کسی تحریر کو بھی اصل کے مطابق اور معیاری ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔

⓫ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ متن کا کوئی لفظ دو مختلف معانی کا یکساں احتمال رکھتا ہے یعنی لفظ کو اُن میں سے ہر ایک پر محمول کرنا اور اُن میں سے کسی کو بھی مرادِ متکلم قرار دینا درست ہو یا دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کسی ایک سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور کسی ایک کو واضح ترجیح بھی نہ ہو جبکہ ترجمہ والی زبان میں ہر معنی کے مطابق الفاظ پائے جاتے ہیں لیکن ایسا جامع لفظ نہیں پایا جاتا جو متن کی طرح دونوں کو یکساں شامل ہو۔ ایسے میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اُن میں سے کسی ایک کو ترجمہ کے تسلسل میں لے کر دوسرے کو بریکٹ میں کرے۔ اِس کے سوا مترجم کے لیے کوئی اور محتاط سبیل موجود نہیں ہے کیوں کہ ایسا نہیں کرے گا تو دو ہی صورتیں ہیں؛

پہلی صورت:۔ ہر معنی کی ادائیگی کے لیے ترجمہ والی زبان سے جدا جدا الفاظ استعمال کرے گا۔

دوسری صورت:۔ صرف ایک کے مطابق ترجمہ کر کے دوسرے کو چھوڑ دے گا۔

اہل علم جانتے ہیں کہ یہ دونوں ترجمہ کی تعریف ''اِبْدَالُ اَلْفَاظِ الْاَصْلِ بِاَلْفَاظِ اللِّسَانِ الْآخَرِ الَّتِی تَقُوْمُ مَقَامَهَا'' کے منافی ہیں کہ اِس میں مقابلۃ الجمع بالجمع ہے جو تقسیم الآحاد علی الآحاد چاہتی ہے جس کے مطابق متن کے ایک ایک لفظ کے بدلہ میں ترجمہ والی زبان سے بھی ایک ایک لفظ ہونا ضروری ہے یعنی ترجمہ کے جملہ الفاظ متن کے تمام الفاظ پر اِس طرح تقسیم ہوتے ہیں کہ متن کے ہر لفظ کے بدلہ میں ترجمہ والی زبان سے بھی ایک ایک لفظ ہوتا ہے جنہیں الفاظِ متن کے مطابق نپے تُلے الفاظ کہتے ہیں۔ جس میں ایک لفظ کے کم و کاست کی بھی

گنجائش نہیں ہوتی۔ نیز اِسی ترتیب سے ترجمہ والے الفاظ کا الفاظِ متن کے قائم مقام ہونا بھی ضروری ہے ورنہ کسی بھی جہت سے اُس کے خلاف ہونے سے ترجمہ کا معیار نہیں رہے گا۔

حقیقت کی اِس روشنی میں دیکھا جائے تو پہلی صورت میں ترجمہ کا ایک لفظ متن سے زیادہ ہے جبکہ دوسری صورت میں عددی موافقت اگرچہ موجود ہے کہ متن کی طرح ترجمہ والی زبان کی طرف سے بھی لفظ ایک ہے لیکن اُس کے قائم مقام نہیں ہے کیوں کہ وہ مختلف معانی کو یکساں شامل تھا جبکہ یہ صرف ایک کو شامل ہے تو پھر اِسے اُس کے مطابق کون کہے۔

۱۲ مترجم کے لیے ضروری ہے کہ فصاحت کے حوالہ سے بھی متن کے جملہ الفاظ کا جائزہ لے اُس کے تمام الفاظ کے فصیح ہونے پر تسلی ہونے کے بعد ترجمہ کے جملہ الفاظ کو بھی اُن کے مطابق فصیح رکھے ورنہ فصیح متن کا ترجمہ غیر فصیح ہونے کی وجہ سے اِسے اُس کا قائم مقام نہیں کہا جاسکتا اور اگر متن کے کسی فصیح لفظ کے ترجمہ کے لیے ترجمہ والی زبان میں قائم مقام ہونے کے قابل فصیح لفظ دستیاب نہ ہو تو اُس سے مرادی معنی کے قریب الافادہ غیر فصیح اور غیر مانوس الاستعمال لفظ استعمال کرنے کے بعد بریکٹ میں اُس کی وضاحت کرنا ضروری ہے اور اگر ترجمہ والی زبان میں اُس کے قریب الافادہ غیر فصیح لفظ بھی دستیاب نہ ہونے کی صورت میں ترجمہ میں بھی اُسی کا اعادہ کرنا ضروری ہے اِس صورت میں بریکٹ سسٹم کی قطعاً کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

یہاں اِس بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ترجمہ ہمیشہ اصل کے تابع اور اُس پر متفرع ہوتا ہے جس کے مطابق الفاظِ متن کی فصاحت پر تسلی کی صورت میں ترجمہ کے الفاظ کو اُن کے مطابق اور اُن کے قائم مقام کرنے کے بعد بلاغت کے حوالہ سے مترجم پر کوئی خاص ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کیوں کہ متن کی فصاحت سمیت ترجمہ کی جملہ شرائط کے مطابق کیے گئے ترجمہ کو بلاغت آپ ہی حاصل ہوتی ہے کیوں کہ متن کی فرع اور اُس کے تابع ہونے کی وجہ سے اُس کے جملہ احکام اور معنوی خوبیوں کا حامل ہوتا ہے مگر یہ کہ کوئی خارجی مانع موجود ہو جو عام ترجمہ میں نہیں ہوتا اور اہلِ علم جانتے ہیں کہ بلاغت کسی بھی کلام کے معنوی حُسن

میں شامل ہے ایسے میں ترجمہ کی بلاغت وہی ہوتی ہے جو متن کی ہے۔فصاحت و بلاغت کے حوالہ سے عام ترجمہ کے اِس باب میں اتنی روشنی کافی ہے جبکہ اِس پر مزید روشنی دوسرے باب یعنی ''خاص ترجمۃ القرآن'' کے باب میں آنے والی تحقیق سے بھی پڑے گی مطالعہ جاری رکھتے ہوئے انتظار فرمایئے۔

۱۳ متن کے کسی لفظ کا ترجمہ میں اعادہ کرنے کی دوصورتیں ہیں اور بریکٹ سسٹم اختیار کرنے کی بھی صرف دوصورتیں ہیں جبکہ اِن کے پسِ منظر یکساں نہیں ہیں کیوں کہ بریکٹ سسٹم کی ہر صورت ترجمہ والی زبان کی طرف سے تنگی دامن کی بِنا پر اختیار کی جاتی ہے کہ ایک صورت میں اصل کے مطابق فصیح اور مانوس الاستعمال لفظ ہی دستیاب نہیں ہے تو اصل کے قریب غیر مانوس الاستعمال لفظ استعمال کرنے کے بعد اُس کی وضاحت کے لیے اِس سسٹم کو اپنایا جاتا ہے اور دوسری صورت میں اصل کی جامعیت کے مطابق لفظ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اِسے اختیار کیا جاتا ہے جبکہ متن کے کسی لفظ کا ترجمہ میں اعادہ کرنے کی ہر صورت کا پسِ منظر ترجمہ والی زبان کی طرف سے تنگی دامن کا عارضہ نہیں ہوتا بلکہ صرف ایک صورت ایسی ہے جس میں اصل کے ترجمہ کے لیے ترجمہ والی زبان میں کوئی لفظ ہی موجود نہ ہو جبکہ دوسری وہ صورت جس میں ترجمہ والے الفاظ کے مقابلہ میں متن کا اپنا لفظ سہل اللسان، کثیرالاستعمال اور زیادہ مشہور ہوتا ہے ان میں اصل کا اعادہ کرنے کا پسِ منظر اُس کی اصلیت ہے کہ ترجمہ والی زبان میں بھی کثیر الاستعمال ہونے کے بعد اُسے ترجمہ والی زبان کے قلیل الاستعمال لفظ کے ساتھ بدلنا معقول و مناسب نہیں ہے۔

۱۴ کسی بھی کتاب کا ترجمہ کرتے وقت مترجم کے لیے ضروری ہے کہ ترتیب کے حوالہ سے دونوں زبانوں کا جائزہ لے جس کے مطابق ترجمہ والی زبان کی ترتیب متن کی ترتیب کے سوفیصد مطابق ہونے کی صورت میں ترجمہ کی ترتیب کو بھی اُس کے مطابق رکھنا ضروری ہے ورنہ ترتیب سے خلاف ہونے والا ترجمہ اصل کے قائم مقام کہلانے کے قابل نہیں ہوتا لیکن

دو زبانوں کی ترتیب میں ہر اعتبار سے موافقت کا پایا جانا بہت کم ہوتا ہے جسے حُسنِ اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے تاہم فنِ ترجمہ کی وسیع دُنیا میں اِس کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہزاروں صفحات کی کسی کتاب کا ترجمہ کرنے میں صرف ایک مقام ایسا آ جائے وہ بھی اُصولِ ترجمہ کے ماتحت ہوتا ہے اِس لیے اُسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جبکہ ترتیب کا اختلاف زبانوں کے اختلاف کو اگر لازم نہیں ہے تو مقتضائے فطرت ضرور ہے جس کے مطابق کسی نہ کسی حوالہ سے ترتیب کا اختلاف کثرت سے پایا جاتا ہے مثال کے طور پر فارسی دوسری زبانوں کی نسبت عربی کے زیادہ قریب ہے اِن دونوں میں مضاف الیہ ہمیشہ موخر ہوتا ہے جبکہ جملہ فعلیہ میں فاعل کے حوالہ سے اختلاف ہوتا ہے کہ عربی میں موخر ہوتا ہے اور فارسی میں مقدم جیسا بالترتیب کہا جاتا ہے ''ذھب زید ،زید رفت'' اور اگر ترجمہ والی زبان کی فطری ترتیب متن کی ترتیب سے خلاف ہے جو غالب اکثریت میں ایسا ہی ہوتا ہے تو پھر ترجمہ کی ترتیب کو مافیہ الترجمہ والی زبان کی ترتیب پر جاری رکھتے ہوئے اِس کے محاورہ کو متن کے محاورہ کے مطابق کرنا ضروری ہے گویا اِس کے محاورہ کو ترجمہ کی ترتیب کو متن کی ترتیب کے مطابق کرنے سے اجتناب ضروری ہے ورنہ ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہوگا اور اہلِ علم سے مخفی نہیں ہے کہ ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہونے والا ترجمہ ایسا ہی غلط، بے محاورہ اور بے مقصد کہلاتا ہے جیسا متن کے محاورہ سے خلاف ہونے والا ترجمہ غلط، بے محاورہ اور بے مقصد ہوتا ہے کیوں کہ معیاری اور بامقصد ترجمہ کا دونوں محاورہ کے مطابق ہونا ضروری ہے یہ تب ہی ممکن ہوگا کہ ترجمہ کو مافیہ الترجمہ والی زبان کی فطری ترتیب پر رکھ کر اِس کے محاورہ کو متن کے محاورہ پر منطبق کیا جائے۔

مثال کے طور پر فارسی سے اُردو میں ترجمہ کرتے ہوئے ''رفیقش رفت ورفیقت آمد'' کے ترجمہ میں ''اُس کا دوست گیا اور تیرا دوست آیا'' کہا جائے تب ترجمہ بامحاورہ کہلائے گا ورنہ ترجمہ کی ترتیب کو اصل کی ترتیب کے مطابق کرکے ''دوست اُس کا گیا اور دوست تیرا آیا''

کہنا اُردو کے عام محاورہ سے خلاف ہوگا۔ اِسی طرح عربی سے اُردو میں ترجمہ کرتے ہوئے ''جآء رفیقہ وذھب رفیق زید، اُس کا ساتھی آیا اور زید کا ساتھی گیا'' کہا جائے جو ترتیب سے خلاف ہونے کے باوجود بامحاورہ ہے یعنی دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہے اور ترجمہ کے سانچہ میں فِٹ اور معیاری ہے بخلاف اِس کے کہ مافیہ الترجمہ والی زبان کے محاورہ سے صرفِ نظر کر کے ترجمہ کو اصل کی ترتیب کے مطابق رکھ کر کہا جائے ''آیا ساتھی اُس کا اور گیا ساتھی زید کا'' بے محاورہ کہلائے گا جبکہ بے محاورہ ترجمہ بامقصد نہیں ہوتا اور ترجمۃ الکلام نہیں بلکہ ترجمۃ الالفاظ کہلاتا ہے جو ترجمہ کے متعارف مفہوم سے جدا اور محدود چیز ہے۔

⑮ ترجمہ کی مذکورہ تعریف ''اِبْدَالُ اَلْفَاظِ الْاَصْلِ بِاَلْفَاظِ اللِّسَانِ الْآخَرِ الَّتِی تَقُوْمُ مَقَامَھَا'' اگرچہ مقابلۃ الجمع بالجمع کے انداز پر ہے جس میں تقسیم الآحاد علی الآحاد ہوتی ہے تاہم ترجمہ کی اجتماعی کیفیت کا متن کی اجتماعی کیفیت کے قائم مقام ہونے کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ ترجمہ کے الفاظ کا اپنی انفرادی حیثیت میں الفاظ متن کی انفرادی حیثیت کے مطابق ہونا بھی ضروری ہونے کی طرح اِن کی اجتماعی حیثیت کا اُن کی اجتماعی حیثیت کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے ورنہ مختلف ترتیب والی زبانوں کا معنوی توافق ظاہر نہیں ہوگا اور یہ سب کچھ ترجمہ کے حسنِ انداز کی بدولت حاصل ہو سکتا ہے اِس لیے مترجم کے لیے ضروری ہے کہ اِس سے غافل نہ رہے۔

ایک مغالطہ کا ازالہ:۔ فصاحت وبلاغت کے حوالہ سے شاید کسی کو یہ مغالطہ ہو جائے کہ یہاں پر عام ترجمہ کے اُصول بیان ہو رہے ہیں جو دُنیا کی کسی بھی زبان میں لکھی گئی کتاب کے ترجمہ کو شامل ہیں جبکہ فصاحت وبلاغت علمی اصطلاحات ہیں جو عربی زبان کے ساتھ مختص ہیں۔ ایسے میں اِس بحث کو عام ترجمہ کے اُصول میں نہیں بلکہ عربی متن کا کسی عجمی زبان میں کیے جانے والے ترجمہ کی بحث میں اور خاص کر ترجمۃ القرآن کے باب میں کرنا چاہیے۔

اِس کا جواب یہ ہے کہ فصاحت وبلاغت کوعلمی اصطلاحات کہنا غلط ہے کیوں کہ علمی اصطلاحات کسی فن کے اُن مخصوص الفاظ کوکہا جاتا ہے جواُسی کے ماہرین یا اُس کا شغل رکھنے والوں کے مابین استعمال کیے جاتے ہیں جبکہ فصاحت وبلاغت خالصتاً لسانی الفاظ ہیں اصطلاحی نہیں جوعربی وعجمی دونوں میں یکساں استعمال ہوتے ہیں اوراُن حقائق سے عبارت ہیں جودُنیا کی ہرزبان میں معتبر ہیں۔ دنیا کی وہ کون سی زبان ہے جس میں مہذب اورغیر مہذب، مانوس الاستعمال اورغیر مانوس الاستعمال، سہل اللسان اورثقیل علی اللسان الفاظ کی تفریق نہ کی جاتی ہو یا محل وموقع کے مناسب اور غیرمناسب کلام کی تمیز محسوس نہ کی جاتی ہوجبکہ فصاحت وبلاغت بھی ایسے ہی حقائق سے تعبیر ہیں جو بلاتخصیص دنیا بھر کی تمام زبانوں میں محسوس کی جاتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ دونوں اپنی اصلیت کے اعتبار سے عربی الوضع اورعربی اللغۃ ہیں جوفارسی واُردو جیسی کچھ عجمی زبانوں میں بھی کثیرالاستعمال ہیں جبکہ دوسری زبانوں میں اِن کے مفہوم کے لیے دوسرے الفاظ استعمال ہوتے ہیں لیکن الفاظ کے بدلنے سے حقائق نہیں بدلتے۔ فُنون لسانیہ کے حوالہ سے مترجمین کو لگنے والا صرف یہی ایک مغالطہ نہیں ہے بلکہ صرف ونحو، متن لُغت، علم اشتقاق جیسے حقائق کے بارے میں بھی یہی تاثر پایا جاتا ہے کہ یہ عربی زبان کے ساتھ مختص ہیں جن کا دوسری زبانوں کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

حضرات کو لگنے والے اِس مغالطہ کی وجہ یہ ہے کہ اِن سب کی تدوین وایجاد عربی زبان میں ہوئی ہے کیوں کہ اِن سے اصل مقصد قرآن فہمی تھی کہ لسانِ قرآنی کے اِن گوشوں کو سمجھنے کے بعد اسلام میں داخل ہونے والے مختلف زبان والے عجمیوں کو اِسے سمجھنا آسان ہوجائے۔ نیز اِن فُنون کی کچھ مباحث عربی زبان کے ساتھ مختص ہیں جنہیں دیکھ کر سطحی ذہن والے ناپختہ حضرات اِن پورے فنون کو اوراُن کے جملہ حقائق کو دوسری زبانوں کے لیے شجرۂ ممنوعہ قرار دیتے ہیں۔ جوحقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ جسے محسوس کرتے ہوئے بعض اسلاف نے اِس پر واضح گفتگو کی ہے۔ مثلاً سعدالدین التفتازانی نے کتاب المطول میں علم المعانی کی تعریف میں مذکور لفظ ''عربی'' سے متعلق لکھا ہے:

"وتخصيص اللفظ بالعربی مجرد اصطلاح لان هذه الصناعة انما وضعت لمعرفة احوال اللفظ العربی"(۱)

امام تفتازانی کی اِس تشریح کی مزید وضاحت کرتے ہوئے عبدالحکیم علی المطول نے لکھا ہے؛

"مجرد اصطلاح ای ليس للاحتراز عن العجمی اذيعرف بها احواله ايضًا"(۲)

کچھ کمی وبیشی کے ساتھ یہی حال دوسرے لسانی فنون کا بھی ہے کہ اُن کے بعض مسائل اگرعربی کے ساتھ خاص ہیں تو بعض دوسری زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں مثلاً کلمہ وکلام کی تفریق اورکلمہ کی تینوں اقسام اورکلام کی دونوں قسمیں یعنی کلام انشائی اورکلام خبری، پھران میں سے ہرایک کی مختلف اقسام جن کی تفصیل سے علم بلاغت اورعلم نحو میں بحث کی جاتی ہے۔اِسی طرح حقیقت ومجاز کی قسمیں اورکنایہ اوراستعارہ وتشبیہ جن سے علم البیان میں بحث کی جاتی ہے اورفعل معلوم ومجہول، فعل لازم ومتعدی اور ماضی مضارع جن سے علم تصریف میں بحث کی جاتی ہے۔اِس قسم کی سینکڑوں مباحث جولسانی ولُغت کے اختلاف کے ساتھ تمام زبانوں میں پائے جاتے ہیں کیوں کہ یہ مستقل حقائق ہیں جوزبانوں کے بدلنے سے نہیں بدلتے۔جیساعربی زبان میں کلامِ خبری کاترجمہ کسی دوسری زبان کےکلام انشائی میں کرنا غلط ہے اِسی طرح اِس سے برعکس کرنا بھی غلط ہے اِسی طرح کسی بھی عجمی زبان میں مرکب ناقص یا مفرد کا ترجمہ دوسری عجمی زبان کے کلام میں یعنی مرکب تام میں کرنا بھی غلط ہے جس میں عربی وعجمی کی قطعاً کوئی تفریق نہیں ہے۔اِسی طرح عربی زبان میں اسم کی جگہ فعل ذکرکرنا یافعل معلوم کی جگہ فعل مجہول ذکرکرنا یااِس سے برعکس کرنا غلط ہے، اِسی طرح دوسری زبانوں میں بھی غلط ہے۔یہی حال ترجمہ کا بھی ہے جیساعربی زبان کے لفظ

---

(۱) المطول،ص:35۔

(۲) حاشیه السیالکوتی علی المطول،بحث تعریف علم المعانی،ص:72،مطبوعه منشورات الرضی قم ایران۔

''اولآء'' جومشارالیہ بعید کے لیے استعمال ہونے کی صورت میں اُس کا ترجمہ لفظ ''وہ'' میں کرنے کے بجائے لفظ ''یہ'' میں کرنا غلط ہوگا۔ اِسی طرح ''ھٰٓاولآء'' جوقریب کے ساتھ خاص ہے کا ترجمہ لفظ ''یہ'' میں کرنے کے بجائے لفظ ''وہ'' میں کرنا بھی غلط ہے۔ اِسی طرح اُردو محاورہ میں ضمیر بعید یا بعید اشارہ کے لیے استعمال ہونے والا لفظ ''اُس'' کی جگہ لفظ ''اِس'' استعمال کرنا غلط ہے ویسا ہی اِن کے تراجم کو بدل کے ''اُس'' کی جگہ ''اِس'' یا ''اِس'' کی جگہ ''اُس'' کہنا غلط ہے جس میں عجمی و عربی کی قطعاً کوئی تفریق نہیں ہے۔ یہی حال ضمائر کا بھی ہے جیسا ضمائر بارزہ اور ضمائر مستترہ ایک دوسرے کی ضد ہیں، ایک کی جگہ دوسرے کا استعمال جائز نہیں ہے ویسا ہی ایک کا ترجمہ دوسرے میں کرنا بھی جائز نہیں ہے جس میں عربی وعجمی کی کوئی تفریق نہیں ہے، مذکر کی جگہ مؤنث یا اِس سے برعکس استعمال جیسا عربی میں ناجائز ہے ویسا ہی عجمی میں بھی ناجائز ہے۔ یہی حال اِن کے تراجم کا بھی ہے جیسا عربی میں مذکر متن کا ترجمہ مؤنث میں کرنا یا اِس سے برعکس کرنا غلط ہے ویسا ہی عجمی میں بھی ناجائز ہے اور مرکب غیر تام کی جگہ مرکب تام استعمال کرنا یا اِس سے برعکس کرنا قبیح وممنوع اور حرام فی اللسان والمحاورہ کہلاتا ہے۔ یہی حال اِن کے تراجم کا بھی ہے کہ مرکب غیر تام جو مفرد کہلاتا ہے کا ترجمہ مرکب تام جو کلام کہلاتا ہے میں کرنا یا اِس سے برعکس کرنا بھی قبیح ومکروہ اور ترجمۃ الحرام کہلاتا ہے جس میں عجمی وعربی کا ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔

الغرض صرف ونحو، علم المعانی، علم البیان جیسے جتنے بھی فنون مدون کیے گئے ہیں اُن کی تدوین اور اُنہیں پڑھنے پڑھانے سے اصل مقصد اگرچہ لسانِ قرآنی کی فہم ہے اور مقاصد ومعارف قرآنی تک رسائی ہے، دوسرے مختص الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ قرآن فہمی میں آسانی ہے تاہم عجمی زبان کو اِن کی روشنی سے محروم نہیں کہا جاسکتا بلکہ اِن کے اکثر مباحث ایسے حقائق ہیں جو دُنیا کی تمام زبانوں کو محیط، سب میں پائی جاتی ہیں اور ہر زبان والے اِن کا احساس رکھتے ہیں۔

حقائق کی اِس روشنی میں ہم نے بھی اِس بحث کو عام ترجمہ کے زیرِ اُصول کردیا جس پر

مزید روشنی دوسرے باب یعنی ''ترجمۃ القرآن'' سے متعلق خاص باب میں بھی پڑے گی جس میں دُنیا بھر کی تمام زبانوں میں یکساں پائے جانے والے اُصول وحقائق کے علاوہ اُن اُصول وحقائق سے بھی بحث کی جائے گی جو دوسری زبانوں میں نہیں بلکہ صرف عربی کے ساتھ مختص ہیں اِس میں بھی سب یکساں نہیں بلکہ بعض عام عربی کے ساتھ مختص ہیں جیسا اِسم اشارہ اور ضمیر خطاب کے مابین آنے والا حرف تبعید ''ل'' جس کی عملی شکلیں ''ذَالِكَ، ذَالِكُمَا، ذَالِكُمْ، ذَالِكِ، ذَالِكُمَا، ذَالِكُنَّ'' جیسے الفاظ میں دیکھی جاسکتی ہیں جبکہ بعض عام عربی کے ساتھ نہیں بلکہ صرف لسانِ قرآنی کے خاص انداز وایجاز کی جامعیت کے ساتھ مختص ہیں کسی عجمی زبان کی بات ہی کیا ہے جبکہ افصح فصحآءالعرب بھی اس کے سامنے عاجز ہیں۔ جسے منظوم کہا جاسکتا ہے نہ منثور اور تقریر کہا جاسکتا ہے نہ تحریر بلکہ برزخ بین النظم والنثر کے اعجاز پر فائز ہونے کے ساتھ برزخ بین الکتاب والخطاب کی بے مثلیت پر بھی فائز ہے۔ بے مثلیت کے اِس کمال واعجاز کے باوجود اُس کا ترجمہ فنِ ترجمہ کے عام اُصولوں سے مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ ترجمۃ القرآن کے لیے آگے آنے والوں کو فنِ ترجمہ کے عمومی اُصولوں اور عام شرائط کی پابندی کے ساتھ ترجمۃ القرآن کے لیے مخصوص شرائط کی پابندی بھی ضروری ہے یعنی ''الاھتمام حسب المقام''۔

اِس حوالہ سے **خلاصۃ الکلام بعد التفصیل** ترجمہ اپنے عرفی مفہوم میں ایک مستقل فن ہے جو دوسرے فنون کی طرح تعریف، غرض، موضوع رکھتا ہے، جس کتاب، تحریر اور دستاویز کا بھی ترجمہ کیا جائے چاہے وہ عرشی کتاب ہو یا فرشی، خالق جل جلالہ کی طرف سے ہو جیسا قرآن شریف یا کسی انسانی دل ودماغ کی ایجاد ہو اور دنیا کی کسی بھی زبان میں ہو اُس کا ترجمہ شروع کرنے والے کی نظر اُس کے اِفادہ پر ہوتی ہے کہ دوسری زبان والوں کو اِس سے آگاہ کرنا ہے اگر یہ مقصد پیشِ نظر نہ ہو تو ترجمہ نام کی کوئی تحریر وجود میں نہیں آسکتی۔ اور اِس مقصد کی برآوری کے لیے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ ترجمہ کو بامقصد بنانے کے لیے مترجم کے لیے ضروری ہے کہ چند باتوں کی پابندی

کرے جو ترجمہ کے اُصول وشرائط کہلاتی ہیں اِس کے بعد اگر ترجمہ کسی انسانی کتاب کا کر رہا ہو بس اتنا ہی کافی ہے کہ فنِ ترجمہ کے اُصول اور ترجمہ کی عمومی شرائط کہلانے والی اِن چیزوں کی پابندی پر مشتمل ترجمہ ہمیشہ بامقصد ہوتا ہے اور اگر ترجمہ کسی انسانی کتاب کا نہیں بلکہ قرآن کریم کا کیا جارہا ہے تو پھر فنِ ترجمہ کے اِن تمام اُصولوں اور ترجمہ کی عمومی شرائط کی مِن وعَن پوری طرح پابندی کے علاوہ ترجمۃ القرآن کے لیے اضافی اور مخصوص شرائط کی بھی پابندی ضروری ہے ورنہ کسی ایک سے خلاف ہونے پر بھی ترجمہ بے مقصد ہوسکتا ہے چہ جائیکہ ایک سے زیادہ شرائط سے خلاف ہونے والے ترجمہ کو معیاری اور بامقصد کہا جاسکے جبکہ عام شرائط کے سلسلہ میں متن کی لسانی حیثیت کی مختلف حیثیتیں جاننے کو اولیت حاصل ہے کہ ترجمہ کرنے والے کو جب تک متن کے تمام لسانی پہلوؤں کا علم نہ ہو محض ترجمہ والی زبان کا ماہر ہونے سے وہ ترجمہ کا حق کبھی ادا نہیں کرسکتا کیوں کہ ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیتوں کو جاننا اگرچہ شرط ہے لیکن ثانوی درجہ میں ہے اور متن کے تابع اور اُس پر متفرع ہے جس میں عربی اور عجمی زبانوں کا قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ متن کی جملہ لسانی حیثیات کو جاننا بھی مستقل شرط ہے اِسی طرح ترجمہ والی زبان میں مہارت بھی مستقل شرط ہے اور آپس میں یہ دونوں شرطیں اصل اور فرع کا ربط رکھتی ہیں یعنی اول الذکر متبوع کا درجہ رکھتا ہے جبکہ ثانی الذکر اُس پر متفرع اور اُس کے تابع کا درجہ رکھتا ہے اِس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ متن کے جملہ پہلوؤں پر نظر رکھے بغیر ترجمہ کرنے والے سے اُس کے مطابق ترجمہ کی اُمید کرنا ''بیل سے دودھ ملنے'' کی اُمید کرنے سے مختلف نہیں ہوگا اگرچہ ترجمہ والی زبان کا ماہر ہی کیوں نہ ہو اِسی طرح ترجمہ والی زبان میں مہارت کے بغیر کسی کتاب کا ترجمہ کرنے والے سے اُس کے مطابق ترجمہ کرنے کی اُمید کرنا بھی ''پتھر سے دودھ'' کی توقع کرنے سے مختلف نہیں ہوگا بلکہ بالترتیب دونوں کا ماہر ہونا ضروری ہے جبکہ مزید شرائط کا مرتبہ اِن دونوں کے بعد ہے۔ (وَاللّٰہُ الْھَادِی اِلٰی سَبِیْلِ الرَّشَادِ)

ترجمۃ الالفاظ اور ترجمۃ الکلام کا فرق:۔

عام ترجمہ سے متعلق ضروری مسائل کے سلسلہ میں اِس بات کو سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ترجمۃ الالفاظ اور ترجمۃ الکلام دو جدا جدا چیزیں ہیں جن کا ایک دوسرے پر حمل جائز نہیں ہے کیوں کہ اِن کے مفہوم بھی جدا ہیں اور مصداق بھی اِس لیے کہ ترجمۃ الالفاظ کے معنی یہ ہیں کہ الفاظ مفردہ کا مفہوم دوسری زبان کے الفاظ میں بیان کیا جائے جسے ''تعبیر عن لغة بلغةٍ اُخری'' کہا جاتا ہے یعنی ایک زبان کے کسی لفظ کے معنی کو دوسری زبان کے الفاظ میں بیان کرنا جس میں اُس کے مفہوم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کیوں مفرد یعنی کلام نہ ہونے کی وجہ سے فاعل، مفعول بہ یا مفعول بہ اور عامل و معمول اور فصاحت و بلاغت جیسے کسی پہلو کا وجود اُس میں نہیں ہوتا کہ ترجمہ میں بھی اُس کا لحاظ ضروری ہو اِس کی مثال جیسا عربی زبان کے لفظ ''اسد'' کا ترجمہ شیر میں کیا جائے، یا رحمٰن کا ترجمہ زیادہ مہربان میں اور رحیم کا بہت مہربان میں کیا جائے، علیٰ ہٰذا القیاس۔ اور بعض کتابوں میں لکھے ہوئے مشکل یا ناآشنا الفاظ کا جو ترجمہ کیا جاتا ہے وہ بھی اِس کی مثالوں میں شامل ہے جسے متعارف معنی میں نہیں بلکہ لُغوی مفہوم میں ترجمہ کہا جاتا ہے۔ حضرت شاہ رفیع الدین کا کیا ہوا ترجمۃ القرآن بھی درحقیقت ترجمۃ القرآن نہیں بلکہ اِسی قبیل سے ہے اور گوجرانوالہ کے مولانا محمد ظریف القادری کا کیا ہوا ترجمۃ القرآن بھی اِسی قبیل سے ہے کیوں کہ قرآن شریف کلمہ نہیں بلکہ کلام ہے تو اُس کا ترجمہ بھی ترجمۃ الکلام ہوگا جبکہ اِن دونوں پر ترجمۃ الکلام کی تعریف نہیں بلکہ ترجمۃ الفاظ القرآن صادق آتا ہے جسے ترجمۃ الکلام ہرگز نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ اِن کے مابین تقابل تضاد کی وجہ سے ایک دوسرے پر حمل ممکن نہیں ہے یعنی جو ترجمۃ الالفاظ ہوگا اُسے ترجمۃ الکلام کہنا جائز نہیں ہے اِسی طرح جو ترجمۃ الکلام ہوگا اُسے ترجمۃ الالفاظ کہنا درست نہیں اِن کے مابین تقابل تضاد کی ایسی مثال ہے جیسے مرکب ناقص اور مرکب تام کے مابین ہے یا جملہ اور غیر جملہ کے مابین ہے۔ نیز ترجمۃ الالفاظ کو ترجمہ کہنا لُغت کی زبان ہے عرف کی نہیں جبکہ ترجمۃ الکلام کو ترجمہ کہنا حقیقتِ عرفیہ کے طور پر

ہے۔ایسے میں ترجمۃ الالفاظ کا مصداق ''الکلمۃ المفردۃ'' کے سوااور کچھ نہیں ہوگا بخلاف ترجمۃ الکلام کہ وہ مرکب تام سے مقصدِ متکلم کودوسری زبان میں منتقل کرنے سے عبارت ہے جس میں فقط الکلمۃ المفردہ کا نہیں بلکہ مرکبِ تام اور جملہ کے مدلول ومفہوم کودوسری زبان کے ایسے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے جو اصل الفاظ کے قائم مقام ہوسکے یعنی اُن کی جملہ حیثیتوں کے مطابق ہوکہ وہ عامل ہے یہ بھی عامل، وہ معمول ہے یہ بھی معمول، وہ فاعل ہے یہ بھی فاعل، وہ مفعول بہ ہے یہ بھی مفعول بہ ہے۔یہ بھی اُسی انداز پر ہواور اِس کا مصداق پورا فقرہ اور جملہ کے سوااور کچھ نہیں ہے۔

ترجمۃ الالفاظ کی دوقسموں کی تفریق:۔

ترجمۃ الالفاظ کی ایک قسم وہ ہے جوکلماتِ مفردہ کے حوالہ سے ہوتی ہے کسی غیر مشہور اور غیر مانوس الاستعمال لفظ کے معنیٰ کوکسی دوسری قابلِ فہم زبان کے الفاظ میں بیان کیا جائے جیسے عربی''اسد''اور''غضنفر''کا بالترتیب ترجمہ''شیراور ببر شیر''میں کیا جائے اور فارسی کے ''تسمۂ پاء''کا ترجمہ کھوار زبان کے''چھاری''میں کیا جائے ،علیٰ ہٰذا القیاس۔جس مفرد لفظ کا بھی ترجمہ کیا جائے اُسے ترجمۃ اللفظ ہی کہا جائے گا اور تفسیر وتشریح یا تفہیم کہنا بھی کافی حدتک درست ہوگا کہ جس زبان میں اُس کا ترجمہ کیا جارہاہے اُس زبان کے جاننے والوں کے لیے تفسیر بھی ہے تشریح وتفہیم بھی،گویا ترجمۃ الالفاظ کا یہ انداز تعریفِ لفظی کی ایک جھلک ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اِس میں اصل کے مفہوم کودوسری زبان کے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے جبکہ تعریفِ لفظی میں دوسری زبان کے الفاظ میں ترجمہ کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اصل کی زبان میں بھی ہوسکتی ہے جو اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔

ترجمۃ الالفاظ کی دوسری قسم وہ ہے جس میں الفاظِ مفردہ کے نہیں بلکہ کسی مضمون اور مرکب تام وکلام کے مختلف حصہ الفاظ کے معانی دوسری زبان کے الفاظ میں بیان کیے جاتے ہیں جس میں اُن کی ترکیبی حیثیت کوظاہر کرنا مقصد نہیں ہوتا کہ وہ مسند ہے یا مسندالیہ،مضاف ہے یا

مضاف الیہ، موصول ہے یا موصوف، عامل ہے یا معمول وغیرہ۔ ترجمۃ الالفاظ کی اِس قسم میں کبھی کبھی کلام کے الفاظ مفردہ کی ترکیبی حیثیت آپ ہی ظاہر ہو جاتی ہے جسے حُسنِ اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے اِس کی عملی مثالوں کو سمجھنے کے لیے بھی حضرت شاہ رفیع الدین کا ترجمہ کافی ہے جس میں حسنِ اتفاق سے ترکیبی حیثیت ظاہر ہونے کی مثالوں کی بھی کمی نہیں ہے اور ظاہر نہ ہونے کی مثالیں بھی بہت ہیں۔ مثال کے طور پر ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ '' تک تینوں آیتوں کے ترجمۃ الالفاظ میں اِسم جلالت اور اُس کے بعد مذکور ہونے والے چاروں اوصاف ''الْعٰلَمِيْنَ، اَلرَّحْمٰنِ، الرَّحِيْمِ، مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ '' کا ترکیبی ربط ظاہر نہیں ہورہا کہ اسم جلالت موصوف اور یہ چاروں اُس کی بالترتیب اوصاف ہیں کیوں کہ اُردو محاورہ کے مطابق موصوف وصفت کا ارتباط کرنے کے لیے اُن کے مابین لفظ ''جو'' کا استعمال ضروری ہوتا ہے جو ترجمۃ الالفاظ میں نہیں بلکہ ترجمۃ الکلام میں ہوتا ہے جو یہاں پر موجود نہیں ہے جیسا ترجمہ کے الفاظ ''سب تعریف واسطے اللہ کے پروردگار عالموں کا بخشش کرنے والا مہربان خداوند دن جزا کا'' سے صاف ظاہر ہے کہ متن کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ اُردو زبان میں ظاہر کیا گیا ہے جو درست اور اصل کے لُغوی مفہوم کے مطابق ہے لیکن متن کی ترکیبی حیثیت ظاہر کرنے سے قاصر ہے جبکہ اِس کے متصلاً بعد آیت نمبر 4 کے الفاظ کا جو ترجمہ کیا گیا ہے اُس میں متن سے مقصد ظاہر ہونے کے ساتھ مسند ومسند الیہ کا ارتباط بھی ظاہر ہورہا ہے جو ترجمہ کے الفاظ ''تجھ ہی کو عبادت کرتے ہیں ہم اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں'' سے آپ ہی واضح ہورہا ہے۔

الغرض ترجمۃ الالفاظ کی پہلی قسم کی حقیقت تعریفِ لفظی سے مختلف نہیں ہے جو لفظی تشریح کہلانے کے زیادہ قابل ہے جس کے معنون اور مُبدل منہ میں ہی کلام نہیں ہے تو پھر ترجمہ میں کہاں سے آئے گا۔ انجامِ کار اُس میں کلام کا تصور ہی نہیں ہے چہ جائیکہ اسے کسی کتاب، کسی متن اور کسی مضمون کا ترجمہ کہنا درست ہو۔ اِس کے مقابلہ میں دوسری قسم کے اجتماعی مفہوم سے حسنِ اتفاق

کے طور پر کبھی کلام بھی ظاہر ہوتا ہے اور متن والے کلام کا ترجمہ ہونا محسوس ہوتا ہے اِس کے باوجود اِسے ترجمۃ الکلام نہیں بلکہ ترجمۃ الالفاظ کے نام سے موسوم کیا جائے کیوں کہ متعارف مفہوم میں ترجمۃ الکلام کا وجود اُس کی علت غائی کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اُصولِ فطرت "**یستحیل وجود المعلول بدون علتہ**" سے خلاف ہونے کو ممکن نہیں کہا جا سکتا۔ اور اہل علم جانتے ہیں کہ متعارف مفہوم میں ترجمۃ الکلام کی علتِ غائی اور اِس سے مقصد متن والے کلام کی عبارۃ النص سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے جبکہ ترجمۃ الالفاظ کی کسی قسم اور کسی بھی صورت سے مترجم کا مقصد اِفادۃ الکلام اور افادۃ مقصد المتکلم نہیں بلکہ مفردات الکلام کے اِفادہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا یہ وہ نکتہ ہے جس سے غفلت کی بنا پر بعض اہل علم ترجمۃ الالفاظ کی اِس دوسری قسم کی تعبیر ترجمہ تحت اللفظ کے عنوان سے کرتے ہیں اور اِسے ترجمۃ الکلام کی ایک مستقل قسم کہتے ہیں جو با محاورہ ترجمہ کے مقابلہ میں سمجھا جاتا ہے اِس حوالہ سے ہندو پاک کے وہ علمی حلقے جو ترجمۃ القرآن جیسے کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط عمل کو آسان سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں اُن کے پورے ماحول میں ترجمۃ الکلام کی یہی دو قسمیں مشہور ہیں یعنی تحت اللفظ ترجمہ اور با محاورہ ترجمہ۔

انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ تاثر سراسر غلط ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ متعارف ترجمہ ہمیشہ تحت اللفظ ہوتا ہے۔ فنِ ترجمہ میں فوق اللفظ ترجمہ کا کوئی تصور ہی نہیں ہے کیوں کہ ہر ترجمہ کے متن کو فوقیت حاصل ہوتی ہے وہی اصل ہے جبکہ ترجمہ اُس کے ماتحت اور اُس کی فرع ہے اور اُس کے تابع ہونے کی بنا پر ہمیشہ اُس کے ماتحت، اُس کے قائم مقام اور اُس کے مطابق ہونا ضروری ہے تو پھر اِس تقسیم کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ با مقصد ترجمۃ الکلام ہمیشہ با محاورہ ہوتا ہے اور ہندو پاک کے اِن حلقوں میں با محاورہ ترجمہ کے بارے میں بھی وہ تصور نہیں ہے جو ہونا چاہئے کیوں کہ ترجمۃ الکلام کو تحت اللفظ اور با محاورہ کی طرف تقسیم کہنے والے اِن حلقوں کے نزدیک با محاورہ کا معیار یہ ہے کہ وہ ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے مطابق ہو آگے عام ہے چاہے متن والی زبان کے محاورہ کے مطابق ہو یا نہ ہو، نیز جملہ شرائط کے مطابق ہو یا نہ ہو، نیز متن کے

سیاق وسباق کے مناسب ہو یا نہ ہو، جبکہ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ ترجمۃ الکلام کے سلسلہ میں بامحاورہ ترجمہ کا ایسا تصور ممکن نہیں ہے جس میں اصل کو ترجمہ والی زبان پر قربان کیا جائے یا اصل کو فرع کے تابع کیا جائے بلکہ بامقصد ترجمۃ الکلام کی صرف ایک ہی قسم ہے جو بامحاورہ ہے کیوں کہ کسی بھی کلام کا بامقصد اور معیاری ترجمہ بے محاورہ نہیں ہوسکتا کیوں کہ بے محاورہ ہونے کا مطلب اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ متن کی لسانی حیثیت سے یا ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت سے یا دونوں سے خلاف ہے جبکہ اِن سب میں شرط کی مخالفت ہے جو دونوں زبانوں کی لسانی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ ایسے میں کسی بھی کلام کے بامقصد اور معیاری ترجمہ کو بے محاورہ کہنا یا بامحاورہ کے مقابلہ میں ترجمۃ تحت اللفظ کے عنوان سے شہرت دینے کو معقول کہا جاسکتا ہے نہ مناسب۔ نیز محاورہ عربی زبان کا لفظ ہے اور علم تصریف کے مطابق باب ''مفاعلة'' کا مصدر ہے جو عربی کی طرح اُردو زبان میں بھی کثیر الاستعمال ہے جس کا مفہوم ہے باہم گفتگو کرنا، کسی کلام کا تکرار کرنا اور ایک دوسرے سے مراجعۃ الکلام کرنا جیسا زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر عنترہ نے اپنے مدِ مقابل کو کلام کی سمجھ سے قاصر و نااہل قرار دیتے ہوئے کہا ہے؛

لو کان یدری ماالمحاورۃاشتکی   ولکان لوعلم الکلام مکلمی

نیز محاورہ مصدر مجہول اور کبھی حاصل بالمصدر المجہول کے انداز پر اُس کلام کو بھی کہتے ہیں جو کسی زبان میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہو یعنی ''الکلام المردد'' کلام میں اِن دونوں طریقوں سے اِس کا استعمال عربی و عجمی دونوں میں ہوتا ہے جبکہ مفردات کے لیے مستعمل ہونے کی کوئی مثال اور کوئی محاورہ موجود نہیں ہے عربی میں نہ عجمی میں تو پھر ترجمۃ الالفاظ کے لیے اِسے استعمال کرنے کا کیا جواز ہوسکتا ہے۔

خلاصۃ الکلام:۔ ترجمۃ الالفاظ اور ترجمۃ الکلام دو الگ الگ چیزیں ہیں جن کے مفہوم بھی اور مصداق بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں ترجمۃ الالفاظ پر لفظ ترجمہ کا اطلاق کرنا حقیقت لُغو یہ کے

طور پر ہے جس میں عرف کا کوئی دخل نہیں ہے اِس کے برعکس ترجمۃ الکلام پر لفظ ترجمہ کا اطلاق حقیقتِ عرفیہ کے طور پر ہے جو حقیقتِ لُغویہ کے بھی منافی نہیں ہے، کسی بھی کلام کا بامقصد اور معیاری ترجمہ ہمیشہ بامحاورہ ہوتا ہے شرائط کے مطابق ہوتا ہے اِس میں لفظی ترجمہ یا تحت اللفظ ترجمہ جیسے الفاظ وتقسیمات جو سننے کو ملتی ہیں یہ بعض علمی حلقوں کی ناقص فکر ہے۔ اسلاف میں اِس کا کوئی ثبوت ہے نہ مثال اور درایۃً اِسے تسلیم کرتی ہے نہ روایۃً۔

ترجمہ کی عمومی شرائط:۔ ترجمہ کا فن تصنیف وتالیف، مضمون نویسی اور مقالہ نگاری جیسی کسی بھی صنف سے جدا اور مستقل فن ہے اس کے اُصول وضوابط اور شرائط بھی مستقل حیثیت کی حامل ہیں جس کے مطابق کوئی بھی کتاب چاہے آسمانی ہو یا زمینی اور جس زبان میں بھی ہو اُس کے ترجمہ سے بنیادی مقصد اُس کے مندرجات کے اصل مقاصد کو ترجمہ والی زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے جس میں کامیاب ہونے کے لیے فطرتِ سلیمہ درج ذیل شرائط کی مقتضی ہے، جو کسی بھی کتاب کے ترجمہ کے لیے عمومی شرائط کہلاتی ہیں؛

1. دونوں زبانوں کی لُغت، حقیقت، مجاز، کنایہ اور اشارات وکنایات اور محاورات ولوازمات پر پوری طرح عبور وتجربہ ہو جو محض درسیات کی حد تک پڑھنے سے نہیں بلکہ عملی ممارست وتجربہ کا نتیجہ یا قدرتِ الٰہی کی توفیق وعطیہ ہوتا ہے۔
2. مُترجم اپنی پسند کو دخل نہ دے کہ متن کے حقیقی مفہوم کا رُخ اپنی کسی ذہنی ترجیح کی طرف موڑ دے اِس صورت میں ترجمہ معیاری ہونے کے بجائے اصل پر ظلم اور خیانت ہوگا۔
3. ترجمہ کے الفاظ اختصار وتطویل کے حوالہ سے اصل کے مطابق ہوں یعنی اصل کے الفاظ اگر مقصودی مفہوم سے مختصر ہوں تو اُس کے مطابق ترجمہ کے الفاظ کا بھی مختصر ہونا ضروری ہے اور اُس کے برابر ہو تو ترجمہ کے الفاظ کا بھی اُس کے برابر ہونا ضروری ہے اور اگر وہ اصل مقصود سے زیادہ ہیں تو پھر ترجمہ کے الفاظ کا بھی اُسی تناسب سے زیادہ ہونا ضروری ہے کلام کی

اِن تین صورتوں کو دنیائے بلاغت کی زبان میں بالترتیب اختصار و مساوات اور اطناب وتطویل کہا جاتا ہے جس کے مطابق اختصار والے متن کا ترجمہ مساوات یا تطویل میں کیا جائے یا مساوات وتطویل والے متن کے کچھ حصوں کو نظر انداز کیا جائے تو ایسے ترجمہ کو اصل کے مطابق نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ترجمہ اصل کا معنوی عکس ہوتا ہے جس میں اصل کے مقاصد کو ترجمہ والی زبان میں منتقل کیا جاتا ہے جو اصل کے نپے تلے الفاظ کے مطابق ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

❼ جہاں ترجمہ کے الفاظ وترتیب کو متن کی ترتیب کے خلاف کرنے پر اُس کے مقاصد متاثر ہوتے ہوں یا ترجمہ فصاحت و بلاغت کے دائرہ سے نکلتا ہو وہاں پر ترجمہ کی ترتیب کو اصل کی ترتیب کے مطابق رکھنا بھی ضروری ہے کیوں کہ اصل سے مراد کے منافی ترجمہ اُس کے مطابق کہلانے کے قابل نہیں ہوسکتا اِسی طرح اصل کی فصاحت و بلاغت کے منافی ترجمہ بھی اُس کے مطابق اور معیاری نہیں کہلاتا۔

❽ دو ایسے مختلف معانی کے لیے یکساں استعمال ہونے والے متن جن میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے پر ترجیح نہ ہو اور متن کو اُن میں سے ہر ایک پر محمول کرنا بھی درست ہو لیکن کتاب والے کی اصل مراد معلوم نہ ہو کہ اُن میں سے کون سا مفہوم مراد ہے۔

ایسے مقامات پر مترجم کے فرائض میں شامل ہے کہ ترجمہ والی زبان میں اُس کے مطابق یا اُس کے قریب لفظ تلاش کرنے میں حتی المقدور کوشش کرے مل گیا تو اُسے ترجمہ کے طور پر استعمال کرے اور نہ ملنے کی صورت میں اُن ہی میں سے کسی ایک کو ترجمہ کے تسلسل میں رکھ کر دوسرے کو کلمہ یا کے ساتھ بریکٹ میں کرے یہ طریقہ معیاری ترجمہ کے لیے ضروری ہے کیوں کہ اگر ایسا نہ کرے گا تو دو صورتوں سے خالی نہ ہوگا:

(i) متن کے اُس لفظ کو دونوں پر محمول کر کے دونوں کے ترجموں کو تسلسل میں رکھے گا۔

(ii) ایک کو ترک کر کے دوسرے ترجمہ پر اکتفا کرے گا۔ اول صورت میں ترجمہ ڈبل اور تطویل ہو کر اصل سے خلاف ہوگا۔

دوسری صورت میں ترجیح بلا مرجح ہو کر ممکن ہے کہ اصل کی مراد کے بھی خلاف ہو۔ ایسے میں مذکورہ انداز کے ناگزیر ہونے میں کس کو شک ہوسکتا ہے۔

❻ جہاں پر متن کے کسی لفظ کے مصادیق ومظاہر متعدد ہوں اور اُن میں سے اکثر کی مرادِ متکلم میں شامل ہونا معلوم ہونے کے ساتھ بعض مراد نہ ہونا بھی معلوم ہوا ایسے مقامات پر متن کے اُسی لفظ کو ترجمہ میں ذکر کرنا ضروری ہے کیوں کہ ایسا نہ کرے گا تو تین صورتوں سے خالی نہیں ہوگا؛

(i) غیر مرادی افراد کو منفی انداز میں اور مرادی افراد کو مثبت انداز میں ذکر کرے گا۔

(ii) صرف غیر مرادی افراد کو استثناء کے طور پر ذکر کرے گا۔

(iii) صرف مرادی افراد کی تفصیل بتائے گا جبکہ یہ تمام صورتیں متن کے اختصار کے منافی ہیں تو پھر انہیں معیاری اور اصل کے مطابق کون کہہ سکتا ہے ایسے میں مذکورہ انداز ناگزیر ہونے میں کس کو شک ہوسکتا ہے۔

❼ جہاں متن کا کوئی لفظ ترجمہ والی زبان میں بھی مستعمل ہو، فصیح بھی ہو، کثیر الاستعمال اور سہل الفہم بھی ہو اور ترجمہ والی زبان میں اُس کے ترجمہ کے لیے موجود لفظ اِن تینوں اوصاف میں اُس سے کم ہو۔ ایسے تمام مقامات پر ترجمہ کو اصل کے مطابق کرنے کے لیے ضروری شرط قرار پاتی ہے کہ ترجمہ میں متن والے لفظ کو ہی ذکر کرے ورنہ ترجمہ کا معیار قائم نہیں رہے گا۔

❽ متن کا کوئی لفظ ناقابل فہم ہونے کی صورت میں اپنی طرف سے ترجمہ کی خانہ پُری کرنے کے بجائے ترجمہ کے تسلسل میں اُسی کو ذکر کرنا ضروری ہے۔ ترجمہ کو اصل کے مطابق کرنے کے لیے ایسا کرنا اِس لیے ضروری ہے کہ نافہمی کی صورت میں اپنے اندازے کے مطابق خانہ پُری کرنے میں اصل کی مراد سے خلاف ہوسکتا ہے جو ترجمہ سے مقصد کے خلاف ہونے کے ساتھ امانتداری کے بھی خلاف ہے جب کہ مترجم کا امین ہونا ضروری ہے۔

❾ متن کے کسی لفظ کے ترجمہ کے لیے ترجمہ والی زبان میں پائے جانے والا لفظ جب کثیر الاستعمال اور مشہور اور سہل الفہم نہ ہو اور متن کا یہ لفظ ترجمہ والی زبان میں بھی غیر مانوس اور غیر

مستعمل ہو ایسے تمام مقامات پر اُس کے مفہوم کے مطابق یا اُس کے قریب جو لفظ پایا جاتا ہے اُسے ترجمہ کے طور پر ذکر کرنے کے بعد بریکٹ میں اُس کی تفہیم کے لیے مناسب وضاحت ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں کرے گا تو پھر تین صورتوں سے خالی نہ ہوگا؛

(i) اُس کے اصل ترجمہ کے ساتھ توضیحی الفاظ بھی ترجمہ کے تسلسل میں ذکر کرے گا۔

(ii) صرف توضیحی الفاظ کو ترجمہ کے طور پر ذکر کرے گا۔

(iii) صرف ترجمہ کے الفاظ پر اکتفا کرے گا۔

اول صورت میں ترجمہ بے ڈھنگا اور بے ربط ہونے کے ساتھ متن کے اختصار کے برعکس طویل ہوگا تو پھر اسے اصل کے مطابق کون کہے گا۔

دوسری صورت میں ترجمہ کہلانے کے ہی قابل نہیں رہے گا کیوں کہ ترجمہ کے الفاظ کا متن کے مفہوم کے عین مطابق یا اُس کے قریب ہونا ضروری ہے جبکہ یہ اُن میں سے ایک بھی نہیں ہے تو پھر ترجمہ کہلانے کا کیا مطلب؟

تیسری صورت میں ترجمہ بجائے خود اگرچہ درست ہوگا لیکن قابل فہم نہیں ہوگا جب قابل فہم ہی نہیں ہے تو پھر بے مقصد و بے فائدہ ہوگا حالانکہ ترجمہ سے غرض و غایت اصل سے مقاصد کو دوسری زبان میں منتقل کر کے اُس کے جاننے والوں کو اصل سے مستفید کرنا ہے۔ ایسے میں مذکورہ انداز ناگزیر ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے

۱۰ متن کی پوری عبارت سے مجموعی مقصد پیشِ نظر رکھنے کے ساتھ اُس کے ایک ایک حصے کی لُغوی اور فنی حیثیت سمجھنے کے بعد اُن کے مطابق انداز اور الفاظ استعمال کرنا بھی ضروری ہے، کیوں کہ متن کے اجتماعی مفاد سے مختلف انداز یا اُس کے مفردات کی لسانی یا فنی حیثیت کے منافی الفاظ پر مشتمل ترجمہ اصل کے مطابق کہلانے کے قابل نہیں ہوتا۔

علی العموم کسی بھی فصیح و بلیغ کتاب کے معیاری ترجمہ کے لیے اِن دس شرائط کی مختصر تعبیر اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ دونوں زبانوں کے محاورات ولوازمات جاننے کے ساتھ اُس کے مطابق اصل

کے مقاصد کو بلاکم وکاست دوسری زبان میں منتقل کرنا۔ گویا علی العموم کسی بھی کتاب کے معیاری ترجمہ کے لیے اجمال کے درجہ میں یہی ایک شرط ہے جو تفصیل کے درجہ میں مذکورہ دس نکات پر منتج ہوتی ہے جبکہ قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے اِن کے علاوہ مزید گیارہ شرائط اور بھی ہیں، جن کی پوری تفصیل دوسرے باب میں آئے گی۔

ترجمہ کی عمومی شرائط کے سلسلہ میں مذکورہ شرط یعنی متن کے جملہ پہلوؤں کو سب سے پہلے جاننا اور اُس پر پورا اطمینان حاصل ہونے کے بعد ترجمہ کے الفاظ و انداز کو اُس کے مطابق رکھنے کی مختلف حیثیات میں سے ایک حیثیت اصل متکلم کی مراد یعنی ماسیق لہ الکلام کو جاننا بھی ہے۔ جس سے خلاف کیے جانے والے تراجم کی **پہلی مثال** فتاویٰ رضویہ، ج 14، کے مترجم مولانا مفتی محمد خان قادری مہتمم جامعہ اسلامیہ لاہور کا کیا ہوا وہ ترجمہ ہے جس میں اُنہوں نے فقہاء کرام کی مشہور عبارت ''مجرد ایھام المعنی المحال کاف فی المنع '' کا ترجمہ کیا ہے ''محض محال معنی کا وہم بھی ممانعت کے لیے کافی ہوتا ہے''(۱) جو متن سے مراد اور جس مقصد کے لیے فقہاء کرام نے یہ کلام کیا ہے اُس سے خلاف ہے کیوں کہ ترجمہ کا یہ انداز کسی محال معنی کے وہم ناجائز ہونے پر دلالت کررہا ہے جبکہ فقہاء کرام کی مراد اور اِس کلام سے اُن کا مقصد وہم کی ممانعت ہرگز نہیں بلکہ ایسے کلام کو ممنوع فی الاسلام بتانا ہے جو کسی ناجائز معنی کے موہم ہو۔ اہل علم جانتے ہیں کہ کسی محال معنی کے موہم کلام کا ممنوع فی اسلام ہونا اور محض محال معنی کے وہم کا ممنوع فی الاسلام ہونا دو الگ چیزیں ہیں؛

اول:۔ کلام خبری ہونے کی صورت میں تصدیق کے قبیل سے ہے۔

دوم:۔ تصور کی خاص قسم ہے جسے وہم کہا جاتا ہے۔

اور اہل علم جانتے ہیں کہ تصدیق کا ترجمہ تصور میں جائز نہیں ہے اور کلام انشائی ہونے کی صورت

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج 14، ص 650، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور۔

میں تصور کی وہ قسم کہلاتی ہے جسے فلسفہ کی زبان میں تخییل یا تکذیب کہتے ہیں اور وہم کو تخییل کی جگہ استعمال کرنا جائز ہے نہ تکذیب کی جگہ تو پھر اُس کا ترجمہ وہم میں کرنے کا کیا جواز ہے اِس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ اِس عبارت سے فقہاءِ کرام کا واحد مقصد اور عبارۃ النص اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جائز معنی کے حامل ہونے کے باوجود کسی ناجائز معنی کا موہم بننے والے کلام کی اجازت اسلام میں نہیں دی جاسکتی بلکہ اُس سے منع کیا جائے گا یہ تب ہوتا ہے جب ایسا کلام کرنا ممکن ہو جبکہ کسی محال معنی کا وہمہ دل میں پیدا ہونا انسان کے اختیار میں ہی نہیں ہے تو پھر اُس سے منع کرنے کا مطلب ہی کیا ہے۔لیکن مترجمین ہیں کہ کلامِ موہم المحال کا ترجمہ وہم المحال میں کر رہے ہیں جس کا پسِ منظر اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اِن حضرات نے اُصولِ ترجمہ اور اُس کی فطری شرائط کو پیشِ نظر نہیں رکھا۔افسوس یہ کہ مذکورہ متن کا معیاری ترجمہ (ناجائز کا محض وہمہ دینے والی بات بھی منع کرنے میں کافی ہے،محال کا محض وہمہ دینے والا کلام بھی ممنوع ہونے میں کافی ہے،محال معنی کا صرف وہمہ دینے والا کلام بھی ممانعت میں کافی ہے،محال معنی کا موہم کلام بھی ممانعت میں کافی ہے) جیسے کسی بھی انداز میں ممکن ہونے کے باوجود ایسا ترجمہ کر ڈالا جو متن سے مقصد اور مرادِ متکلم سے خلاف ہے۔(فیاللعجب لھذاالعجب)

دوسری مثال:۔ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہٗ کے رسائل حصہ کتاب الحُجُب سے درج ذیل اشعار:

فَمَـا ثَـمَّ اِلَّا اللّٰـہ وَالْکون حَـادِث ۔۔۔ وَمَـا ثَـمَّ اِلَّا الْکـونُ وَاللّٰـہ ظَـاھِرٌ

مَـا الْعِـلْـم اِلَّا الْـجَھْل بِاللّٰہِ فَاعْتَصِم ۔۔۔ بِـقَـوْلِـی فَـاِنِّـی عَـنْ قَـرِیْب اُسَافِر

وَمَـا لِـی مَـالٌ غَـیْـر عِلْمِـی وَوَارِث ۔۔۔ سِـوٰی عَیْنِ اَوْلَادِی فَذَا الْمَال حَاضِرٌ

کا ترجمہ کرتے ہوئے ابرار احمد شاہی نے مترجم کی حیثیت سے اور سلطان عبدالعزیز المنصوب نے ناظرِ ثانی و مصحح کی حیثیت سے لکھا ہے:

''یہاں تو صرف اللہ ہی ہے یہ کائنات تو حادث ہے۔یہاں تو صرف اللہ ہی ہے یہ کائنات تو ظاہر ہے۔علم تو صرف اللہ سے لاعلم ہونے کا نام ہے۔میری یہ بات پلے باندھ لے کیوں کہ میں بہت نزدیک سے سفر کر کے آیا ہوں۔اور میرے پاس علم اور اپنی اولاد کی شکل میں وارث کے سوا کیا مال ومتاع ہے؟ سو یہ مال بھی حاضر ہے۔(۱)

ترجمہ کا یہ انداز نہ صرف متن سے مقصدِ متکلم کے خلاف ہے بلکہ اُس کے مختلف الفاظ سے مرادی معنی سے بھی برعکس ہے جو مذکورہ شرط سے غفلت کا نتیجہ ہے اِس کی تفصیل اِس طرح ہے کہ اولین شعر ''فَمَاثَمَّ اِلَّا اللّٰه وَالْکون حَادِث......وَمَاثَمَّ اِلَّاالکونُ وَاللّٰه ظَاھِرْ'' کے پہلے مصرع کے آغاز میں لفظ ''ثَـــمَّ'' اپنے حقیقی معنی پر محمول ہے کیوں کہ یہ بعید کے لیے موضوع ہے قریب کے لیے نہیں اِس لیے اِس کے ترجمہ میں لفظ ''یہ'' کہنا غلط ہے جبکہ دوسرے مصرع کے آغاز میں حقیقت پر نہیں ہے بلکہ صنعتِ مشاکلت پر محمول ہے جیسا مشہور محاورہ ''اطبخوا لی جبۃ و قمیصًا'' میں لفظ ''طبخ'' اپنے سے سابق ''اقترح شیئا نجدلك طبخه'' کی مشاکلت کے لیے استعمال ہوا ہے لہٰذا اِس کا ترجمہ لفظ ''یہ'' میں کرنا درست ہوگا۔اور شعر کے پہلے مصرع سے اُس کے قائل کا مقصد یہ ہے کہ مرتبہٗ ازل میں اللہ تعالیٰ کی ذات وحدہ لاشریک کے سوا کوئی شے موجود نہیں تھی کیوں کہ الکون الجامع یعنی ذاتِ الٰہی کے سوا پورا کون جسے عالَم کبیر بھی کہا جاتا ہے حادث ہی حادث ہے جو ازلی نہیں ہوسکتا اور دوسرے مصرع سے مقصد یہ ہے کہ عالَم ناسوت یعنی اربعہ عناصر کے اِس جہاں کی ہر شے اور اُس کے خالق وحدہ لاشریک کے مابین ظاہر ومظہر کا تعلق ہے کہ ذاتِ الٰہی اِن سب میں ظاہر اور یہ سب کے سب اُس کے مظاہر ہیں۔اور یہ دونوں لفظ یعنی ظاہر و مظہر اپنے لُغوی مفہوم پر محمول نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شے میں ظاہر ہوجائے معقول ومحسوس ہو جائے،مشموم وملموس ہوجائے نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ ظاہر ایسا کہ کبھی ظاہر نہیں ہوتا،معقول ومحسوس

---

(۱) کتاب الحُجُب رسائل ابن عربی،ص: 92,93 مطبوعہ ابن عربی فاؤنڈیشن ہیڈ آفس خانقاہ سندرشریف لاہور۔

نہیں ہوتا کہ اُس کی عظمتِ شان اِس سے مانع وحاجب ہے اور کائنات کا اُس کے لیے مظہر ہونا اِس طرح کہ یہ خودظاہر ہیں، معقول ومحسوس ہیں اور اُسی ایک وحدہ لاشریک کے جلوے ہیں، اُس کے بغیر ان کا ثبوت ہے نہ وجود۔ اشعار کے پسِ منظر کی اِس روشنی میں ان کے پہلے شعر کا حقیقی ترجمہ ''پس وہیں پر نہیں ہے مگر اللہ اور کون حادث ہے اور یہاں پر نہیں ہے مگر کینونت اور اللہ تعالیٰ ظاہر ہے، پھر وہیں پر نہیں ہے مگر اللہ اور عالَم ناسوت حادث ہے اور یہیں پر کینونت کے سوا کچھ نہیں اور اللہ ظاہر ہے'' جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو متن کے ایک ایک جزو پر منطبق ہونے کے ساتھ اصل مقصد کے بھی مطابق ہے۔ جسے پسِ پشت ڈال کر ترجمہ کے نام سے متن کی معنوی تحریف کرنے کا کیا جواز ہے ایسے میں ترجمہ کی مذکورہ شرط سے کون انکار کرسکتا ہے۔

اشعار کے دوسرے حصہ ''مَاالْعِلْم اِلَّا الجَهْل بِاللّٰهِ فَاعْتَصِم ...... بِقَوْلِي فَاِنِّي عَنْ قَرِيْب اَسَافِر '' سے تین مقاصد ہیں:

پہلا مقصد:۔ اللہ تعالیٰ کی ذات جملہ کائنات میں ظاہر ہونے کے باوجود لاظاہر اور لامعقول و لامحسوس اور ماوراء العقل والادراک ہونے کے فلسفہ کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اُس کے کمالِ ظہور کی بداہت کا حجاب لاحق ہے جس کی وجہ سے اُس وحدہ لاشریک کی تحدید اور اُس کی حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہے اُس کی ذات سے متعلق جس تصور کو بھی علم کہا جاتا ہے وہ درحقیقت حجاب کا علم ہے اُس کی ذات کا نہیں۔ اِس باب میں قولِ فیصل یہ ہے کہ ''اَنَّهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى لَايُعْلَم اِلَّا انَّه لَايُعْلَم ''۔

دوسرا مقصد:۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے ادراک اور عدمِ ادراک سے متعلق اِس قولِ فیصل ''اَنَّهُ لَا يُعْلَم اِلَّا اِنَّه لَايُعْلَم '' کی تفہیم کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ اللہ کی توفیق سے میں بھی اُن میں شامل ہوں اور میں عنقریب دارِ آخرت کے سفر پر جانے والا ہوں اِس لیے میری باتوں کو پلے باندھ کر اِن سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ شعر کے اِس پسِ منظر کے مطابق اُس کا حقیقی ترجمہ (اللہ تعالیٰ کی حقیقت سے متعلق علم نہیں ہے مگر جہل میری بات پلے سے باندھ کہ میں عن قریب

سفرِ آخرت پر جاؤں گا، حقیقۃ الحق کا علم نہیں ہے مگر جہل تو میری بات کو یاد رکھ میں عنقریب سفرِ آخرت پر جارہا ہوں) جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو متن سے مقصد پر بھی منطبق ہے اور دوسری تمام شرائط پر بھی برابر ہے۔

تیسرا مقصد:۔ شعر کے تیسرے حصہ ''**وَمَالِی مَالٌ غَیرُ عِلْمِي وَوَارِث**......**سِوىٰ عَيْنِ اَوْلَادِي فَـذَالمَال حَاضِرُ**'' سے مقصد یہ بتانا ہے کہ میں نے پوری عمر معارف کے درس میں گزاری، دُنیا اور اُس کی رعنائیوں کو کبھی خاطر میں نہیں لایا اور میری صُلبی اولاد بھی نہیں ہے انجامِ کار میرے ترکہ میں مال ہوگا نہ وارث ایسا بھی نہیں ہے کہ میرے بعد میرے فیض کا یہ سلسلہ منقطع ہوگا نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا بلکہ وہ تمام حضرات میری روحانی اولاد ہیں جو میرے حلقۂ درس سے معارف کا فیض پاتے ہیں۔ میرا فیض پھیلانے کے حوالہ سے یہ حضرات بمنزلہ چشمہ ہیں جو پیاسوں کو سیراب کرتا ہے اور میرے چشمہ فیض کا یہ مال سب کے لیے حاضر ہے۔

اِس کے مطابق شعر کا معیاری ترجمہ ''علم کے سوا میرا کوئی مال ہے نہ وارث میری روحانی اولاد کے چشمہ علم کے ماسوا تو یہ مال حاضر ہے، میرے لیے مال نہیں ہے میرے علم کے سوا اور وارث نہیں ہے میری علمی اولاد کے چشمہ فیض کے سوا تو یہ مال حاضر ہے) جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا تھا جو ہر اعتبار سے بے غبار اور با مقصد ہے شرائط کی پابندی میں ترجمہ ناممکن کہنے والوں کو اِس پر بار بار غور کرنا چاہیئے کہ جو ترجمہ بھی شرائط کی پابندی کے بغیر ہو وہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا پیشِ نظر اشعار کے ترجمہ میں ہوا ہے۔

عام ترجمہ کی مذکورہ شرط سے خلاف ہونے کی ترجمۃ القرآن سے **پہلی مثال** کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 214 کے حصہ ''**وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ**'' کا اشرف علی تھانوی کا کیا ہوا یہ ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے ''حالاں کہ تم کو ہنوز اُن مسلمان لوگوں کا سا کوئی عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہوگزرے ہیں'' جو آیت کریمہ کی عبارۃ النص اور اُس کے نزول سے سراسر خلاف

ہے کیوں کہ آیت کریمہ سے مقصد اِس کے سیاق وسباق اور قرآنی تفسیر کی روشنی میں یہ بتانا ہے کہ استطاعت کے باوجود حق کا تحفظ ودفاع نہ کرنے والوں کا دخول جنت کا اُمیدوار ہونا فضول ہے، نیز ایمان ولوازماتِ ایمان اور تقاضائے ایمان کے تحفظ ودفاع کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات ومصائب کو برداشت کرنے اور اُن کے مقابلہ میں صبر واستقامت دکھانے کی اہمیت بتانا ہے کہ یہ ایمان کی کسوٹی ہے، جنت کا استحقاق پانے والوں کی پہچان ہے اور جنت میں داخلہ کے لیے شرط ہے جس پر اگلی اُمتوں کے انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم اور اُن پر ایمان لانے والے سچے متبعین نے بھی عمل کیا ہے۔ الغرض آیت کریمہ سے مقصد حق کی خاطر قربانی دینے اور اِس راہ میں پیش آنے والی مشکلات ومصائب کو برداشت کرنے کا جذبہ اور حسبِ ضرورت اِس پر عمل کرنے کو جنت کا ثمن، اُس کی قیمت اور اُس میں داخلہ کے لیے ضروری شرط بتانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جس پر انبیاء سابقین اور اُن پر ایمان لانے والے سچے متبعین نے بھی عمل کیا ہے۔ آیت کریمہ کے مقصدِ نزول کے حوالہ سے حقیقت کی اِس روشنی میں دیکھا جائے تو اگلوں پر گزرنے والے عجیب واقعات کے پیش آنے کو جنت میں داخلہ کے لیے ضروری قرار دینے کی کیا تک ہے، متن کی اِس کے ساتھ کون سی مناسبت وربط ہے اور آیت کریمہ کے مقصدِ نزول سے اِس کا کیا تعلق ہے جبکہ اُس کے نزول سے مقصد کے مطابق ترجمہ ''جبکہ تم پر اگلوں جیسے حالات نہیں آئے، اور حال یہ ہے کہ تم پر ابھی اگلوں کی سی روداد نہیں آئی'' جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے۔

دوسری مثال:۔ سورۃ البقرہ، آیت نمبر 187 کے حصہ ''وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ'' کا اشرف علی تھانوی کا کیا ہوا ترجمہ ''اور اُن بیبیوں کے بدن سے اپنا بدن بھی مت ملنے دو جس زمانہ میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو مسجدوں میں'' جو آیت کریمہ سے مرادِ الٰہی کے سراسر خلاف ہے کہ سیاق وسباق سے آیت کریمہ کے نزول سے جو مقصد مفہوم ہو رہا ہے وہ اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آیت کریمہ سے مقصدِ نزول اعتکاف کی حالت میں شہوت کے ساتھ ہاتھ

لگانے کی تمام صورتوں سے اجتناب کا حکم ہے جس کی عملی صورتیں مَس بالشہوت کے ادنیٰ فرد سے لے کر اعلیٰ فرد تک سب کو شامل ہیں جبکہ شہوت کے بغیر عورت کے بدن کا معتکف کے بدن کے ساتھ ملنے کی قطعاً کسی ایک صورت سے بھی منع نہیں ہے۔ آیت کریمہ کا یہ مفہوم اپنی جگہ قطعی ہونے کی بناء پر مجتہدین ومفسرین کے مابین بھی متفقہ اور غیر متنازعہ ہے جیسے تفسیر روح المعانی میں ہے:

''فَهُمَا اِمَّامُبَاحَانِ اِتفَاقًابِاَن يكونَا بِغَيرِ شَهوةٍ وَاِمَّاحَرامَانِ بِاَن يكونَابِهَا''(۱)

آیت کریمہ کے اِس مفہوم کا قطعی ہونے کی بناء پر کل مکاتب فکر مجتہدین ومفسرین کا بھی اِس پر اجماع ہے، نیز بخاری شریف میں حضرت اُم المومنین عائشہ صدیقہ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنهَا سے مروی ہے:

''قالت كان رسول الله ليدخل على راسه وهو في المسجدفار جله''(۲)

اِن تمام حقائق سے برخلاف آیت کریمہ کے ترجمہ میں یہ کہنا ''اُن بیبیوں کے بدن سے اپنا بدن بھی مت ملنے دو جس زمانہ میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو مسجدوں میں'' آیت کریمہ کی عبارۃ النص کے سراسر خلاف ہونے کے ساتھ اٹکل پچو کے سوا اور کچھ نہیں ہے چہ جائیکہ آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ کہلائے۔ حالاں کہ متن سے مقصد متکلم کے مطابق ترجمہ ''اور اُنہیں ہاتھ نہ لگاؤ جب تم مسجدوں میں اعتکاف سے ہو، اور اُنہیں نہ چھوؤ جب تم مسجدوں میں اعتکاف سے ہو'' جیسے کسی بھی انداز سے کیا جاسکتا ہے یعنی ترجمہ والی زبان کی طرف سے کوئی مجبوری نہیں ہے۔

عام ترجمہ کی ایک ذیلی شاخ یہ بھی ہے کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے لسانی مجبوری لاحق ہوئے بغیر ترجمہ کے الفاظ کو متن کے الفاظ سے زیادہ نہ کرے ورنہ ترجمہ کی حد سے نکل جائے گا کیوں کہ ترجمہ کی تعریف ہے کہ ''ابدال الفاظ الاصل بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها'' یعنی متن کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جائے جو متن کے الفاظ کے قائم مقام ہو

(۱) تفسیر روح المعانی، ج:2،ص:68۔

(۲) بخاری شریف، باب الاعتکاف، ج:1،ص:272۔

سکیں اور ظاہر ہے کہ ترجمہ کا کوئی لفظ جب اصل کے الفاظ سے زیادہ ہوگا تو اُس کے حوالہ سے ''ابــــدال'' کا تصور نہیں ہوگا کہ وہ کس سے بدل ہے۔ مگر یہ کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے تنگی دامن اور ناگزیر مجبوری لاحق ہو جائے کہ اُس صورت میں مشہور اُصولِ فطرت ''الضرورات تبیح المحظورات'' کے جواز میں جائے گا۔

عام ترجمہ میں اِس اُصول سے خلاف ہونے والے ترجمہ کی **پہلی مثال** فتاویٰ رضویہ، جلد دوم سے متن ''قال فی المنیة بعدما عرف المستعمل بمآء ازیل به حدث او استعمل فی البدن علی وجهه القربة مانصه امرئة غسلت القدر او القصاع لا یصیر المآء مستعملا'' کا ترجمہ میرے قابلِ احترام بھائی اللہ کا ولی مفتی سید شجاعت علی القادری جسٹس شرعی عدالت اسلام آباد رَحْمَةُاللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے اِس انداز سے کیا ہے:

''منیہ میں مآء مستعمل کی تعریف میں کہا کہ وہ پانی جس سے کوئی حدث زائل کیا گیا ہو یا بدن پر قربۃ کے طور پر استعمال کیا گیا ہو پھر فرمایا کہ اگر کسی عورت نے ہانڈی یا بڑا پیالہ دھویا تو پانی مستعمل نہ ہوگا۔''(۱)

اُصولِ ترجمہ سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ اِس میں لفظ ''پھر فرمایا'' بے تکہ ہونے کے ساتھ لفظ ''فرمایا'' حشو و زوائد کے قبیل سے ہے اور متن کے الفاظ پر بلا ضرورت زیادہ جبکہ متن کے الفاظ کے مطابق الفاظ میں اُس کا ترجمہ (منیہ میں مآء مستعمل کی تعریف کرنے کے بعد کہ یہ وہ پانی ہے جس سے حدث زائل کیا گیا ہو یا ثواب کے طور پر بدن میں استعمال کیا گیا ہو) کہا ہے جس کی عبارت یہ ہے کہ عورت نے ہانڈی یا بڑا پیالہ دھویا وہ پانی مستعمل نہیں ہوگا، مُنیہ میں مآء مستعمل کی یہ تعریف کہ وہ پانی جس سے حدث زائل کیا گیا ہو یا بدن میں علی وجہ القربۃ استعمال کیا گیا ہو کرنے کے بعد کہا ہے جس کی عبارت یہ ہے کہ عورت نے ہانڈی یا غان دھوئے وہ پانی مستعمل نہ

(۱) فتاویٰ ضویہ، ج:2، ص:51، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور۔

ہوگا) جیسے کسی بھی انداز میں کیا جا سکتا ہے جس سے حضرت مرحوم نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْف نے بے توجہی فرما کر نہ صرف یہ کہ ترجمہ میں ایک لفظ زیادہ کیا بلکہ اِس کے علاوہ اور بھی کئی وجوہ سے نامناسب کیا ہے لیکن اِس مثال میں ہمارے پیشِ نظر الفاظِ متن سے زیادہ کیے جانے والے لفظ کی نشان دہی کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے لہٰذا ہم اِسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

اعترافِ حقیقت:۔ حضرت ابن مسعود مفتی ابن مفتی سید شجاعت علی القادری نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہُ میرے ہم درس اور اُستاذ بھائی بھی تھے اور نہ صرف ہم عصر بلکہ ہم عمر اور جگری دوست بھی تھے۔علم وعمل اور تقویٰ وپرہیزگاری میں اتنے ثقہ تھے کہ اُن کے اہل خاندان سے لے کر ہم درس ساتھیوں تک سب کو اُن پر اعتماد تھا اور اُن کی علمی ثقاہت سے متاثر ہو کر اربابِ اختیار نے اُنہیں وفاقی شرعی عدالت کا جج مقرر کیا تھا اُن کی متعدد مذہبی خدمات کے زمرہ میں فتاویٰ رضویہ، جلد دوم کی عربی عبارات کا ترجمہ بھی شامل ہے جو کافی حد تک درست ہونے کے باوجود کچھ مقامات پر شرائط سے متجاوز ہے اور پیشِ نظر مثال بھی اُن ہی میں سے ہے۔حضرت موصوف ومرحوم کی علمی جلالت کے باوجود ترجمہ میں ایسی کمزوریوں کا صادر ہونا اِس بات کی دلیل ہے کہ ترجمہ کا فن نہایت مشکل ہے،تصنیف وتالیف تعلیق وتحشیہ اور مضمون نویسی ومقالہ نویسی جیسی ہر تحریری صنف سے جداگانہ اور مستقل ہے اور اس کی تعریف وغرض وموضوع سے لے کر شرائط واُصول تک تمام لوازمات وتقاضے بھی جدا ہیں جن میں سے کسی ایک شرط سے بے توجہی کی وجہ سے بھی ترجمہ بے مقصد ہو سکتا ہے چاہے مترجم بجائے خود جتنا بڑا عالم ہی کیوں نہ ہو۔

ہم اِس باب میں ترجمہ کی عمومی شرائط سے منحرف بالترتیب عام ترجمہ اور خاص قرآن شریف کے ترجمہ سے دو دو مثالیں پیش کر رہے ہیں یہ اُن حضرات کی لکھی ہوئی ہیں جن کی علمی شہرت کے ساتھ حلقہ اثر بھی ہے اور کافی حد تک اہل علم بھی اُن سے متاثر ہیں یہاں تک کہ اُن کے حلقہ اثر کے لوگ اُن کی غلطیوں پر تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔اِس سے قارئین یہ سبق لے سکتے

ہیں کہ غیر معیاری حضرات اور لہو لگا کر شہیدوں میں شمار ہونے والوں کی طرح دونوں زبانوں پر عبور کے بغیر ترجمہ کرنے والوں نے کیا کیا گل نہ کھلائے ہوں گے خاص کر ترجمۂ قرآن کے نام سے معنوی تحریفات کی کیا کیا مثالیں قائم نہ کی ہوں گی، کسی انسانی کتاب اور اللہ تعالیٰ کی کتاب ''قرآن شریف'' کے خلافِ شرط ہونے والے ترجمہ غلط اور غیر معیاری کہلانے میں مشترک ہونے کے علاوہ خاص فرق یہ ہے کہ کسی انسانی کتاب کا غلط ترجمہ کے نقصانات محدود ہوتے ہیں جبکہ قرآن کے غلط ترجمہ کے نقصانات لامحدود ہوتے ہیں۔ (اَعَاذَنَااللّٰہُ مِنۂُ)

جملہ معترضہ کی اِن سطور کے بعد عام ترجمہ کی مذکور شرط یعنی ترجمہ کے الفاظ کو متن کے الفاظ سے زیادہ نہ کرنے سے خلاف ہونے والے ترجمہ کی **دوسری مثال** کے لیے فتاویٰ رضویہ کی عربی و فارسی عبارات کے مترجم مفتی محمد خان قادری کا کیا ہوا یہ ترجمہ دیکھا جا سکتا ہے جو اُنہوں نے فتاویٰ رضویہ، جلد ہفتم میں مذکور حدیث ''انکم فی صلٰوۃ ما انتظرتم الصلٰوۃ'' کا کیا ہے ''بے شک تم نماز ہی میں ہو جب تک نماز کے انتظار میں ہو۔(۱) جس میں لفظ ''ہی'' متن کے الفاظ سے زیادہ ہے کیوں کہ اُردو محاورہ میں لفظ ''ہی'' حصر کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ متن میں یہاں پر حصر کا کوئی لفظ موجود ہے نہ کوئی انداز تو پھر اسے کس کا بدل کہا جائے گا نہ صرف اتنا بلکہ مقتضائے مقام بھی نہیں ہے۔ ایسے میں اِس کی حیثیت حشو وزوائد کی قباحت سے خالی نہیں ہے جو کلام سے اصل مقصد کی فہم میں مخل ہو رہا ہے کیوں کہ اِس کے مطابق نماز کا انتظار کرتے ہوئے تلاوتِ قرآن، تسبیح و تہلیل وعظ و نصیحت، درس و تدریس جیسے عمل کی بھی نفی ہو رہی ہے کہ انتظارِ صلٰوۃ کے اثناء میں اِس قسم کے عمل کرنے والے بھی نماز ہی میں مصروف ہیں حالاں کہ حدیث سے یہ مقصد ہرگز نہیں ہے بلکہ اِس سے مقصد اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ نماز کا انتظار کرنے والے کو نماز کا ثواب ملتا ہے چاہے اِس اثناء میں نیکی کا جو عمل بھی کر رہا ہو۔ ایسے میں متن پر اِس قسم کے

---

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج7، ص 231، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور۔

اضافہ کو حشو وزوائد کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے یہاں پر کوئی ناگزیر مجبوری ہو بلکہ الفاظِ متن کے مطابق ترجمہ "بے شک تم نماز میں ہو جب تک نماز کے انتظار میں ہو، بے شک تم نماز کے ثواب میں ہو جب تک نماز کے انتظار میں ہو جیسے کسی بھی سادہ انداز میں کیا جاسکتا ہے جو متن سے اصل مقصد کے مطابق ہونے کے ساتھ جملہ شرائط پر بھی منطبق ہے۔ اِس سے دُنیائے علم کو اور خاص کر ترجمۂ کتب کا افادہ واستفادہ کرنے والوں کو یہ سبق بھی مل رہا ہے کہ ترجمہ صنفِ تحریر میں کتنا مشکل کام ہے جس میں متن سے محض ایک لفظ کا فرق بھی اِسے بے مقصد کردیتا ہے نہ صرف بے مقصد بلکہ اصل مقصد کی فہم میں مُخل بن کر دائرہ بلاغت سے بھی نکال دیتا ہے جسے معنوی تحریف سے خالی نہیں کہا جاسکتا۔

عام ترجمہ کی پیشِ نظر شرط کے خلاف ہونے والے ترجمۃ القرآن کی مثال کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 160 کا اشرف علی تھانوی اور فتح محمد خان جالندھری کے کیے ہوئے تراجم کو دیکھا جاسکتا ہے جو بالترتیب اِس طرح ہیں؛

اشرف علی تھانوی:۔ "مگر جو لوگ توبہ کریں اور اصلاح کردیں اور اُن مضامین کو ظاہر کردیں تو ایسے لوگوں پر میں متوجہ ہو جاتا ہوں اور میری تو بکثرت عادت ہے توبہ قبول کرلینا اور مہربانی فرمانا۔"

فتح محمد جالندھری:۔ "ہاں جو توبہ کرتے ہیں اور اپنی حالت درست کرلیتے اور احکامِ الٰہی کو صاف صاف بیان کردیتے ہیں تو میں اُن کے قصور معاف کردیتا ہوں اور میں بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔"

جن میں اول الذکر نے متن کے حصہ "وَبَیَّنُوْا" کے ترجمہ میں لفظ "اُن مضامین" کا اضافہ کیا ہے اور ثانی الذکر نے متن کے حصہ "وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ" کے ترجمہ میں لفظ "اور" کو اضافہ کیا ہے جس کے نتیجہ میں اول متن سے مراد کے عموم اور مقصد سے خلاف ہوگیا کیوں کہ سیاق و

سباق کے مطابق یہاں پر جس چیز کو بیان کرنا مقصد ہے وہ عام ہے جو یہودیوں کے علماءِ سُوء اور اُن کے غیر معیاری مشائخ کے چھپائے گئے مضامین واحکام کو بھی شامل ہے اور عام احکامِ الٰہی کے حوالہ سے بھی کتمانِ حق سے بچ کر آسمانی کتاب کے احکام حسبِ ضرورت ظاہر کرنے کو بھی شامل ہے۔آیت کریمہ کے اِس لفظ ''بیـنـوا'' کے ساتھ کسی خاص مفعول بہ کو ذکر نہیں کیا گیا ہے۔اہل بلاغت جانتے ہیں کہ فعل متعدی کے ساتھ اُس کے مفعول بہ کو ذکر نہ کرنے سے بڑا مقصد عموم المراد ہوتا ہے۔جیسا آیت کریمہ ''وَاللّٰہ یدعُوْااِلَی دَارِ السَّلَام '' (یونس:25) کی تفسیر میں جمہور مفسرین نے بھی لکھا ہے۔

حقیقت کی اِس روشنی میں ترجمہ کا یہ اضافی لفظ متن سے عموم المراد کے منافی ہونے کے ساتھ حشو وزوائد کے زمرہ میں شامل ہو رہا ہے جبکہ دوسرے ترجمہ کا حال اِس سے بھی بدتر ہے کیوں کہ آیت کریمہ ''وَاَنَـا التَّـوَّابُ الرَّحِیْم '' میں لفظ ''التـواب،الـرحیـم'' خبر بعد الخبر ہیں ضمیر ''اَنَا'' سے جن کے درمیان حرفِ عطف کا آنا ممکن نہیں ہے جس کے برعکس ترجمہ میں لفظ ''اور'' لایا گیا ہے جو حرفِ عطف ''وْ'' کا ترجمہ ہے دونوں ترجموں کی یہ خرابیاں محض اِس لیے دیکھنے کو مل رہی ہیں کہ مترجمین نے مذکورہ شرط سے لاپروائی کی ہے جو عام ترجمہ کی صحت کے لیے عام سی شرط ہے جبکہ ترجمۃ القرآن کے لیے مخصوص واضافی شرائط کا یہاں پر ذکر ہی نہیں ہے اُن کے حوالہ سے دیکھا جائے تو اِس قسم کے تراجم کو معنوی تحریف کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ترجمہ کی عمومی شرائط کے سلسلہ میں مذکورہ شرط کی ایک شق یہ بھی ہے کہ متن کا لفظ اگر فعل ہے تو پھر فعل لازم اور متعدی ہونے کے حوالہ سے،اور مجہول ہونے کے حوالہ سے اُس کی حیثیت پر اطمینان کے بعد ترجمہ میں بھی اُس کے مطابق الفاظ استعمال کرنا ضروری ہے ورنہ فعل لازم کا ترجمہ متعدی میں یا متعدی کا ترجمہ لازم میں کرنے سے ترجمہ بے مقصد ہو سکتا ہے جس کی عام ترجمہ میں **پہلی مثال** فتاویٰ رضویہ میں مذکور درج ذیل فارسی اشعار ''ز دو یست ماہ تابان آفریدند

......زقدت سرو بوستان آفریدند'' کا ترجمہ مفتی محمد خان قادری نے اِس طرح کیا ہے؛

''تیرے چہرہ اقدس سے روشن چاند پیدا ہوتے ہیں تیرے قدِ انور سے باغ کے سرو اُگتے ہیں۔''(۱)

جس میں متن کے فعلِ متعدی ''آفریدند'' کا ترجمہ دونوں جگہوں میں فعل لازم کے الفاظ میں کیا گیا ہے کیوں کہ اُردو محاورہ میں لفظ ''پیدا ہونا'' مفعول بہ کا محتاج نہیں ہے تو پھر اِس کی حیثیت فعل لازم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہی حال لفظ ''اُگنا'' کا بھی ہے کہ اِس سے اشتقاق پاکر استعمال ہونے والے تمام الفاظ مثلاً ''اُگتے ہیں، اُگتا ہے، اُگتی ہے، اُگے گا، اُگیں گے'' جیسے جتنے بھی ہیں وہ سب فاعل پر ہی تمام ہوتے ہیں یعنی فعلِ لازم ہی کہلاتے ہیں اور اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ فعل لازم اور متعدی میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرنا جائز نہیں ہے تو پھر اُس کے ترجمہ میں کیوں جائز ہو یہ بھی نہیں ہے کہ یہاں پر ترجمہ والی زبان کی طرف سے تنگی دامن کا عارضہ یا کوئی اور محاوراتی مجبوری لاحق ہے بلکہ مذکورہ اشعار کا ترجمہ (تیرے چہرہ سے روشن چاند پیدا کیے......تیرے قد سے باغ کے سرو پیدا کیے، تیرے چہرہ سے روشن چاند پیدا کردیئے...... تیرے قد سے سروِ باغ پیدا کردیئے) جیسے کسی بھی متعدی انداز میں ہوسکتا ہے جبکہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے کسی ناگزیر مجبوری کے بغیر متن کی نوعیت سے خلاف ہونے والا ترجمہ کبھی بامقصد نہیں ہوسکتا یہاں پر بھی ایسا ہی ہوا ہے کہ متن سے مقصد کارکنانِ قضا وقدر کو فاعل اور روشن چاند اور سرو باغ کو مفعول بہ قرار دینے کے ساتھ ممدوح کے چہرہ کو اِن دونوں کے لیے اصل ماخذ و بنیاد بتانا ہے ببیں تفاوت راہ از کجا تابکجا است ایسے میں عام ترجمہ کی مذکورہ شرط سے انکار کی کیا مجال ہے۔ (فاعتبروا ایھا المترجمون)

دوسری مثال:۔ فتاویٰ رضویہ، جلد اول کی عربی اور فارسی عبارات کے مترجم محمد احمد مصباحی نے

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج:14، ص:649، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور۔

متن ''ھٰذا کلہ ماظھر لی ولیحرر'' کا ترجمہ یہ سب وہ ہے جو مجھ پر ظاہر ہوا اس پر خوب غور کیا جائے'' جس میں نہ صرف یہ کہ متنِ لغت اور تحریر کے لُغوی مفہوم سے خلاف کر کے ترجمہ کو بے مقصد بنایا گیا ہے جس پر افسوس کیے بغیر کوئی سامع رہ سکتا ہے نہ کوئی قاری بلکہ اِس پر افسوس بالائے افسوس یہ کہ متعدی متن کا ترجمہ فعل لازم میں کیا گیا ہے کیوں کہ لفظ''لیحرر''علم تصریف کے مطابق امر غائب مجہول کہلاتا ہے جو اپنے مصدر''تحریر'' بمعنی لکھنے سے مشتق استعمال ہوتا ہے اور تحریر بمعنی کتابت فعل لازم نہیں ہے جو مکتوب کے بغیر صرف فاعل سے ہی وجود میں آسکے بلکہ متعدی ہے جس کا تصور مفعول بہ کے بغیر ممکن نہیں ہے اِس کے ترجمہ کے لیے جو الفاظ''اِس پر خوب غور کیا جائے'' استعمال کیے گئے ہیں متعدی نہیں بلکہ فعل لازم کے قبیل سے ہیں کیوں کہ غور کرنا مفعول بہ نہیں بلکہ مفعول فیہ یعنی مافیہ الغور والفکر کے مقتضی ہیں۔اہل علم جانتے ہیں کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے کوئی ناگزیر مجبوری یا کوئی خاص محاورتی اور بلاغت مقتضا موجود نہ ہونے کی صورت میں متن کی نوعیت سے خلاف الفاظ استعمال کرنے سے ترجمہ بامقصد نہیں ہوسکتا جبکہ یہاں پر ایسی کوئی مجبوری یا مقتضائے مقام موجود نہیں ہے کیوں کہ اِس کے ترجمہ میں (اور اِسے لکھا جائے ،اور اِسے لکھ کر محفوظ کیا جائے ،اور اِسے کتابت میں لایا جائے) جیسے کوئی بھی الفاظ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

ایسے میں ترجمہ کی مذکورہ شرط کے ناگزیر ہونے سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے دانش جُو مستفتی کے جواب میں اِس تحریر سے ہمارا مقصد بھی متعدی ہے یعنی صرف دانش جُو جیسے ایک سائل کی فہمائش اور ان کی رہنمائی تک محدود نہیں ہے بلکہ دانش جو حضرات کے ساتھ اُن دانش دِہ شیوخ واساتذہ اور علم کی روشنی پھیلانے والے حضرات کو بھی خوابِ غفلت سے جھنجھوڑنا ہے کہ عمومی شرائط کی پابندی کے بغیر کسی بھی قابلِ ذکر کتاب کا ترجمہ کرنا بھی روا نہیں ہے چہ جائیکہ ترجمۃ القرآن جیسے کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط عمل جائز ہوسکے۔اِس تحریر سے ہمارے مقصد اِس لیے بھی متعدی ہے کہ عمومی شرائط سے خلاف جن تراجم کو ہم مثال کے طور پر

ذکر کررہے ہیں یہ دانش جو حضرات کے کیے ہوئے نہیں ہیں بلکہ الٰہیات کے حوالہ سے حلقہ اثر رکھنے اور اپنے انداز پر علم پھیلانے والے دانش وہ حضرات کے کیے ہوئے تراجم ہیں یعنی ''چوں کفر از کعبہ برخیزد کجاماند مسلمانی '' اللہ بہتر جانے لہولگا کر شہیدوں میں شمار ہونے والوں کی طرح بغیر شرائط کے مترجم بننے والے بے اثر حضرات کیا کیا تحریفات کررہے ہوں گے۔

ترجمۃ القرآن میں مذکورہ عام شرط سے خلاف ہونے والے ترجموں کی مثال کے لیے محدث کچھوچھوی سید محمد اور عبدالرحمٰن گیلانی کے ترجموں کو دیکھا جاسکتا ہے جو اُنہوں نے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 108 کے حصہ ''وَمَنْ یَتَبَدَّلِ الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ '' کا بالترتیب ترجمہ کیا ہے ''اور جو بدل کرلے کفر کو ایمان سے تو بے شک گم کردیا اُس نے ہموار راستہ، اور جس نے ایمان کو کفر کی روش سے بدل دیا اُس نے صراطِ مستقیم کو گم کردیا'' جس میں متن کے غیر متعدی فعل ''ضَلَّ '' کا ترجمہ متعدی میں کیا گیا ہے جو بالترتیب اُن کے الفاظ ''بے شک گم کردیا اُس نے ہموار راستہ، اُس نے صراطِ مستقیم کو گم کردیا'' سے آپ ہی معلوم ہورہا ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے جس کی وجہ ترجمہ کی مذکورہ عام شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے ورنہ آیت کریمہ کے اِس حصہ کی لسانی حیثیت کہ یہ فعلِ لازم ہے اور اِس کے متعدی ہونے کا کوئی محاورہ موجود نہیں ہے۔ نیز لسانِ قرآنی کے مطابق (ض، ل، ل) کے مادہ سے اشتقاق پاکر استعمال ہونے والے الفاظ میں ''ضـــلال '' اپنے وجود میں مفعول بہ کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ صرف فاعل پر ہی تمام ہوتا ہے جس وجہ سے اِسے فعل لازم کہا جاتا ہے جبکہ اِس کے مقابلہ میں ''اضلال '' ہے جو اپنے وجود میں مفعول بہ کی طرف محتاج ہے جس وجہ سے ہے اِسے فعل متعدی کہا جاتا ہے جس کے مطابق آیت کریمہ کا درست ترجمہ ''اور جو ایمان کے بدلے کفر لے وہ ٹھیک راستہ سے بہک گیا، اور جو ایمان کے بدلے میں کفر لے بے شک وہ سیدھی راہ سے بہک گیا، جو ایمان کے بدلے

کفر لے بے شک وہ صراطِ مستقیم سے بہک گیا'' جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا ہے جو متن کی لسانی حیثیت کے مطابق ہونے کے ساتھ دونوں زبانوں کے محاورہ پر بھی منطبق ہے لیکن اِس کی توفیق صرف اُنہیں نصیب ہوسکتی ہے جو ترجمہ کی شرائط کا التزام کریں۔(واللہ الھادی الی سبیل الرشاد)

ترجمہ کی عمومی شرائط کے سلسلہ میں مذکور شرط کی ایک شق یہ بھی ہے کہ موصول یا مفصول ہونے کی حیثیت سے متن کی تمیز کرے اِس حوالہ سے اُس کی حیثیت پر قلبی اطمینان پانے کے بعد ترجمہ والی زبان سے اُس کے مطابق الفاظ و انداز اختیار کرے ورنہ موصول متن کا ترجمہ مفصول میں اور مفصول کا ترجمہ موصول میں ہوکر ترجمہ بے مقصد ہوسکتا ہے۔موصول سے ہماری مراد علم نحو والا موصول نہیں ہے جو کبھی حرفی ہوتا ہے کبھی اسمی اور ہر صورت میں صلہ کا مقتضی ہوتا ہے کیوں کہ صلہ کے بغیر اُس کا تصور ممکن ہے نہ وجود بلکہ اِس سے ہماری مراد وہ موصول ہے جو علم بلاغت میں مشہور و معروف ہے جسے عطف نسق بھی کہا جاتا ہے۔جس میں حرف عطف کے ذریعہ دو الفاظ یعنی معطوف و معطوف علیہ ایک دوسرے کے ساتھ موصول ہوتے ہیں اور ایک حکم میں شریک ہوتے ہیں جبکہ مفصول میں ایسا نہیں ہوتا کیوں کہ اُس میں حرف عطف کے بغیر دو کلام یا دو لفظ مستقل انداز سے مذکور ہوتے ہیں جس وجہ سے اُنہیں ضدین کہا جاتا ہے کہ موصول کی جگہ الفاظ کو مفصول کرنا جائز ہے نہ اِس کے برعکس ورنہ مقصد سے خلاف ہوگا اور بلاغت کے دائرہ سے نکل کر بے مقصد ہوگا کیوں کہ اِن سے مقاصد مختلف ہوتے ہیں جب اِن میں سے ایک کی جگہ دوسرے کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے تو پھر ترجمہ کیوں جائز ہوگا جبکہ ترجمہ اصل کی فرع اور اُس کے تابع ہے۔

اِس کی خلاف ورزی پر مشتمل ترجموں کی پہچان کے لیے عام ترجمہ میں پہلی مثال فتاویٰ رضویہ، جلد ہفتم کے مترجم کا وہ ترجمہ ہے جس میں اُنہوں نے فتاویٰ رضویہ میں موجود فقہ کی مشہور عبارت ''لو وجد فرجة فی الاول لا الثانی له خرق الثانی لتقصیرھم'' کا ترجمہ اِس انداز سے کیا ہے ''اگر کسی نے صف اول میں رخنہ پایا حالاں کہ دوسری میں نہ تھا تو اُس کے لیے

دوسری صف والوں کی کوتاہی کی وجہ سے دوسری صف کو چیرنا جائز ہوگا۔''(۱)

جس میں متن کے حصہ''لاالثانی ''پر آیا ہوحرفِ''لا''جوحرف عطف ہے،جس کی وجہ سے اُس کے معطوف ومعطوف علیہ یعنی پہلی صف میں خالی جگہ پانا اور دوسری صف میں نہ پانا یہ دونوں آپس میں موصول ہوکر اِس بات کے لیے جواز بن رہے ہیں کہ بعد میں آنے والا دوسری صف کو چیز کر پہلی صف جاسکتا ہے اگر یہ دونوں آپس میں موصول نہ ہو یعنی اِن کے مابین حرفِ واصل نہ ہوتو پھر اِس پر مرتب ہونے والے حکم''لہ خرق الثانی ''کا تصور ممکن نہیں ہوگا جبکہ متن کے آخری حصہ''لتقصیرھم ''معطوف ومعطوف علیہ کے اُس مجموعہ کی شرعی حیثیت ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ پہلی صف میں خالی جگہ دیکھنے کے باوجود اُس میں کھڑے ہونے کے بجائے دوسری میں کھڑے ہوکر اُسے بھرنے والوں میں سے ہر ایک قصوروار ہے کہ اُس نے شریعت کے متفقہ حکم''اتموا الصفوف الاول فالاول ''سے خلاف کیا ہے،جس وجہ سے بعد میں آنے والے کے لیے جائز ہے کہ اُن میں سے جنہیں بھی چاہے سزا دے جو اُن کے بیچ میں سے گزر کر اگلی صف جانے میں پائی جاتی ہے۔لیکن مترجم نے متن کی اِس حیثیت کو پیشِ نظر رکھے بغیر اُسے من پسند کا تابع بنایا اور اُس کے حصہ''لاالثانی ''کو جملہ حالیہ تصور کیا جبکہ حقیقت میں حال ذوالحال کی کیفیت کا یہاں پر تصور بھی نہیں ہے۔ایسے میں ترجمہ کے بامقصد ہونے کا کیا تصور پیدا ہوسکتا ہے جبکہ اُس کی لسانی حیثیت کے مطابق حقیقی ترجمہ (اگر صفِ اول میں خالی جگہ پائی دوسری میں نہیں اُس کے لیے دوسری کو چیرنا جائز ہے اُن کی کوتاہی کی وجہ سے،صفِ اول میں رخنہ پایا دوسری میں نہیں اُسے جائز ہے کہ دوسری صف کو چیرے اُن کے قصور کی وجہ سے) جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو متن کی وصلی حیثیت کے مطابق ہونے کے ساتھ دوسری تمام شرائط پر بھی منطبق ہے لیکن یہ سہولت صرف اُنہیں میسر ہوسکتی ہے جو شرائط کی اہمیت کا احساس رکھتے ہوں جس کے بغیر کلام کو ترجمہ کے

(۱) فتاویٰ رضویہ،ج7،ص45،مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاھور۔

نام سے ایک زبان سے دوسری زبان کی طرف منتقل کرنے والوں سے درست ترجمہ کی توقع کرنا اِس سے مختلف نہیں ہوگا کہ "بیل سے دودھ ملنے" کی توقع کی جائے۔

دوسری مثال:۔ فتاویٰ رضویہ میں منقول "الحدیقۃ الندیہ فی شرح الطریقۃ المحمدیہ" کی درج ذیل عبارت "قد سئل بعض العلماء عن هذه المقامات المنصوبة حول الكعبة التي يصلون فيها الآن باربعة ائمة على مقتضا المذاهب الاربعة فاجاب بانها بدعة ولٰكنها بدعة حسنة لا سيئة لا تهاتدخل بدليل السنة الصحيحة وتقريرها في السنة الحسنة لا نها لم يحدث منها ضرر ولا حرج في المسجد ولا في المصلين من المسلمين لعامة اهل السنة والجماعة بل فيهاعميم النفع في المطر والحر الشديد والبرد وفيها وسيلة للقرب من الامام في الجمعة وغيرها فهي بدعة حسنة ويسمون بفعلهم للسنة الحسنة وان كانت بدعة اهل السنة لا اهل البدعة"

اِس کا ترجمہ مفتی محمد خان القادری نے اِس طرح کیا ہے "بعض علماء سے کعبہ معظّمہ کے اردگرد مقاماتِ مخصوصہ میں مذاہب اربعہ کی اقتداء میں نماز ادا کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو اُنہوں نے اسے بدعت کہا لیکن یہ بدعت حسنہ ہے سیۂ نہیں کہ یہ سنت صحیحہ کی دلیل و تقریر پر سنت حسنہ میں داخل ہے کیوں کہ اِس کی وجہ سے کوئی ضرر نہیں ہوتا نہ مسجد میں کوئی تنگی ہے اور عام اہل سنت کے نمازیوں میں کوئی حرج ہے بلکہ اِس میں بارش اور سخت گرمی و سردی میں فائدہ وآسانی ہے اور اِس میں جمعہ وغیرہ میں امام کا قرب بھی حاصل رہتا ہے لہٰذا یہ بدعت حسنہ ہے اور فقہاء اپنے اِس فعل کا نام سنت حسنہ رکھتے ہیں اگرچہ یہ اہل سنت کی بدعت ہے نہ کہ اہل بدعت کی"۔

جس میں متن کی متعدد لسانی حیثیات سے خلاف کرکے ترجمہ کو بے مقصد بنایا گیا ہے جبکہ ہم یہاں پر صرف پیشِ نظر شرط کی خلاف ورزی کا پسِ منظر بتانا چاہتے ہیں کہ اِس میں متن کی

عطف والی حیثیت سے بے اعتنائی کی گئی ہے جس کی وضاحت اِس طرح ہے کہ یہاں پر متن کے حصہ "فاجاب بانهابدعة" میں لفظ "بدعة" اور اُس کے بعد والے الفاظ "ولكنها بدعة حسنة لا سيئة" آپس میں معطوفات ہیں کہ "لكنها بدعة حسنة" معطوف ہے "بدعة" پر جن کے مابین حرف عطف "واؤ" ہے اور لفظ "سيئة" معطوف ہے "بدعة حسنة" پر جن کے مابین حرف عطف لا ہے اور متن کے حصہ "لم يحدث منها ضرر" میں لفظ "ضرر" معطوف علیہ ہے جبکہ اِس کے بعد والے الفاظ "لا حرج" اُس پر عطف ہے جس میں "واؤ" حرف واصل اور لا تاکید نفی کی خاص صورت ہے اور حصہ "في المسجد في المصلين" بھی آپس میں معطوف و معطوف علیہ ہے جس کے بعد "اهل السنة والجماعة" تک بیان ہے "مصلين" کے لیے اور متن کا حصہ "بل فيهاعميم النفع" معطوف ہے جملہ سابقہ "لم يحدث منهاضرر" پر جبکہ بعد میں مذکور ہونے والا جملہ "وفيهاوسيلة للقرب من الامام" اِس پر معطوف ہے اور متن کا حصہ "و يسمون بفعلهم" سے لے کر آخر تک مستقل کلام ہے جو پیش آمدہ مسئلہ پر عمل کرنے والوں کو اہل بدعت نہ بلکہ اہل سنت کے نام سے یاد کرنے پر مستقل دلیل ہے جس میں لفظ "يسمون" علم تصریف کے مطابق باب "تفعيل" سے فعل مضارع مجہول ہے جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے جس میں سے اول ضمیر مرفوع متصل بارز "واؤ" کی شکل میں قائم مقام فاعل ہے جبکہ دوسرا "اهل السنة لا اهل البدعة" ہے جو معطوف و معطوف علیہ سے مجموعہ ہے اور لفظ "وان كانت بدعة" میں مذکور لفظ "ان" کلمہ وصلیہ کہلاتا ہے جس کے بعد مذکور ہونے والے جملہ کا نقیض اولی بالجزا ہوتا ہے اور اِس کلام کے آغاز میں یعنی "ويسمون" میں مذکور حرف "وٗ" عطف کے لیے نہیں بلکہ استینافیہ ہے جس کے مابعد ہونے والا کلام جملہ مستانفہ کہلاتا ہے۔

حقائق کی اِس روشنی میں پیشِ نظر متن کا معیاری ترجمہ "بے شک بعض علماء سے پوچھا گیا کعبہ کے اردگرد مقررہ اُن مقامات سے متعلق جن میں اب چاروں اماموں کی اقتداء میں نماز پڑھتے ہیں چاروں مذاہب کے تقاضا کے مطابق تو اُس نے جواب دیا کہ یہ بدعت ہے لیکن بدعت

حسنہ ہے نہ سیئہ کیوں کہ یہ داخل ہوتی ہے سنت صحیحہ کی دلیل اور اُس کی تقریری کی وجہ سے سنت حسنہ میں کیوں کہ اِس سے کوئی ضرر اور نہ کوئی حرج پیدا ہوا مسجد میں نہ نمازیوں میں جو عام اہل سنت الجماعت مسلمانوں میں سے ہیں بلکہ اِس میں نفع عام ہے بارش اور شدید گرمی اور ٹھنڈ میں اور اِس میں امام کے قریب ہونے کا وسیلہ ہے جمعہ وغیرہا میں تو یہ بدعت حسنہ ہے اور اچھا طریقہ پر عمل کرنے والے اپنے اِس عمل کی وجہ سے اہل السنۃ کے نام سے یاد کیے جائیں گے اہل بدعت کے نام سے نہیں اگر چہ اُن کا یہ عمل ''لُغت'' کی زبان میں بدعت ہی کیوں نہ ہو، کعبہ کے اردگرد مقررہ اُن مقامات سے متعلق بعض علماء سے پوچھا گیا جن میں اب چار اماموں کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں چاروں مذاہب کے تقاضا سے تو اُس نے جواب دیا کہ یہ بدعت ہے اور اِس سے مراد بدعت سیئہ نہیں بلکہ حسنہ ہے کیوں کہ سنت صحیحہ کی دلیل اور اُس کی تقریری کی بناء پر سنت حسنہ میں شامل ہوتا ہے کیوں کہ اِس سے کوئی نقصان پیدا ہوا نہ حرج مسجد میں نہ نمازیوں میں جو عام اہل سنت مسلمانوں میں سے ہیں بلکہ اِس میں عام نفع ہے بارش اور شدید گرمی اور ٹھنڈ میں اور اِس میں امام کے قرب کا وسیلہ ہے جمعہ وغیرہا میں انجام کار یہ بدعت حسنہ ہے اور سنت حسنہ پر عمل کرنے والے اُس کے سبب اہل سنت سے موسوم ہوں گے اہل بدعت سے نہیں'' اِس جیسے کسی بھی انداز سے کیا جاسکتا ہے جو نہ صرف متن کی پیشِ نظر حیثیت پر منطبق ہے بلکہ اِس کے علاوہ متعدد حیثیات کے بھی مطابق اور جملہ شرائط کے بھی موافق ہے لیکن اِس کی توفیق اُن ہی کو نصیب ہوتی ہے جو ترجمہ کرتے وقت خود کو شرائط کے پابند سمجھتے ہیں۔ یہ اتنا عام مسئلہ ہے کہ کسی اہل علم سے پوشیدہ ہے نہ کسی فن کار سے کیوں کہ دُنیا کے کسی بھی فن کی حقیقت، اُس کے لوازمات اور شرائط کو سمجھے بغیر اُس میں کودنے والے سے اصلاح کی اُمید نہیں کی جاسکتی جبکہ ترجمہ کا فن دُنیائے تحریر کی جملہ اصناف وفنون سے مختلف اور مشکل ترین فن ہے کثیر الشرائط اور مقتضی احتیاط ہے کہ صرف ایک شرط سے خلاف ہونے پر بھی ساری محنت ضائع ہوسکتی ہے لیکن افسوس اِس بات پر کہ لوگ اِسے آسان سمجھ کر ترجمہ کے نام سے کچھ

عجیب وغریب تحریریں شائع کررہے ہیں۔ اِس پر مستزاد یہ کہ ترجمہ پڑھنے والوں کی غالب اکثریت صحیح وسقیم کی تمیز کرنے سے عاری ہے بلکہ ترجمہ کے نام سے جو کچھ بھی سامنے آتا ہے اُسے اصل کی جگہ قبول کرتی ہے دراصل غلط تراجم کے مروج ہونے میں بھی حضرات کی اِس روش کو بڑا دخل ہے ورنہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ پڑھنے والوں میں %10 اہل تمیز ہوں تب بھی اِس اُفتاد کا انسداد ہوسکتا ہے۔

اِس کے علاوہ دوسری وجہ اِس کی یہ بھی ہے کہ خاص کر قرآن وسنت اور اِن کی فہم کے لیے موقوف علیہ علوم وفنون کو مسلم آبادیوں میں سیاسی مقتدرہ کی سرپرستی حاصل نہیں ہے ثانوی درجہ میں ہونے کی وجہ سے تعلیم وتعلم اور افہام وتفہیم کے حوالہ سے اِن کی موثر نگرانی بھی نہیں ہے جس کے سایہ عاطفت وتحفظ میں اِن کی اشاعت ہوتی اور ایک قوم سے دوسری قوم اور ایک زبان سے دوسری زبانوں کو منتقل کرنے میں بے اعتدالی سے تحفظ ہوتا۔ نیز مذہبی مقتدرہ جو خود کو اِس کا امین و مسئول سمجھتا ہے ایک راہ پر نہیں ہے فرقہ در فرقہ، تقسیم در تقسیم کے نتیجہ میں فرمانِ الٰہی ''کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ ''(۱) کا منظر پیش کررہا ہے، ہر فریق اپنے اکابرین کی بے اعتدالیوں کو چھپا کر دوسروں کی جائز تفہیمات کو بھی ناجائز قرار دینے میں کوشاں ہے، کسی فریق کو بھی جماعت بندی کی عصبیت سے آزاد ہو کر صحیح وسقیم کی تمیز کرنے کی توفیق نہیں ہے۔ ایسے میں قرآن وسنت کی تشریح وترجمانی میں عصبیت کی رسہ کشی ہونے کی طرح قرآن شریف کا ترجمہ بھی محفوظ نہیں ہے، سچ فرمایا رب کریم جل جلالہ وعم نوالہ نے ''لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ''(۲) ''اِسے چھو نہیں سکتے مگر پاک ذہن والے۔'' سے پاک وصاف ہو۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ جنوبی ایشیائی خطہ میں اور خاص کر پاک وہند کے مذہبی مدارس

---

(۱) المومنون:53۔

(۲) الواقعہ:79۔

میں قرآن وسنت کو کلام اللہ اور کلام الرسول کی حیثیت سے سمجھنے کی بجائے اپنے مخصوص نظریہ کے رنگ میں دیکھا جاتا ہے اور معلمین و متعلمین کی پوری عمریں اُسے اپنے نظریہ پر منطبق کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتی ہیں اور اپنے مخصوص نظریہ کے حق میں قرآن وسنت کی غلط تشریح، بے حقیقت تعبیر اور غیر معیاری ترجمہ دیکھ کر بھی اُسے تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ اپنی مخصوص ذہنی ترجیح سے خلاف حقیقی تشریح و تعبیر اور ترجمانی و ترجمہ کو مسترد کیا جاتا ہے۔ الٰہیات کے حوالہ سے معروضی حالات کے ایسے دل خراش ماحول میں غلط تراجم کو رواج پانے کا موقع مل رہا ہے اور غیر معیاری مترجمین کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے کیوں کہ سیاسی مقتدرہ کی طرف سے مذہبی اقتدار کی ان دھڑہ بندیوں کی گرفت نہیں ہے اور قرآن وسنت کے تحفظ کا اہتمام نہیں ہے اور قرآن کی روشنی کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کے لیے فطری شرائط کا احساس نہیں ہے۔ مترجمین کے ہاتھوں اُصولِ ترجمہ کا ضیاع دیکھ کر افسردگی کے عالم میں قلم نہ روک سکا بات لمبی ہوگئی میں نے اِس مقام پر عمومی شرائط کی مذکورہ شق یعنی متن کی لسانی حیثیات میں سے وصل اور فصل کی تمیز سے خلاف ہونے والے ترجمۃ القرآن کی مثالیں پیش کرنی تھیں۔

جس کی ایک مثال سورۃ البقرہ، آیت نمبر 43 ''وَاَقِیْمُوا الصَّلاۃَ وَآتُوا الزَّکَاۃَ'' مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اِس کا ترجمہ کیا ہے ''اور نماز پڑھو زکوٰۃ دیا کرو'' جس میں متن کے حرف واصل ''وَ'' کے ترجمہ سے بے اعتنائی کر کے موصول متن کو مفصول کر دیا گیا ہے جبکہ اُس کا حقیقی ترجمہ ''اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو'' جیسی کسی بھی وصلی صورت میں ہو سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ترجمہ کی عمومی شرائط سے ناآشنا حضرات ایسی بے اعتدالیوں کو محض ایک حرف کا فرق کہہ کر ٹال دیں گے جو اُن کی ماحولیاتی مجبوری ہے کہ اُنہیں اِس سے معنوی طور پر اُٹھنے والے قبائح کا علم نہیں ہے اور بلاغت پر پڑنے والے برے اثرات کا اِدراک نہیں ہے جبکہ حقیقت میں یہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے جس کی اہمیت سے متعلق تلخیص المفتاح میں کہا ہے؛

''ومقام الفصل یباین مقام الوصل''(۱)

---

(۱) تلخیص المفتاح فی البلاغۃ بحث تعریف بلاغت الکلام۔

دوسری مثال:۔ جو مذکورالصدر سے برعکس ہے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 199 کے حصہ ''ان اللہ غفور رحیم'' کا تھانوی اور فتح محمد جالندھری کے کیے ہوئے تراجم کو دیکھا جا سکتا ہے جو بالترتیب اِس طرح ہیں ''یقیناً اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے اور مہربانی فرمائیں گے، بے شک خدا بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے'' جن میں لفظ ''اور'' نہ صرف بے محل ہے متن پر بے مصرف اضافہ اور اُس کی بلاغت کے منافی ہے بلکہ اُس کی لسانی حیثیت کو بدلنے کے مترادف ہے کیوں کہ نحوی اور بلاغی اُصولوں کے مطابق اُس کے دونوں لفظ ''غفور، رحیم'' بالترتیب خبر بعد الخبر ہیں لفظ ''اِن'' کے لیے جبکہ خبر بعد الخبر آپس میں موصول نہیں بلکہ مفصول ہوتے ہیں یعنی معطوف و معطوف علیہ نہیں بلکہ مستقل حیثیت کے حامل ہوتے ہیں جس کے مطابق یہاں پر لفظ ''رحیم'' اپنے سے ماقبل یعنی ''غفور'' کے تابع ہوئے بغیر مستقل طور پر ''اِنّ'' کے لیے خبر اور اُس کا معمول ہے جیسا ''غفور'' کسی کے تابع ہوئے بغیر بلاواسطہ اور مستقل خبر و معمول ہے جبکہ اِن کے مابین حرفِ عاطف آنے کی صورت میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ آپس میں ضدین ہونے کی وجہ سے ''غفور رحیم'' کی جگہ غفور و رحیم'' کہنا جائز ہے نہ اِس سے برعکس تو پھر ایک کا ترجمہ دوسرے میں کرنے کا کیا جواز ہے؟ (واللہ الھادی الی سبیل الرشاد)

ترجمہ کی عمومی شرائط کے سلسلہ میں متن کی لسانی حیثیت کی پہچان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ متن میں استعمال ہونے والے اِسم ضمیر کی نوعیت کہ ضمیر بارز ہے یا مستتر اور مذکر ہے یا مونث اور حاضر ہے یا غائب اِس پر اطمینان پانے کے بعد ترجمہ والی زبان سے اِس کے مطابق لفظ استعمال کرنا ضروری ہے ورنہ ضمیر مستتر کا ترجمہ بارز میں یا اِس سے برعکس اِسی طرح غائب کا ترجمہ حاضر میں یا اِس سے برعکس کرنے سے ترجمہ کا مقصد فوت ہو سکتا ہے چہ جائیکہ ظاہر کا ترجمہ ضمیر میں اور ضمیر کا ترجمہ ظاہر میں کرنے کو جائز کہا جائے۔

شرط کی اِس شِق کی خلاف ورزی پر مشتمل ترجموں کی ایک مثال شرح جامی کے آغاز ''الحمد لِوَلِیّہ'' کا ترجمہ کیا گیا ہے ''ہر قسم کی حمد لائق حمد کے لیے ہے'' یہ ترجمہ لطائف المعانی فی تسہیل شرح

ملا جامی کے مصنف پیر عبداللطیف مرحوم نے کیا ہے جس میں ضمیر مجرور جو ولی کے لیے مضاف الیہ ہے کا ترجمہ اِسم ظاہر میں کیا گیا ہے جیسا مذکورہ الفاظ "لائق حمد کے لیے ہے" سے صاف ظاہر ہے جو متن کے ایجاز واختصار کے منافی ہونے کے ساتھ اُس کی بلاغت سے بھی خلاف ہے جبکہ اصل سے مراد کے مطابق ترجمہ "حمد علی الاطلاق اُس کے متصرف کے لیے خاص ہے، حمد اُس کے متصرف کے لیے ہے" جیسے انداز میں کیا جاسکتا ہے جو لُغت کے مطابق ہونے کے ساتھ متن کی جملہ لسانی حیثیات پر بھی منطبق ہے یہ الگ بات ہے کہ ترجمہ سے قطع نظر تشریح یا تفہیم کے طور پر بہت کچھ جائز ہوتا ہے شرح جامی کے جملہ حمد یہ کے ترجمہ کے نام سے یہ الفاظ "ہر قسم کی حمد لائق حمد کے لیے ہے" بھی تشریح وتفہیم کے طور پر یقیناً جائز اور درست ہیں لیکن ترجمہ کے طور پر ہرگز نہیں کیوں کہ ترجمہ کے ایک ایک لفظ کا متن کے ایک ایک لفظ کا بدل اور اُس کے قائم مقام ہونا ضروری ہے جبکہ اِسم ظاہر اور اِسم ضمیر آپس میں ضدین ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے بدل ہوسکتے ہیں نہ قائم مقام۔

دوسری مثال:۔ فتاویٰ رضویہ میں مذکور فواتح الرحموت کی عبارت "علی ھذا ینبغی ان یقرء ھا فی التراویح بالجھر مرۃ ولا تَتَادَیٰ سنۃ الختم دونھا" کا ترجمہ کیا گیا ہے "یعنی اِس بنا پر چاہئے کہ بسم اللہ شریف تراویح میں جہر سے ایک بار پڑھی جائے بے اِس کے سنتِ ختم ادا نہ ہوگی" (۱)۔ اِس میں "یقرء ھا" کے ضمیر منصوب متصل کا ترجمہ اِسم ظاہر "بسم اللہ شریف" میں کیا گیا ہے جو اُس کی لسانی حیثیت سے خلاف ہے۔ نیز جب یہ پوری عبارت مع سیاق وسباق بسم اللہ شریف سے متعلق ہے نہ صرف فتاویٰ رضویہ کے محولہ مقام پر بلکہ اُس کے اصل یعنی فواتح الرحموت میں بھی اِس پورے مضمون کا محور بسم اللہ شریف کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس کے مطابق متن کی مذکورہ عبارت میں بھی ضمیر استعمال کیا گیا ہے جو عین مقتضاء المقام ہے تو پھر ترجمہ کے اِس بے ڈھنگے انداز کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اِس بے اعتدالی کی اصل وجہ مذکورہ شرط سے بے اعتنائی کے

---

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج:7، ص:661، مطبوعہ رضا فائونڈیشن لاہور۔

سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ اِس کا معیاری ترجمہ ''اِس بنا پر مناسب ہوگا کہ اُسے تراویح میں ایک بار جہر سے پڑھا جائے جس کے بغیر سنتِ ختم ادا نہ ہوگی، اِس کے مطابق چاہئے کہ تراویح میں ایک بار اِسے جہر سے پڑھے جس کے بغیر ختم کی سنت ادا نہ ہوگی'' جیسے کسی انداز میں کیا جا سکتا ہے لیکن یہ توفیق اُنہیں نصیب ہو سکتی ہے جو شرائط کی پابندی کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی کچھ شرط نا آشنا حضرات کے کیے ہوئے کچھ تراجم بھی درست دکھائی دیتے ہیں جسے حسنِ اتفاق یا مشہور ضرب المثل ''رمية من غير رام'' سے مختلف نہیں کہا جا سکتا اُس کی مثال ایسی ہے جیسے صرف ونحو کے قواعد سے نا آشنا کچھ حضرات عربی کتابوں کی درست عبارت پڑھ لیتے ہیں خاص کر حافظِ قرآن حضرات میں یہ کمال مشہور ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اِس عالمِ اسباب میں کوئی فن، کوئی کسب اور کوئی بھی قابلِ ذکر عمل شرائط کے بغیر نا تمام و نا مراد ہونے کی طرح ترجمہ کا عمل بھی شرائط کی پابندی کے بغیر با مقصد نہیں ہو سکتا۔

ترجمۃ القرآن میں پیشِ نظر شرط کی خلاف ورزی کی **پہلی مثال** سورۃ البقرہ، آیت نمبر 5 ''وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'' کا تھانوی نے ترجمہ کیا ہے ''اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب'' جس میں ظاہری صورتِ ضمیر ''هُم'' سے بے اعتنائی کی گئی ہے حالاں کہ مسند الیہ کی تاکید اور مسند کی مسند الیہ کے ساتھ تخصیص پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اِس کی بڑی اہمیت ہے جس کے مطابق آیت کریمہ کا درست ترجمہ ''اور یہی مراد کو پہنچنے والے ہیں، اور وہی فلاح پانے والے ہیں'' جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو نہ صرف لفظ ''هُم'' کے مرجع کی تاکید اور فلاح کا اُن کے ساتھ خاص ہونے پر دلالت کر رہا ہے جو آیت کریمہ کے نزول سے مقصد اور اُس کی عبارۃ النص بھی ہے بلکہ جملہ شرائط پر بھی منطبق ہے۔ اِس کے برعکس قابلِ اعتراض ترجمہ کے مذکورہ انداز میں نہ صرف اِس ایک لفظ ''هُم'' سے بے اعتنائی کی گئی ہے بلکہ اِس کے ساتھ لفظ ''هُم'' کے مرجع کو اور تخصیص و تاکید والے مفاد کو بھی نظر انداز کیا گیا ہے گویا بظاہر ایک غلطی دِکھائی دینے والے اِس انداز میں تین

غلطیاں ہیں، جس کی اصل وجہ ترجمہ کی مذکورہ شرط کو پامال کرنا ہے۔ ایسے میں شرائط کی اہمیت سے کیسے انکار ہوسکتا ہے۔

دوسری مثال:۔ سورۃ البقرہ، آیت نمبر 95 ''وَ لَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ'' کا ترجمہ ثناء اللہ امرتسری نے اِس انداز سے کیا ہے ''اور اپنے کیے ہوئے کی وجہ ہرگز موت کی خواہش نہ کریں گے'' جس میں ضمیر منصوب متصل جو آیت کریمہ کے حصہ ''وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ'' میں ہے کا ترجمہ اِسم ظاہر ''موت'' میں کیا گیا ہے جو اُس کی بلاغت سے خلاف ہے کیوں کہ اِس سے متصلاً قبل موت کا ذکر آچکا ہے جس کے بعد ایجاز واختصار اور لسانی حلاوت کا مقتضا یہی ہے کہ اعادہ کرنے کے بجائے اُس کی طرف ضمیر راجع کیا جائے آیت کریمہ میں بھی ایسا ہی ہے لیکن افسوس کہ ترجمہ میں یہ سب کچھ نظر انداز ہوا جو باعثِ افسوس ضرور ہے لیکن باعثِ تعجب نہیں ہے کیوں کہ جو عمل بھی اُس کی واجبی شرائط کے بغیر کیا جائے اُس کا حشر ایسا ہی ہوتا ہے جبکہ متن کی لسانی حیثیت کے حوالہ سے پیشِ نظر شرط کے مطابق ترجمہ ''اور ہرگز اُس کی آرزو نہ کریں گے اُن بدعملیوں کے سبب جو آگے کر چکے، اور وہ ہرگز اُس کی تمنا نہ کریں گے اپنے ہاتھوں آگے کیے ہوئے بُرے اعمال کے سبب'' جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو نہ صرف اِس ایک شرط پر بلکہ جملہ شرائط پر منطبق ہے۔

عام ترجمہ کی شرائط کے سلسلہ میں متن کی لسانی حیثیت کی ایک شِق یہ بھی ہے کہ متن کے اِسم موصول اور اِسم موصوف کے مابین تمیز کرکے ترجمہ والی زبان سے اُس کے مطابق الفاظ استعمال کیے جائیں ورنہ متن کے اسم موصول کا ترجمہ موصوف میں کرنے یا اِس سے برعکس کرنے سے ترجمہ بے مقصد ہوسکتا ہے۔ جس سے خلاف ہونے والے تراجم کی **پہلی مثال** فتاویٰ رضویہ میں قنوت نازلہ پڑھنے والے امام کے پیچھے مقتدی کے پڑھنے یا نہ پڑھنے سے متعلق شامی سے منقولہ عبارت ''الذی یظهرلی ان المقتدی یتابع امامه'' کا ترجمہ کیا گیا ہے ''میرے نزدیک ظاہری بات یہ ہے کہ مقتدی بھی امام کی پیروی میں پڑھے'' (۱)۔ جس میں اُس کی لسانی حیثیت من حیث الصلہ

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج:7، ص:537، مطبوعہ رضافائونڈیشن لاہور۔

والموصول سے خلاف کیا گیا ہے کیوں کہ لسانی قواعد کے مطابق لفظ ''الــــــذی '' اِسم موصول اور ''یظھرلی '' کا جملہ فعلیہ اُس کے لیے صلہ ہے اور صلہ وموصول کا یہ مجموعہ یا دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اِسم موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتداء ہے جبکہ اُس کے بعد والی عبارت لسانی قواعد کے مطابق اِس کے لیے خبر ہے جبکہ ترجمہ میں اِسے صلہ وموصول کے بجائے صفت وموصوف ظاہر کیا گیا ہے جیسا اس کے مذکورہ الفاظ ''میرے نزدیک ظاہری بات یہ ہے'' سے صاف ظاہر ہے حالاں کہ یہاں پر ترجمہ والی زبان کی طرف سے قطعاً کوئی رکاوٹ اور مجبوری نہیں ہے بلکہ شرط کے مطابق درست ترجمہ ''وہ جو مجھ پر ظاہر ہو رہا ہے یہ کہ بے شک مقتدی اپنے امام کی متابعت کرے گا، وہ جو مجھے ظاہر ہو رہا ہے یہ ہے کہ بے شک مقتدی اپنے امام کی متابعت کرے گا'' جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو نہ صرف مذکورہ شرط پر بلکہ دونوں زبانوں کے محاوروں پر بھی منطبق ہے۔

دوسری مثال:۔ فتاویٰ رضویہ میں مرقاۃ شرح مشکوٰۃ سے ''**یسن القنوت فی اخیرۃ سائر المکتوبات للنازلۃ التی تنزل بالمسلمین عامۃ کوبآء قحط وطاعون او خاصۃ ببعضھم کاسر العالم اوالشجاع ممن تعدی نفعہ** '' کا ترجمہ اِس طرح کیا گیا ہے اِس وقت تمام فرائض کی آخری رکعت میں قُنوت نازلہ پڑھنا سنت ہے جو عام مصیبت مسلمانوں پر مثلاً کسی عالم یا بہادر جس کے نفع کثیر ہو کا مقید ہو جانا''(۱)

اِس ترجمہ میں متن کے اِسم موصول ''التی '' کا ترجمہ صفت وموصوف اور ظرف کے مابین مبہم کر دیا گیا ہے ممکن ہے کہ ترجمہ کے نام سے یہ لکھتے وقت مترجم نے لفظ ''جب'' کو اُس کا ترجمہ قرار دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ لفظ ''عام مصیبت مسلمانوں پر نازل ہو'' کو اُس کا منطوق تصور کیا ہو بہر حال متن کے اِسم موصول ''التی'' کا ترجمہ اِسے نہیں کہا جا سکتا ہے کیوں کہ ترجمہ والے لفظ کے لیے ضروری ہے کہ اصل کے قائم مقام ہو یعنی اُس کی لُغوی، محاورتی اور لسانی حیثیت کے قائم مقام ہو سکے جو اِس ترجمہ میں مفقود ہے تو پھر اسے اصل کے مطابق کہنے کا کیا جواز ہے جبکہ شرط کے مطابق

---

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج:7، ص:494، مطبوعہ رضا فائونڈیشن لاہور۔

درست ترجمہ (قنوت نازلہ پڑھنا سنت ہوگا تمام فرائض کی آخری رکعت میں اُس عام حادثہ کے لیے جو مسلمانوں پر نازل ہوتا ہے جیسا قحط اور طاعون کی وباء یا اُن میں بعض کے ساتھ خاص ہو جیسا عالم یا بہادر کمانڈر جیسے کسی ایسے شخص کا گرفتار ہونا جس کا نفع عام ہوتا ہے۔قنوت پڑھنا سنت ہوگا تمام فرائض کی آخری رکعت میں اُس عام اُفتاد کی وجہ سے جو مسلمانوں پر نازل ہوتی ہے جیسا قحط اور طاعون کی وباء یا بعض مسلمانوں کے ساتھ خاص ہو جیسا عالم اور بہادر جیسے کسی ایسے شخص کا گرفتار ہونا جس کا فائدہ متعدی ہوتا ہے) جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا ہے جو کسی بھی اعتبار سے متن کے مطابق اور شرائط پر منطبق ہے۔ایسے میں پیشِ نظر شرط کی اہمیت سے انکار کی کس کو مجال ہے۔

ترجمۃ القرآن میں پیشِ نظر شرط سے خلاف کی **پہلی مثال** سورۃ البقرہ، آیت نمبر 29

''هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا'' کا ترجمہ تھانوی نے کیا ہے''وہ ذاتِ پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدے کے لیے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب'' جس میں متن کے اِسم موصول ''اَلَّذِیْ'' کا ترجمہ اِسم موصوف میں کیا ہے کیوں کہ اُردو محاورہ میں لفظ ''ایسا، ایسے'' دو حال سے خالی نہیں ہوتے، تشبیہ کے لیے استعمال ہوتے ہیں یا صفت کے لیے جبکہ تشبیہ کا تصور یہاں پر نہیں ہے تو پھر توصیف والا مفہوم ہی متعین ہو جاتا ہے جسے قبول کرنے کے لیے متن تیار نہیں ہے کیوں کہ لفظ ''اَلَّـــذِیْ'' کے بعد مذکور ہونے والا جملہ ہمیشہ اُس کے لیے صلہ ہوتا ہے جس میں صفت کا تصور ہی نہیں ہے تو پھر آنکھیں بند کرکے اِس کا ترجمہ ''توصیف'' میں کرنے کا کیا جواز ہے جسے قبول کرنے کے لیے نحاۃ تیار ہیں نہ بُلغاء اور عبدالرحمٰن جامی اِسے سننا گوارا کرتا ہے نہ سعدالدین تفتازانی اور سیبویہ اِسے دیکھنا پسند کرتا ہے نہ عبدالقاہر جرجانی ایسے میں ترجمہ کے اِس انداز کو آیت کریمہ کی معنوی تحریف کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔جس کی اصل وجہ مذکورہ شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ شرط کے مطابق ترجمہ ''وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنایا جو کچھ زمین میں ہے،وہی ہے جس نے تمہارے لیے پیدا کیا وہ تمام چیزیں جو زمین میں ہیں''

جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو نہ صرف اِس ایک شرط پر منطبق ہے بلکہ ترجمہ کی جملہ شرائط سے لے کر ترجمۃ القرآن کی مخصوص شرائط تک سب پر منطبق اور معیاری ہے لیکن ایسی توفیق صرف اُنہیں نصیب ہوسکتی ہے جو شرائط کی اہمیت کا احساس رکھتے ہیں۔(وَاللّٰهُ الهَادِی اِلٰی سَبِیلِ الرَّشَادِ)

دوسری مثال:۔ سورۃ البقرہ، آیت نمبر 275 ''اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ '' کا ترجمہ سید ریاض حسین شاہ نے کیا ہے''ایسے لوگ جو سود کھائیں وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر اُس شخص کے کھڑے ہونے کی طرح جسے شیطان کی چھوت نے باؤلا بنادیا ہو''اِس میں مذکور شرط سے خلاف ہونے کے علاوہ اور بھی کئی وجوہ سے متن سے خلاف کیا گیا ہے لیکن ہم یہاں پر صرف پیشِ نظر شرط سے خلاف ہونے کا ماتم کررہے ہیں۔

ترجمہ کو بامقصد بنانے کے لیے مذکورہ شرط یعنی متن کی لسانی حیثیت کی ممکنہ جہات پر بصیرت حاصل ہونے کی **ایک شق** یہ بھی ہے کہ مِن حیث اللسان اُس کی ہیئت کذائیہ کو پیشِ نظر رکھ کر ترجمہ کے الفاظ و انداز کو اُس پر منطبق کیا جائے ورنہ ترجمہ غلط اور بے مقصد ہوسکتا ہے۔

اِس سے خلاف ہونے والے تراجم کی **پہلی مثال** فتاویٰ رضویہ کی عربی عبارت''اَفَیُظَنُّ بِهٖ اَنَّهٗ لَمْ یُدْرِكْ مَا اَدْرَكُوْا فَاعْتَمَدَ شَیْئًا اسقطوہ لِضُعْفِهٖ فَیَالِلْاِنْصَافِ اَیُّ الظنین اَبْعَدُ '' کا ترجمہ کیا گیا ہے''کیا ہم اُن کے بارے میں یہ گمان کرلیں کہ جو ان مشائخ نے معلوم کیا کہ وہ امام کو معلوم نہ ہوسکا اور جس پر امام نے اعتماد کیا اُس کو اُنہوں نے ساقط کردیا کیوں کہ وہ ضعیف تھا تو خدارا انصاف کیجئے کہ یہ کیسا گمان ہے''(فتاویٰ رضویہ، ج:1، ص:121، رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔ جو کئی وجوہ سے متن کی ہیئت ترکیبی سے خلاف ہے جس کا پسِ منظر اُس کی لسانی حیثیت کی ہیئت کذائیہ والے پہلو سے غفلت ہے ورنہ اُس کی ترکیبی حیثیت کو پیشِ نظر رکھنے والوں سے ایسی غلطی کبھی نہیں ہوسکتی وہ اِس طرح ہے کہ متن کے اولین حصہ''افیظن بہ''میں فعل ظن معلوم نہیں بلکہ مجہول ہے جو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے مفعول اول جو فاعل کا قائم مقام ہورہا ہے معین و مشخص نہیں

ہے بلکہ کوئی بھی واقفِ حال اور سیاقِ کلام میں مذکور دو گمانوں سے آگاہ ہر شخص ہوسکتا ہے جبکہ اُس کے بعد "انه لم یدرك مادركو فاعتمدشیئا اسقطوه لضعفه "لسانی قواعد کے مطابق مصدر منسلخ اور محلاً منصوب ہونے کے بعد اُس کے لیے دوسرا مفعول بہ ہے۔ اِسی طرح متن کے آخری حصہ "فَیَالِلْاِنْصَافِ اَی الظنین ابعد "میں حرف "ف" عطف الجملہ علی الجملہ کے لیے ہے اور لفظ "انصاف" مستفات لہ ہے اور "ای الظنین "میں لفظ "ظنین" سے مراد مذکور الصدر دو گمان ہیں:

اول:۔ مشائخ کے بارے میں یہ گمان کہ اُنہوں نے امام ابوحنیفہ کی دلیل کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اُن کے قول سے عدول کیا ہے۔

دوم:۔ امام ابوحنیفہ کے بارے میں یہ گمان کہ وہ اُس حقیقت کا اِدراک نہ کر سکے جس کا اِدراک اُنہوں نے کیا تو اُس نے اِسی چیز پر اعتماد کیا ہے جس کو اُس کے ضعف کی وجہ سے اِن حضرات نے ساقط کر دیا اور لفظ "ابعد" تفصیل پر نہیں بلکہ بغیر تفصیل کے استعمال ہونے کی مشہور مثال "عدۃ المتوفاعنھازوجھاابعدالاجلین "کے قبیل سے ہے اور اِس سے مراد انصاف سے بعید ہونا ہے۔

متن کی ترکیبی ہیئت کذائیہ کے حوالہ سے اِن حقائق کی روشنی میں اُس کا حقیقی ترجمہ (پھر اُن کے بارے میں کیا یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ جس حقیقت کو اُنہوں نے پایا ہے وہ اُسے نہ پا سکے تو ایسی چیز پر اعتماد کیا جسے اُس کے ضعف کی وجہ سے انہوں نے ساقط کر دیا تو اے علماء متوجہ ہو جاؤ انصاف کے لیے کہ اِن دو گمانوں میں سے کون انصاف سے بعید ہے، تو کیا اُن کی بابت یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ جس حقیقت کا اِدراک انہوں نے کیا ہے وہ اُسے نہ پا سکے تو ایسی چیز پر اعتماد کیا جسے انہوں نے اُس کے ضعف کی وجہ سے ساقط کر دیا تو اے اہل علم سوچو کہ اِن گمانوں میں سے کون سا بعید ہے) جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو متن کی ہیئت کذائیہ کے مطابق ہونے کے ساتھ

دوسری تمام شرائط پر بھی منطبق اور بے غُبار ہے۔

دوسری مثال:۔ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی کتاب الاسفار کی عبارت؛

وَقَالُوا العِذَارُ جَنَاح الهَوٰی   اِذَامَااستَوٰی طارعَن و کرہِ

هٰـذَاالْبَيـت اَنْشـدَنيهِ قَائِلُه وَهُوَالْكَاتِب الْاَدِيْب اَبُوعمروبن مهيب باشبيليه،عمله فـي حـمـوبـن ابـراهيـم بـن ابـى بكرالميرغي،وَكَانَ اَجْمَل اَهْل زَمَانه،رآه عندنا زائـرًاوقـد خـط عِـذَارُهُ،فـقـلـت له:ياابـاعمر!اماترى الى هذالحسن الوجه؟فعمل الابيات في ذٰلك وهي:!

وَقَالُوا العِذَارُ جَنَاح الهَوٰی   اِذَامَـااستَوٰی طارعَن و کرہِ
وَلَيْـسَ كَـذٰلِكَ فَـخبّـرُهُم   فَيَـامَـابِـعِـذرِی اَوْعـذرہِ
اِذَاكـمُلَ الْحُسْن فِي وجُنةِ   فَـخَـاتـمـه ويك مِن شَعْرہِ

کا ترجمہ کیا گیا ہے:

اُنہوں نے کہا؛ داڑھی کے بال محبت کے پر ہیں۔
جب یہ بڑھتے ہیں تو (محبت) اپنے گھر چھوڑ جاتی ہے۔

یہ مجھے اس کے کہنے والے نے خود سنایا، آپ ابوعمر بن مہیب اشبیلیہ والے لکھاری اور ادیب ہیں۔ آپ نے یہ شعر حمو بن ابراہیم بن ابی بکر الذنجی کے بارے میں لکھا جو کہ اپنے زمانے کے خوب صورت ترین نوجوانوں میں سے تھے۔ آپ کو ہمارے ہاں ایک زائر نے دیکھا جبکہ آپ کے چہرے پر چند بال نمودار ہو چکے تھے، میں نے ان سے کہا؛ ''ابوعمرو! کیا آپ اِس حسین چہرے کی طرف نہیں دیکھتے؟ آپ نے اِسی وقت یہ اشعار کہہ ڈالے۔

داڑھی کے بال محبت کے پر ہیں،
جب یہ بڑھتے ہیں تو (محبت) اپنے گھر چھوڑ جاتی ہے۔
ان سے کہہ دو ایسی بات نہیں،

چاہے میرے یا اس کے رُخساروں پر نکلیں۔

جب رُخساروں میں حُسن مکمل ہو جائے،

تو اس کا انجام اس کے بالوں سے تجھے للکارتا ہے۔(۱)

جو متعدد وجوہ سے غلط ہے جس کی واحد وجہ متن کی ترکیبی اور لُغوی ہیئت کذائیہ سے بے توجہی ہے ورنہ اُس کے اِس پہلو کو پیشِ نظر رکھنے والے ایسی غلطی نہیں کر سکتے ہیں۔ جس کی تفصیل اِس طرح ہے کہ متن کے لفظ ''ر آہ عندنا زائرًا'' ضمیر فاعل ابو عمرو ابن مہیب کی طرف راجع ہے یعنی دیکھنے والا وہ ہے جبکہ ضمیر منصوب متصل ''ہ'' سے مراد حمو ابن ابراہیم ہے اور لفظ ''زائـــرًا'' حال ہے۔ اول سے یا دوسرے سے ضمیر اول سے حال ہونے کی صورت میں زائر کا مظہر یعنی زیارت کرنے والا ابو عمرو ابن مہیب ہوگا اور دوسرے ضمیر سے حال ہونے کی صورت میں اِس کا مظہر حمو ابن ابراہیم ہوگا کہ زیارت کرنے والا وہ تھا اور متن کے حصہ ''الی ھذا الحسن الوجھہ'' میں لسانی قواعد کے مطابق لفظ ''الحســن الوجھہ'' صفتِ مشبّہ ہونے کی بنا پر صفت ہے اپنے موصوف کے لیے جس سے اصل مقصد اُس کی ذات نہیں بلکہ یہی صفت ہے اور متن میں مذکور لفظ ''عـــــذار'' عربی لُغت کے مطابق دو چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے؛

❶ انسانی چہرے کا وہ حصہ جو کان کے ساتھ متصل بالوں سے خالی جگہ اور رُخسار کے مابین واقع ہے جس کا اوپر والا حصہ سر کے بالوں کے ساتھ لگتا ہے اور نچلا حصہ جبڑے کے ساتھ لگتا ہے۔

❷ اِس حصے پر اُگنے والے بالوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ اول میں حقیقت اور دوسرے میں مجاز مرسل کے انداز پر ہے جسے تسمیۃ الحال باسم المحل کہا جا سکتا ہے۔

یہاں پر متن کے پیشِ نظر اشعار میں یہ لفظ اپنے دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے کیوں کہ اولین مصرع ''العذار جناح الھوی'' میں یہ پہلے معنی پر نہیں بلکہ دوسرے معنی محمول ہے

(۱) کتاب الاسفار عن نتائج الاسفار، ص: 156,157، ابن العربی فاؤنڈیشن۔

اوراس کے بعد دونوں جگہوں میں یعنی ''بعذری او عذرہ'' میں پہلے والے معنی پر محمول ہے۔

متن کی لسانی حیثیت کی ہیئت ترکیبی کے حوالہ سے اِن حقائق کی روشنی میں اُس کا معیاری ترجمہ (کہنے والوں نے کہا کہ عِذار محبت کے پر ہیں جب وہ بڑھتے ہیں یہ اپنے گھونسلے سے اُڑ جاتی ہے یہ بیت اُس کے قائل نے بمقام اشبیلیہ میں مجھے سنائی وہ لکھاری ادیب ابوعمرابن مہیب ہیں اُس نے یہ بنائے حموابن ابراہیم ابن ابی بکرالمیر عی کے بارے میں یہ کہے اور وہ اپنے وقت کے حسینوں سے زیادہ حسین تھا اُسے ہمارے ہاں زیارت کرتے ہوئے دیکھا جبکہ اُس کے عِذار کے خط آئے تھے تو میں نے اُسے کہا اے ابوعمرو! کیا تو اِس حسین چہرے والے کی طرف نہیں دیکھ رہے تو اُس نے اُس کے متعلق جوابیات کہے یہ ہیں'' کہنے والوں نے کہا کہ عِذار محبت کے پر ہیں جب وہ بڑھتے ہیں یہ اپنے گھونسلے سے اُڑ جاتی ہے حالاں کہ بات ایسی نہیں ہے تو اُنہیں بتا دے کہ وہ قائم رہتی ہے میرے عِذار یا اُس کے عِذار کے ساتھ جب رُخسار پر حسن کامل ہو جائے تو اُس کا خاتمہ اُس کے بالوں سے ہے تیری خرابی''، لوگوں نے کہا کہ عِذار محبت کے پر ہیں جب وہ غالب ہوتے ہیں یہ اپنے گھونسلے سے اُڑ جاتی ہے یہ بیت اشبیلیہ میں اُس کے قائل نے مجھے سنائی اور وہ لکھاری ادیب ابوعمرابن مہیب ہیں اُس نے یہ بنائی حموابن ابراہیم ابن ابی بکرالمیر غی کی بابت اور وہ اپنے ہم عصروں سے زیادہ جمیل تھا اُنہوں نے اُسے ہمارے پاس زیارت کرتے دیکھا درانحالیکہ اُس کے خط عِذار نمایاں تھے میں نے اُسے کہا اے ابوعمرو کیا تو اِس حسین چہرے والے کی طرف نہیں دیکھتا تو اُس نے اُسی وقت بیت بنائے اور وہ یہ ہیں'' جبکہ بات ایسی نہیں ہے تو اُنہیں بتا کہ وہ قائم رہتی ہے چاہے میرے عِذار یا اُس کے عِذار کے ساتھ وہ جانے کی چیز نہیں ہے بلکہ کسی نا کسی عِذار میں قائم رہتی ہے تو تیری خرابی کہ اُس کا خاتمہ اُس کے بالوں سے ہے'') جیسے کسی بھی انداز میں ممکن ہے جس میں نہ کوئی اشکال ہے نہ کوئی قباحت بلکہ مذکورہ شرط پر برابر ہونے کے ساتھ عام ترجمہ کی دوسری تمام شرائط پر بھی منطبق ہو رہا ہے۔

حاشیتی اضافہ:۔ شرائط سے غفلت پر مبنی ترجمہ کا غلط ہونا بھی باعثِ تعجب نہیں ہے اور شرائط کے مطابق ترجمہ کا درست ہونا بھی مشکل نہیں ہے کیوں کہ نہ صرف فنِ ترجمہ بلکہ کسی بھی فن میں کارکردگی کا یہی حال ہے کہ جو شخص اُس کے اُصول وضوابط اور شرائط وتقاضوں سے آگاہ ہو اور اُس کی روشنی میں کام کرے اُس کے لیے پورا فن آسان ہوتا ہے، کارکردگی تسلی بخش ومعیاری ہوتی ہے اور ناظرین وسامعین اُس کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اِس کے برعکس وہ حضرات جو اُصول و شرائط اپنائے بغیر فن کاری دِکھانا چاہتے ہیں یعنی لہو لگا کر شہیدوں میں شمار ہونا چاہتے ہیں، پورا فن اُن کے لیے مشکل ہو جاتا ہے، اُن کی راست روی کے بجائے کجروی زیادہ ہوتی ہے اور تعمیر کی نسبت تخریب زیادہ ہوتی ہے اِس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر کام کو اُس کے اُصولوں کے مطابق کرنے سے متعلق ارشاد فرمایا؛

''وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا''(۱)

قرآنی معارف سے آگاہ حضرات سے مخفی نہیں ہے کہ ارشادِ الٰہی کا یہ انداز صرف گھروں میں اُن کے دروازوں کے رستوں سے آنے تک محدود نہیں ہے بلکہ دُنیا کے کسی بھی فن، کسی بھی ہنر اور کسی بھی جگہ داخلہ کے لیے اُس کے اُصولوں کے مطابق قدم اُٹھانے کی بھی رہنمائی کرتا ہے۔ ایسے میں اناڑیوں کے ہاتھوں فن کی بگاڑ دیکھ کر افسوس ضرور ہو گا لیکن تعجب نہیں ہے۔ اِسی طرح حقیقی فن کار کی حسنِ کارکردگی پر بھی تعجب نہیں ہے، ہم ترجمہ کی عمومی شرائط کے اِس باب میں ہر شرط سے خلاف ہونے والے تراجم کے ساتھ شرائط کے مطابق تراجم کی بھی دو دو مثالیں جو پیش کر رہے ہیں۔ اِس کا فلسفہ بھی یہی کچھ ہے کہ ترجمہ کے اُصول وشرائط سے آگاہ اور اُس کے تقاضوں سے واقف حضرات کے لیے کسی بھی متن کا معیاری ترجمہ کرنا آسان ہے نہ صرف ایک رنگ میں بلکہ متعدد انداز میں ترجمہ کا حق ادا کیا جا سکتا ہے جبکہ اُصول وشرائط سے عاری شخص بگاڑ کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔

---

(۱) البقرۃ:189۔

ترجمۃ القرآن میں پیشِ نظر شرط کی خلاف ورزی کی **پہلی مثال** سورۃ البقرہ، 275 ''اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ'' کا ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی نے کیا ہے ''سود خور لوگ نہ کھڑے ہوں گے مگر اُسی طرح جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان چھو کر خبطی بنا دے۔'' جو آیت کریمہ کی ہیئت ترکیبی کے مطابق ہرگز نہیں بلکہ اِس کا پہلا حصہ یعنی ''سود خور لوگ نہ کھڑے ہوں گے'' ''یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ'' جیسی ہیئت کذائیہ کا ترجمہ ہے جبکہ دوسرا حصہ دو تشبیہوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے کسی بھی عربی متن کا ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہے چہ جائیکہ آیت کریمہ کا ترجمہ ہو۔ اِس کی وجہ پیشِ نظر شرط سے بے توجہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ اُس کے مطابق ترجمہ ''وہ جو سود کھاتے ہیں کھڑے نہ ہوں گے مگر اُس کے کھڑے ہونے کی طرح جسے شیطان نے چھو کر بدحواس کیا ہو، وہ جو سود کھاتے ہیں نہیں اُٹھتے مگر اُس کے اُٹھنے کی طرح جسے شیطان چھو کر پاگل کر دیتا ہے'' جیسی کسی بھی شکل میں ہوسکتا ہے۔

دوسری مثال:۔ سورۃ البقرہ، آیت نمبر 199 کے آخری حصہ ''اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ'' کا تھانوی نے ترجمہ کیا ہے ''یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور مہربانی فرماویں گے'' جو آیت کریمہ کی لسانی ہیئت کذائیہ سے سراسر خلاف ہے۔

اولاً:۔ اِس میں حرفِ عطف ''اور'' لا کر ترجمہ کو معطوف و معطوف علیہ بنا دیا گیا ہے جبکہ آیت کریمہ کی ہیئت ترکیبی میں عطف نہیں ہے۔ گویا ترجمہ کو متن سے برعکس کیا گیا ہے اِس لیے عطف اور بغیر عطف الفاظ آپس میں ضدین ہوتے ہیں، مقاصد مختلف ہوتے ہیں، تلخیص المفتاح میں ہے: ''ومقام الفصل یباین مقام الوصل''(۱)

یعنی عطف کا مقام بغیر عطف کی ضد ہوتا ہے۔

ثانیاً:۔ یہاں پر متن کے دونوں لفظ یعنی ''غفور'' بھی اور ''رحیم'' بھی غیر کلام ہیں یعنی جملہ نہیں ہیں کیوں کہ یہ صفت مشبہ ہیں اور صفتِ مشبہ اپنے فاعل سے مل کر جملہ نہیں بلکہ شبہ جملہ ہوتا ہے

(۱) تلخیص المفتاح، ص:5۔

جبکہ ترجمہ مرکب تام اور جملہ کے انداز میں کیا گیا ہے جیسا اُس کے مذکورہ الفاظ ''معاف کردیں گے اور مہربانی فرماویں گے'' سے صاف ظاہر ہے جسے سننے کے لیے نحاۃ تیار ہیں نہ بُلغاء اور سیبویہ اِسے دیکھنا گوارا کرتا ہے نہ تفتازانی حالاں کہ شرط کے مطابق ترجمہ (یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے، بے شک اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے) جیسی کسی بھی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔ جس سے مانع کوئی لسانی مجبوری ہے نہ کوئی رُکاوٹ متن کے مطابق درست ترجمہ کے بجائے اُس کی لسانی حیثیت سے خلاف اِس کج روی کا پسِ منظر مذکورہ شرط سے بے اعتنائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے ورنہ اُس کی لسانی حیثیت کو پیشِ نظر رکھ کر ترجمہ کرنے والے سے ایسی غلطی کبھی نہیں ہو سکتی۔

یہاں پر بھی ترجمہ کی شرائط سے نا آشنا اور اناڑی حضرات یہی کہہ کر ٹال دیں گے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور بعض ایسے بھی ہوں گے جو ''غفور'' کے ترجمہ میں ''بخشنے والا اور معاف کر دیں گے'' کو ایک شے تصور کر کے ٹال دیں گے۔ جو متن کی لسانی حیثیت سے بے خبر ہونے کی دلیل ہے جبکہ حقیقت میں اِن کے مابین کلمہ وکلام کا فرق ہے اور لسانیات سے قدرے واقف ہر شخص سمجھتا ہے کہ کلمہ وکلام میں نکتۂ تفریق مرکب تام ہونا ہے کہ مرکب تام ہونے کی صورت میں کلام اور جملہ کہلاتا ہے ورنہ مفرد اور کلمہ کہلاتا ہے جس میں عربی وعجمی کی قطعاً کوئی تفریق نہیں ہے اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ کلمہ کی جگہ کلام استعمال کرنا جائز ہے نہ کلام کی جگہ کلمہ ورنہ گفتگو بے مقصد ہو سکتی ہے تو پھر ایک کا ترجمہ دوسرے میں کرنے کا کیا جواز ہے۔ یہ سب کچھ عام ترجمہ سے متعلق ہیں جو ترجمۃ القرآن کی نسبت آسان ہے جب بے اُصول و بے شرط مترجمین اِس میں ناکام ہیں تو پھر اُن سے قرآن شریف کا معیاری ترجمہ ہونے کی توقع ہی فضول ہے۔ ترجمہ کی عمومی شرائط کے سلسلہ میں متن کی لسانی حیثیت کے حوالہ سے جو کچھ ہم نے پیش کیا اِسے تفصیل اور احاطہ نہ سمجھا جائے بلکہ یہ اُس کی چند شقیں ہیں۔ جنہیں سمجھنے کے بعد باقی تمام شقوں کی اہمیت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے جن میں فاعل کے طور پر مذکور ہونے والے متن کا ترجمہ بھی فاعل کے انداز میں اور اضافت کے طور پر

مستعمل ہونے والے کا ترجمہ بھی اضافت کے انداز میں، جملہ اسمیہ متن کا ترجمہ اسمیہ کے انداز میں اور جملہ فعلیہ کا ترجمہ بھی فعلیہ کے انداز میں، متن جملہ فعلیہ کے جس انداز پر ہو ترجمہ بھی اُسی انداز میں اسی طرح فعل مضارع حال و مستقبل کے حوالہ سے جس انداز پر ہو ترجمہ بھی اُسی انداز میں اور متن کے ایک جملہ کا ترجمہ بھی صرف ایک جملہ میں کرنے جیسے کثیر الجہات گوشے شامل ہیں جن سے خلاف ہونے والا ترجمہ بے مقصد اور غلط ہوتا ہے۔

ایک ضروری وضاحت:۔ عام ترجمہ کی شرائط کے سلسلہ میں یہ جو کچھ ہم بیان کر رہے ہیں یہ سب کے سب صرف پہلی شرط یعنی متن کی لسانی حیثیت کو سمجھنے کے مختلف گوشے ہیں جن پر دوسری شرط یعنی ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیات اور اُس کی اقسام واصناف اور محاورہ متفرع ہوسکتا ہے کیوں کہ ترجمہ کو متن کے مطابق کرنا بغیر اِس کے ممکن نہیں ہے کہ دونوں زبانوں کی جملہ حیثیات کو اِسی ترتیب سے سمجھا جائے۔ اِس سے درج ذیل حقائق کا افادہ ہو رہا ہے:

1. ترجمہ کو اصل کے مطابق کرنے کے لیے دونوں زبانوں میں مہارت ضروری ہے۔
2. متن کی لسانی حیثیت کا احاطہ بنیادی شرط کے درجہ میں ہے جبکہ ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت کا احاطہ ثانوی درجہ میں ہے جبکہ عملی صورت میں معیت ہے یعنی ترجمہ کرتے وقت بالترتیب دونوں کی جملہ حیثیات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جس میں تقدم و تاخر زمانی کا تصور ممکن نہیں ہے۔
3. متن کی لسانی حیثیت متبوع اور ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت اُس کی تابع ہے۔
4. رُتبۃً تقدم و تاخر اور تابع و متبوع کے اِس فرق کے علاوہ دونوں کی شرط ہونے میں قطعا کوئی فرق نہیں ہے جس کے مطابق اجمال کے درجہ میں دونوں کو ملا کر کہا جاسکتا ہے کہ دونوں زبانوں میں مہارت اولین شرط ہے جبکہ تفصیل کے درجہ میں ہر ایک مستقل شرط ہے۔

یہی وجہ ہے کہ متن کی لسانی حیثیت کے کسی پہلو سے خلاف ہونے والا ترجمہ غیر معیاری اور بے مقصد ہونے کی طرح ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت کے کسی پہلو اور محاورہ سے خلاف

ہونے والا ترجمہ بھی معیاری نہیں کہلاتا جس کی عام ترجمہ میں **پہلی مثال** فتاویٰ رضویہ کی عربی عبارت"**کما بسطہ المولٰی عبدالغنی النابلسی قدس سرہ القدسی فی الحدیقۃ الندیہ وغیرہُ فِی غَیرِھَا** "کا ترجمہ کیا گیا ہے"جیسا کہ اِس پر تفصیلی بحث علامہ عبدالغنی نابلسی قدس سرہ القدسی نے حدیقہ ندیہ اور دیگر علماء نے اپنی کتب میں کی ہیں"(۱) جو ترجمہ والی زبان یعنی اُردو محاورہ سے خلاف ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ یہاں پر ترجمہ کو با محاورہ کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ موجود ہو نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق معیاری ترجمہ (جیسا کہ مولیٰ عبدالغنی النابلسی قدس سرہ القدسی نے الحدیقۃ الندیہ میں اور اُس کے غیروں نے اِس کے غیر میں تفصیل کی ہیں، جیسا مولیٰ عبدالغنی النابلسی قدس سرہ القدسی نے الحدیقہ الندیہ میں اور اُس کے غیر (دوسرے علماء نے) اِس کی غیر میں (اپنی کتابوں میں) اِس کی تفصیل کی ہیں) جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا ہے جو ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ متن کی لسانی حیثیت اور اُس کے محاورہ پر بھی منطبق ہے۔

دوسری مثال:۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی کتاب الحُجب کی عبارت"**فسبحان من لا یعلم الا بانہ لایعلم**"کا ترجمہ کیا گیا ہے"پاک ہے وہ جو صرف اِسی بات سے جانا جاسکتا ہے کہ وہ نہیں جانا جاسکتا"(۲) اُردو محاورہ سے قدرے شناسائی رکھنے والوں سے بھی اِس کا بے ڈھنگا پن پوشیدہ نہیں رہ سکتا جو ترجمہ والی زبان کی تنگیٔ دامن کی وجہ سے نہیں بلکہ اِس میں مترجم کی کمزوری یا غفلت کی وجہ سے ہے کیوں کہ اُردو محاورہ کے مطابق پیشِ نظر متن کا معیاری ترجمہ (تو پاکی ہے اُسے جسے نہیں جانا جاتا مگر اِتنا کہ اُسے نہیں جانا جاسکتا، تو پاکی ہے اُسے جسے اِس کے سوا نہیں جانا جا

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج:7، ص:465، رضافاؤنڈیشن لاھور۔

(۲) کتاب الحُجب، ص: 54، مترجم ابراراحمدشاھی تصحیح و نظرثانی سلطان عبدالعزیز المنصوب، مطبوعہ ابن عربی فاؤنڈیشن لاھور۔

سکتا کہ وہ نہیں جاتا) جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے جو ایجاز واختصار کے سوا باقی ہر حیثیت سے متن کے مطابق اور ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت کے حوالہ سے بھی بے غُبار ہے جبکہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے تنگیِ دامن کا یہاں پر صرف ایک عارضہ ہے جو ایجاز واختصار کے حوالہ سے ہے کہ اُردو محاورہ میں اُس کے ساتھ توافق ممکن نہیں ہے جسے متن کا لسانی اعجاز یا اُس کے متکلم یعنی حضرت شیخ اکبر کی سُخن دانی کا اعجاز کہا جاسکتا ہے۔ ایسے کسی بھی مُوجز ومختصر متن کے ترجمہ میں اطناب وتطویل کو ترجمہ والی زبان کی طرف سے مجبوری کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا جس میں مترجم پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

ترجمۃ القرآن میں پیشِ نظر شرط سے خلاف ہونے والے تراجم کی مشتے نمونہ ازخروارے

پہلی مثال سورۃ البقرہ، آیت نمبر 32 "قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ" کا ترجمہ اشرف علی تھانوی نے کیا ہے "فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں ہم کو کوئی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا بے شک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں کہ جس قدر جس کے لیے مصلحت جانا اُسی قدر فہم وعلم عطا فرمایا" جسے اُردو محاورہ کے مطابق ہرگز نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ اُردو محاورہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ آپ استعمال کیا جاتا ہے نہ جمع کے الفاظ اور نہ ہی شانِ الٰہی کی تعظیم وآداب کو انسانوں کی تعظیم وآداب پر قیاس کرنے کی کوئی مثال موجود ہے جبکہ اس ترجمہ میں اِن تینوں انوکھے استعمالات کو جمع کیا گیا ہے جو اِسے پڑھنے والوں سے پوشیدہ ہے نہ دیکھنے والوں سے اور کوئی بھی واقف حال شخص بدعت فی اللسان کے اِس غیر مانوس ترجمہ پر افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہاں ترجمہ کی شرائط واُصول سے ناآشنا حضرات کی دُنیا ہی جدا ہے کہ اُن کے سامنے ترجمہ کے نام سے جو تحریر بھی آجائے، یہ اُسے تسلیم کرتے ہیں چاہے متن کے محاورہ سے خلاف ہو یا ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے یا دونوں سے اور ترجمہ پڑھنے والوں کی غالب اکثریت بھی ایسے حضرات کی ہے اور غیر معیاری تراجم کے مروج ہونے کے ذمہ دار بھی یہی لوگ ہیں ورنہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ سے استفادہ کرنے والوں میں اگر 10%

بھی اہل تمیز ہوں جو صحیح وسقیم کی تفریق کر سکیں تب بھی کافی حد تک اصلاح احوال ہو سکتی ہے۔

دوسری مثال:۔ سورۃ آلِ عمران، آیت نمبر 29 "قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ" کا حافظ نذیر احمد دہلوی اور عاشق الٰہی میرٹھی نے بالترتیب ترجمہ کیا ہے (اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اُسے چھپاؤ یا اُسے ظاہر کرو وہ بہر حال اللہ کو تو فی الوقت معلوم ہو ہی جائے گا، اے محمد! کہہ دے کہ اگر تم چھپاؤ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اُسے ظاہر کرو بہر حال اللہ تو اُس کو جان ہی لے گا) جو اُردو محاورہ سے خلاف ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ سے متعلق یہ کہنا کہ "وہ فی الوقت اللہ تعالیٰ کو معلوم ہو ہی جائے گا، یا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ اُسے جان ہی لے گا) غیر مانوس ہے جس سے اُردو بولنے والوں کے کان آشنا ہیں نہ زبان بلکہ اُردو محاورہ کے مطابق آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ (کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے دل کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ کو سب معلوم ہے، کہہ دیجئے اگر تم اپنے جی کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ اُسے جانتا ہے) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو نہ صرف ترجمہ والی زبان کے مطابق ہے بلکہ متن کی لسانی حیثیت پر منطبق ہونے کے ساتھ جملہ اعتراضات سے بھی پاک وصاف ہے اور شانِ الٰہی سے متعلق اسلامی عقیدہ کا مظہر ہونے کے ساتھ علمِ الٰہی کی ازلیت وابدیت کا بھی اظہار ہے۔ ترجمۃ القرآن کے نام سے شانِ الٰہی میں غلط عقیدہ کا موجب بننے والے ایسے تراجم کی اصل وجہ مذکورہ شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو پھر شرائط کی اہمیت سے انکار کی کیا گنجائش ہے۔

عمومی شرائط کے مدارج:۔

عام ترجمہ یعنی کسی بھی کتاب کے معیاری ترجمہ کے لیے شرائط کے سلسلہ میں دونوں زبانوں میں مہارت کو اولیت حاصل ہے کیوں کہ متن کی لسانی حیثیت سے ناآشنا شخص سے یہ توقع کرنا فضول ہے کہ وہ ترجمہ کے الفاظ وانداز کو اُس کے مطابق کر سکے چاہے ترجمہ والی زبان کا بڑے سے بڑا ماہر کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت سے ناآشنا شخص سے بھی

یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ترجمہ کے الفاظ و انداز کو اُس کے مطابق کر سکے چاہے متن کی زبان کا ماہر ہی کیوں نہ ہو۔ اِس شرط کا ترجمہ کی باقی تمام شرائط سے مقدم اور سب سے اہم ہونے کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ یہ سب کی بنیاد ہے کہ اِس کے بغیر دوسری شرائط کا تصور ہی نہیں ہے۔ نیز اِس کے گوشے اور حیثیات بھی سب سے زیادہ ہیں اور ہر حیثیت اپنی جگہ مستقل شرط کی مانند ہے کہ کسی بھی مستقل شرط سے بے اعتنائی کی صورت میں ترجمہ غلط ہونے کی طرح کسی بھی لسانی حیثیت سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی بے مقصد ہوتا ہے جن کی کچھ مثالیں گزشتہ سطور میں ہم بیان کر آئے ہیں، ایسے میں ترجمہ کی کسی شرط سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ترجمہ کی عمومی شرائط کے سلسلہ میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ مترجم مَن پسند اور ذہنی ترجیح کو دخل نہ دے چاہے ترجیح کا یہ انداز مذہب کے حوالہ سے ہو یا تشریح و تعبیر کے حوالہ سے یا واقعہ کے اعتبار سے ورنہ کلام ترجمہ کی حد سے نکل کر تفہیم یا ترجمانی کی حدود میں شمار ہوگا۔ عام ترجمہ میں اِس کی **پہلی مثال** فتاویٰ رضویہ، جلد پنجم کے مترجم قاضی عبدالدائم مدظلہ العالیہ نے ''**رسالہ منیر العین فی حکم تقبیل الابھامین**'' کا ترجمہ کیا ہے ''انگوٹھے چومنے کے سبب آنکھوں کا روشن ہونا'' (۱) جو اُس کا ترجمہ کہلانے کے قابل ہرگز نہیں ہے جس کی واحد وجہ یہی ہے کہ ترجمہ کو شرائط کے مطابق رکھنے کے بجائے مترجم نے ''تقبیل ابہامین'' کے جواز اور اُس سے فائدے کو ذہنی ترجیح بنایا اور اُسی کی فہمائش کے تصور سے مغلوب ہو کر ترجمہ کے نام سے یہ لکھ دیا جسے اِس پسِ منظر کے حوالہ سے تفہیم کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن تفہیم کا درست ہونا ترجمہ کی درستی کو مستلزم نہیں ہے کیوں کہ اِن کی حقیقتیں مختلف ہیں کہ ترجمہ میں اصل کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ سے بدلا جاتا ہے جو اصل کے قائم مقام اور اُس کی جملہ حیثیات کے حامل ہو سکیں جبکہ تفہیم میں اصل کے مفہوم کی فہمائش کی جاتی ہے اور بس۔ ایسے میں ایک کی جگہ دوسرا استعمال کرنے یا ایک کے نام سے دوسرا پیش کرنے کو معقول کہا جاسکتا ہے نہ مناسب۔

---

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج:5، ص:429، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور۔

شرائط کی اہمیت اور مقامِ عبرت:۔

قاضی عبدالدائم جیسی علمی شخصیت اور ہمہ صفت موصوف ہستی کے ترجمہ کی اِس بے اعتدالی سے دُنیا کو یہ سبق مل رہا ہے کہ فنِ ترجمہ نہایت مشکل فن ہے، کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہے کہ صرف ایک شرط سے بے توجہی کے نتیجہ میں کلام ترجمہ کی حد سے نکل جاتا ہے اور قاضی عبدالدائم دائم جیسے عالم و فاضل جو سیرۃ النبی ﷺ کے سلسلہ میں تمغہ یافتہ ادیب و مصنف ہیں۔ جنہوں نے "سیدالوریٰ" نام کے عظیم شاہکار سے علم و فضل کی شہرت پائی ہے جو ہر اعتبار سے قابلِ تحسین ہے۔ ایسے مسلم سُخن دان سے بھی لغزش ہوسکتی ہے تو پھر علم و عرفان سے نا آشنا حضرات کے لیے کتنا مشکل ہوگا اِس میں اُن حضرات کے لیے عبرت ہے جو "لہو لگا کر شہیدوں" میں شمار ہونے والوں کی طرح ترجمہ کی شرائط و اُصول سے نا آشنا ہوتے ہوئے بھی یہ شوق پورا کرنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ دیکھنے کو مل رہا ہے کہ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے اُردو زبان میں کیے گئے اکثر تراجم غلط ہیں جس وجہ سے التباس الحق بالباطل ہو رہا ہے اور علوم و فنون کے ضروری مسائل متنازعہ بن رہے ہیں یا نا قابلِ فہم معمہ خاص کر ترجمۃ القرآن کے نام سے کلام اللہ پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں، انجانے میں معنوی تحریفات کی مثالیں قائم کی جارہی ہیں اور شرمناک حد تک غلطیوں کا ارتکاب کیا جارہا ہے، جن کے دل خراش مواقع کی تفصیل ہم نے اپنی دوسری کتاب "**تفسیر مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن**" کی تینوں جلدوں میں کی ہے۔ فتاویٰ رضویہ کی جلد پنجم کے فاضل مترجم سے اگر یہ بے اعتدالی نہ ہوئی ہوتی تو باقی تمام عربی عبارات کا جو ترجمہ اُنہوں نے کیا ہے اُسے معیاری اور فتاویٰ رضویہ کے شایانِ شان کہا جاسکتا ہے۔

بے اعتدالی کی یہ مثال صرف اِس ایک مقام پر نہیں بلکہ اِس کی **دوسری مثال** رسالہ ایذان الاجر فی اذان القبر کے ترجمہ میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جو اِس طرح کیا گیا ہے "دفن کے بعد قبر پر اذان کہنے کے جواز پر مبارک فتویٰ"(۱) اُس کے مطابق نہ ہونا اِس کا پہلے کی طرح ہی ظاہر ہے کہ

(۱) فتاویٰ رضویہ، ج:5، ص:653، مطبوعہ رضافاؤنڈیشن لاہور۔

ترجمہ کی حد سے ہی خارج ہے اِس کی بھی وہی وجہ ہے کہ اِسے ترجمہ کی شرائط وحدود میں رکھنے کے بجائے بعد الدفن اذان علی القبر کے جواز کو ذہنی ترجیح بنایا گیا ہے اور اسی کی تفہیم کی گئی ہے حالاں کہ اِن دونوں مقامات یعنی دونوں رسائل کے ناموں کا معیاری ترجمہ بالترتیب اِس طرح کیا جاسکتا ہے (تقبیل ابہامین کے حکم میں آنکھ روشن کرنے والی تحریر، تقبیل ابہامین کی شرعی حیثیت میں آنکھ روشن کرنے والا فتویٰ، اذان قبر میں اجر سے آگاہی، اذانِ قبر میں اعلام اجر) جیسے کسی بھی انداز میں ممکن ہے جبکہ فتاویٰ رضویہ، جلد پنجم کے مترجم جیسے صاحبِ علم وعرفان اِس سے بھی بہتر انداز میں کر سکتے تھے۔ کاش مذکورہ شرط سے بے توجہی نہ کرتے تو اُن کی صلاحیتوں کی روشنی میں یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ وہ سب کچھ درست کرتے۔

ترجمۃ القرآن میں مذکورہ شرط سے خلاف ہونے والے تراجم کی **پہلی مثال** سورۃ البقرہ، آیت نمبر 69 ''قَالَ اِنَّه یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ '' کا اشرف علی تھانوی نے ترجمہ کیا ہے ''آپ نے فرمایا کہ حقِ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو'' عربی زبان سے قدرے مناسبت رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ ''بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ '' کا معنیٰ ''زرد رنگ کی گائے'' کے سوا اور کچھ نہیں ہے چہ جائیکہ اُس کا ترجمہ ''زرد رنگ کے بیل'' میں کرنا جائز ہو کیوں کہ لفظ ''صَفْرَآءُ'' پر آیا ہوا الف نفس کلمہ سے زائد ہے جو علامت تانیث ہے اور یہ جہاں پر بھی آتا ہے اُس کا مونث ہونا لازم ہوتا ہے یہ اتنا واضح مسئلہ ہے کہ عربی زبان اور علم نحو سے ذرہ برابر واقفیت رکھنے والے مبتدیوں سے بھی پوشیدہ نہیں ہے تو پھر اس کا ترجمہ ''بیل'' میں کرنے کی مثال ایسی ہی غلط ومضحکہ خیز ہے۔ جیسا ''کلب صَفْرَآءُ'' کا ترجمہ ''زرد رنگ کے کتے'' میں کیا جائے یا ''بکری'' کا ترجمہ ''بکرا'' میں کیا جائے۔ اِس غلطی میں تھانوی کے ساتھ کچھ اور مترجمین بھی کھاتہ شریک ہیں جنھیں معاف نہیں کیا جاسکتا۔ مترجمین کی اِس بے اعتدالی کی واحد وجہ مذکورہ شرط سے خلاف ورزی کے سوا کچھ اور معلوم نہیں ہو رہی کہ ہندوستان کے کچھ گاؤں شالوں اور مندروں میں نصب بیل کے نقشوں

کو دیکھ کر مصر کے گاؤ پرستوں کو اُن پر قیاس کیا اور عقیدہ جمایا کہ بیل پرست مصریوں کے ماحول میں رہ کر بنی اسرائیل بھی بیل کی پرستش سے مانوس تھے اِس لیے قاتل معلوم کرنے کے لیے بھی اُنہیں بیل ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ پیشِ نظر آیت کریمہ کا ترجمہ کرتے وقت مترجمین کی ذہنی ترجیح کے اِس تصور نے سب کچھ بگاڑ دیا جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ ایسے میں مذکورہ شرط کی اہمیت سے کیسے انکار ہوسکتا ہے۔

ترجمۃ القرآن میں اِس کی خلاف ورزی کی **دوسری مثال** سورۃ آلِ عمران، 26 ''قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِكَ الْخَیْرُ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' کا تھانوی نے ترجمہ کیا ہے ''اے محمد ﷺ! آپ اللہ تعالیٰ سے یوں کہیئے کہ اے اللہ مالک تم ملک کے آپ مُلک جس کو چاہیں دے دیتے ہیں اور جس سے چاہیں ملک لے لیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں غالب کر دیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں پست کر دیتے ہیں آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی بلاشبہ آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں''۔ اِس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو لفظ آپ کے ساتھ خطاب کرنا اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کو لفظ آپ کے ساتھ خطاب کرنا اور اللہ تعالیٰ کی تعظیم کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کر کے اُس وحدہ لاشریک کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کرنا، یہ تینوں انداز ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہیں کیوں کہ اُردو محاورہ میں رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''آپ'' کہہ کر مخاطب کرنے کی کوئی مثال موجود ہے نہ کسی بھی انسان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کو آپ کہہ کر مخاطب کرنے کا کوئی محاورہ و استعمال پایا جاتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی تعظیم کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کر کے اُس وحدہ لاشریک کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کرنے کی کوئی مثال موجود ہے جب ترجمہ والی زبان کی پوری تاریخ میں اِس کا کوئی محاورہ و مثال نہیں ملتی اور متعارف اور مانوس نہیں ہے تو پھر اِس کی حیثیت بدعۃ فی الترجمہ ہونے کے ساتھ غیر مانوس فی المحاورہ سے خالی نہیں ہے، ایسے میں وہ کون سا واقفِ حال ہوسکتا ہے جو اِسے آیت کریمہ

کے مطابق اور اُس کا معیاری ترجمہ کہہ سکے۔ یہاں پر بھی اِس غلطی کی اصل وجہ ترجمہ کی مذکورہ شرط سے خلاف ورزی کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ مترجم نے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے مابین تخاطب کو انسانوں کے باہمی تخاطب پر قیاس کر کے مذکورہ انداز کو ذہنی ترجیح بنایا اور آیت کریمہ سے مرادِ الٰہی کو اُس پر متفرع کیا نتیجتاً ترجمہ کو اپنی مَن پسند کا تابع بنا کر بگاڑ دیا کیوں کہ درست ترجمہ کے لیے ضروری ہے کہ دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو ورنہ متن کے محاورہ سے خلاف ترجمہ غلط ہونے کی طرح ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی نا قابلِ قبول اور غیر معیاری ہوتا ہے۔

حقائق کی اِس روشنی میں مذکورہ شرط کی اہمیت سے انکار کی کیا مجال ہوسکتی ہے جس کے مطابق ترجمہ آیت کریمہ کا اِس طرح ہوسکتا ہے (یوں عرض کرا ے اللہ! ملک کے مالک تو جسے چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذِلت دے ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے بے شک تو سب کچھ کرسکتا ہے، یوں التجا کرا ے اللہ! مالک الملک تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے ملک لے اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے تیرے ہاتھ میں ہی خیر ہے بے شک تو ہر شے پر پوری قدرت رکھتا ہے'' جو شرائط کے مطابق ہونے کی بدولت جملہ اعتراضات سے بھی پاک وصاف ہے اور حشو وزوائد سے بھی محفوظ۔ (واللہ الھادی الی سبیل الرشاد)

عام ترجمہ کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ترجمہ کے الفاظ اور اُس کا حجم متن کے مطابق ہو ورنہ ایجاز واختصار والا متن کا ترجمہ اطناب اور تطویل میں کرنے سے نہ صرف یہ کہ اُس کا معنوی حسن متاثر ہوگا، بلاغت کے منافی اور بے ڈھنگا ہوگا بلکہ ترجمہ کی حد سے ہی نکل جائے گا کیوں کہ ترجمہ کے ہر لفظ کا متن کے کسی نہ کسی لفظ کا عِوض ہونا ضروری ہے جسے قائم رکھنے کے لیے ناگزیر ہے کہ اُن کے مطابق نپے تلے الفاظ استعمال کیے جائیں مگر یہ کہ ترجمہ والی زبان کے کچھ الفاظ یا انداز ایسا ہو جو تعداد میں کم ہونے کے باوجود متن کے جملہ الفاظ کے قائم مقام ہوسکے۔ لسانیات کی اِس وسیع

دُنیا میں ایسی زبانوں کی بھی کمی نہیں ہے جس میں عربی کو ضرب المثل کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اُردو زبان کے مندرجہ ذیل متن ''انسان پر لازم ہے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے'' کا ترجمہ عربی میں کیا جائے تو اس کے نصف سے بھی زیادہ نہیں ہوگا مثلاً ''علی الانسان اکرام ضیفه، علی الانسان ان یکرم ضیفه'' جو حجم میں اگر چہ اُس سے کم ہے تاہم ترجمہ کی حد سے نہیں نکلتا کیوں کہ اِس کی ساخت اور ہیئت اجتماعی ایسی ہے کہ متن کے تمام الفاظ کے قائم مقام ہو کر اُن سب کے مفاد پر دلالت کر رہی ہے۔ اِس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ عربی زبان کی ہر صنف اور ہر جملہ ایسا ہی ہوتا ہے، نہیں ایجاب کلی ہر گز نہیں بلکہ فی الجملہ کچھ زبانوں کی بعض صورتوں میں ایسا ہوتا ہے جس میں عربی کو شہرت حاصل ہے۔ جبکہ قرآن شریف کا معاملہ عام عربی سے اعلیٰ ہے جس کے مطابق اِس حوالہ سے اُسے ایجاب کلی کا درجہ حاصل ہے یعنی اُس کا ہر جملہ بے مثال ایجاز و اختصار کی شکل میں بے شمار وسعتوں کو شامل ہے، معنوی وسعتوں کا حامل ہوتے ہوئے ایجاز و اختصار کے اِس کمال کو اُس کے اعجاز میں بڑا دخل ہے اور اِسی وجہ سے اِس کا ترجمہ کرنا بھی پُلِ صراط عبور کرنے سے کم نہیں ہے جیسا وہ عبور کرنے کے لیے واجبی شرائط کے حاملین کے لیے آسان ہے ویسا یہ بھی آسان، اور جیسا وہ بے شرائط کے لیے معمہ ویسا یہ بھی معمہ ہے۔ الغرض قرآن شریف کے ایجاز و اختصار اور بعض زبانوں اور کلام کی کچھ صورتوں کے مخصوص احکام سے قطع نظر ترجمہ کے حجم کو متن کے حجم کے برابر رکھنا یعنی اُس سے طویل نہ ہونے دینا ترجمہ کے معیاری ہونے کے لیے شرط ہے مگر یہ کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے کوئی ناگزیر رکاوٹ ہو، تنگی دامن کا عارضہ ہو اور لسانی مجبوری ہو جو بہت کم ہوتا ہے ایسے مواقع کے لیے الگ اُصول ہیں جن کی کچھ تفصیل ہم بیان کر آئے ہیں اور کچھ آئندہ چل کر بیان کریں گے۔ اِس شرط سے خلاف ہونے والے تراجم کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں:

پہلی صورت:۔ متن کے مفرد لفظ کا ترجمہ جملہ میں کیا جائے جیسا سورۃ البقرہ، آیت نمبر 199 کے حصہ ''اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ '' کا اشرف علی تھانوی نے ترجمہ کیا ہے ''یقیناً اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے اور مہربانی فرمائیں گے'' جس میں لفظِ ''غفور'' اور ''رحیم'' کا ترجمہ جملہ فعلیہ میں

کرنے کی وجہ سے ترجمہ کا حجم متن سے دوچند ہوگیا ہے حالاں کہ متن کے یہ دونوں الفاظ صفتِ مشبہ ہیں جو اپنے فاعل سے مل کر بھی جملہ نہیں ہوتے بلکہ مفرد ہی رہتے ہیں جنہیں غیر جملہ اور غیر کلام بھی کہا جاتا ہے جس میں نحاۃ کی دو رائے ہیں نہ بُلغاء کی تو پھر اِن کا ترجمہ جملہ میں کرنے کو رجم بالغیب کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاتا جس کے متعدد قبائح ونقصانات میں سے ترجمہ کا طویل ہونا بھی ہے جو مذکورہ شرط سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ایسے میں مذکورہ شرط کی اہمیت سے انکار کی مجال کیسے ہوسکتی ہے جس کے مطابق بڑی آسانی کے ساتھ معیاری ترجمہ (بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ خوب بخشنے والا خوب مہربان ہے) جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا ہے۔اِس کے حجم میں بھی متن کی نسبت قدرے اضافہ پایا جاتا ہے جو ترجمہ والی زبان کی تنگیٔ دامن کی وجہ سے ہونے کی بنا پر معیوب نہیں ہے جبکہ صفتِ مشبہ کا ترجمہ جملہ میں کرنے کے لیے کسی قسم کی بھی مجبوری نہیں ہے بلکہ اُس کا پسِ منظر مذکورہ شرط سے غفلت یا متن کی لسانی حیثیت سے ناآشنائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔(یَالَلْعُلَمآءِ لِھٰذَا العکس)

دوسری صورت:۔ متن کے ایک جملہ کا ترجمہ ایک سے زیادہ جملوں میں کیا جائے جس کی مثال سورۃ البقرہ،102 ''یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ '' کا ترجمہ تھانوی نے کیا ہے''اور حالت یہ تھی کہ آدمیوں کو بھی اس سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے''ڈبل ترجمہ کے اِس بے ڈھنگے پن میں ترجمہ کا حجم متن سے کئی گنا زیادہ ہوا ہے جس کا پسِ منظر نہ صرف پیشِ نظر شرط سے بے اعتنائی بلکہ اِس کے ساتھ تفہیم وترجمہ میں عدمِ تفریق بھی ہے کہ ترجمہ کے نام سے یہ سب کچھ لکھتے وقت اِن میں تمیز نہیں کی گئی ہے۔

تیسری صورت:۔ ترجمہ میں غیر ضروری الفاظ شامل کیے جائیں جو ترجمہ کی حقیقت اور اس کی تعریف سے نابلد ہونے کی دلیل ہے۔اِس کی مثال سورۃ البقرہ،214 ''اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ '' کا اشرف علی تھانوی نے ترجمہ کیا ہے''دوسری بات سنو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں بے مشقت جا داخل ہوں گے''جس کی پوری ساخت اور ہیئت ترکیبی حشو وزوائد

ہے ترجمہ کے نام سے یہ لکھتے وقت اگر مترجم ترجمہ کی حقیقت اور اس کی تعریف کا احساس کرتا کہ وہ متن کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ سے بدلنا ہے جو اصل کے قائم مقام ہو سکے تو بے مصرف تطویل کی یہ مثال کبھی قائم نہ کرتا۔

ترجمہ کی عمومی شرائط کے زمرہ میں یہ بھی ہے کہ ترجمہ کو متن کی ترتیب کے مطابق رکھنا اگر ممکن ہو یعنی ترجمہ والی زبان کی ترتیب متن کی ترتیب کے مطابق ہونے کی ممکنہ صورتوں میں اُس سے خلاف نہ کرے ورنہ خلاف الاصل ہونے کے ساتھ بے مقصد ہونے کا بھی امکان ہے یہ عام ترجمہ میں ہے چاہے جس کتاب کا بھی ہو جبکہ قرآن شریف کے ترجمہ میں اِس کا نقصان اظہر یقینی ہے۔ اِس کی ایک مثال سورۃ البقرہ، آیت نمبر 55 ''وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً'' کے ترجمہ میں فتح محمد جالندھری اور نذیر احمد دہلوی نے بالترتیب لکھا ہے (اور جب تم نے موسیٰ سے کہا کہ موسیٰ جب تک ہم خدا کو سامنے نہ دیکھ لیں گے تم پر ایمان نہیں لائیں گے، اور وہ وقت یاد کرو جب تم نے یعنی تمہارے بڑوں نے موسیٰ سے کہا تھا اے موسیٰ جب تک ہم خدا کو ظاہر میں نہ دیکھ لیں ہم تو کسی طرح تمہارا یقین کرنے والے ہیں نہیں کہ خدا ہی تم سے کلام کر رہا ہے) ہم سمجھتے ہیں کہ ترجمہ کی شرائط اور اُصول سے غافل حضرات اِسے معمولی سمجھ کر ٹال دیں گے جبکہ حقیقت میں یہ دو غلطیوں پر مشتمل ہے؛

پہلی غلطی:۔ آیت کریمہ میں ''حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً'' آخری غایت کے طور پر مذکور ہوا ہے کہ ایمان نہ لانے کی مدت اُس پر منتہی ہوگی جبکہ آخری غایت ہر شے کی اُس سے موخر ہی ہوتی ہے گویا لفظ ''حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً'' کا آیت کریمہ کے اول حصہ ''لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ'' سے موخر ہونا عین مقتضائے فطرت ہے۔ ترجمہ کو اُس کی ترتیب سے خلاف کر کے مقتضائے فطرت سے خلاف کیا گیا ہے جو نا قابلِ معافی ہے۔

دوسری غلطی:۔ ترجمہ والی زبان کی طرف سے کسی مجبوری کے بغیر متن کی ترتیب سے خلاف کرنا غیر معقول اور نا مناسب ہے کیوں کہ جب ترجمہ والی زبان میں متن کی ترتیب کے مطابق ترجمہ

(اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا یقین نہ لائیں گے جب تک علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں ،اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز تم پر یقین نہیں کریں گے یہاں تک کہ خود آمنے سامنے خدا کو دیکھ لیں) جیسے کسی بھی انداز سے ہوسکتا ہے جو دونوں زبانوں کے محاورے کے مطابق ہونے کے ساتھ جملہ اعتراضات سے بھی پاک وصاف ہے۔ترجمہ والی زبان کی طرف سے کسی مجبوری کے بغیر اصل کی ترتیب سے خلاف کرنے کے اِس بے ڈھنگا پن کا جواز ہی کیا ہے۔

حقائق کی اِس روشنی میں مذکورہ شرط کی ضرورت سے کون انکار کرسکتا ہے اور اس کی اہمیت سے بے اعتنائی کی کیا مجال ہے ورنہ نتیجہ ایسا ہی ہوگا جو اِن تراجم کا ہوا ہے۔(وَاللّٰہُ الھَادِی اِلٰی سَبِیْلِ الرَّشَادِ)

ترجمہ کی شرائط کے زمرہ میں یہ بھی ہے کہ متن کے جس لفظ کے دو مفہوم ہوں اور دونوں کا احتمال یکساں جائز ہو یعنی کسی ایک سے بھی انکار کی گنجائش نہ ہو اور خارجی دلائل وشوائد سے کسی ایک کو واضح ترجیح بھی نہ ہو اور ترجمہ والی زبان میں ہر دو کے علیحدہ ترجمہ کے لیے الفاظ دستیاب ہوں لیکن دونوں کو یکساں شامل ہونے والا لفظ موجود نہیں ہے جو متن کا بدل ہوسکے،ایسی تمام صورتوں میں ایک مفہوم کو ترجمہ کے تسلسل میں رکھ کر دوسرے کو بریکٹ میں کیا جائے۔باقی رہا یہ تصور کہ کِس کو تسلسل میں رکھے اور کِس کو بریکٹ میں کیا جائے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر مترجم کو مکمل اختیار ہے کہ جیسا چاہے ویسا کرے اِس کی ایسی مثال ہے جیسا کہا جاتا ہے''جالس الحسن اوابن سیرین ''یعنی تجھے اختیار ہے چاہے حسن بصری کے ساتھ مجالست اختیار کرے یا ابن سیرین'' کے ساتھ یعنی اِن میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے پر واضح ترجیح نہیں ہے تو پھر ہر صورت درست ہے۔ایسا کرنا اِس لیے ضروری ہے ایسا نہ کرے گا تو تین صورتوں سے خالی نہیں ہوگا؛

1. بغیر ترجمہ کے چھوڑ دے گا۔
2. ترجمہ کے نام سے دونوں مفہوموں کا جدا جدا اظہار کرے گا۔
3. صرف ایک کا اظہار کرے گا۔

یہ تینوں صورتیں غلط ہیں کیوں کہ اِن سب میں ترجمہ کی حد سے ہی نکلتا ہے کیوں کہ:

پہلی صورت میں چھوڑے ہوئے لفظ کے عوض جب کوئی لفظ ہی نہیں لایا گیا تو پھر ترجمہ کا تصور ہی ختم ہو گیا کیوں کہ وہ اِس بات سے عبارت ہے کہ متن کے جملہ الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جائے جو اُن کے قائم مقام ہو سکے۔

دوسری صورت میں یہ ڈبل ترجمہ ہے یعنی متن کے ایک لفظ کے عوض ترجمہ والی زبان سے دو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو ترجمہ کی حقیقت سے خلاف ہے کہ اُس میں متن کے ایک لفظ کے مقابلہ میں ترجمہ والی زبان کا بھی ایک لفظ ہوتا ہے تو پھر ڈبل ترجمہ کے اس بے ڈھنگے پن کو اُس کے مطابق یا اُس کا ترجمہ کون کہہ سکتا ہے۔

تیسری صورت میں ترجیح بلا مرجح ہے جس سے حقیقی ترجمہ کا خالی ہونا ضروری ہے۔

حقائق کی اِس روشنی میں مذکورہ اُصول سے انحراف کی مجال کیسے ہو سکتی ہے۔ عام ترجمہ کی شرائط کے سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ متن کے کسی لفظ کے متعدد معانی ہوں اور تفسیر کے طور پر اسے اُن سب پر محمول کرنا درست ہو یعنی کسی ایک سے بھی انکار جائز نہ ہو اور کسی ایک کو بھی واضح ترجیح نہ ہو جبکہ ترجمہ والی زبان میں اُن سب کے جدا جدا ترجمہ کے لیے مستقل الفاظ پائے جاتے ہیں لیکن ایسا جامع لفظ دستیاب نہیں ہے جو اصل کی طرح سب کو یکساں شامل ہو سکے ایسی تمام صورتوں میں متن کے اُسی لفظ کو ترجمہ میں ذکر کرنا ضروری ہے کیوں کہ ایسا نہ کرے گا تو چار صورتوں سے خالی نہیں ہوگا:

1. اُسے ترک کرے گا۔
2. اُس کے ہر مدلول اور ہر احتمال کے لیے دستیاب الفاظ کو ذکر کرے گا کہ ہر معنی کے مطابق ترجمہ والی زبان سے الفاظ لائے گا۔
3. کسی ایک معنی کے مطابق ترجمہ کر کے باقی کو ترک کرے گا۔
4. ایک کا ترجمہ تسلسل میں رکھ کر باقی سب کو بریکٹ میں کرے گا۔ جبکہ یہ سب کے سب غلط

ہیں کیوں کہ:

پہلی دوصورتوں میں ترجمہ کی حد سے نکل جائے گا یعنی ترجمہ کہلانے کے قابل ہی نہیں رہے گا جو کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جو ترجمہ کی حقیقت سے آگاہ ہے۔

تیسری صورت میں ترجیح بلامرجح ہوگی جس سے ترجمہ کا خالی ہونا اور محفوظ ہونا ضروری ہے۔

چوتھی صورت غیر مہذب اور غیر معقول ہے کیوں کہ بریکٹ سسٹم مجبوری کی پیداوار ہونے کی وجہ سے زیادہ طویل عبارت اور متعدد چیزوں کا متحمل نہیں ہوسکتا اُس کا مصرف صرف ایک لفظ، ایک جملہ، ایک مضمون کی تفہیم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

ترجمہ کے اُصول وشرائط میں یہ بھی ہے کہ متن کا کوئی لفظ دو سے زیادہ یعنی متعدد معانی کا یکساں احتمال رکھتا ہو اور ترجمہ والی زبان میں ایسا لفظ پایا جاتا ہو جو ایک کے سوا باقی سب کو شامل ہو سکے ایسی تمام صورتوں میں اُسے متن کے ترجمہ کے طور پر تسلسل میں رکھے اور اُس ایک معنی کو کلمہ ''یا'' کے ساتھ بریکٹ میں کرے یہ اِس لیے ضروری ہے کہ اگر ایسا نہ کرے گا تو پھر چار صورتوں سے خالی نہیں ہوگا:

1. متن کو ترجمہ کے بغیر چھوڑ دے گا۔
2. ہر احتمال کے اظہار کے لیے دستیاب الفاظ کو ترجمہ کے طور پر ذکر کرے گا۔
3. کسی ایک احتمال کے اظہار کے لیے دستیاب لفظ کو ترجمہ کے طور پر ذکر کرے گا۔
4. ایک کو ترجمہ کے تسلسل میں رکھ کر باقی سب کو بریکٹ میں کرے گا۔

پہلی دوصورتوں میں ترجمہ کی حد سے نکل جائے گا جیسا اِس سے پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔

تیسری صورت میں ترجیح بلامرجح ہے۔

چوتھی صورت میں غیر معقول اور بریکٹ سسٹم سے خلاف ہے جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے۔

حقائق کی اِس روشنی میں مذکورہ صورت ناگزیر ہونے میں کس کو شک ہوسکتا ہے۔ ترجمۃ القرآن میں اِس کی مثال سورۃ البقرہ، آیت نمبر 49 ''وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ''

میں لفظ ''بــلآء'' ہے۔ جمہور مفسرین کے مطابق اس کے معنی میں متعدد احتمالات ہیں۔ مثال کے طور پر السید المحمود البغدادی الآلوسی الحنفی المتوفی 1280ھ نے اسی آیت کریمہ کے تحت لکھا ہے:

''اشارة الی التذبیح والاستحیاء او الانجاء''

اس کے بعد لکھا ہے: ''ویجوز ان یشار بذالکم الیٰ الجملة''(۱)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے فرمان ''وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ'' میں اسمِ اشارہ سے ہو سکتا ہے کہ ''یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ کُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَ کُمْ'' کی طرف اشارہ ہو یا ہو سکتا ہے کہ ''وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ'' کی طرف ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اِن دونوں کی خصوصیت سے قطع نظر نفسِ واقعہ کی طرف اشارہ ہو۔

اس کے بعد لکھا ہے: ''فان حملت الاشارة علی المعنی الاول فالمراد بالبلآء المحنة وان علی الثانی فالمراد به النعمة وان علی الثالث فالمراد به القدر المشترک کالامتحان الشائع بینهما''

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اِسمِ اشارہ ''وَفِیْ ذٰلِکُمْ'' اگر پہلے معنی پر محمول ہو تو ''بَلَآءٌ'' سے مراد محنت ومشقت ہوگی اور اگر دوسرے معنی کی طرف عائد ہو تو اِس سے مراد انعام ونعمت ہوگی اور اگر تیسرے معنی پر محمول ہو تو اس سے مراد قدر مشترک ہوگی یعنی مطلق امتحان وآزمائش جو امتحان بالحسنات اور امتحان بالسیآت کے مابین قدر مشترک ہے۔

قاضی ناصر الدین البیضاوی الشافعی المتوفی 685ھ نے لکھا ہے:

''محنة ان اشیر بذالکم الی صنیعهم ونعمة ان اشیر به الی الانجاء''

اس کے دو سطر بعد لکھا ہے: ''ویجوز ان یشار بذالکم الی الجملة و یراد به الامتحان الشائع بینهما''(۲)

---

(۱) تفسیر روح المعانی، ج:1، ص:54۔

(۲) تفسیر بیضاوی مع شیخ زادہ، ج:1، ص:300۔

اس کا مفہوم بھی وہی ہے جو حنفی المذہب مفسر کی عبارت کا ابھی بیان ہوا ہے۔

جاراللہ الزمخشری المعتزلی المتوفی 538ھ نے لکھا ہے: "و البلآء" المحنة ان اشير بذالكم الى صنيع فرعون والنعمة ان اشير به الٰى الانجاء"

الامام الشوکانی مِن اہل الحدیث المتوفی ۱۲۵۰ھ نے لکھا ہے:

"الى جملة الامر والبلآء يطلق تارة على الخير وتارة على الشر فان اريد به هنا الشر كانت الاشارة بقوله وَفِيْ ذٰلِكُم بَلَآءٌ الى ما حل بهم من النَقمةِ بالذبح ونحوه وان اريد به الخير كانت الاشارة الى النعمة الَّتِى انعم الله عليهم بالانجاء"(۱)

مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں ہے:

"وَسُمِّيَ الغَمُّ بَلآء مِن حيث اَنَّهٗ يُبلى الجسمَ"

ایک جگہ پر احکام شرعیہ تکلیفیہ کو اور انسان کی منجانب اللہ مکلفیت کو "بلآء" کہنے کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "والثالِثُ اَنّ اختبَارَ اللّٰه تعالٰى لِلعِباد تارةً بالمسّارِ لِيشْكُرُوْا وَتَارَةً بالمضّار لِيَصبِرُوْا فَصَارَتِ المحِنَةُ والمِنحَةُ جَمِيْعًا بَلآءً"

اور تیسرے مقام پر بالخصوص سورۃ البقرۃ کی اسی آیت میں واقع لفظ "بَلَآءٌ" سے مرادِ الٰہی کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے: "وَقَوْلُهُ عَزَّوَجَلَّ وَفِي ذَالِكُمْ بَلَآءٌ مِنْ رَبِّكُمْ راجعٌ اِلَى الامرين اِلَى المحِنَة الَّتِىْ فى قولِه عَزوَجل يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَ كُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَ كُمْ وَاِلَى المِنحَةِ الَّتِى انجاهُمْ"(۲)

اِن سب سے حاصل مقصد یہ کہ یہاں پر لفظ "بلآء" میں پانچ احتمالات ہیں۔

پہلا احتمال:۔ اِس سے مراد غم و صدمہ ہے جو فرعونیوں کے مظالم کی وجہ سے بنی اسرائیل کو پہنچتا

---

(۱) تفسیر فتح القدیر، ج:1، ص:83۔

(۲) مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی، ص:60,61، مادہ (بلآء۔

تھا جس کے مطابق آیت کا مفہوم ہوگا کہ ''تمہارے رب کی طرف سے کائنات میں جاری نظام تکوین کے تحت فرعونیوں کے ہاتھوں تمہیں پہنچنے والا عذاب جو تمہارے لئے بڑا غم و صدمہ تھا جس سے ہم نے تم کو نجات بخشی''

دوسرا احتمال:۔ اِس سے مراد زحمتِ تکلیف بالحسنات ہو، جس کے مطابق آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا ''فرعونیوں کے مظالم سے نجات دینے کے احسان میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی زحمت تکلیف تھی''۔

تیسرا احتمال:۔ اِس سے مراد زحمتِ تکلیف بالسیأت ہو، جس کے مطابق آیت کریمہ کا مفہوم یوں ہوگا ''فرعونیوں کے مظالم واستحصال میں رکھنے میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی زحمتِ تکلیف تھی''۔ان دونوں کی تائید وتصدیق اُس آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے جہاں پر ''وَبَلَوْنٰھُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ ''(۱) فرمایا ہے، یعنی ''ہم نے بنی اسرائیل کو کبھی راحتوں اور کبھی تکلیفوں کے ساتھ آزمایا''۔

چوتھا احتمال:۔ اِس سے مراد مطلق امتحان وآزمائش ہو جو آیت کریمہ ''وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ'' سے لے کر آخر تک کے مجموعہ سے مستفاد ہے۔

پانچواں مفہوم بمعنی احسان وانعام ہے اِس معنی کے مطابق پیش نظر آیت کریمہ کا مفہوم ہوگا ''فرعونیوں کے مظالم سے تمہیں نجات بخشنے میں تمہارے رب کی طرف سے تم پر بڑا احسان وانعام تھا''۔

اہل فہم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اِن پانچوں احتمالات میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ یقینی امر ہے متعدد آیات قرآنی کے مدلول ہیں اور بلا تخصیص سب کو معلوم ہے کہ فرعونیوں کے مظالم بنی اسرائیل کے لیے بڑے غم تھے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے نظام تکوین اور سرالقدر کے ماتحت ہورہا

---

(۱) الاعراف:168۔

تھا اور ابتلاء '' بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ '' کی زحمت بڑا امتحان ہے اور اِن مظالم سے نجات بخشنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل پر بڑا احسان وانعام تھا۔

مترجم چاہے کسی انسانی کتاب کا ترجمہ کر رہا ہو یا قرآن شریف کا بہر حال ایسے مقامات کا معیاری ترجمہ پیش کرنا اُس کے لیے امتحان سے کم نہیں ہے جس کے لیے دونوں زبانوں کے جملہ گوشوں سے آگاہی کے ساتھ مذکورہ تمام اُصول وشرائط پر بھی عمیق نظر درکار ہے جس کے مطابق ترجمہ والی زبان میں یہاں پر لفظ '' بَــلَآء '' کے سابق الذکر چاروں معانی کو شامل ہونے والے دو لفظ دستیاب ہیں۔ایک :لفظِ امتحان ،دوسرا: لفظ بلا۔اُردو میں کثیر الاستعمال ہونے والے یہ دونوں لفظ عربی سے آئے ہیں اِن میں بڑا فرق یہ ہے کہ اُردو میں استعمال ہونے والا امتحان عربی کے امتحان کا ہم معنی ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ لفظ ''بلا'' کی اصل بھی بلآء'' ہے فرق صرف ہیئت کذائیہ اور ساخت کا ہے۔نیز اُردو میں استعمال ہونے والے اِن دونوں لفظوں کا یہاں پر لفظ '' بـــلآء '' کے اول الذکر چاروں معانی کو شامل ہونا صرف اِس اعتبار سے ہے کہ اُن میں امتحان کی کُلفت پائی جاتی ہے چاہے جس انداز سے بھی ہو اور پانچویں معنی کو شامل نہ ہونے کی **ایک وجہ** یہ ہے کہ اُس میں امتحان نہیں ہے بلکہ محض احسان وانعام ہے۔

دوسری وجہ:۔اُردو محاورہ میں امتحان کو تکلیف لازم ہے چاہے جس انداز سے بھی ہو تو پھر محض احسان وانعام کو شامل ہونے کا تصور ہی کیا ہے۔

تیسرا فرق :۔جو عربی کے ''بلآء''اور اُردو کے ''بلا'' کے مابین ہے وہ یہ ہے کہ عربی کا لفظ '' بــلآء '' یہاں پر آیت کریمہ میں مذکورہ پانچوں معانی کو شامل ہے جبکہ اُردو کی 'بلا' پانچویں معنی کو شامل نہیں ہے۔ اُردو لُغت کی مستند کتاب فرہنگ آصفیہ، ج 1 ص 407، مادہ (ب،ل،ا) میں اِس کے سات مختلف معانی بتانے کے بعد ہر ایک تحت مزید ذیلی معانی او استعمالات بتائے ہیں جن میں محض احسان یا محض انعام واکرام کے لیے اِس کے استعمال ہونے کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے۔

عام ترجمہ کے پیشِ نظر اُصول کے مطابق آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ (اور اِس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑا امتحان تھا یا (بڑا احسان)، اور اِس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی یا ''بڑا انعام'') جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو پھر متن کے لفظ ''بلآء'' کا ترجمہ ترک کیا جائے گا یا ترجمہ کے نام سے اُس کے پانچوں معانی کا جدا جدا اظہار کیا جائے گا یا کسی ایک کے مطابق ترجمہ کر کے باقی سب سے صرفِ نظر کیا جائے گا۔

یا پانچویں معنی کے مطابق ترجمہ کر کے باقی سب کو بریکٹ میں کیا جائے گا جبکہ یہ چاروں صورتیں غلط ہیں جس کی وجوہات گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ حقائق کی اِس روشنی میں مذکورہ اُصول آپ ہی ناگزیر قرار پاتا ہے جس کے مطابق ترجمہ معیاری ہونے کے ساتھ بریکٹ سسٹم بھی معقول ہوتا ہے۔ (وَاللّٰهُ الهَادِي اِلَى سَبِيْلِ الرَّشَادِ)

ترجمہ کی صحت کے لیے جہاں دوسری شرائط واُصول کی پابندی ضروری ہے وہاں متن کے لُغوی مفہوم کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے ورنہ متن کے لُغوی مفہوم سے خلاف ہونے والا ترجمہ غلط ہوگا۔ ترجمۃ القرآن میں اِس کی مثال سورۃ البقرہ، آیت نمبر 285 میں حصہ متن ''یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ'' کا ترجمہ سید محمد وجیہہ السیما عرفانی نے کیا ہے ''الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے ناواقف لوگ اُنہیں مالدار سمجھتے ہیں'' جو کہا گیا ہے یہ لفظ ''تعفف'' کا مفہوم الگ تھلگ رہنے سمجھنے پر مبنی ہے جو غلط ہے کیوں کہ لسانِ قرآنی میں لفظ ''تعفف'' الگ تھلگ رہنے کے لیے موضوع ہے نہ اِس میں استعمال ہونے کا کوئی ثبوت موجود ہے۔ مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں ہے:

''العفة حصول حالة للنفس تمتنع بها عن غلبة الشهوة والمتعفف المتعاطي لذالك بضرب من الممارسة والقهر''

''عفۃ'' نفسِ انسانی کے لیے اُس حال کے حصول سے عبارۃ ہے جس کے ہوتے ہوئے وہ نفسانی خواہشات کے غلبہ سے محفوظ ہوجاتا ہے جبکہ ''مُتَعَفِّف'' اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے نفس

امارہ پر کنٹرول کرنے کی بدولت اِس حالت پر فائز ہو۔

المنجد میں ہے: ''عف عفا و عفة و عفافا و عفافة کف و امتنع عما لا یحل او لا یجمل''

اِس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لفظ اپنے چاروں مصادر یعنی (عَفًّا، عِفَّةً، عَفَافًا اور عَفَافَةً) میں ہر اُس چیز سے بچنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جو جائز نہیں یا کم از کم انسانی زینت کے منافی ہے۔

اِس کے بعد لکھا ہے: ''تعفف عن کذا امتنع''

الغرض یہ لفظ مجرد استعمال ہو یا مزید فیہ یعنی باب تفعل سے بہر حال اِس کا مفہوم کسی معیوب چیز سے اجتناب و امتناع کے بغیر نہیں ہوتا چہ جائیکہ لوگوں سے الگ تھلگ رہنے جیسے مفہوم میں ہو۔ ترجمہ کی اِس غلطی کی وجہ مذکورہ شرط سے بے اعتنائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ مذکورہ شرط کے ساتھ دوسری شرائط کو پیشِ نظر رکھ کر آیت کریمہ کا حقیقی ترجمہ ''نادان اُنہیں تو انگر سمجھے بچنے کے سبب، ناواقف اُنہیں مال دار سمجھے بچنے کے سبب، ناواقفِ حال اُنہیں غنی سمجھے سوال سے بچنے کے سبب'' جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے تو پھر شرط کی راہ سے ہٹ کر ترجمہ کرنے کا نتیجہ ایسا ہی ہوگا، جو اِس کا ہوا ہے۔

دوسری مثال: ۔سورۃ آلِ عمران، آیت نمبر 185 ''وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ'' کا ترجمہ اشرف علی تھانوی نے کیا ہے ''اور تم کو پوری پاداش تمہاری قیامت ہی کے روز ملے گی'' جس میں متن کے لفظ ''اُجور'' کا ترجمہ ''پاداش'' میں کیا گیا ہے جو اُس کی لُغوی حیثیت بلکہ متنِ لُغت کی حیثیت سے بھی خلاف ہے کیوں کہ لسانِ قرآنی کے مطابق اُجور جمع ہے اجر کی اور اجر کارِ خیر کے بدل کے ساتھ مختص ہے جبکہ لفظ پاداش اُردو محاورہ میں کارِ خیر کے بدل کے لیے استعمال نہیں ہوتا لگتا یوں ہے کہ مترجمین کو یہ لکھتے وقت اجر اور جزاء کے مابین فرق کا اِدراک نہیں تھا ورنہ جزاء کے ترجمہ کے ساتھ قدرے مناسبت رکھنے والے اِس لفظ کو ''اُجُوْرَ'' کے ترجمہ کے لیے کبھی استعمال نہ کرتے

کاش یہ حضرات اور نہ سہی کم از کم مفردات لغات القرآن سے ہی روشنی لینے کی کوشش کرتے پھر بھی اِس لغزش سے تحفظ پاتے۔ مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں لفظ ''اجر اور جزاء'' کے مابین فرق بتاتے ہوئے کہا ہے:

''الا جر والاجرة مایعود من ثواب العمل دُنیویا کان اواُخرویا نحوقوله تعالیٰ ان اجری الا علی الله،واتیناه اجره فی الدنیا وانه فی الاخرة لمن الصالحین، ولاجر الآخرة خیر للذین امنوا والاجرة فی الثواب اللدنیوی وجمع الاجر اُجور''

اِس کے بعد کچھ فاصلہ پر لکھا ہے:''والاجر والاجرة یقال فیما کان عن عقد وما یجری مجری العقد ولا یقال الا فی النفع دون الضر''

اِس کے بعد لفظ جزاء کا مفہوم بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''والجزاء یقال فیما کان عن عقد وغیرعقد ویقال فی النافق والضار''(۱)

لُغت سے ملنے والی اِس روشنی کے مطابق اِن کے مابین عام وخاص کا فرق ہے کہ اجر کارِ خیر کے بدل کے ساتھ خاص ہے جس میں ضرر ونقصان نہیں بلکہ خیر ہی خیر اور نفع ہی نفع ہوتا ہے جبکہ لفظ ''جزاء'' نفع ونقصان دونوں کو عام ہے جس وجہ سے اُمورِ شر سے متعلق استعمال ہونے کی صورت میں اِس کے ترجمہ کے طور پر لفظ ''پاداش'' استعمال کرنے کو غلط نہیں کہا جا سکتا اور اُمورِ خیر سے متعلق استعمال ہونے کی صورت میں اُس کے ترجمہ کے لیے اِسے استعمال کرنے کی قطعاً کوئی تک نہیں ہوتی جبکہ لفظ ''اجر اور اُجور'' کے ترجمہ کے لیے اِسے استعمال کرنے کا قطعاً کوئی جواز ہی نہیں ہے ایسے میں اِس ترجمہ کے غلط ہونے کی اصل وجہ مذکورہ شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

---

(۱) مفردات لغات القرآن ،امام الراغب الاصفہانی،مادہ(ا،ج،ر)۔

دوسرا باب:۔

باب ثانی خاص ترجمۃ القرآن سے متعلق ہے جس میں درج ذیل موضوعات سے بحث کی جائے گی:

❶ ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض وموضوع۔

❷ جن اسلاف نے قرآن شریف کے ترجمہ کو ناممکن یا ناجائز کہا ہے اُس کا مصرف اور تقاضائے انصاف۔

❸ ترجمۃ القرآن کی تاریخ اور ضرورت اور اس پر گزرنے والے مراحل۔

❹ ترجمۃ القرآن کے لیے ناگزیر شرائط واُصول اور احتیاطی تقاضے۔

❺ ترجمۃ القرآن کی شرعی حیثیت۔

ترجمۃ القرآن کی نسبت عام ترجمہ کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسا خاص کی نسبت عام سے ہوتی ہے کیوں کہ عام ترجمہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے جنس ہے جس کے ماتحت دو متبائن نوع ہیں۔ایک عرشی کتاب کا ترجمہ اور دوسرا فرشی کتاب کا ترجمہ کہلاتا ہے، اور فرشی کتاب کے ترجمہ کے ماتحت بے شمار اصناف ہیں جبکہ عرشی کتاب یعنی قرآن شریف کے ترجمہ کے تحت جزئیات ہیں جنہیں آیاتِ قرآنیہ کا ترجمہ کہا جاتا ہے جن کے بغیر ترجمۃ القرآن کے خارجی وجود کی تمیز ممکن ہے نہ صحیح وسقیم کی پہچان۔اِس کے علاوہ ایک دوسرے انداز سے بھی ترجمۃ القرآن کی نسبت عام ترجمہ سے پہچانی جاسکتی ہے کہ عام ترجمہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے کہ وہ اصل کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے اُن الفاظ سے بدلنا ہے جو اصل کے قائم مقام ہوسکیں، جنس ہے اور ترجمۃ القرآن سے لے کر انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے جتنے بھی تراجم دُنیا میں پائے جاسکتے ہیں یہ سب کے سب اُس کے ماتحت متبائن انواع ہیں بہرحال ترجمۃ القرآن عام ترجمہ کے ماتحت خاص قسم ہے اِس

کے مبادیات ثلاثہ یعنی تعریف، غرض، موضوع کی اگر چہ قدرے پہچان مطلق ترجمہ کی تعریف، غرض وموضوع کے بیان سے ہو چکی ہے تاہم اِس کی اہمیت کے پیشِ نظر یہاں پر تصریح بماعلم ضمناً کے طور پر اِنہیں صراحتاً بیان کرنا بھی ضروری ہے۔

ترجمۃ القرآن کی تعریف:۔

قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جواُن کے قائم مقام ہو سکیں اور قائم مقام ہونے سے مطلب یہ ہے کہ اُن کی جملہ حیثیات کے مطابق ہوں مثلاً اُس کا جو مفہوم ہے اِس کا بھی وہی ہو اور اُس کی جولسانی حیثیت ہے اِس کی بھی وہی حیثیت ہو یعنی وہ مبتداء ہے یہ بھی مبتداء ہو اور وہ خبر ہے یہ بھی خبر ہو، وہ متعدی ہے یہ بھی متعدی اور وہ لازم ہے یہ بھی لازم اور وہ فعلِ معلوم ہے یہ بھی فعلِ معلوم ہو اور وہ مجہول ہے یہ بھی مجہول ہو، وہ مذکر یا مونث ہے یہ بھی اُس کے مطابق ہو۔علی ہٰذاالقیاس ورنہ اُس کی حیثیت سے خلاف ہونے والا لفظ ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوگا۔ترجمہ کے الفاظ جو اصل سے بدل کہلاتے ہیں کمیت وکیفیت دونوں کے حوالہ سے اصل کے مطابق ہونا اگر چہ دونوں ترجموں میں ناگزیر ہے کہ اِس کے بغیر ترجمہ کا تصور ہی نہیں ہے تاہم ترجمۃ القرآن میں اِس کی اہمیت عام ترجمہ کی نسبت کئی گنا زیادہ ہے کیوں کہ عام ترجمہ میں بعض حیثیات کے حوالہ سے مطابق نہ ہونے کا نقصان کم ہے جبکہ ترجمۃ القرآن میں عدمِ مطابقت کے نقصانات نہ صرف زیادہ بلکہ خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔مثال کے طور پر کسی انسانی کتاب کی عبارت ''اذبحوا بقرۃ'' سے اُس کی مراد'' گائے ذبح کرنا ہو''اور ترجمہ اُس کا''بیل ذبح کرو''میں کیا جائے کیوں کہ بیل گائے کا قائم مقام نہیں ہے لیکن غلطی کی یہ نوعیت آیت کریمہ ''اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً''(۱) میں''بقرہ'' کا ترجمہ بیل میں کرنے سے کم ہے کیوں کہ اِس میں انسان کی مراد ظاہر کرنے میں غلطی ہے جبکہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول

---

(۱) البقرۃ:67۔

کی مراد ظاہر کرنے میں غلطی ہے جن کی نوعیت اور گناہ میں بڑا فرق ہے۔ نیز یہاں پر اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے مترجم کہہ سکتا ہے کہ لفظ ''بقرہ'' اِسم جنس ہونے کی وجہ سے گائے اور بیل دونوں کو شامل ہے اور گائے مراد ہونے پر کلام میں کوئی خارجی دلیل موجود نہیں تھی جس وجہ سے مراد کی تعیین و تشخیص کرنے میں ہم سے کوتاہی ہوئی ہے جبکہ آیت کریمہ میں اِس قسم عذر خواہی اور بہانہ جوئی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کیوں کہ اس مقام پر بیل مراد نہ ہونے کے لیے سیاق وسباق کی دلیل موجود ہے کہ لفظ ''بقرہ'' کی طرف راجع ہونے والے تمام ضمائر مونث ہیں جو مذکر کے لیے استعمال نہیں ہو سکتے۔

نیز آیت کریمہ کا حصہ ''اِنَّه یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ''(۱) اس کے مونث ہونے پر یعنی گائے ہونے پر مستقل دلیل ہے کیوں کہ یہ الف تانیث کی ایسی علامت ہے جس کا مذکر پر داخل ہونا ممکن ہی نہیں ہے بلکہ یہ جس اِسم پر بھی آئے وہ ہمیشہ مونث ہی ہوتا ہے یہ اتنا واضح مسئلہ ہے کہ عربی زبان سے اور خاص کر علم نحو سے قدرے روشنی پانے والوں سے بھی مخفی نہیں رہ سکتا چہ جائیکہ قرآن شریف کا ترجمہ کرنے کی جرات کرکے آگے آنے والے اِس سے جاہل رہ سکے۔ ایسے میں لفظ ''بقرہ'' کے مذکورہ دونوں ترجموں کی غلطی کو یکساں کون کہہ سکتا ہے اِس کے علاوہ عواقب ونتائج کے حوالہ سے بھی مندرجہ ذیل فرق ہے:

1. انسانی کتاب کے ترجمہ میں اِس غلطی کی نسبت انسان کی طرف ہو رہی ہے کہ وہ بیل ذبح کرنے کا حکم دے رہا ہے جبکہ قرآن شریف کے ترجمہ میں اِس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جارہی ہے کہ وہ بیل ذبح کرنے کا حکم دے رہا ہے یہ دونوں نسبتیں اگرچہ خلافِ حقیقت اور جھوٹ ہیں تاہم اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ نسبت کرنے کا گناہ کسی انسان کی طرف نسبت کرنے کے برابر نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

(۱) البقرة:69۔

''اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَایُفْلِحُوْنَ''(۱)

۲ انسانی کتاب کے ترجمہ میں اِسے غلطی اور بے اعتدالی کے سوااور کچھ نہیں کہا جاتا جبکہ قرآن شریف کے ترجمہ میں اِس قسم کی غلطیوں کومحض بے اعتدالی کہنے پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ معنوی تحریف بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ قرآن شریف صرف الفاظ یا محض معانی کا نام نہیں ہے بلکہ الفاظ ومعانی کے مجموعۂ مرکب کا نام ہے الفاظ اِس حیثیت سے کہ معانی ومقاصد پر دلالت کرتے ہیں اور معانی اِس حیثیت سے کہ الفاظ کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں یعنی دال ومدلول ہونے کی حیثیت سے دونوں کے مجموعۂ مرکب کوکلام اللہ کہا جاتا ہے جس کے مطابق اس کے کسی لفظ کی تغییر کوتحریف لفظی اور لفظ کے کسی مدلول کے بدلنے کوتحریفِ معنوی کہا جاتا ہے۔

۳ انسانی کتاب کے ترجمہ میں اِسے غلطی و بے اعتدالی کہنے کے بعد گناہ کی تعیین وتشخیص کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا جبکہ قرآن شریف کے ترجمہ میں اِسے گناہِ کبیرہ قرار دیئے بغیر نہیں رہا جاتا کیوں کہ تحریف ہے اور کتاب اللہ کی ہر تحریف گناہ کبیرہ ہے۔

حاصلِ کلام:۔ ترجمۃ القرآن کی حقیقت کہ وہ قرآنی آیات کے الفاظ کودوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جواُن کے قائم مقام ہوسکیں یعنی اُن سے مرادی معنی کے مطابق ہونے کے ساتھ اُن کی جملہ فنی ولسانی حیثیات کے بھی حامل ہوں۔ اِس کی اہمیت عام ترجمہ کی اہمیت سے کئی گنا زیادہ ہے اِس کی شرائط بھی عام ترجمہ سے زیادہ اور اِس کے احتیاطی تقاضے بھی عام ترجمہ کے احتیاطی تقاضوں سے زیادہ ہونے کے علاوہ یہ نہایت پُر خطر بھی ہے کہ کسی ایک احتیاطی تقاضے سے بے توجہی یا کسی ایک شرط سے بے اعتنائی کی صورت میں بھی تحریف لازم آسکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف یا اُس کے رسول ﷺ کی طرف نادانستہ طور پر جھوٹ نسبت کرنے کا گناہ ہوسکتا ہے۔ اِس کی کثرت اہتمام کی اِن وجوہات کی بنا پر اس باب میں ہم اِس کے اُمورِ ثلاثہ یعنی تعریف، غرض، موضوع پر مستقل بحث کرنا چاہتے ہیں ورنہ پہلے باب میں اِن پر بھی کافی حد تک روشنی پڑ چکی

---

(۱) یونس:69۔

ہے۔ بزرگانِ دین سے منقول ترجمۃ القرآن کی اِس تعریف کہ وہ ''ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التی تقوم مقامھا'' ہے یعنی قرآنی آیات کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں، اِس کے مطابق متن قرآن کے الفاظ مبدل منہ کہلاتے ہیں جبکہ ترجمہ کے الفاظ اُن سے بدل کہلاتے ہیں اور بدل و مبدل منہ۔ یہاں پر اپنے لُغوی مفہوم پر محمول ہیں یعنی عِوض اور معوض عنہ، یہ تصریح ہم اِس لیے کر رہے ہیں کہ کسی قاری و سامع کا ذہن اِس سے نحوی اصطلاح کیطرف نہ جائے۔

ترجمۃ القرآن کی اِس تعریف میں ترجمہ کے الفاظ کا متن کے الفاظ کے قائم مقام ہونے سے مقصد بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اُن کے ساتھ مختص احوال کے ماسوا جملہ احوال میں اُن کے مطابق اور اُن کی لسانی حیثیات کے حامل ہو۔ مثلاً وہ جس مرادِ الٰہی پر دلالت کر رہے ہیں یہ بھی اُسی پر دلالت کریں اور صَرف، نحو، بلاغت وغیرہ کے حوالہ سے وہ جس حیثیت کے حامل ہیں یہ بھی اُسی حیثیت کے حامل ہوں ورنہ اُس کے قائم مقام کہلانے کے قابل نہیں ہوں گے جب اصل کے قائم مقام کہلانے کے قابل نہ ہوگا تو پھر ترجمۃ القرآن کہلانے کے قابل بھی نہ ہوگا کیوں کہ ترجمۃ القرآن کے لیے یہ فصل مُقوِّم ہے جس کے بغیر اُس کا وجود ہی ممکن نہیں ہے۔ اِس کی ایسی مثال ہے جیسے ناطق کے بغیر انسان کا وجود متصور نہیں ہے۔ باقی رہے متنِ قرآن کے وہ احوال جو اُسی کے ساتھ مختص ہیں یا الفاظ کی وہ خصوصیات جو ترجمہ والی زبان میں متصور نہیں ہیں جیسا معرب ومبنی ہونا اور مخصوص مخارج سے ادا ہونا اور فصاحت و بلاغت میں بے مثل ہونا اور مخصوص ترتیب و اعجاز اور کمالِ اختصار و ایجاز میں بے مثال ہونا اور کسی بھی حوالہ سے عام انسانوں کی فہم سے ماوراء علوم و معارف پر مشتمل ہونا جو کسی بھی ترجمہ والی زبان میں متصور نہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ کے الفاظ کا ان کے مطابق ہونا بھی ضروری نہیں ہے کیوں کہ ایسا کرنا مترجم کے لیے ممکن ہی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا''(۱) اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں کرتا مگر اُس کی

---

(۱) البقرۃ:286۔

استطاعت کے مطابق۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہئے کہ قرآن شریف کی اِن خصوصیات کو دلیل بنا کر اُس کے ترجمہ کو بھی ناممکن کہا جائے جیسا بعض حضرات نے کہا ہے یا عدمِ مطابقت کے اِس جواز کو بہانہ بنا کر ترجمۃ القرآن کے فصل مقوِم سے ہی صَرفِ نظر کیا جائے جیسا قرآن شریف کے اکثر تراجم میں ہوا ہے۔

جنوبی ایشیاء (برصغیر پاک و ہند) کے مشاہیر مسالک کے درجنوں اُردو تراجم قرآن اِس وقت ہمارے سامنے موجود ہیں جن کی غالب اکثریت اِس غلطی پر مشتمل ہے کسی میں ترجمہ کے الفاظ قرآنی الفاظ کے لُغوی مفہوم سے خلاف ہیں، کسی میں مرادی معنی سے خلاف ہیں اور کسی میں اُس کی صَرفی حیثیت سے خلاف ہے تو کسی میں نحوی حیثیت کی دھجیاں اُڑائی گئی ہیں۔ اِسی طرح کسی میں ایک وجہ سے خلاف کیا گیا ہے اور بعض میں اصل سے اختلاف کی متعدد وجوہ جمع کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر سورۃ البقرہ، آیت 35 کے حصہ ''وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ'' کا ترجمہ کیا گیا ہے ''اور مت قریب جانا تم دونوں اِس درخت کے ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے ظالموں سے'' یہ ترجمہ اہل حدیث علماء کی ایک جماعت نے کیا ہے جس میں مولانا حافظ صلاح الدین یوسف اور مولانا محمد عبدالجبار کے اسمآء نمایاں ہیں جبکہ اشاعتی ادارہ (دار السلام الریاض) کے مہتمم عبدالجبار مجاہد سمیت کچھ پاکستانی اور کچھ سعودیہ عربیہ میں رہنے والے اہل حدیث علماء کا تعاون بھی انہیں شامل ہے اور اِس کے شروع میں حرفِ اول کے نام سے پروفیسر عبدالجبار شاکر بیت الحکمۃ لاہور کی لکھی ہوئی ''اور کچھ ترجمہ قرآن کے بارے میں'' کے عنوان سے حافظ صلاح الدین یوسف کی لکھی ہوئی جو تحریریں شائع ہوئیں ہیں اُنہیں دیکھنے اور پڑھنے والے یہ تاثر قائم کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جید علماء کرام کے اشتراکِ عمل سے وجود میں آنے والا یہ ترجمہ ضرور معیاری ہوگا اور دوسرے تراجم پر اُٹھنے والے جملہ اعتراضات سے پاک اور محفوظ ہوگا لیکن ترجمۃ القرآن کی فطری شرائط کی روشنی میں اس کے مندرجات کو دیکھنے کے بعد دوسرے تراجم سے بھی زیادہ مایوسی ہوتی ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ اِس ٹیم کو فنِ ترجمہ کے بنیادی اُصول کا ہی اِدراک نہیں تھا چہ جائیکہ ترجمۃ القرآن کی خُصوصی

شرائط کا احساس ہو۔ اِس آیت کریمہ کے ترجمہ میں اکٹھی چار غلطیاں کی گئی ہیں:

❶ ترجمہ والی زبان کے محاورہ کو مسخ کیا گیا ہے جیسا اُس کے الفاظ و انداز ''اورمت قریب جانا تم دونوں اِس درخت کے ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے ظالموں سے'' کے سننے اور پڑھنے والوں سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے کیوں کہ اُردو محاورہ میں کسی بھی فعل کے لیے فاعل کے طور پر استعمال ہونے والے تثنیہ اور جمع یکساں استعمال کیے جاتے ہیں جس کے مطابق آیت کریمہ کا ترجمہ ''اور قریب مت جاؤ اِس درخت کے کہ پھر ظلم کرنے والوں میں ہو جاؤ گے، اور اِس درخت کے نزدیک نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے'' اِس جیسے کسی بھی انداز سے ہو سکتا ہے جو متن کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے بھی مطابق ہے۔

❷ متن کی لُغوی حیثیت سے بھی خلاف ہے کیوں کہ لِسانِ قرآنی کی ایک لُغوی حیثیت یہ بھی ہے کہ اَمر، نہی، استفہام، تمنی، ترجی جیسے چند عوامل کے جواب میں واقع ہونے والے ''فا'' اور ''واؤ'' کے بعد مذکور ہونے والا فعل جو منصوب ہوتا ہے اپنے عامل یعنی ''اَن'' مقدرہ کے ساتھ مل کر مصدر منسلخ ہونے کے بعد معطوف علیہ والے حصہ کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے یہ خالصتاً لُغت کا مسئلہ ہے جو لِسانِ قرآنی کی لُغت کے ساتھ مختص ہے جس کے مطابق پیشِ نظر آیت کریمہ کی تفہیم یا ترجمانی اِس طرح ہوگی ''**لاتجمعابین قِربان الشجرہ و الظلم** ''یعنی ایسا نہ ہونے پائے کہ شجرہ کے پاس جانے کی وجہ سے ظالم قرار پاؤ لیکن تفہیم یا ترجمانی کے درست ہونے سے ترجمہ کا درست ہونا لازم نہیں آتا کیوں کہ اِن کی حقیقتیں ایک دوسرے سے جدا ہیں کہ تفہیم و ترجمانی میں متن کے الفاظ سے زیادہ الفاظ استعمال کرنا ضروری ہے جبکہ ترجمہ میں زیادہ نہ کرنا ضروری ہے ہاں یہ الگ بات ہے کہ کسی آیت کریمہ کے مفہوم سے یا اُس کی ترجمانی سے ترجمہ کے لیے روشنی لی جا سکتی ہے جس کے مطابق پیشِ نظر آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ ''اور قریب مت جاؤ اِس درخت کے کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے'' جیسے کسی بھی معقول انداز میں کرنا ممکن ہے جو دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ متن کی لسانی حیثیت کے

بھی مطابق ہے بخلاف اِس قابلِ اعتراض ترجمہ کے کہ اس میں لفظ ''ورنہ'' استعمال کر کے متن کی اجتماعیت والی حیثیت سے خلاف کیا گیا ہے کیوں کہ اُردو محاورہ میں لفظ ''ورنہ'' کا مابعد اُس کے ماقبل کے ساتھ جمع نہیں ہوتا لیکن مترجمین کی ٹیم پر افسوس کہ یہ سب کچھ لکھتے وقت اُنہوں نے آیت کریمہ کی لسانی حیثیت کا خیال رکھا نہ لُغوی مفہوم کا اور مرادِ الٰہی کا اِدراک کیا نہ فنی اور لسانی حیثیت کے اِس باریک گوشے کا جس کے نتیجہ میں ان دو خرابیوں کے ساتھ۔

❸ مرادِ الٰہی سے بھی خلاف ہو رہا ہے کیوں کہ آیت کریمہ کے اِس حصے سے مقصد بالترتیب دونوں سے بچنا ہے اِس طرح سے کہ شجرہ کے قریب جانا سبب ہے ظلم کے لیے یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ شجرہ کے قریب جائے اور ظالم نہ ہو۔ اِسی فلسفہ کے مطابق پہلے ''قربانِ شجرہ'' سے منع کرنے کے متصلاً بعد ظالم ہونے کا ذکر ہوا ہے کہ اِن میں انفرادیت اور جدائی نہیں بلکہ وجودی ارتباط ہے کہ شجرہ کے قریب جانا ملزوم اور ظالم ہونا اُسے لازم ہے ایسے میں مترجمین کے مذکورہ انداز ''اور مت قریب جانا تم دونوں اِس درخت کے ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے ظالموں سے'' کو آیت کریمہ کا لُغوی مفہوم کہا جا سکتا ہے نہ مرادِ الٰہی کے مطابق بلکہ غلط محض کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

❹ اِن تینوں ناہمواریوں کے ساتھ چوتھی بے اعتدالی یہ ہے کہ یہ نحوی اُصول سے بھی خلاف ہے جسے سننے کے لیے سیبویہ تیار ہے نہ نور الدین جامی نہ صرف اتنا بلکہ علم نحو کے ابتدائی درسیات میں مشہور مثال ''لاتاکل السمکة وتشرب اللبن'' کی نحوی ترکیب سمجھ کر پڑھنے والے مبتدی بھی اِس پر تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔

اِس بے اعتدالی میں مترجمین کی مذکورہ ٹیم منفرد نہیں ہے بلکہ اُن کے ساتھ اشرف علی تھانوی، عبد الماجد دریا آبادی، فتح محمد خان جالندھری، محمد جونا گڑھی، ڈاکٹر طاہر القادری، ثناء اللہ امرتسری اور مفتی مظہر اللہ جیسے بڑے بڑے شامل ہیں جیسا بالترتیب اُن کے کیے ہوئے تراجم کے مندرجہ ذیل الفاظ وانداز سے (اور نزدیک نہ جائیو اِس درخت کے ورنہ تم بھی اُن ہی میں شمار ہو جاؤ

گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں،اور اِس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم گناہ گاروں میں سے ہو جاؤ گے،لیکن اِس درخت کے پاس نہ جانا نہیں تو ظالموں میں داخل ہو جاؤ گے،لیکن اِس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ ظالم ہو جاؤ گے،مگر اِس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ حد سے بڑھنے والوں میں شامل ہو جاؤ گے،مگر اِس درخت کے قریب نہ جائیو نہیں تو ظالم ٹھہرو گے،مگر اِس درخت کے نزدیک نہ جانا اگر تم اِس کے قریب گئے تو حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے) سے صاف ظاہر ہے کہ باہمی اختلاف الفاظ کے باوجود ظالم ہونے کو حرفِ نفی ''لا'' کے مدخول اور ''قربان شجرہ'' پر معطوف ہونے سے خلاف پر سب متفق ہیں جس وجہ سے یہ سب کے سب متن کی لسانی حیثیت کے خلاف ہونے کے ساتھ اُس کی فنی حیثیت سے بھی خلاف اور لُغوی مفہوم سے برعکس ہونے کے ساتھ مرادِ الٰہی سے بھی خلاف ہیں مترجمین سے اتنی کثیر تعداد میں غلطیوں کا صادر ہونا باعثِ افسوس ضرور ہے مگر باعثِ تعجب نہیں ہے۔افسوس اِس لیے کہ جب قرآن شریف کے ترجمہ کا حق نبھانے کی استطاعت نہیں تھی تو پھر ''لہو لگا کر خود کو شہیدوں'' میں شامل ہونے کی کیا ضرورت تھی جس میں نادانستہ طور پر تحریف کی مثالیں ثبت کی جارہی ہیں،ترجمہ کو قرآنی آیات کے تابع کرنے کے بجائے آیاتِ قرآنی کو اپنی من پسند کا تابع کیا جارہا ہے،شرائط کی رعایت کے بغیر ترجمہ کے نام سے وہ کچھ لکھا جارہا ہے جو معنوی قرآن کہلانے کے قابل نہیں ہے اور ترجمۃ القرآن کی تعریف اور اس کی حقیقت کو بنیاد بنا کر ترجمہ کے الفاظ کو اُس کے مطابق کرنے کے بجائے اِس سے برعکس کیا جارہا ہے تو پھر اِس پر نہ صرف ایک بار بلکہ سو بار افسوس ہے اِس کے باوجود قابلِ تعجب اِس لیے نہیں ہے کہ نہ صرف ترجمۃ القرآن بلکہ ہر فن اور ہر کمال کا یہی حال ہے کہ اُس کی حقیقت سے ناآشنا اور شرائط سے ناواقف کو اُس کے قریب نہیں جانا چاہیے ورنہ تعمیر کی بجائے تخریب کرے گا،بنانے کی بجائے بگاڑے گا اور دادو تحسین پانے کے بجائے طعن و تشنیع و ملامت سنے گا۔مترجمین کی اِن تمام غلطیوں کا نکتۂ آغاز ایک ہے،سب میں مشترک ہے جو ترجمۃ القرآن کی تعریف ''ھو ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التی تقوم مقامھا ''یعنی قرآن شریف کے الفاظ کو

دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جواُن کے قائم مقام ہوسکیں، سے غفلت ہے ورنہ ترجمۃ القرآن کی اس تعریف کو پیشِ نظر رکھ کر ترجمہ کرنے والے سے غلطی نہیں ہوسکتی بشرطیکہ اُس کی شرائط واُصول کی بھی پابندی کرے۔

ترجمۃ القرآن کی تعریف کا تجزیہ:۔

قرآن شریف کی پیشروانِ اسلام سے منقول اِس تعریف کو علمی زبان میں حدِ تام کہا جا سکتا ہے جس کے مطابق ترجمۃ القرآن مطلق ترجمہ کے عرفی مفہوم کے ماتحت ایک مستقل نوع ہے جس کی تحدید وتعریف جنس قریب اور فصل قریب کے مجموعہ سے کی گئی ہے کیوں کہ قرآن شریف کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے الفاظ میں بدلنا اِس نوع کی نسبت بمنزلہ جنس قریب ہے جبکہ ترجمہ کے الفاظ کا آیاتِ قرآنی کے الفاظ کے قائم مقام ہونا یعنی اُن کی جملہ حیثیات کے مطابق ہونا بمنزلہ فصل قریب ہے جس کے مطابق ترجمۃ القرآن کی یہ تعریف جامع ومانع ہونے کی اعلیٰ مثال ہے جسے پیشِ نظر رکھ کر قرآن شریف کا ترجمہ کرنے والا کبھی غلطی نہیں کرسکتا کیوں کہ قرآن شریف کا ترجمہ کرنے میں غلطی کی جو راہیں ہوسکتی ہیں یا دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جن راہوں سے غلطی کا تصور ہوسکتا ہے اِس تعریف میں اُن سب کی نشان دہی موجود ہے کہ بنیادی طور پر وہ صرف تین راہیں ہیں:

پہلی راہ:۔ ترجمہ کے الفاظ قرآنی الفاظ کے قائم مقام ہونے کے قابل نہ ہوں یعنی لُغوی معنی سے لے کر مرادی معنی تک اور صَرفی یا نحوی یا بلاغی یا کسی بھی فنی حیثیت سے لے کر لسانی پہلو تک اُس کی جو حیثیت ہے یہ بھی اُسی حیثیت کی حامل ہوں ورنہ کسی ایک حیثیت میں اُس سے خلاف ہونے پر بھی ترجمہ غلط اور بے مقصد ہوسکتا ہے

غلطی کی اِس راہ کو اگر لامحدود کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیوں کہ قرآن شریف کے الفاظ اور ان کی ترتیب اور اُن کے تقاضے جیسی حیثیات کی کوئی نہایت نہیں ہے تو پھر ترجمہ کے الفاظ کی اُن کے ساتھ موافقت

اور اُن کے قائم مقام ہونے کی کیا حد ہو سکتی ہے یہاں پر دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

اول:۔ آیاتِ قرآنیہ کے الفاظ اور اُن کی ترتیب وتقاضے اگر چہ لانہایت ہیں تاہم ترجمہ کے الفاظ وترتیب اور تقاضوں کا 100% اُن کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے کیوں کہ اُن کے دو حصے ہیں:

ایک کا تعلق ایسے رُموز ومعارف کے ساتھ ہے جو عام انسانوں کی فہم سے بلکہ عام اہل علم کے اِدراک سے بھی ماوراء ہیں۔

دوسرے کا تعلق عام فہم مسائل اور سہل الفہم احکام کے ساتھ ہے کہ ہر اہل لسان اُنہیں سمجھ سکتا ہے جبکہ غیر اہل لسان اُن علوم وفنون کی مدد سے اُن کا اِدراک کر سکتے ہیں جو قرآن فہمی کے لیے بمنزلہ آلہ اور موقوف علیہ کہلاتے ہیں مثلاً علم اللغۃ، علم الاشتقاق، علم تصریف، علم نحو، علم المعانی، علم البیان اور علم البدیع جیسے جتنے بھی لسانی علوم وفنون ہیں یہ سب کے سب قرانی مقاصد کو سمجھنے کے لیے بمنزلہ آلہ ہیں جس وجہ سے انہیں علوم اٰلیہ کہا جاتا ہے اور آیاتِ قرآنیہ کے الفاظ کی اپنے معانی پر دلالت اور اُن کے باہم ارتباط کی پہچان کے لیے ذرائع ہیں جس وجہ سے اِنہیں موقوف علیہ بھی کہا جاتا ہے کہ غیر اہل لسان یعنی اہل عجم اِن کے بغیر قرآن شریف کے عام فہم مسائل کو بھی نہیں سمجھ سکتے ہیں اور قرآن شریف کے ترجمہ کا تعلق اُس کے رموز واسرار کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اِس سے مقصد قرآن شریف کے عام معانی اور عوام کے لیے قابلِ فہم مفاہیم سے دوسری زبان والوں کو آ گاہ کرانا ہوتا ہے جس کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ ترجمہ کے الفاظ، الفاظِ متن کے اُن تقاضوں کے مطابق ہوں جو اِن علوم آلیہ کے حوالہ سے ہوتے ہیں اور ایسا کرنا مترجم کے لیے ممکن ہے، تحت القدرۃ ہے اور دونوں زبانوں کے ماہر کے لیے آسان ہے گویا ترجمۃ القرآن کی مذکورہ تعریف ''ھو ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التی تقوم مقامھا'' اِس میں لفظ ''تقوم مقامھا'' سے مقصد الفاظِ قرآنی کے صرف اُن تقاضوں کے مطابق ہونا ہے جو اِن علوم آلیہ کے حوالہ سے ہیں اور یہ قرآن شریف کے معارف

اور اُس کے رُموز واسرار کے مقابلہ میں اگر چہ محدود ہیں تاہم بجائے خود کثیر ہیں کہ کسی فن اور کسی بھی لسانی حیثیت سے خلاف ہونے والا ترجمہ غلط ہوتا ہے جبکہ الفاظِ قرآنی کی لسانی حیثیات اپنی محدودیت میں بھی لامحدود وبے شمار ہیں۔ اِس طریقے سے ترجمۃ القرآن میں غلطی کی اِس راہ کی جملہ شاخوں کو سمجھنے کے لیے علوم آلیہ اور قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ فنون کی جملہ شاخوں کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ اِسی فلسفہ کے تحت قرآن شریف کے ترجمہ کی درستی کے لیے جو فطری شرائط ہیں اُن کی فہرست میں آیاتِ قرآنیہ کی معتاد لسانی اور اُن کی جملہ فنی حیثیات کا اِدراک سب سے مقدم ہے جس کے بعد ترجمہ والی زبان کی جملہ لسانی حیثیات کے اِدراک کا مرتبہ ہے۔ جس کے مطابق دوزبانوں میں سے کسی ایک کی لسانی حیثیت سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی بے مقصد اور غلط قرار پاتا ہے۔ ایسے میں ترجمۃ القرآن میں غلطی کی اِس راہ کی وسعت اور اِس کے جزئیات کی کثرت میں کس کو شک ہوسکتا ہے بخلاف دوسری اور تیسری غلط راہ کے کیوں کہ اُن کی واقعی صورتیں ایک ایک سے زیادہ نہیں ہیں، جو درج ذیل ہیں؛

دوسری راہ:۔ کسی لفظ کو ترجمہ کیے بغیر چھوڑ دیا جائے کہ اِس صورت میں ترجمہ کی حقیقت ہی متاثر ہوگی کیوں کہ جب ترجمہ میں اُس سے بدل کوئی لفظ اور کوئی جملہ ہی نہیں ہے تو پھر ''ابدال لفظة بلفظة'' کا کیا تصور باقی رہتا ہے۔

تیسری راہ:۔ ترجمہ میں کوئی ایسا لفظ یا کوئی ایسا جملہ استعمال کیا جائے جس کے بدل کے طور پر متن میں کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔

ترجمۃ القرآن کی اِس تعریف کہ ''ھو ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التی تقوم مقامھا'' اِس کی جامعیت ومانعیت کے حوالہ سے **الحاصل والمحصول** مندرجہ ذیل اُمور ہیں:

❶ ترجمہ کے ایک ایک لفظ کا متنِ قرآن کے ایک ایک لفظ کا ایسا بدل ہونا ضروری ہے کہ اُس کے قائم مقام ہوسکے یعنی اُس سے جو معنی ومراد ہے اُس کے مطابق ہونے سے لے کر اُس کی

تمام قابلِ فہم لسانی حیثیات کے مطابق ہو۔

❷ ترجمہ کے الفاظ کا متنِ قرآن کے الفاظ کے مطابق ہونے میں وہ علوم وفنون معتبر ہیں جو قرآن فہمی کے لیے بمنزلہ آلہ اور موقوف علیہ کا درجہ رکھتے ہیں مثلاً علم اللغۃ، علم الاشتقاق، علم تصریف، علم نحو، علم المعانی، علم البیان اور علم البدیع جیسے تمام علوم وفنون کیوں کہ قرآن شریف اِن سب پر محیط ہے۔

❸ اِن علوم وفنون کے حوالہ سے ترجمہ کے الفاظ کا متنِ قرآن کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کی تمیز صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جو اِن تمام فنون میں مکمل دسترس رکھتے ہوں ورنہ کسی ایک میں ناتواں وبے استعداد شخص کے لیے بھی قرآن شریف کا ترجمہ کرنے کی جرات کرنا بے مصرف، خیانت اور ناجائز ہوگا چہ جائیکہ ایک سے زیادہ میں ناتواں کے لیے جائز ہو سکے کیوں کہ کل مکاتب فکر اہلِ اسلام کے اسلاف اِس بات پر متفق ہیں کہ قرآن فہمی کے لیے بمنزلہ آلہ اِن تمام علوم وفنون میں مہارت حاصل کیے بغیر قرآن شریف کی تفسیر کرنا حرام ہے، حدیث نبوی "من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوا مقعده من النار" (ابوداؤد) کا مظہر اور گناہ ہے تو پھر ترجمۃ القرآن کیوں جائز ہو جبکہ تفسیر کی نسبت ترجمہ کا معاملہ زیادہ سخت ہے، کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضِی احتیاط ہے، نیز ترجمۃ القرآن کی حقیقت اگر چہ تفسیر سے جدا مستقل چیز ہے تاہم لُغوی مفہوم کے اعتبار سے تفسیر کی ایک جھلک ترجمہ میں بھی پائی جاتی ہے کیوں کہ لُغت کے مطابق تفسیر فَسَّر سے (ف، س، ر) کی اِسی ترتیب سے اشتقاق پا کر وجود میں آئی ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو ظاہر کرنا جبکہ ترجمہ والی زبان میں بھی قرآن شریف کے معانی اُس زبان کے جاننے والوں پر ظاہر کیے جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف کا جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہو اُس زبان کے عرف میں اُسے معنوی قرآن سمجھا جاتا ہے گویا تفسیر وترجمہ ایک دوسرے سے مختلف اور جدا جدا فن

ہوتے ہوئے بھی باہمی مربوط ہیں کہ ترجمۃ القرآن میں تفسیر کا لغوی مفہوم پایا جاتا ہے جبکہ تفسیر اپنی صحت میں ترجمہ کی درستی پر موقوف ہے ورنہ غلط ترجمہ پر بنا ہونے والی تفسیر کبھی درست نہیں ہوسکتی، نیز ترجمہ اگرچہ تفسیر سے جدا مستقل چیز ہے مفسرین کے اقوال و آراء پر موقوف ہونے کے بجائے صرف اپنی شرائط پر استوار ہوتا ہے تاہم تفسیر سے ترجمہ کو روشنی ضرور ملتی ہے اور نہ ہی مترجم کو سہولت کاری ملنے سے انکار نہیں کیا جاسکتا خاص کر اُن آیاتِ قرآنیہ کا ترجمہ کرنے میں جو کسی بھی فن کے حوالہ سے معرکۃ الآراء ہیں ایسے تمام مقامات پر مترجم کو مفسرین سے روشنی لینی ہوتی ہے۔ تفسیر و ترجمہ کے باہمی ارتباط کے یہ معارف ناقابلِ انکار حقائق ہونے کی طرح ترجمۃ القرآن کا تفسیر سے مشکل ہونا بھی واضح حقیقت ہے کیوں کہ تفسیر کرنے یا لکھنے میں جواز کے دائرہ میں رہتے ہوئے مفسّر کو بہت کچھ کہنا اور لکھنا جائز ہوتا ہے جو مترجم کے لیے جائز نہیں ہے، تفسیر کے الفاظ کا قرآن شریف کے الفاظ سے زیادہ ہونا ضروری ہے ورنہ تفسیر کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا جبکہ ترجمہ میں متن قرآن کے الفاظ سے زیادہ الفاظ استعمال نہ کرنا ضروری ہے بلکہ اِس کے لیے متن کے الفاظ کے مطابق نپے تُلے الفاظ استعمال کرنا ہوتا ہے جیسا ترجمۃ القرآن کی تعریف ''ھو ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التی تقوم مقامھا '' سے معلوم ہو رہا ہے مگر یہ کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے تنگیٔ دامن کا عارضہ ہو جو اُصولِ فطرت ''الضرورات تبیح المحظورات '' کی طرف لے جاتا ہے۔

❹ ترجمہ کے الفاظ کا متنِ قرآن کے الفاظ کے قائم مقام ہونا اور اُن کی متعارف حیثیات کا حامل ہونا جو ضروری ہے اِس میں ایک قابلِ فہم اور ضروری بات یہ بھی ہے کہ الفاظِ قرآنی کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم:۔ جو مذکور فی الکلام ہوتے ہیں جیسا عام حالات میں ہوتا ہے کہ لکھے، دیکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔

دوسری قسم:۔ جو مذکور فی الکلام نہیں ہوتے، لکھے اور پڑھے بھی نہیں جاتے لیکن کلام کی نوعیت کے مقتضا ہوتے ہیں جنہیں مقدر فی الکلام بھی کہا جا سکتا ہے اور مذکور حکمی بھی۔ مثال کے طور پر آیت کریمہ ''وَکُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَاتَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ''(۱) جس میں جانبِ معطوف یعنی ''لَاتَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ'' بمنزلہ استثناء ہے ماقبل کے عموم سے یعنی ''وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا'' سے کیوں کہ اگر امتناعی حکم کی یہ صورت نہ ہوتی تو وہ اپنے کمال عُموم وشُیوع کی بنا پر اس کے نقیض یعنی ''اَکْلِ شجرہ'' کو بھی شامل ہوتا تو پھر اِسے بمنزلہ استثناء کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔ اِسی فلسفہ کے تحت امام جلال الدین السیوطی نے اِس قسم اشباہ ونظائر سے متعلق مستقل عنوان قائم کیا ہے جسے الموصول لفظاً والمفصول معناً کہا جاتا ہے۔(۲) اِسے وصل اور فصل جیسے متضاد اوصاف سے یاد کرنے کی وجہ ظاہر ہے کہ حرفِ عطف ''وَ'' ماقبل کے ساتھ وصل چاہتا ہے جبکہ استثنائی صورت فصل چاہتی ہے۔ جس منادیٰ سے حرفِ نداء محذوف ہو جیسا ''يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا''(۳) جیسے مقامات میں ہے وہ بھی اور مجاز بالحذف جیسا ''وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ''(۴) میں ہے یہ بھی اِسی قبیل سے ہیں جس کے مطابق اِن کے تراجم میں بالترتیب لفظ ''مگر، اے، اہل'' جیسے الفاظ کا اضافہ حقیقت میں الفاظِ متن سے اضافہ نہیں ہے، کہ ترجمۃ القرآن کی حد سے نکلنے کا تصور ہو سکے بلکہ اُن میں حکماً موجود الفاظ کے عِوض کہلاتے ہیں۔

ایک اشتباہ کا ازالہ:۔ ترجمۃ القرآن کے سلسلہ میں ہماری اِس توضیح سے اُن حضرات کو مغالطہ لگ سکتا ہے جو الفاظ مقدرہ اور الفاظ منویہ کے مابین تمیز کرنے سے قاصر ہیں ہمارا تجربہ

(۱) البقرة:35۔

(۲) الاتقان فی علوم القرآن،ج:1،ص:92۔

(۳) یوسف:29۔

(۴) یوسف:82۔

ہے کہ درسِ نظامی کی گودامی تعلیم سے فارغ تحصیل علماء کرام کی غالب اکثریت مقدر فی الکلام اور مَنوِی فی الکلام کے مابین تفریق نہیں کرتے ہیں جو علم البیان کی رُو سے غلط ہے کیوں کہ امامانِ بلاغت اور سخن شناس دُنیا کے نزدیک اُن میں نفی واثبات کا فرق ہے جسے تقابل ایجاب وسلب بھی کہا جاسکتا ہے بلکہ متناقفین بھی اِس کی تفصیل اِس طرح ہے کہ کلام میں جو چیز مقدر ہوتی ہے چاہے اُس کی تقدیر کا پسِ منظر وفلسفہ جو بھی ہو۔ بہر حال وہ ملفوظ کے حکم میں ہوتی ہے اور ترجمہ میں اُس کے عوَض لفظ استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے جبکہ منوی فی الکلام مذکور کے حکم میں نہیں ہوتا ورنہ اُسے منوِی کون کہے۔ اِس لیے ترجمہ میں اُس کے عوَض لفظ استعمال کرنے کا تصور ہی نہیں رہتا کیوں کہ ترجمہ کا ہر لفظ عام حالات میں متن کے کسی لفظ سے بدل ہی ہوتا ہے جیسا اُس کی تعریف سے ظاہر ہو رہا ہے۔ جس کی واقعی صورتیں صرف دو ہیں، ایک ملفوظ اور دوسری مقدر، جبکہ منوِی کی دُنیا ہی جدا ہے، حقیقتاً مذکور ہے نہ حکمًا بلکہ متکلم کے ذہن یا اُس کے دل کے سوا اِس کے وجود کے لیے ظرف اور محل ہی نہیں ہے تو پھر ترجمہ میں اُس کے عوَض لفظ لانے کا کیا جواز باقی رہتا ہے۔

علم البیان اور بلاغت کے اِس اُصول کے مطابق تشبیہ بلیغ کی تیسری قسم جس میں مشبہ نہ حقیقتاً مذکور فی الکلام ہوتا ہے نہ تقدیرًا بلکہ صرف متکلم کے دل ودماغ میں ہوتا ہے جیسا آیت کریمہ ''صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ''(۱) میں ہے یہ بھی منوی فی الکلام کے قبیل سے ہے ترجمہ کے حوالہ سے اِن کی بالترتیب مثالیں اِس طرح ہوگی ''يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ''(۲) اے یوسف اِسے چھوڑ۔ جس میں لفظ ''اے'' مقدر فی الکلام ''یا'' سے عوَض بن رہا ہے۔ اِسی طرح آیت کریمہ ''وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا ''(۳) کے ترجمہ ''اور اُس بستی والوں سے پوچھ لے جس میں ہم

---

(۱) البقرۃ:18۔

(۲) یوسف:29۔

(۳) یوسف:82۔

تھے۔''میں لفظ''والوں''متن کے الفاظ سے زیادہ نہیں بلکہ اُس میں مقدر لفظ''اہل''سے عوض بن رہا ہے اِس کے برعکس اگر آیت کریمہ''صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ''(۱) کے ترجمہ کو اِن پر قیاس کر کے''وہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں''کہا جائے غلط ہوگا، اُس کے مطابق نہیں ہوگا بلکہ متن سے زیادہ اور بے مصرف ہوگا کیوں کہ یہاں پر لفظ''وہ''سے متعلق یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ یہ متن کے کسی لفظ سے عوض ہے۔ظاہر ہے کہ اِس کے لیے معوض عنہ کہلانے کے قابل کوئی لفظ موجود نہیں حقیقتاً نہ حکماً کیوں کہ جمہور مفسرین کے مطابق آیت کریمہ کا یہ حصہ تشبیہ بلیغ کی تیسری قسم کے قبیل سے ہے جس میں مشبہ جو یہاں پر کفار ومشرکین کے حواس ہیں نہ حقیقتاً مذکور ہیں نہ تقدیراً بلکہ منوی کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔جس کے مطابق ترجمہ یوں ہوگا''بہرے، گونگے، اندھے ہیں''اِس کی ترتیب اِس طرح ہے کہ''بہرے، گونگے، اندھے''بالترتیب آیت کریمہ میں حقیقتاً مذکور تینوں الفاظ کے ترجمے ہیں جبکہ لفظ''ہیں''حکم کا اظہار ہونے کے ساتھ مبتداء مقدر سے بھی عوض ہے جو کفار ومشرکین کی ذات سے عبارت ہے جس کی تعبیر مفسرین نے''هُمْ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ''جیسے انداز سے کی ہے کیوں کہ مفسر ہونے کی حیثیت سے کچھ توضیح وتفہیم کرنی ضروری ہوتی ہے ورنہ تفسیر کا مطلب ہی کیا ہے لیکن تفسیر کا درست ہونا ترجمہ کے درست ہونے کو مستلزم نہیں ہے کیوں کہ اِن کی حقیقتیں اور لوازمات ایک دوسرے سے مختلف ہیں، تعریف وغرض اور موضوع جدا ہیں، شرعی احکام اور عرفی پہچان مختلف ہیں۔

حقائق کی اِس روشنی میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جن مترجمین نے آیت کریمہ''صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ''کے ترجمہ میں''وہ بہرے ہیں گونگے ہیں، اندھے ہیں''جیسے انداز اختیار کیا ہے اُن سب نے صرف تفسیروں پر انحصار کیا ہے، تفسیر کو ترجمہ کے لیے معیار بنایا ہے اور ترجمہ کو اُس کی شرائط پر استوار کرنے کے بجائے تفسیر پر بنا کیا ہے جسے استحسان کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا کیوں کہ ترجمہ تفسیر سے مختلف حقیقت ہے اور مستقل فن ہے جو مستقل شرائط ولوازمات پر مبنی ہے اُس کی

---

(۱) البقرۃ:18۔

بہتری کے لیے تفسیروں سے روشنی لینا اگرچہ مناسب اور مُمِد ہے لیکن شرائط اور متن کی لسانی حیثیات سے صرفِ نظر کر کے محض تفسیر پر بنا کرنے کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے مترجمین کو لگنے والے اِس مغالطہ سے ترجمۃ القرآن کی اہمیت پر مزید روشنی پڑ رہی ہے کہ یہ عام ترجمہ کی طرح نہیں ہے بلکہ اِس کا حق ادا کرنے کے لیے ہمہ جہت نظر وفکر کرنی ہوتی ہے، متنِ قرآن کی جملہ لسانی حیثیات کو پیشِ نظر رکھنا ہوتا ہے اور قرآن فہمی کے لیے تمام موقوف علیہ عُلوم وفنون سے روشنی لینی ہوتی ہے جن کی ایک جھلک علم البیان کے حوالہ سے مقدر فی الکلام اور منوِی فی الکلام کے مابین تفریق بھی ہے جس سے غفلت کی بِنا پر مترجمین نے قرآن شریف کے منوی فی الکلام مقامات کا ترجمہ مقدر فی الکلام کے انداز پر کرنے کی غلطی کی ہے شاید علم بلاغت کی اِن باریکیوں سے غافل مترجمین ومفسرین کو تنبیہ کرتے ہوئے امامانِ بلاغت نے فرمایا ہے:

''ان الواقف علی تمام مرادالحکیم تعالٰی وتقدس من کلامہ مفتقر الی ھٰذین العلمین کل الافتقار فالویل کل الویل لمن تعاطی التفسیر وھو فیھما راجل''(۱)

یعنی حکیم سبحانہ وتعالٰی کے کلام سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنے کے درپے شخص علم المعانی اور علم البیان کی طرف ہر طرح محتاج ہے پھر پوری طرح خرابی ہے اُس شخص کے لیے جو اِن کے بغیر کتاب اللہ کی تفسیر کرنے کے درپے ہوتا ہے۔

امام الراغب الاصفہانی نے فرمایا: ''ولا حظ فی معرفتہ لمن لم یتوفر نصیبہ من البلاغۃ''(۲)

اِس کی معرفت میں اُس کا حصہ نہیں ہے جسے بلاغت سے پورا حصہ نہیں ملا۔

جاراللہ الزمخشری نے قرآن فہمی کے لیے علم بلاغت کی اہمیت کے سلسلہ میں کافی تفصیل لکھنے کے

(۱) مفتاح العلوم، حصہ علم البلاغت، ص:70، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت۔

(۲) مقدمۃ التفسیر امام الراغب الاصفہانی المطبوع مع مفردات القرآن، ص: 585، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی۔

بعد کہا ہے:"ولایغوص علی شیء من تلك الحقائق الا رجل قدبرع فی علمین مختصین بالقرآن وھما علم المعانی وعلم البیان"(۱)

یعنی قرآنی معارف کے سمندر میں غوطہ زنی کرکے اِن حقائق کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوگا مگر وہی شخص جو قرآن شریف کے ساتھ مختص دو علموں میں سربرآوردہ ہو اور وہ دو علم المعانی اور علم البیان ہیں۔

ایک متوقع اشتباہ کا ازالہ:۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں اِمامانِ بلاغت کی طرف سے علم المعانی اور علم البیان کو سب کچھ کہنے اور اِس کے بغیر قرآن شریف کی سمجھ ناممکن قرار دینے سے ممکن ہے کسی کو یہ مغالطہ ہو جائے کہ اِس کے بعد کسی دوسرے فن کی ضرورت نہیں رہتی خاص کر مفتاح میں یوسف السکاکی کی مذکورہ عبارت سے اِس اشتباہ کو مزید تقویت ملتی ہے کہ اُنہوں نے دوسرے لسانی علوم (صرف، نحو، متنِ لُغت اور علم اشتقاق وغیرہ) سے بھی بحث کی ہے لیکن کسی ایک سے متعلق بھی یہ نہیں لکھا کہ اس کے بغیر قرآن شریف کی فہم ناممکن ہے جیسا بلاغت سے متعلق لکھا ہے جبکہ حقیقت میں اِن تمام علوم وفنون کی ضرورت ہے کہ ان کے بغیر قرآن شریف کی فہم ممکن ہے نہ ترجمہ۔

اِس کا جواب یہ ہے کہ اِمامانِ بلاغت کی مذکورہ عبارات سے مقصد دوسرے لسانی علوم وفنون سے اِستغنا بتانا ہرگز نہیں بلکہ اِس سے واحد مقصد قرآن فہمی اِن دونوں کی پوری فہم پر موقوف بتانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اِن دونوں سے ناواقف اور بے کمال شخص قرآن شریف کی فہم میں کمال پیدا نہیں کرسکتا جو عین حقیقت ہے اور واقعہ کی عکاسی ہے کیوں کہ یہ دونوں علم بلاغت کہلاتے ہیں اور بلاغت کی حقیقت "مطابقة الکلام لمقتضی الحال مع فصاحته" سے عبارت ہے کہ کلام کے تمام ترکیبی اجزاء فصیح ہونے کے ساتھ وہ مقتضائے حال کے بھی مطابق ہو اور ظاہر ہے کہ فصاحت کی پہچان صَرف، نحو، اشتقاق اور متنِ لُغت جیسے لسانی علوم کے رُموز کو پہچانے بغیر ممکن نہیں

---

(۱) مقدمة الکشاف المطبوعه مع ج:1، ص:16، مطبوعه دارالمعرفه بیروت۔

ہے یہ اتنا آسان مسئلہ ہے کہ علم بلاغت کی ابتدائی اور درسی کتابیں پڑھنے والوں سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ حقیقت کی اِس روشنی میں اِمامانِ بلاغت کی مذکورہ عبارات کی جامعیت کو دادِ تحسین دیئے بغیر کون رہ سکتا ہے کہ قرآن فہمی کے لیے علم المعانی اور علم البیان کی اہمیت بتانے کے ضمن میں اُن تمام عُلوم وفنون کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو فہم قرآن کے لیے بمنزلہ آلہ اور موقوف علیہ ہیں۔ (فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْجَزَآء)

ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ:۔ قرآن شریف کا اندازِ بیان اگرچہ برزخ بین الخطاب والکتاب ہے اور علی الاطلاق نظم ہے نہ نثر بلکہ ہر ایک کا رنگ لیا ہوا برزخ بین القسمین ہے اور ہر لحاظ سے انسانی کلام کی جملہ اصناف سے ماوراء و بے مثل ہونے کے باوجود تینوں بنیادی قسموں کی جھلک پر مشتمل ہے یعنی حقیقت، مجاز و کنایہ جیسا انسانی کلام اِن تینوں سے خالی نہیں ہوتا ویسا قرآن کے خطاب و تفہیم کو مخاطبین پر آسان کرنے کیلئے اِن سے ماوراء اور کسی غیر مانوس انداز پر نہیں رکھا ہے۔

حقیقت:۔ ہر وہ لفظ یا کلام ہے جسے اُس کے اپنے ماوُضع لہ میں استعمال کیا جائے۔

مجاز:۔ وہ لفظ یا وہ کلام ہے جسے اُسے کے ماوُضع لہ کے غیر کسی دوسرے معنیٰ ومفہوم میں استعمال کیا جائے اور ماوُضع لہ مراد نہ ہونے پر قرینہ موجود ہو۔

کنایہ:۔ ہر وہ لفظ اور وہ کلام ہے جسے اُس کے ماوُضع لہ میں استعمال نہ کیا جائے اور ماوُضع لہ مراد نہ ہونے پر کسی قسم کا قرینہ بھی موجود نہ ہو۔

قرآن شریف اِن سب پر مشتمل ہے اور سب کی فہم بھی آسان ہے مگر یہ کہ مجاز کی خاص قسم ''تشبیہ'' اپنی کثرت تنوع اور تلون کی لطافتوں کی بنا پر قابلِ توجہ ہے خاص کر استعارہ اور تشبیہ بلیغ کی وہ قسم جس میں مشبہ نہ حقیقتاً مذکور فی الکلام ہوتا ہے نہ حکماً یعنی محذوف بھی نہیں ہوتا بلکہ صرف اور صرف متکلم کی نیت میں ہوتا ہے۔ ایسے تمام مواقع پر استعارہ اور تشبیہ بلیغ کے مابین تفریق کرنا سامع وقاری دونوں کے لیے امتحان سے کم نہیں ہوتا جیسا انسانی کلام میں اِن کے مابین تمیز کرنا

مشکل ہے ویسا قرآن شریف میں بھی ہوتا ہے کیوں کہ قرآن کریم کے بہت سے مقامات بھی ایسے ہی معرکۃ الآراء ہیں۔ جن مفسرین نے بلاغت کے حوالہ سے قرآن شریف کی تفسیر کی ہے اُنہوں نے بھی سب سے زیادہ اِسی کو موضوع بحث بنایا ہے خاص کر جار اللہ الزمخشری نے لیکن تفسیر کشاف کے بعض مقامات پر اِس حوالہ سے کچھ اِبہام پائے جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر اِس فن میں کم استعداد رکھنے والے حضرات کو مغالطہ بھی لگا ہے اُن میں سے ایک مقام سورۃ البقرہ، آیت 18 ''صُمٌّ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ'' بھی ہے جسے عند المحققین تشبیہ بلیغ کے قبیل سے شمار نے کے بعد یہ بھی کہا ہے کہ اِس میں مشبہ مذکور ہے جو منافقین سے عبارت ہے، کشاف کی عبارت یوں ہے؛

''فان قلت هل يُسمّٰى ما فى الآية استعارةً قلت مختلف فيه المحققون على تسميته تشبيهًا بليغًا لا استعارةً لان المستعار له مذكور وهم المنافقون و الاستعارة انما تطلق حيث يطوىٰ ذكر المستعار له ويجعل الكلام خلوًا عنه صالحًا لان يراد به المنقول عنه والمنقول اليه لو لا دلالة او فحوى الكلام''(۱)

اور ظاہر ہے کہ مستعار لہ یعنی مشبہ یہاں پر مذکور ہونے کی ظاہری صورت یہی ہے کہ منافقین کی طرف راجع ہونے والی ضمیر ''هُم'' محذوف ہے اور محذوف مذکور کے حکم میں ہوتا ہے جس کے مطابق تقدیر عبارت ''هُم صُمٌّ بُكْمٌ عُمْىٌ'' ہو گی جو تشبیہ بلیغ کی تین قسموں میں سے کس کی فہرست میں شامل ہے واضح ہونے کے بجائے مزید ابہام واشتباہ میں پڑ رہی ہے جبکہ تشبیہ بلیغ کی اعلیٰ قسم وہ ہے جس میں مشبہ حقیقتاً مذکور ہو نہ حکمًا یعنی عملاً ملفوظ بھی نہ ہو اور محذوف بھی نہ بلکہ صرف اور صرف نسیاً ہو اور عند التحقیق آیت کریمہ بھی اِسی پر محمول ہے جسے سمجھنے کے لیے ذخیرہ تفسیر پر انحصار کرنے کا نتیجہ بے سود ہو گا کہ اِس سے اشتباہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا کیوں کہ مفسر کو بہت کچھ کہنے اور لکھنے کی گنجائش ہوتی ہے جو مترجم کے لیے ممکن نہیں۔ نیز مترجم اور مفسر کے پیشِ نظر مقاصد اور غرض وغایت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ اِس دلدل سے نکل

(۱) تفسیر الکشاف، ج:1، ص:204، تحت الآیۃ المذکورہ۔

کہ حدیث نبوی ''دع مایریبك الی ما لایریبك '' کی راہ اختیار کرنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ اصل فن اور بلاغت کے مسلمہ اماموں کی طرف رجوع کرنا ہوگا جنہوں نے تشبیہ کی اِس معرکۃ الآراء قسم میں اطمینان بخش فرق بتایا ہے کہ جس مقام پر مشبّہ بہ جسے مستعار منہ اور منقول عنہ جیسے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے اپنے حقیقی معنی پر محمول نہ ہو بلکہ مشبہ کے معنی پر محمول ہو وہ استعارہ ہوتا ہے جبکہ اِس کے برعکس ہونے کی صورت میں تشبیہ بلیغ ہوتا ہے۔مثال کے طور پر ''رئیت اسدا'' جس میں اداۃ تشبیہ مذکور ہے نہ وجہ تشبیہ اِسی طرح مشبّہ بھی مذکور نہیں ہے نہ حقیقتاً نہ حکماً کہ محذوف ہو جسے مذکورِ تقدیری بھی کہا جاسکتا ہے یہاں پر لفظ ''اسد'' اگر اپنے حقیقی معنی پر کہ حیوان مفترس ہے نہیں بلکہ معنی مجازی یعنی مشبہ کے معنی پر محمول ہے کہ اِس کی جگہ اُسے استعمال کرکے ''رئیت رجلا شجاعا'' کہنا درست ہو تو اِس صورت میں تشبیہ بلیغ نہیں بلکہ استعارہ متعین ہوگا اور اگر لفظ ''اسد'' اپنے حقیقی معنی پر محمول ہو کہ اُس کی جگہ ''رئیت رجلا شجاعا'' کہنا درست نہ ہو تشبیہ بلیغ متعین ہوگا جو تشبیہ بلیغ کی تیسری قسم کہلاتی ہے جس میں مشبہ یعنی ''رجل شجاع'' حقیقتاً مذکور ہے نہ حکماً بلکہ متکلم کی نیت کے سوا اور کہیں نہیں ہے جیسے متکلم نے اپنے ذہن میں عین ''اسد'' ہونے کا تصور کیا ہے۔

استعارہ اور تشبیہ بلیغ کی تیسری قسم کے مابین تفریق کے اِس نکتے کو سمجھنے کے لیے مطول کی مندرجہ ذیل عبارت ''من باب التشبیه المطوی فیه ذکر المشبه کما فی الاستعارة و هو مشکل لان المشبه فیه لیس بمذکور ولا مقدرویمکن التفصی عن هذا الاشکال بان الاستعارة تجب ان تکون مستعملة فی غیر ماوضع له وعلامته ان یصح وقوع اسم المشبه موقعه ولا یفوت الا المبالغة فی التشبیه فیصح فی نحو رئیت اسدا ان یقال رئیت رجلا شجاعاوهذالیس کذلك علی مایظهر بالتامل وکذا لایصح ان یراد بالبحرین الموصوفین المؤمن والکافر لان قوله تعالیٰ ''ومن کل تاکلون لحماطریا وتستخرجون حلیة تلبسونها''ینبیء عن انه تعالیٰ قصد التشبیه

لاالاستعارة و ارادتفضيل البحرالاجاج على الكافربانه قد يشارك العذب في المنافع والكافر خلوعن المنفعة فهوفي طريقة قوله تعالٰى "فهي كالحجارةاواشد قسوة وان من الحجارة لما يتفجرمنه الانهار" ولخفاء ذٰلك ذهب كثيرمن الناس الى ان الآيتين من قبيل الاستعارة وان صاحب الكشاف اوردهما مثالين للاستعارة و لا يخفي ضعفه على من تامل لفظ الكشاف "کو دیکھنے کی ضرورت ہے جس میں دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا گیا ہے اِس کی تائید وتصدیق اور تحسین کرتے ہوئے میر سید السند کی مندرجہ ذیل توضیح بھی اپنی مثال آپ ہے:

"هذاالكلام جيدفان المدارفي الفرق بين الاستعارة والتشبيه اذاتردد بينهما ان اسم المشبه به ان كان مستعملافي معنى المشبه كان استعارة وان كان مستعملافي معناه الحقيقي كان تشبيهاوعلامة كونه مستعملا في معنى المشه اى ومن لوازم استعماله فيه ان يصح وقوع اسم المشبه موقعه فاذا انتفى هذه العلامت كما في الآيتين بشهادة الفطرة السليمة بعد التامل فيهماانتفى كونه استعارة وكان تشبيها سوآء كان المشبه مذكورابالفعل او مقدرافي نظم الكلام اولا يكون مذكورا ولا مقدرانعم يجب كون المشبه مرادافي معنى الكلام وان لم يمكن تقديره في نظمه على وجه لا يختل نظامه"

جبکہ مطول کے شارح چلپی نے بھی اِس کی تصدیق کرتے ہوئے مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے:

"ان معيار الفرق بين الاستعارة والتشبيه هوانه ان صح حذف المشبه به و اقامة المشبه مقامه بحيث لا يفوت الا المبالغة فاستعارة والافتشبيه"

اور عبدالحکیم السیالکوٹی علی المطول نے اِن سب کی تصدیق وتوثیق کرنے کے ساتھ اِس فن کے ساتھ شغف رکھنے والوں کو جو روشنی دی ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

"ليس المرادبالمقدرخلاف المذكوراى المحذوف فان المحذوف عندهم

کالمذکورفھوداخل فی قولہ مذکوربل المرادبہ ان لا یکون مرادامنویا ایضافان الاستعارۃ المتفق علیھا مایکون المشبہ فیھا معرضاعنہ بالکلیۃ بان لا یکون مذکوراولا محذوفا لاتمام الکلام ولا منویا مرادابان یکون اسم المشبہ بہ مستعملا فی معنی المشبہ بحیث لو اقیم لفظ المشبہ مقامہ لاستقام الکلام الا انہ یفوت المبالغۃالمستفادۃ من الاستعارۃوفی التشبیہ یکون مستعملا فی معناہ الحقیقی فلا یستقیم اقامت اسم المشبہ مقامہ وبذٰلک یعرف کون اسم المشبہ مرادافی التشبیہ دون الاستعارۃ''

اہل فن کی طرف سے کی گئی تحقیق کی اِس روشنی میں سورۃ البقرہ، آیت 18 صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ'' کا تشبیہ بلیغ کی تیسری قسم ہونے میں شک کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے جس میں منافقین کے تینوں مشاعر یعنی کان، آنکھ اور عقل مشبّہ ہونے کی حیثیت سے حقیقتاً مذکور ہیں نہ حکماً بلکہ منوِی کے سوااور کچھ نہیں ہیں تو اس کے ترجمہ میں ''وہ بہرے، گونگے ہیں اندھے ہیں'' کہنے کا قطعاً کوئی جواز نہیں رہتا کیوں کہ ترجمہ کا ہر لفظ متن کے کسی لفظ کا عوض ہوتا ہے اور مُعوض عنہ مذکور حقیقی یا مذکورِ حکمی سے خالی نہیں ہوتا جبکہ اِن دونوں کے مقابلہ میں آنے والا مذکور منوی مُعوض عنہ ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ ایسے میں آیت کریمہ کے معیاری ترجمہ میں ''بہرے، گونگے اندھے ہیں'' جیسے انداز کے سوا کچھ اور ممکن نہیں ہے لیکن مترجمین کی غالب اکثریت پرافسوس کہ اُنہوں نے آیت کریمہ کو فنِ بلاغت کے مذکورہ انداز میں دیکھنے کے بجائے تفسیروں سے دھوکہ کھا گئے۔ (فیاللعجب لھذاالعجب)

ترجمۃ القرآن کی مذکورہ تعریف کا ایک مقتضاء یہ بھی ہے کہ ترجمہ کے الفاظ کو متنِ قرآن کے مطابق کرنے کے لیے **آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم اول اور مفہوم ثانی** کے مابین فرق کو سمجھا جائے۔ اِس کی تفصیل اِس طرح ہے کہ قرآن شریف کتاب مبین ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ وَ كِتَابٍ مُّبِیْنٍ ''(۱) یہ روشن کتاب کی آیات ہیں۔

---

(۱) النمل:1۔

نیز فرمایا: ''تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ''(۱)

یہ آیتیں ہیں قرآن اور روشن کتاب کی۔

نیز فرمایا: ''تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ''(۲)

یہ آیتیں ہیں کتاب اور روشن قرآن کی۔

نیز فرمایا: ''وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ''(۳)

قرآن شریف کی صفت ہونے کی حیثیت سے لفظ ''مُبِیْن '' متعدی بھی ہو سکتا ہے اور لازم بھی **اول صورت** میں اِس کے معنی ہوں گے کہ وہ اپنے مضامین و احکام اور مرادِ الٰہی کو اپنے سامعین و قارئین پر واضح کرنے والی کتاب و قرآن ہے۔

دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنے مضامین و احکام اور مرادِ الٰہی کے حوالہ سے واضح ہے، ظاہر اور سہل الفہم ہے اور سننے اور پڑھنے والے کسی خفا و تکلیف کے بغیر، اُسے سمجھ سکتے ہیں۔

جبکہ اہل علم یہ بھی جانتے ہیں کہ قرآن شریف کی بعض آیات مثلاً کنایات و متشابہات کا معاملہ اِس سے مختلف ہے ورنہ اُنہیں کنایہ و متشابہ اور مجمل و خفی جیسی صفات سے یاد کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا۔ نیز ظاہری احکام اور واضح مضامین کے علاوہ آیاتِ قرآنیہ کچھ ایسے رُموز و معارف پر بھی مشتمل ہیں کہ عام قاری و سامع کی فہم سے ماوراء ہیں جن کی فہم و اِدراک سے خواص اہل اللہ ہی مستفیض ہوتے ہیں۔

اِس کے جواب میں اختلافِ جہات کا قول کیا جاتا ہے جو قابلِ فہم بھی ہے اور معقول بھی کہ مبین والی صفت اُس کی ذات کے اعتبار سے ہے کہ کسی تخصیص کے بغیر اُس کی ایک ایک آیت اُصولِ

---

(۱) یوسف:1۔

(۲) الحجر:1۔

(۳) یونس:61۔

فطرت کے مطابق مبین ہے جس میں کسی قسم کا تشابہ ہے نہ خفا جبکہ عدمِ مبین ہونا چاہے جس انداز سے بھی ہو مخاطبین وسامعین کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے اور وقت کے حوالہ سے بھی یعنی تمام سامعین ومخاطبین کی فہم ایک جیسی نہیں ہوتی مثلاً اہل لسان جتنا غیر اہل لسان نہیں سمجھ سکتے ہیں پھر اہل لسان میں بھی قرآن شریف کے نازل ہونے کے زمانہ میں موجود اہل لسان جتنا بعد والے اہل لسان نہیں سمجھ سکتے مُرورِ زمانہ کے ساتھ دوسری زبانوں میں فرق آنے کی طرح قرآن شریف کی زبان یعنی عربی میں بھی تبدیلی آئی ہے اگرچہ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں کم سہی پھر بھی تبدیلی سے انکار نہیں کیا جا سکتا جبکہ جمہور اہل عجم کی قرآن فہمی عرب کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اِسی طرح مجتہدین وعرفاء اپنی بصیرت ایمانی وحدس وجدانی کی بدولت جتنا اِدراک کر سکتے ہیں عام علماء کو وہ نصیب نہیں ہے علیٰ ہٰذا القیاس قرآن شریف کے تمام مخاطبین کی فہم یکساں نہیں ہوتی جبکہ اُس سے پہچانے جانے والے احکام ومفہومات کی بنیادی طور پر صرف دو قسمیں ہیں۔

مفہوماتِ قرآنیہ کی ایک اہم تقسیم:۔

اول:۔ جسے مفہوم اول کہا جاتا ہے۔ **دوم:۔** جسے مفہوم ثانی کہا جاتا ہے۔

مفہومِ اول وہ ہیں جس کے ساتھ جملہ مخاطبین مکلّف بھی ہیں اور اُس پر عمل کرنے کے ذمہ دار بھی یہ قرآن شریف سے پہچانے جانے والے وہ مفہومات ہیں جنہیں عام اہلِ لسان محض سننے اور پڑھنے کے ساتھ ہی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں جس میں اہل علم اور غیر اہل علم کی کوئی تفریق نہیں ہے جبکہ غیر اہل لسان یعنی عجمی لوگوں میں وہ حضرات بھی انہیں آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں جو قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم وفنون مثلاً صرف، نحو، بلاغت وغیرہ سے واقف ہوں۔

مفہوم ثانی سے مراد وہ رُموز واسرار اور عُلوم ومعارف ہیں جن کا اِدراک عوام الناس نہ بلکہ خواص اہل اللہ، مخصوص علماء اور نورِ بصیرت سے معمور سینے والے اولیاء اللہ ہی کر سکتے ہیں۔

قرآن شریف کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے سے غرض وغایت کا تعلق پہلے مفہوم

کے ساتھ ہے دوسرے سے نہیں یعنی ترجمہ کرنے سے جو مقصد پیشِ نظر ہونا ضروری ہے وہ آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم اول سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اِس میں کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ترجمہ کرتے وقت اُن تمام علوم آلیہ کو پیشِ نظر رکھا جائے جو قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ ہیں۔ ترجمۃ القرآن کے اُصول وشرائط کے سلسلہ میں یہ نکتہ ضبطِ تحریر میں لانے سے واحد مقصد ہمارا اُن حضرات کے پھیلائے ہوئے مغالطہ کا ازالہ کرنا ہے جنہوں نے لکھا ہے کہ قرآن شریف کے معارف اور رُموز واسرار لانہایت ہونے کی بِنا پر اُس کا ایسا ترجمہ ناممکن ہے جو جامع ہو۔ اِن حضرات کا یہ کلام ترجمۃ القرآن کو ناممکن اور ناجائز کہنے والوں کے لیے نکتۂ آغاز ہے۔ آنکھیں بند کر کے اِسے تسلیم کرنے والے کچھ حضرات نے اِس پر حرام کی بھی دفعہ لگائی ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہوگا یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اِن حضرات کو اگر قرآن شریف کے مفہوم اول اور مفہوم ثانی کی تمیز ہوتی یا ترجمۃ القرآن سے بنیادی مقصد اور غرض وغایت کا احساس ہوتا تو ایسی بات کبھی نہ کہتے یا نظم قرآن کے پردہ میں پوشیدہ لانہایت معارف کا جمہور الناس اور عام مخاطبین سے ماوراء ہونے کا تصور ہوتا تو ترجمۃ القرآن جیسی اہم تبلیغ اسلام پر حرام کی دفعہ کبھی نہ لگاتے۔ (فَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتکی)

خلاصۃ الکلام:۔ قرآن شریف کا ترجمہ کرنا اصل میں اُس کی تبلیغ ہے جس کا تعلق اُس کے مفہوم اول کے ساتھ ہے۔ مفہوم ثانی کا تعلق ترجمۃ القرآن سے ہے نہ تبلیغ قرآن سے اور قرآن شریف کے ترجمہ کو اُس کے مطابق اور بامقصد بنانے کے لیے مستقل شرائط ہیں جن کی توفیق میسر ہونے کے بعد ترجمہ بالیقین بامقصد ومعیاری ہوجاتا ہے۔ (وَاللّٰہُ الْھَادِی اِلٰی سَبِیْلِ الرَّشَادِ)

ترجمۃ القرآن کی تعریف کا ایک اور مقتضاء:۔

قرآن شریف کے ترجمہ کی مذکورہ تعریف ”ھو ابدال الفاظِ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التی تقوم مقامھا “ کا ایک اہم مقتضا یہ بھی ہے کہ اِس کے جملہ الفاظ مع ہیئت

کذا ئیہ متنِ قرآن کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے بھی مطابق ہوں۔ جسے بامحاورہ ترجمہ کہتے ہیں ورنہ ترجمہ بے مقصد ہوسکتا ہے۔ اِس کی تفصیل اِس طرح ہے کہ لُغت کی زبان میں ترجمہ کی دو قسمیں ہیں؛

1 ترجمۃ الالفاظ۔ 2 ترجمۃ الکلام

اِس مناسبت سے کہا جاسکتا ہے کہ ترجمۃ الفاظ القرآن اور ترجمۃ القرآن کیوں کہ قرآن شریف کلام اللہ ہے جو نفس الفاظ نہیں بلکہ الفاظ ومعانی کے مجموعہ مرکب کا نام ہے۔

اول قسم: ۔ترجمہ الفاظ القرآن حقیقی قرآن کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف الفاظ کی تبدیلی ہے کیوں کہ حقیقی قرآن محض الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ الفاظ دالّہ اور معانی مدلولہ کے مجموعہ کا نام ہے جیسا اُصولِ فقہ کی کتابوں میں لکھا ہوا سب کو معلوم ہے کہ ''**هُوَ اِسْمٌ لِلنِظْمِ وَالْمَعْنٰی جَمِیْعًا**''(۱) یعنی قرآن شریف الفاظ ومعنی کے مجموعہ کا نام ہے۔

دوم قسم: ۔ترجمۃ القرآن حقیقی قرآن کا ترجمہ ہے یعنی قرآن شریف کے الفاظ دالہ اور معانی مدلولہ کے مجموعہ مرکب کا جس میں ترجمہ والے الفاظ اصل کے الفاظ کے قائم مقام کہلانے کے قابل ہیں کہ اِن سے اُن کی لسانی، فنی اور مرادی حیثیت پہچانی جارہی ہے اور ترجمہ والی زبان کے محاورہ کو حقیقی قرآن کے محاورہ کے تابع اور اُس کے مطابق کرکے مرادِ الٰہی کی حتی المقدور فہمائش کی جارہی ہے یہ ہے بامحاورہ ترجمہ کا حقیقی مفہوم جس کے مطابق ہر معیاری ترجمہ بامحاورہ ہوتا ہے اور ہر بامحاورہ ترجمہ شرائط کے مطابق ہوتا ہے، معنوی قرآن ہوتا ہے یہی متعارف فی الاسلام ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں ترجمۂ الفاظ القرآن صرف اور صرف ناپختہ بچوں کی فہمائش کے لیے ہوتا ہے کہ قرآنی الفاظ اور صرف الفاظ کے فقط لُغوی مفہوم کی کچھ فہمائش ہوجائے جس کے بعد ترجمۃ القرآن کی طرف قدم بڑھانا آسان ہوجائے۔

عرفِ عام میں ترجمۃ القرآن کی قطعاً کوئی تقسیم نہیں ہے بلکہ یہی ایک حقیقت ہے جسے بامحاورہ

(۱) حسامی، بحث کتاب اللہ۔

ترجمہ بھی کہا جاسکتا ہے، معیاری بھی اور شرائط کے مطابق بھی جس میں ترجمہ والی زبان کے محاورہ کو قرآن شریف کے محاورہ کے تابع، اُس کی فرع اور اُس کے مطابق کر کے ترجمۃ القرآن کو قابلِ فہم کیا جاتا ہے اور بس۔ باقی بامحاورہ ترجمہ سے متعلق یہ تصور کہ قرآن شریف کے محاورہ اور اُس کی لسانی اور فنی حیثیت کو ترجمہ والی زبان پر قربان کیا جائے یا یہ تصور کہ ترجمہ کی شرائط کو پامال کر کے بھی متن کو ترجمہ والی زبان کا تابع بنایا جائے تو اِس کی گنجائش اسلام میں نہیں ہے اور اِس کے قبائح وخطرات نہایت بھیانک ہیں۔ (اَعَاذَنَااللّٰہُ مِنۡہُ)

لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ غلط تراجم کو تحفظ دینے کے لیے بامحاورہ ترجمہ کا بہانہ ڈھونڈنے والوں کی غالب اکثریت اِس ''ظُلُمٰت بَعۡضُهَافَوۡقَ بَعۡضٍ'' میں مبتلا ہے۔ البتہ لُغت کے اعتبار سے ترجمۃ الالفاظ اور ترجمۃ القرآن کی بھی دو قسمیں ہیں۔

ترجمۃ الالفاظ کی دو قسموں کی تفریق:۔

پہلی قسم:۔ جو کلماتِ مفردہ کے حوالہ سے ہوتی ہے کسی غیر مشہور اور غیر مانوس الاستعمال لفظ کے معنیٰ کو کسی دوسری قابلِ فہم زبان کے الفاظ میں بیان کیا جائے جیسے عربی ''اسد'' اور ''غضنفر'' کا بالترتیب ترجمہ ''شیر اور ببر شیر'' میں کیا جائے اور فارسی کے ''تسمۂ پاء'' کا ترجمہ کھوار زبان کے ''چھاری'' میں کیا جائے علیٰ ہٰذا القیاس۔ جس مفرد لفظ کا بھی کیا جائے اُسے ترجمۃ اللفظ ہی کہا جائے گا اور تفسیر وتشریح یا تفہیم کہنا بھی کافی حد تک درست ہوگا کہ جس زبان میں اُس کا ترجمہ کیا جارہا ہے اُس زبان کے جاننے والوں کے لیے تفسیر بھی ہے تشریح وتفہیم بھی، گویا ترجمۃ الالفاظ کا یہ انداز تعریفِ لفظی کی ایک جھلک ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اِس میں اصل کے مفہوم کو دوسری زبان کے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے جبکہ تعریفِ لفظی میں دوسری زبان کے الفاظ میں کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اصل کی زبان میں بھی ہوسکتی ہے جو اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔

دوسری قسم:۔ جس میں الفاظِ مفردہ کے نہیں بلکہ کسی مضمون اور مرکب تام وکلام کے مختلف حصّہ

الفاظ کے لغوی معانی دوسری زبان کے الفاظ میں بیان کیے جاتے ہیں جس میں اُن کی ترکیبی حیثیت اور مرادی مفہوم کو ظاہر کرنا مقصد نہیں ہوتا کہ وہ مسند ہے یا مسند الیہ، مضاف ہے یا مضاف الیہ، موصول ہے یا موصوف، عامل ہے یا معمول وغیرہ۔ ترجمۃ الالفاظ کی اس قسم میں کبھی کبھی کلام کے الفاظ مفردہ کی ترکیبی حیثیت آپ ہی ظاہر ہو جاتی ہے جسے حُسنِ اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے اِس کی عملی مثالوں کو سمجھنے کے لیے بھی حضرت شاہ رفیع الدین کا ترجمہ کافی ہے جس میں حسنِ اتفاق سے ترکیبی حیثیت ظاہر ہونے کی مثالوں کی بھی کمی نہیں ہے اور ظاہر نہ ہونے کی مثالیں بھی بہت ہیں۔ مثال کے طور پر ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ '' تک تینوں آیتوں کے ترجمۃ الالفاظ میں اِسم جلالت اور اُس کے بعد مذکور ہونے والے چاروں اوصاف ''الْعٰلَمِيْنَ، اَلرَّحْمٰنِ، الرَّحِيْمِ، مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ '' کا ترکیبی ربط ظاہر نہیں ہورہا کہ اسم جلالت موصوف اور یہ چاروں اُس کی بالترتیب اوصاف ہیں کیوں کہ اُردو محاورہ کے مطابق موصوف وصفت کے ارتباط کے لیے اُن کے مابین لفظ ''جو'' کا استعمال ضروری ہوتا ہے جو ترجمۃ الالفاظ میں نہیں بلکہ ترجمۃ الکلام میں ہوتا ہے جو یہاں پر موجود نہیں ہے جیسا ترجمہ کے الفاظ ''سب تعریف واسطے اللہ کے پروردگار عالموں کا بخشش کرنے والا مہربان خداوند دن جزا کا'' سے صاف ظاہر ہے کہ متن کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ اُردو زبان میں ظاہر کیا گیا ہے جو درست اور اصل کے لغوی مفہوم کے مطابق ہے لیکن متن کی ترکیبی حیثیت اور اُس سے مرادی مفہوم ظاہر کرنے سے قاصر ہے جبکہ اِس کے متصلاً بعد آیت نمبر 4 کے الفاظ کا جو ترجمہ کیا گیا ہے اُس میں متن سے مرادی مفہوم ظاہر ہونے کے ساتھ مسند ومسند الیہ کا ارتباط بھی ظاہر ہورہا ہے جو ترجمہ کے الفاظ ''تجھ ہی کی عبادت کرتے ہیں ہم اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں'' سے آپ ہی واضح ہورہا ہے۔

الغرض ترجمۃ الالفاظ کی پہلی قسم کی حقیقت تعریفِ لفظی سے مختلف نہیں ہے جو لفظی تشریح کہلانے کے زیادہ قابل ہے جس کے معنون اور مُبدل منہ میں ہی کلام تام وجملہ نہیں ہے تو پھر

ترجمہ میں کہاں سے آئے گا۔ انجامِ کار اُس میں کلام کا تصور ہی نہیں ہے چہ جائیکہ اسے کسی کتاب، کسی متن اور کسی مضمون کا ترجمہ کہنا درست ہو۔ اِس کے مقابلہ میں دوسری قسم کے اجتماعی مفہوم سے حسنِ اتفاق کے طور پر کبھی کلام بھی ظاہر ہوتا ہے اور متن والے کلام کا ترجمہ ہونا محسوس ہوتا ہے اِس کے باوجود اِسے ترجمۃ الکلام نہیں بلکہ ترجمۃ الالفاظ کے نام سے موسوم کیا جائے کیوں کہ متعارف مفہوم میں ترجمۃ الکلام کا وجود اُس کی علت غائی کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اُصولِ فطرت ''یستحیل وجود المعلول بدون علته'' سے خلاف ہونے کو ممکن نہیں کہا جا سکتا۔ اور اہل علم جانتے ہیں کہ متعارف مفہوم میں ترجمۃ الکلام کی علتِ غائی اور اِس سے مقصد متن والے کلام کی عبارۃ النص سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے جبکہ ترجمۃ الالفاظ کی کسی قسم اور کسی بھی صورت سے مترجم کا مقصد اِفادۃ الکلام اور افادۃ مقصد المتکلم نہیں بلکہ مفردات الکلام کے اِفادہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا یہ وہ نکتہ ہے جس سے غفلت کی بِنا پر بعض اہل علم ترجمۃ الالفاظ کی اِس دوسری قسم کی تعبیر ترجمہ تحت اللفظ کے عنوان سے کرتے ہیں اور اِسے ترجمۃ الکلام کی ایک مستقل قسم کہتے ہیں جو بامحاورہ ترجمہ کے مقابلہ میں سمجھا جاتا ہے اِس حوالہ سے ہندوپاک کے وہ علمی حلقے جو ترجمۃ القرآن جیسے کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاطِ عمل کو آسان سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں اُن کے پورے ماحول میں ترجمۃ الکلام کی یہی دو قسمیں مشہور ہیں یعنی تحت اللفظ ترجمہ اور بامحاورہ ترجمہ۔

انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ تاثر سراسر غلط ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ متعارف ترجمہ ہمیشہ تحت اللفظ ہوتا ہے۔ فنِ ترجمہ میں فوق اللفظ ترجمہ کا کوئی تصور ہی نہیں ہے کیوں کہ ہر ترجمہ کے متن کو فوقیت حاصل ہوتی ہے وہی اصل ہے جبکہ ترجمہ اُس کے ماتحت اور اُس کی فرع ہے اور اُس کے تابع ہونے کی بِنا پر ہمیشہ اُس کے ماتحت، اُس کے قائم مقام اور اُس کے مطابق ہونا ضروری ہے تو پھر اِس تقسیم کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ بامقصد ترجمۃ الکلام ہمیشہ بامحاورہ ہوتا ہے اور ہندوپاک کے اِن حلقوں میں بامحاورہ ترجمہ کے بارے میں بھی وہ تصور نہیں ہے جو ہونا چاہئے کیوں کہ ترجمۃ الکلام کو تحت اللفظ اور بامحاورہ کی طرف تقسیم کہنے والے اِن حلقوں کے نزدیک بامحاورہ

کا معیار یہ ہے کہ وہ ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے مطابق ہو آگے عام ہے چاہے متن والی زبان کے محاورہ کے مطابق ہو یا نہ ہو، نیز جملہ شرائط کے مطابق ہو یا نہ ہو، نیز متن کے سیاق وسباق کے مناسب ہو یا نہ ہو، جبکہ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ ترجمۃ الکلام کے سلسلہ میں بامحاورہ ترجمہ کا ایسا تصور ممکن نہیں ہے جس میں اصل کو ترجمہ والی زبان پر قربان کیا جائے یا اصل کو فرع کے تابع کیا جائے بلکہ بامقصد ترجمۃ الکلام کی صرف ایک ہی قسم ہے جو بامحاورہ ہے اِس لیے کہ کسی بھی کلام کا بامقصد اور معیاری ترجمہ بے محاورہ نہیں ہوسکتا کیوں کہ بے محاورہ ہونے کا مطلب اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ متن کی لسانی حیثیت سے یا ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت سے یا دونوں سے خلاف ہے جبکہ اِن سب میں شرط کی مخالفت ہے جو دونوں زبانوں کی لسانی حیثیت کے مطابق ہونا ہے۔ایسے میں کسی بھی کلام کے بامقصد اور معیاری ترجمہ کو بے محاورہ کہنا یا بامحاورہ کے مقابلہ میں ترجمۃ تحت اللفظ کے عنوان سے شہرت دینے کو معقول کہا جاسکتا ہے نہ مناسب۔نیز محاورہ عربی زبان کا لفظ ہے اور علم تصریف کے مطابق باب ''مُفَاعَلَه'' کا مصدر ہے جو عربی کی طرح اُردو زبان میں بھی کثیر الاستعمال ہے۔جس کا مفہوم ہے باہم گفتگو کرنا، کسی کلام کا تکرار کرنا اور ایک دوسرے سے مراجعۃ الکلام کرنا جیسا زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر عنترہ نے اپنے مدِ مقابل کو کلام کی سمجھ سے قاصر و نااہل قرار دیتے ہوئے کہا ہے؛

لو کان یدری ماالمحاورۃ اشتکی ولکان لو علم الکلام مکلمی (۱)

یعنی وہ اگر گفتگو کے سلیقہ کو جانتا میں اُس کی شکایت کرتا اور وہ گلہ وشکوہ کرنے کا مستحق بھی ہوتا کاش میرے ساتھ ہم کلامی کرنے والا یہ جانتا۔

نیز محاورہ مصدر مجہول اور کبھی حاصل بالمصدر المجہول کے انداز پر اُس کلام کو بھی کہتے ہیں جو کسی زبان میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہو یعنی ''اَلْکَلَام المُرَدَّد'' کلام میں اِن دونوں طریقوں سے اِس کا استعمال عربی وعجمی دونوں میں ہوتا ہے جبکہ مفردات کے لیے مستعمل ہونے کی کوئی مثال

(۱) مجمع البیان، ج:10، ص:370۔

اور کوئی محاورہ موجود نہیں ہے عربی میں نہ عجمی میں تو پھر ترجمۃ الالفاظ کے لیے اِسے استعمال کرنے کا کیا جواز ہوسکتا ہے۔

خلاصۃ الکلام:۔ ترجمۃ الالفاظ اور ترجمۃ الکلام دو الگ الگ چیزیں ہیں جن کے مفہوم بھی اور مصداق بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں ترجمۃ الالفاظ پر لفظ ترجمہ کا اطلاق کرنا حقیقت لُغویہ کے طور پر ہے جس میں عرف کا کوئی دخل نہیں ہے اِس کے برعکس ترجمۃ الکلام پر لفظ ترجمہ کا اطلاق حقیقتِ عرفیہ کے طور پر ہے جو حقیقتِ لُغویہ کے بھی منافی نہیں ہے، کسی بھی کلام کا با مقصد اور معیاری ترجمہ ہمیشہ با محاورہ ہوتا ہے شرائط کے مطابق ہوتا ہے اِس میں لفظی ترجمہ یا تحت اللفظ ترجمہ جیسے الفاظ و تقسیمات جو سننے کو ملتی ہیں یہ بعض علمی حلقوں کی ناقص فکر ہے۔ اسلاف میں اِس کا کوئی ثبوت ہے نہ مثال اور درایۃ اِسے تسلیم کرتی ہے نہ روایت۔

با محاورہ اور بے محاورہ ترجمہ کی قسمیں:۔

با محاورہ ترجمہ اور بے محاورہ ترجمہ آپس میں ضدین ہیں کہ ایک کا وجود دوسرے کے عدم کی دلیل اور ایک کا عدم دوسرے کے وجود کی دلیل ہے۔ نیز با محاورہ ترجمہ کی صرف ایک صورت ہے کہ اس میں ترجمہ والی زبان کے محاورہ کو قرآن شریف کے محاورہ کے تابع اور متن کی فرع اور اُس کے مطابق رکھ کر ترجمۃ القرآن کو قابلِ فہم بنایا جاتا ہے یہ تب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب دونوں زبانوں کی لسانی حیثیت سے لے کر اُن کی فنی حیثیات تک تمام لوازمات و تقاضوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہو ورنہ کسی ایک چیز میں عدم مطابقت کی صورت میں بھی ترجمہ با محاورہ کے دائرہ سے نکل کر بے محاورہ کے خانہ میں داخل ہوسکتا ہے جبکہ بے محاورہ ترجمہ کی تین صورتیں ہیں:

پہلی صورت:۔ ترجمہ والی زبان کے مطابق اور متن والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہو۔ جیسا ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' شریف کے مندرجہ ذیل تراجم:

''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت مہربان رحمت والا ہے۔''

''شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان رحمت والا ہے۔''

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان رحم کرنے والا ہے۔''

یہ سب ترجمہ والی زبان یعنی اُردو محاورہ کے مطابق ہیں کیوں کہ اُردو کے محاورہ میں صفت وموصوف کے مجموعۂ مرکب کی تعبیر مرکب تام کے انداز میں کرنے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا جبکہ متن کے محاورہ سے خلاف ہے کیوں کہ یہاں پر اسم جلالت یعنی لفظ ''اللہ'' موصوف ہے اور ''الرحمٰن، الرحیم'' بالترتیب اُس کی صفات ہیں جبکہ موصوف وصفت کا مجموعہ مرکب جو ترکیب توصیفی کہلاتا ہے مرکب تام و جملہ نہیں ہوتا جس وجہ سے اِن میں لفظ ''ہے'' کہنا لسانِ قرآنی سے خلاف، عربی محاورہ کے منافی اور غلط ہے کیوں کہ یہ مرکب غیر تام کو جملہ کہنے سے مختلف نہیں ہے جسے سننے کے لیے نحاۃ تیار ہیں نہ بُلغاء اور لسانِ قرآنی میں اِس کی کوئی مثال موجود ہے نہ محاورہ عرب میں تو پھر اِسے ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' شریف کا بامحاورہ ترجمہ کہنے کا کوئی جواز ہی نہیں رہتا کیوں کہ بامحاورہ ترجمہ کہلانے کے قابل وہی ہوتا ہے جس میں ترجمہ والی زبان کے محاورہ کو متن کے محاورہ اور اُس کی لسانی حیثیت کے مطابق بنا کر اصل مقصد کی فہمائش کی جائے۔ جس کے مطابق بسم اللہ شریف کا بامحاورہ ترجمہ (اللہ کے نام سے شروع جو مہربان رحمت والا، اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمت والا مہربان) جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا ہے جو دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ شرائط کے بھی مطابق ہے۔

دوسری صورت:۔ اول الذکر سے برعکس ہے یعنی ترجمہ متن کے محاورہ کے مطابق اور ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہوتا ہے جیسا آیت کریمہ ''قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ'' کا کیا گیا ترجمہ:

''فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں ہم کو کوئی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا بے شک آپ بڑے علم والے حکمت والے ہیں۔''

جس میں اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ ''آپ'' استعمال کیا گیا ہے جو اُردو محاورہ سے خلاف ہے کیوں

کہ اُردو محاورہ میں لفظ ''آپ'' انسانوں کے لیے ہی استعمال کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے لیے تخاطب کا یہ انداز مانوس ہے نہ یہ لفظ تو پھر ترجمہ کے اِس انداز کو اُردو محاورہ سے خلاف نہ کہیں تو اور کیا کہیں لیکن متن کے خلاف نہیں ہے کیوں کہ لفظ ''آپ'' نفس مخاطب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اِس اعتبار سے یہاں پر اِسے متن کے ضمیر مخاطب ''كَ، تَ، اَنْتَ'' کے مطابق ترجمہ کہا جاسکتا ہے بشرطیکہ لفظ ''آپ'' سے مراد یہاں پر مخاطب مع التعظیم نہ ہو ورنہ ان کے مصداق کی تعظیم و آداب کو انسانوں کی تعظیم و آداب پر قیاس کر کے لفظ ''آپ'' استعمال کرنے کی صورت میں ترجمہ بے محاورہ کی دوسری قسم سے نکل کر تیسری قسم میں شامل ہو جائے گا جو متن کے محاورہ سے بھی خلاف ہے اور ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے بھی۔

تیسری صورت:۔ جو ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے بھی اور متن کے محاورہ سے بھی خلاف ہو جیسا ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' شریف کا کیا گیا ترجمہ ''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔'' جسے ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے مطابق کہا جاسکتا ہے نہ متن کے کیوں کہ اُردو محاورہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کرنا مانوس نہیں ہے تو پھر ترجمہ کے اِس انداز کو اُس کے محاورہ کے مطابق کون کہے اور متن کے محاورہ سے خلاف اِس لیے کہ اُس کی لسانی حیثیت سے منافی ہے جبکہ علم بلاغت اور نحوی اُصولوں کے مطابق یہاں پر متن کے اِسم جلالت ''اللہ'' موصوف اور ''الرَّحْمٰنِ، الرَّحِيْمِ'' بالترتیب اُس کی صفات ہیں اور موصوف وصفت سے مجموع مرکب جملہ نہیں بلکہ مرکب توصیفی کہلاتا ہے جو جملہ کے مقابلہ میں مفرد اور مرکب غیر تام ہے جس کے برعکس اِس ترجمہ میں لفظ ''ہے'' لگا کر اُسے جملہ ظاہر کیا گیا ہے کیوں کہ لفظ ''ہے'' مفرد پر اور لفظ ''ہیں'' جمع پر حکم لگانے کے لیے مختص ہیں جو مرکب تام اور جملہ کے بغیر استعمال نہیں کیے جاتے۔ ایسے میں ترجمہ کے اِس انداز کو متن کے حوالہ سے بامحاورہ کہا جاسکتا ہے نہ ترجمہ والی زبان کے حوالہ سے۔

خلاصۃ الکلام بعد التفصیل:۔ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ جو معنوی قرآن کہلانے کے قابل ہوتا ہے ہمیشہ بامحاورہ ہوتا ہے اور بامحاورہ سے مراد یہ ہے کہ متن کی لسانی حیثیت کے مطابق ہونے کے ساتھ ترجمہ والی زبان کی لسانی حیثیت کے بھی مطابق ہو ورنہ کسی ایک سے خلاف ہونے کی صورت میں بھی بامحاورہ ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوتا۔ اِس کے علاوہ دوسری شرائط اپنی جگہ ضروری ہیں جن کی پابندی کیے بغیر قرآن شریف کا ترجمہ معیاری نہیں ہوسکتا۔

ترجمۃ القرآن کی تعریف سے متعلق مباحث کے سلسلہ میں چوتھے نمبر کی یہ بحث قدرے لمبی ہوگئی جو بے مصرف نہیں ہے کیوں کہ اِس کے بغیر ترجمۃ القرآن کی حقیقت واضح ہوتی ہے نہ اُس کی افادیت۔

۵ قرآن شریف کے متن کا کوئی لفظ یا کوئی جملہ وحصہ ترجمہ کے بغیر نہ رہے اِسی طرح متنِ قرآن کے الفاظ سے کوئی لفظ ترجمہ میں زیادہ نہ ہونے پائے ورنہ ترجمۃ القرآن کا ثبوت ہی ممکن نہیں ہوگا کیوں کہ اِس سلسلہ میں مُعوّض عنہ اور مُعوض یعنی متنِ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ کے الفاظ میں بدلنے والا عمل اُس کے ثبوت کے لیے بمنزلہ رُکن ہے جس کے بغیر ترجمہ کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔ اِسی ایسی مثال ہے جیسے رکوع، سجود کے بغیر نماز کا ثبوت ممکن نہیں ہے جبکہ ترجمہ کے الفاظ کا متن کے الفاظ کے قائم مقام ہونا اور اُن کی جملہ لسانی حیثیات کا حامل ہونا اُس کی صحت کے لیے معیارِ ممیّز ہے کہ اِس کے بغیر ترجمہ کی صحت ممکن نہیں ہے مقصد اور افادیت نہیں ہے۔ ترجمۃ القرآن کی بزرگانِ دین سے منقول مذکورہ تعریف کی جامعیت و مانعیت کی اِس توضیح سے غرض اور موضوعِ بحث کی بھی کچھ پہچان ہوچکی ہے تاہم اِس کی اہمیت کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ مستقل طور پر بیان کیے جائیں۔ قرآن شریف کا ترجمہ کرنا جو فنِ ترجمہ کی اعلیٰ مثال اور عبادت ہی عبادت ہے، اسلام کی تبلیغ کا آغاز ہے اِس سے **غرض وغایت** قرآن شریف کے معانی و مقاصد اور اُس کے مفہومِ اول سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہے جو اُن کے حوالہ سے قرآن شریف کی تبلیغ کا آغاز ہے اور اُن کے لیے تفسیر و تفہیم کی بنیاد ہے کیوں کہ کسی بھی زبان میں آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر ہو یا تفہیم اُس کے ترجمہ کو ذہن میں مستحضر کیے

بغیر ممکن نہیں ہے۔ نیز تفہیم قرآن ہو یا تفسیر یا تاویل اُس کی صحت میں ترجمۃ القرآن کی صحت کو سب سے بڑا دخل ہے جس کے مطابق ترجمۃ القرآن کو تخم اور تفسیر و تفہیم اور تشریح و تاویل کو اُس سے پیدا ہونے والی پیداوار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ نماز میں قرأۃ القرآن سے عاجز شخص کے لیے قرأۃ کی جگہ ترجمۃ القرآن پڑھنے کے جواز اور تفسیر القرآن پڑھنے کے عدم جواز کی جو تفریق کتابوں میں پائی جاتی ہے اُس کا اصل فلسفہ بھی یہی کچھ ہے کہ ترجمۃ القرآن جس زبان میں بھی ہو اُس کے عرف میں اُسے معنوی قرآن سمجھا جاتا ہے جو تفسیر و تاویل اور تفہیم و تشریح جیسے عوامل کے لیے اصل الاصول ہے یہ شرف تفسیر کو حاصل ہے نہ تفہیم کو اور تشریح کو حاصل ہے نہ تاویل کو، کسی بھی تفسیر و تاویل یا تفہیم القرآن کے عنوان سے کسی بھی تعبیر و تشریح میں غلطی کے پسِ منظر کو دیکھا جائے تو غالب اکثریت کے ساتھ اُس کا نکتۂ آغاز اور بنیاد و منشاء ترجمہ کی غلطی کی صورت میں نظر آتا ہے یعنی جیسا تخم ویسی پیداوار۔ حقائق کی اِس روشنی میں اس کے پُر خطر ہونے میں کس کو شک ہوسکتا ہے۔ (وَاللّٰهُ الهَادِی اِلٰی سَبِیلِ الرَّشَادِ)

ترجمۃ القرآن کا موضوع:۔

متنِ قرآن کے الفاظ کے عِوَض ترجمہ والی زبان سے استعمال ہونے والے الفاظ ہیں اور مسلّمہ اُصول ہے کہ کسی فن کے موضوع کی ذات سے بحث کی جاتی ہے نہ اُس کی ذاتیات سے یہاں پر بھی ایسا ہے کہ متنِ قرآن کے الفاظ سے عِوَض کے طور پر استعمال ہونے والے الفاظ کی ذات اور ان کی ذاتیات یعنی اُن کی ذاتی حیثیت سے نہیں بلکہ متن کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے اِس طرح بحث کی جاتی ہے کہ ترجمہ کے تمام الفاظ آیت کریمہ کے مفہومِ اول پر دلالت کرنے کے حوالہ سے اصل الفاظ کی جملہ حیثیات کے مطابق ہو، اُسے درست ترجمہ کہا جاتا ہے جبکہ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اِس پورے عمل کو غلط کہا جاتا ہے اور ترجمہ کو غیر معیاری و بے مقصد قرار دیا جاتا ہے۔ بحث کی نوعیت کے اِس انداز کے مطابق معیاری اور با مقصد ترجمہ کی صرف ایک صورت ہے جس میں ترجمہ کے تمام الفاظ سے لے کر اُن کی ہیئت ترکیبی تک اصل کے مطابق ہو۔ مثال کے طور

پر متنِ قرآن میں جو لفظ فاعل کے طور پر مذکور ہے ترجمہ کا لفظ بھی فاعل کے طور پر ہو، وہ مفعول بہ کے طور پر مذکور ہے یہ بھی مفعول بہ کے طور پر اور وہ مضاف یا مضاف الیہ کے طور پر ہو یہ بھی ویسا ہی ہو اور مذکر ہے تو یہ بھی مذکر ہو اور مونث ہے یہ بھی مونث ہو، علی ہٰذا القیاس۔ پوری آیت کریمہ کا ترجمہ ہو یا اُس کے کسی حصے کا بہرحال ترجمہ کے تمام الفاظ اصل کے الفاظ کے مطابق ہوتے ہیں اِسی طرح اصل کی ہیئت ترکیبی کی نوعیت اگر مرکب تام ہے تو ترجمہ کے جملہ الفاظ کی ہیئت ترکیبی کی نوعیت بھی مرکب تام ہوتی ہے اور وہ مرکب غیر تام اور غیر جملہ ہونے کی صورت میں ترجمہ کی ہیئتِ ترکیبی کی نوعیت بھی مرکب غیر تام ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ ترجمہ کے جملہ الفاظ کی عرفی حیثیت متن کی عرفی حیثیت کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے کہ ترجمہ بامحاورہ کہلانے کے قابل ہو کیوں کہ ہر معیاری ترجمہ بامحاورہ ہوتا ہے جس پر اِس سے پہلے بھی کچھ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

بے مقصد اور غیر معیاری ترجمہ کی تین قسمیں:۔

پہلی قسم:۔ جس میں ترجمہ کے بعض الفاظ چاہے ایک ہی کیوں نہ ہو اصل سے خلاف ہو چاہے مخالفت کا یہ انداز جس حوالہ سے بھی ہو جس کے مطابق ترجمہ کی بے مقصدیت کی اِس قسم میں بے شمار قسمیں پائی جاتی ہیں اِس کی بھی ایک جھلک اول باب میں معلوم ہو چکی ہے۔

دوسری قسم:۔ جس میں ترجمہ کے تمام الفاظ اصل الفاظ کی جملہ حیثیات کے مطابق ہوتے ہیں لیکن اُن کے مجموعہ کی ہیئتِ ترکیبی کی نوعیت اصل کی ہیئت ترکیبی کی نوعیت سے خلاف ہوتی ہے۔

تیسری قسم:۔ جس میں یہ دونوں بے اعتدالیاں پائی جاتی ہوں۔

ترجمۃ القرآن سے بحث اور کسی قسم کی بھی گفتگو اِن چاروں قسموں میں منحصر ہے، نیز بامقصد اور معیاری ترجمہ کو دادِ تحسین دینے کی جو صورت بھی ہو اُس کا محور اصل کے ساتھ ترجمہ کی مطابقت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اِسی طرح بے مقصد و غیر معیاری ترجمہ کی مذمت کے سلسلہ میں کوئی گفتگو اور کوئی بحث بھی اصل کے ساتھ ترجمہ کی عدم مطابقت کی مذکورہ تین قسموں سے خارج

نہیں ہے اِن کی مثالوں کو بالترتیب سمجھنے کے لیے آیت کریمہ کے حصہ ''قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَۃٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُھَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ''(۱) کا اشرف علی تھانوی اور فتح محمد جالندھری کا کیا ہوا ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے۔ اول الذکر نے اِس کے ترجمہ کے طور پر لکھا ہے:

''آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو۔''

اور ثانی الذکر نے لکھا ہے ''موسیٰ نے کہا پروردگار فرماتا ہے کہ اُس کا رنگ گہرا زرد ہو کہ دیکھنے والوں کے دل کو خوش کر دیتا ہو۔''

یہ دونوں ترجمے اپنی ہیئت اجتماعی کی نوعیت کے اعتبار سے انشاء اِن دونوں کی ہیئت اجتماعی کا انداز جملہ اِنشائیہ کا جیسا اول الذکر میں لفظ (زرد رنگ کا بیل ہو، تیز زرد ہو، فرحت بخش ہو) سے اور ثانی الذکر کے لفظ (گہرا زرد ہو، دیکھنے والوں کے دل کو خوش کر دیتا ہو) سے صاف ظاہر ہے کیوں کہ اُردو محاورہ میں لفظ ہو کسی واقعہ سے خبر دینے کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ طلب کے لیے ہوتا ہے جو ہمیشہ جملہ انشائیہ ہوتا ہے اِس اعتبار سے یہ دونوں غیر معیاری ترجمہ کی دوسری قسم میں شامل ہوتے اور اُس کی مثال قرار پاتے ہیں بشرطیکہ انفرادی حیثیت سے اِن کے الفاظ کی متن کے الفاظ کے مطابق نہ ہونے کا اعتبار نہ کیا جائے اِس کے برعکس اگر اِن کے الفاظ کی فقط انفرادی حیثیت سے الفاظِ متن کی انفرادی حیثیت سے خلاف ہونے کا اعتبار کیا جائے کہ اول الذکر میں ''بَقَرَۃٌ صَفْرَآءُ'' کا ترجمہ ''زرد رنگ'' کے بیل میں کیا گیا ہے اور ثانی الذکر میں متن ''تَسُرُّ'' کے مؤنث لفظ کا ترجمہ ''خوش کر دیتا ہو'' میں کیا گیا ہے جو اُردو محاورہ میں مذکر کے ساتھ خاص ہے جس سے مترجم کی مراد ''بیل'' کے سوا اور کچھ نہیں ہے اِس صورت میں یہ دونوں غلط ترجمہ کی اول قسم میں شامل ہوں گے اور اُس کی مثال قرار پائیں گے اور اِن دونوں صورتوں کی انفرادیت سے برعکس اگر دونوں کا اعتبار کیا جائے کہ اِن کے الفاظ انفرادی حیثیت سے بھی آیت کریمہ کے انفرادی الفاظ کے معنی سے

---

(۱) البقرۃ:69۔

خلاف ہیں اور ہیتِ اجتماعی کی نوعیت بھی اُس کی ہیئت اجتماعی سے خلاف ہے تو پھر غلط ترجمہ کی تیسری قسم میں شامل ہوں گے اور اُس کی مثال قرار پائیں گے۔ باقی رہا یہ تصور کہ اِن کے انفرادی الفاظ اُس کے انفرادی الفاظ کے مطابق نہیں ہیں یہ اِس لیے کہ اُس میں لفظ ''بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ''، ''گائے'' کے ساتھ مختص ہے جو کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جو لسانِ قرآنی سے قدرے شغف اور نحوی قواعد سے کچھ واقفیت رکھتا ہو جس کے مطابق اُس سے مراد بیل لینا ہرگز جائز نہیں ہے چہ جائیکہ ترجمہ جائز ہو۔ اِسی طرح آیت کریمہ میں لفظ ''تَسُرُّ'' بھی مؤنث کا صیغہ ہے جس میں مستتر ضمیر مرفوع متصل سے مراد آیت کریمہ میں مذکور ہونے والی گائے کے سوا اور کچھ نہیں اور اِن ترجموں کی ہیئت اجتماعی کی نوعیت اُس کی ہیئت اجتماعی کی نوعیت سے خلاف اِس لیے ہے کہ یہ طلب وانشاء کے انداز پر ہیں جبکہ وہ جملہ خبریہ ہے تو پھر مطابقت اور اُس کے قائم مقام ہونے کا کیا تصور باقی رہتا ہے۔

تراجم کی دُنیا میں سب سے بڑا ظلم:۔

ایک آیت اور اُس کے بھی صرف ایک حصہ کے ترجمہ میں غلطیوں کی اِن تین قسموں کو جمع کرنے جیسی سنگین بے اعتدالیوں میں مذکور دو مترجم یعنی اشرف علی تھانوی اور فتح محمد خان جالندھری منفرد نہیں ہیں بلکہ ماتم کرنے کے قابل ایسی بے اعتدالیوں میں مترجمین کی غالب اکثریت مبتلا ہے جس کی سینکڑوں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' شریف کا اشرف علی تھانوی اور محمود الحسن کے کیے ہوئے بالترتیب یہ تراجم (شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں، شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے) جن میں ہیئت ترکیبی کی نوعیت متن کی ہیئت نوعیہ سے خلاف ہے کیوں کہ اِن میں لفظ ''ہے'' لگا کر مرکبِ غیر تام متن کے ترجمہ کو مرکب تام بنا دیا گیا ہے متن مرکب غیر تام اِس لیے ہے کہ صفت وموصوف سے مجموع مرکب ہے کہ اسم جلالت ''اللہ'' موصوف اور ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' بالترتیب یکے بعد دیگرے اُس کی صفات ہیں جسے علمی زبان میں مرکب

توصیفی کہا جاتا ہے جو جملہ کے مقابلہ میں مفرداور مرکب غیر تام کہلاتا ہے جبکہ لفظ ''ہے'' اور ''ہیں'' اُردو محاورہ میں مرکب تام اور جملہ کے ساتھ مختص ہیں کیوں کہ اِن میں حکم اور نسبت تامہ کا اظہار ہے جو مرکب غیر تام میں نہیں ہوتا یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ لسانِ قرآنی یعنی عربی زبان سے قدرے مناسبت رکھنے والوں سے بھی پوشیدہ رہ سکے بلکہ عربی قواعد کی ابتدائی کتابیں پڑھنے والے بچے بھی جانتے ہیں کہ صفت وموصوف سے مجموع مرکب کلامِ تام نہیں بلکہ مرکبِ تام کے مقابلہ میں مفرد اور غیر جملہ کہلاتا ہے۔

اِس غلطی میں دومختلف انداز کے مذکورہ تراجم شریک ہونے کے علاوہ اول الذکر میں ہیئتِ ترکیبی کو ایک اور وجہ سے بھی اصل کی ہیئت ترکیبی سے خلاف کیا گیا ہے کہ لفظ ''ہیں'' کہہ کر شانِ الٰہی کی تعظیم کو انسانوں کی باہمی تعظیم وادب پر قیاس کرکے اُس وحدہ لاشریک کے لیے جمع کا انداز اختیار کیا گیا ہے جو نہ صرف متن کی ہیئتِ ترکیبی کے خلاف ہے بلکہ ترجمہ سے قطع نظر کرکے اپنی جگہ بھی ناجائز ہے کیوں کہ تعظیم شانِ الٰہی کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کرنے کا تصور اسلام میں نہیں ہے۔ یہ انداز شرعی اُصولوں کے خلاف ہونے کے ساتھ اُردو محاورہ کے بھی خلاف ہے کیوں کہ اُردو محاورہ میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم وادب کے لیے مقام کی مناسبت سے اُس وحدہ لاشریک کی کسی صفت کو ذکر کیا جاتا ہے۔ اُس کی تعظیم انسانوں کی باہمی تعظیم کے انداز پر قیاس کرکے اُس واحد، احد، یکتا وصمد جل جلالہ وعم نوالہ کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کرنے کی مثال قرآن وسنت میں پائی جاتی ہے نہ اُردو محاورہ میں تو پھر ترجمہ کے اِس انداز کو ''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ'' شریف کی ہیئت ترکیبی کے مطابق کون کہہ سکتا ہے اِن دونوں سے بھی زیادہ قابلِ افسوس ترجمہ وہ ہے جس میں صفت ''الرَّحۡمٰنِ'' اور ''الرَّحِيۡمِ'' دونوں کو مرکبِ تام ظاہر کیا گیا ہے، یعنی ''یک نہ شُد دو شُد'' جیسا مفتی تقی عثمانی کا کیا ہوا ترجمہ ''شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربانی ہے، بہت مہربان ہے'' جس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ ہر شخص مانتا ہے اور جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب پر مہربان ہے اور بہت مہربان ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں ہے لیکن کسی بات کا اپنی جگہ درست ہونا ترجمہ کے درست

ہونے کو ستلزم نہیں ہے جبکہ یہاں پر ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ '' کے ترجمہ میں اِن دو لفظوں ''الرَّحْمٰنِ، الرَّحِيْمِ'' کے ترجمہ کے طور پر ایسا لکھا گیا ہے جو غلط فحش کے سوا اور کچھ نہیں ہے جسے ماہرین لسانیات سننا گوارا کرتے ہیں نہ ماہرین لُغت، نحوشناس اِسے پسند کرتے ہیں نہ امامانِ بلاغت اور عبدالرحمٰن جامی و سیبویہ اِسے مستحسن سمجھتے ہیں نہ تفتازانی و عبدالقاہر جُرجانی۔

ترجمۃ القرآن کے موضوع یعنی ترجمہ کے الفاظ و ہیئت ترکیبی کی نوعیت کا اصل سے خلاف ہونے کی یہ مثال صرف دوسری قسم تک محدود نہیں ہے بلکہ تیسری قسم کی بھی ایک جھلک ہے کیوں کہ مرکب توصیفی یعنی اِسم جلالت مع دونوں صفات ''الرَّحْمٰنِ، الرَّحِيْمِ'' کی ہیئت ترکیبی کی نوعیت جملہ نہیں ہے جبکہ اِس کا ترجمہ نہ صرف ایک جملہ بلکہ دو جملوں میں کیا گیا ہے اور اس اعتبار سے دوسری قسم کی مثال قرار پاتی ہے اور اِن صفات یعنی ''الرَّحْمٰنِ، الرَّحِيْمِ'' کا ترجمہ بھی جملہ اور مرکب تام میں کیا گیا ہے جیسا اُس کے مذکورہ الفاظ ''جو سب پر مہربانی بہت مہربان ہے'' سے صاف ظاہر ہے اِس اعتبار سے دوسری قسم کی مثال بھی قرار پاتی ہے اور ایسے میں تیسری قسم کی مثال ہونا آپ ہی واضح ہو جاتا ہے کیوں کہ جس ترجمہ کے الفاظ بھی الفاظ متن کی نوعیت سے خلاف ہوں اور ہیئتِ اجتماعی کی نوعیت بھی اصل کی اجتماعی نوعیت سے خلاف ہو وہی غیر معیاری ترجمہ کی تیسری قسم کہلاتا ہے جو پہلی اور دوسری قسم کی نسبت بمنزلہ کُل ہے اور یہ دونوں اُس کے لیے بمنزلہ جز و ترجمۃ القرآن کے نام سے معنوی تحریفات کی ایسی بہتات کا مشاہدہ محرک و باعث بن رہا ہے کہ ہم شرائط و اُصول ترجمہ دُنیا کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ علم کی دُنیا میں آ کر صحیح و سقیم کی تمیز کرنے کی صلاحیت کے بعد میرے نصف صدی پر محیط تجربہ نے مجھے یقین دلایا کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کرنا محال و ناممکن اگرچہ نہیں ہے تاہم دُنیائے عرفان کی مشکل ترین صنف ہے جو رب کریم ﷻ کی خصوصی توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اِس توفیق کی ارزانی اُسے نصیب ہوتی ہے جسے عام ترجمہ کے اُصول و شرائط پر عبور ہونے کے ساتھ ترجمۃ القرآن کی اضافی شرائط و اُصول اور لوازمات و تقاضوں کا بھی احاطہ ہو۔ ہزاروں صفحات میں تفسیر لکھنا آسان ہے اور آیاتِ قرآنیہ سے

متعلق تفہیم وتشریح کرنا بھی مشکل نہیں ہے جبکہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کرنے کی توفیق پانا سب سے مشکل ہے، سب سے اہم، سب سے مقدم اور سب سے زیادہ کثیر الشرائط ہے ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہے جس کے بغیر ترجمہ کے نام سے محض قرآنی الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ میں بدلنے اور محض لغوی معنیٰ کو اپنی سمجھ کے مطابق دوسری زبان کا لباس پہنانے یا اُس کی فنی حیثیت اور محاورہ کو ترجمہ والی زبان کے محاورہ کا تابع کرنے کا انجام ایسا ہی ہوگا جو اِن تراجم کی شکل میں دیکھنے کو مل رہا ہے جسے محض غلط اور انجانے میں معنوی تحریف کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

قرآن شریف کے آغاز ''بسم اللہ'' شریف کے ترجمہ میں آیت کریمہ سے خلاف ہونے کی اِن بنیادی تینوں قسموں کی یہ مثالیں محض مشتے نمونہ از خروارے ہے جس میں اہل علم کو دعوتِ فکر ہے کہ پورے قرآن شریف کے ترجمہ میں غیر معیاری مترجمین نے کیا کیا گُل نہ کھلائے ہوں گے، کیا بے اعتدالیاں نہ کی ہوں گی اور نادان دوست بن کر انجانے میں کیا کیا تحریفات کی ہوں گی، جس سے قرآن کو بچانے کے جذبہ کے تحت ہم اُصولِ ترجمہ کا یہ تحفہ پیش کر رہے ہیں۔ اِس اُمید سے کہ بغیر شرائط کے قرآن شریف کا ترجمہ لکھنے کی جسارت نہ کی جائے، غیر معیاری حضرات اِس پُر خطر صنف میں طبع آزمائی نہ کریں اور ترجمۃ القرآن کے نام سے بازار میں فروخت ہونے والی ہر تحریر کو معنوی قرآن سمجھنے کی غلطی نہ کریں بلکہ اِس کی صحت وجواز کے لیے واجبی شرائط کی روشنی میں معیاری وغیر معیاری کی تفریق کریں اس میں غلطی کسی انسانی کتاب کے ترجمہ میں غلطی کی طرح نہیں ہے بلکہ اِس کا سیدھا اثر آیت کریمہ کے معنیٰ پر ہوتا ہے، مرادِ الٰہی سے خلاف ہوتا ہے اور آیت کریمہ کی فنی حیثیت کے منافی ہوتا ہے۔ (اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنۡهُ) اور اِس دلخراش داستانِ غم کا حجم بہت وسیع ہے ہمارے وجدان کے مطابق غلط تراجم کی شکل میں جتنا ظلم قرآن شریف پر کیا گیا ہے اور ہو رہا ہے اتنا شاید کسی دُنیوی کتاب پر نہ کیا گیا ہو اپنے وجدان کی تصدیق وتائید کے سلسلہ میں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ نکتۂ آغازِ قرآن اور دیباچہ الکتاب یعنی ''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ'' شریف کے کیے گئے غلط تراجم کی ایک جھلک سے پردہ اُٹھادیں:

1 اشرف علی تھانوی ”شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔“

2 فتح محمد جالندھری ”شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔“

3 مفتی تقی عثمانی ”شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے۔“

4 عبدالماجد دریا آبادی ”شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔“

5 علامہ وحید الزمان ”شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان ہے رحم والا۔“

6 عاشق الٰہی میرٹھی ”شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے۔“

7 حافظ صلاح الدین یوسف اور مولانا عبدالجبار ”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربانی بہت رحم کرنے والا ہے۔“

8 سید محمد کچھوچھوی ”نام سے اللہ کے بڑا مہربان بخشنے والا۔“

9 مفتی شاہ مظہر اللہ دہلوی ”اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بخشش کرنے والا مہربان ہے۔“

10 مولانا ثناء اللہ امرتسری ”شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔“

11 ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری ”کہو اللہ بے حد مہربان بہت رحم کرنے والے کے نام سے ہی میرا شروع کرنا ہے۔“

12 مولانا محمد نعمت علی چشتی نظامی ”اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم فرمانے والا ہے۔“

13 ڈاکٹر محمد طاہر القادری ”اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔“

14 سید محمد وجیہہ السیما عرفانی ”میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں بہت رحم کرنے والا بڑی رحمتوں والا ہے۔“

15 سید فرمان علی ”خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان رحم والا ہے۔“

16 مولانا محمد جونا گڑھی ”شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔“

17 مولانا عبدالرحمٰن گیلانی ”اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔“

18 مفتی عزیز احمد قادری ”اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا ہے۔“

19 شیخ محمود الحسن ''شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔''

20 شاہ رفیع الدین ''شروع کرتا ہوں میں ساتھ نام اللہ بخشش کرنے والے مہربان کے۔''

21 حافظ نذیر احمد ''شروع اللہ کے نام سے جو نہایت رحم والا مہربان ہے۔''

22 مولانا عبدالحق دہلوی ''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔''

23 شیخ الحدیث مولانا غلام رسول سعیدی ''اللہ ہی کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے۔''

24 پیر کرم شاہ الازہری ''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔''

اِس وقت ہمارے مطالعے میں موجود یہ وہ تراجم ہیں جو مختلف مکاتب فکر کے مشاہیر نے کیے ہیں غلط تراجم کی مذکورہ تین بنیادی قسموں کے حوالہ سے اِن کا تجزیہ و تشخیص اِس طرح ہے کہ نمبر (4،8،20) غلط تراجم کی پہلی فہرست میں شامل ہیں جس میں ترجمہ کے الفاظ آیت کریمہ کے الفاظ کے قائم مقام ہونے کے قابل نہیں ہوتے اِن میں بھی ایسا ہی ہے اِس تفصیل سے کہ ترجمہ نمبر 4 ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کے لفظ ''الرَّحِيْمِ'' کا ترجمہ بار بار رحم کرنے والے میں کیا گیا ہے جو اُس کی فنی اور صرفی حیثیت سے خلاف ہے کیوں کہ وہ صفت مشبہ ہے جس میں انقطاع نہیں ہوتا بلکہ اِس کے ساتھ موصوف ذات جب تک موجود ہے اُس وقت تک اِس کے ساتھ اُس کا متصف ہونا بھی دائم و مستمر ہوتا ہے جس کے مطابق یہاں پر ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' میں بھی ذاتِ الٰہی کا اِن دونوں صفتوں کے ساتھ متصف دائم و مستمر ہے جس میں توقف و انقطاع نہیں ہے جبکہ بار بار کرنے میں توقف و انقطاع ہوتا ہے جو نہ صرف صفتِ رحمت بلکہ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی صفت کے بھی مناسب نہیں ہے کیوں کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق وہ بھی اپنے موصوف وحدہ لاشریک کے مطابق ازلی، ابدی، سرمدی اور دائم و مستمر ہیں۔ ایسے میں ترجمہ کے اِس لفظ کو آیت کریمہ کے لفظ ''الرَّحِيْمِ'' کے مطابق اور اُس کے قائم مقام کون کہہ سکتا ہے ہاں ترجمہ

القرآن کی حقیقت اور اُس کی تعریف، غرض و موضوع سے نا آشنا اور اُس کے لوازمات و شرائط سے بے خبر حضرات کی دُنیا ہی جدا ہے کہ ترجمۃ القرآن کے نام سے جو تحریر بھی اُن کے سامنے آجائے اُسے معنوی قرآن سمجھنے پر مجبور ہیں جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

ترجمہ نمبر 8 کا بھی یہی حال ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اِس میں ترجمہ کے الفاظ متن کی فنی حیثیت سے خلاف ہونے کی وجہ سے اُس کے قائم مقام ہونے کے قابل نہیں تھے جبکہ اُس میں ترجمہ کے الفاظ متن کے لُغوی مفہوم سے خلاف ہونے کی وجہ سے اُس کے قائم مقام ہونے کے قابل نہیں ہیں کیوں کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' میں مذکور لفظ ''الرَّحِيْمِ'' کا لُغوی مفہوم بخشنے والے ہرگز نہیں ہے تو پھر ترجمہ نمبر 8 کے مذکورہ الفاظ کو اُس کے مطابق اور اُس کے قائم مقام ہونے کے قابل کون کہہ سکتا ہے۔

یہی حال ترجمہ نمبر 20 کا بھی ہے کہ اِس میں متن کے لفظ ''الرَّحْمٰنِ'' کا ترجمہ لفظ ''بخشش کرنے والے'' کیا گیا ہے جو اُس کے لُغوی مفہوم سے خلاف ہے تو پھر اُس کے قائم مقام ہونے کا کیا تصور باقی رہتا ہے۔ نیز اِس میں جار و مجرور یعنی ''بِسْمِ اللّٰهِ'' کے لیے عامل کے طور پر جملہ فعلیہ ''شروع کرتا ہوں'' کہنے کے بعد لفظ ''میں'' کا جو اضافہ کیا گیا ہے یہ اُردو محاورہ کے مطابق یہاں پر بے مصرف و بے محل ہے اور حشو و زوائد کے قبیل سے ہونے کی وجہ سے متن کے کسی لفظ کا قائم مقام کہلانے کے قابل نہیں ہے۔

ترجمہ نمبر 1، 2، 3، 5، 6، 7، 9، 10، 12، 13، 15، 16، 17، 18، 19، 21، 22، 23، 24 غلط تراجم کی دوسری فہرست میں شامل ہیں جس میں ترجمہ کے الفاظ کی ہیئت اجتماعی کی نوعیت الفاظِ متن کی اجتماعی نوعیت سے خلاف ہوتی ہے جس وجہ سے یہ اُس کے قائم مقام کہلانے کے قابل نہیں ہوتی یہ تمام تراجم بھی ایسے ہی ہیں کہ اِن میں اظہار حکم والا لفظ ''ہے'' نے ترجمہ کو مرکب تام بنا دیا جبکہ متن مرکب تام نہیں ہے بلکہ صفت و موصوف کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے مرکب تام کہلانے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہے جسے علم نحو اور علم بلاغت سے کچھ مناسبت رکھنے والے بھی سمجھ سکتے ہیں

کہ یہاں پر لفظ ''اللہ'' موصوف ہے اور اُس کے بعد لفظ ''الرحمٰن، الرحیم'' بالترتیب اُس کی صفات ہیں جن کے مابین حکم و خبر اور حکایت کوئی شے نہیں ہے تو پھر اِس کے ترجمہ میں لفظ ''ہے'' کہنے کا کیا جواز ہے جس میں حکم کا اظہار ہوتا ہے اور ہمیشہ مرکبِ تام و جملہ کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے ایسے میں تراجم کی یہ تمام شکلیں آپ ہی غیر معیاری ترجمہ کی دوسری قسم میں شامل ہوتی ہیں جو نہایت قابلِ افسوس ہے۔ اور 11، 14 غلط تراجم کی تیسری فہرست میں شامل ہیں جس میں ترجمہ کے الفاظ بھی الفاظِ متن کی کسی حیثیت سے خلاف ہونے کی وجہ سے اُس کے قائم مقام ہونے کے قابل نہیں ہوتے اور اِن کی اجتماعی نوعیت بھی اُس کی اجتماعی نوعیت سے خلاف ہونے کی وجہ سے اُس کے قائم مقام ہونے کے قابل نہیں ہوتی یعنی متن کے ساتھ ترجمہ کی عدمِ مطابقت کی پہلی اور دوسری صورتوں کی انفرادیت نہیں بلکہ اجتماعیت ہوتی ہے کہ عدمِ مطابقت کی دونوں صورتیں اکٹھی پائی جاتی ہیں اِن ترجموں میں بھی ایسا ہی ہے۔

اِس تفصیل کے ساتھ کہ ترجمہ نمبر 11 کے شروع میں لفظ ''کہو'' جو لکھا گیا ہے یہ ترجمہ کے اُصولوں پر نہیں بلکہ تفسیروں میں بیان شدہ ایک احتمال پر مبنی ہے جسے حرف جار یعنی بسم اللہ کے ''ب'' کے لیے عامل کے طور پر مقدر سمجھا گیا ہے جس کی حیثیت محض احتمال اور درجہ امکان سے زیادہ نہیں ہے جس وجہ سے جمہور مفسرین نے اِس پر توجہ ہی نہیں دی ہے جبکہ ترجمہ کسی خاص احتمال یا کسی مفسر کے قول پر بنا ہونے کے بجائے مستقل اُصول و شرائط رکھتا ہے اور اِس کے تمام الفاظ متن کے متیقن الفاظ کے تابع اور اُن پر متفرع ہوتے ہیں جبکہ یہاں پر ایسا نہیں ہے۔ نیز حرفِ جار ''ب'' کے لیے عامل کے طور پر اِسے ترجمہ کا حصہ بنانے کے بعد دوسرا عامل ''میرا شروع کرنا ہے'' جو لکھا گیا ہے اِس کا مصرف نہیں رہتا۔ نیز حرفِ جار کے لیے عامل کے طور پر فعلِ امر ''کہو'' اُس سے مقدم ذکر کرنے کے بعد حصر کے انداز میں ''بہت رحم کرنے والے کے نام سے ہی میرا شروع کرنا ہے'' جو لکھا گیا ہے یہ بھی بے مصرف ہے تو پھر ترجمہ کے اِن الفاظ کو ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کے الفاظ کے مطابق اور اُن کے قائم مقام کون کہہ سکتا ہے عدمِ مطابقت کے اِس

اعتبار سے ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ '' کا یہ پورا ترجمہ '' کہو اللہ بے حد مہربان بہت رحم کرنے والے کے نام سے ہی میرا شروع کرنا ہے'' آپ ہی غلط ترجموں کی پہلی قسم میں شامل ہو رہا ہے جبکہ لفظ ''ہے'' کا حکم اِسے دوسری قسم میں شامل کر رہا ہے اور یہ دونوں قسمیں اکٹھی پائی جا رہی ہیں اِس اعتبار سے یہ غلط ترجموں کی تیسری قسم میں بھی شمار ہو رہا ہے یعنی '' یک نہ شد دو شد''۔

ترجمہ نمبر **14** بھی ایسا ہی بے ڈھنگا ہے کہ اِس ''میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں'' کہنے میں لفظ ''میں'' بے مصرف ہے جو آیت کریمہ کے کسی لفظ سے بدل ہی نہیں ہے تو پھر اُس کے مطابق اور قائم مقام ہونے کا کیا تصور باقی رہتا ہے بلکہ اِس کی حیثیت حشو و زوائد کے سوا اور کچھ نہیں ہے اِس اعتبار سے ''ہے'' جو لکھا گیا ہے یہ اُسے دوسری قسم میں شامل کر رہا ہے اور یہ دونوں قسمیں ایک ہی متن کے ترجمہ میں جمع ہوئی ہیں اس اعتبار سے غلط تراجم کی تیسری قسم میں بھی شامل ہو رہا ہے۔

ترجمۃ القرآن میں غلطیوں کی یہ بہتات اور بے اعتدالیوں کی یہ دلخراش مثالیں اِس لیے بھی قابلِ افسوس ہیں کہ یہ کسی گمنام و بے اثر شخصیت اور علاقائی یا مقامی زبانوں میں لکھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ مملکتِ پاکستان کی قومی اور ہمہ گیر زبان ''اُردو'' میں اُن مشاہیر کے لکھے ہوئے تراجم ہیں جو مختلف مسالک میں پیشوائیت رکھتے ہیں، علم و عرفان سے پہچانے جاتے ہیں اور علمی شہرت رکھتے ہیں یعنی

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

ترجمہ کے حوالہ سے قرآن شریف کی مظلومیت اِس حد تک محدود نہیں بلکہ علم و عرفان کے حوالہ سے گمنام و بے اثر حضرات نے بھی اِس میدان کی مختلف زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے جو ترجمۃ القرآن کے نام سے ہی سینکڑوں میں دستیاب ہیں، مشاہیر کے ان کارناموں سے اُن کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُن میں کیا کچھ نہ کیا گیا ہوگا۔ قرآن شریف کے نادان دوستوں کی اِس کارستانی کو روکنے اور غلط سے بچا کر معیاری ترجمہ کی اہمیت اُجاگر کرنے کی غرض سے ہم ترجمہ کے اُصول و شرائط کے نام سے یہ تحریر دُنیا کے سامنے لا رہے ہیں تاکہ ترجمۃ القرآن جیسے پُرخطر اور کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط عمل کو آسان نہ سمجھا جائے، اِسے بازیچہ اطفال نہ بنایا جائے، اِس میں قدم

رکھنے سے پہلے عواقب وانجام کو پیشِ نظر رکھا جائے اور اِس کی جملہ شرائط پر بالتفصیل نظر ڈال کر خود کو پرکھا جائے کہ اِس کا حق پورا کرنے کا اہل بھی ہوں یا نہیں۔تراجم قرآن میں غلطیوں کی یہ بہتات دیکھ کر مایوسی کے عالَم میں اُمید کی کچھ کرن بھی نظر آ رہی ہے جسے "ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" کی گھٹاٹوپ اندھیریوں میں اُجالا کہا جا سکتا ہے جو درج ذیل ہیں؛

1. شاہ عبدالقادر دہلوی "شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا۔"
2. امام احمد رضا بریلوی "اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا۔"
3. مولانا امین احسن اصلاحی "شروع خدائے رحمٰن رحیم کے نام سے۔"
4. سید احمد سعید کاظمی "اللہ نہایت رحمت والے بے حد رحم فرمانے والے کے نام سے۔"

غلط تراجم کی مذکورہ بہتات کے مقابلہ میں اِن کی تعداد اگرچہ کم ہے بلکہ آٹے میں مقدارِ نمک سے بھی زیادہ نہیں ہے تاہم اِن کا اعتدال نمک کے اعتدال کی طرح خوش کن ہے کہ اِن میں "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کے مفردات کا ترجمہ اُس کے مفردات کے مطابق اور اُن کے قائم مقام ہو رہا ہے کہ ترجمہ کے کسی لفظ کو متن سے خلاف نہیں کہا جا سکتا۔اِسی طرح اِن کی اجتماعی نوعیت کو بھی اُس کی اجتماعی نوعیت سے خلاف کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہے بلکہ ہر اعتبار سے اِن پر ترجمہ کی تعریف بھی صادق آ رہی ہے اور موضوع کے کسی حال کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا اور ترجمۃ القرآن کے غرض وغایت کے حوالہ سے بھی مفید وبامقصد ہیں جسے ہم قرآن شریف کی حفاظت کے لیے وعدۂ الٰہی کا مظہر کہے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں کہ اِن سے ترجمۃ القرآن کا ریکارڈ درست ہو رہا ہے۔(فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَآءِ)

نادان دوست کا کردار:۔ کچھ حضرات نے شاہ عبدالقادر کے ترجمہ "**موضح القرآن**" کی اصلاح وتفصیل کے نام سے اور بعض نے امام احمد رضا کے ترجمہ "**کنزالایمان**" کی تسہیل کے نام سے خدمات انجام دینے کی جو کوششیں کی ہیں۔حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ نادان دوست کے کردار سے مختلف نہیں ہے۔اُن میں:

پہلا ترجمہ:۔ مولانا محمود الحسن کا موضح الفرقان ہے جس میں اُن کے اپنے الفاظ دس فیصد سے زیادہ نہیں ہیں کیونکہ اُنہوں نے اُس کے متعلق جو مقدمہ لکھا ہے اس میں تصریح ہے کہ یہ مستقل ترجمہ نہیں ہے بلکہ حضرت شاہ عبدالقادر کے موضح القرآن کے جو الفاظ متروک ہو چکے ہیں اُن کی جگہ رائج الوقت اور آسان الفاظ اِستعمال کیے جائیں گے یا جو مقامات حضرت شاہ صاحب کے اِجمال کی وجہ سے نا قابل فہم تھے اُنہیں قابل فہم بنانے کے سوا کچھ اور اِضافہ نہیں کیا جائے گا۔ اپنے ترجمہ سے متعلق یہ وضاحت کرنے کے بعد انہوں نے موضح الفرقان میں اپنے عمل کو حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ کے مقابلے میں یعنی موضح الفرقان کو موضح القرآن کے ساتھ ایسی تشبیہ دی ہے جیسے دوشالہ میں کمبل کا رَفو کیا جائے۔ کاش موضح الفرقان کے مصنف کو اس پاکیزہ عزم کی تکمیل کی توفیق میسّر ہوتی تو کیا ہی اچھا ہوتا لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا کیوں کہ مولانا محمود الحسن صاحب نے موضح القرآن کے جن جن الفاظ کو بدلا ہے یا جس جس اِجمال کی تفصیل پیش کی ہے وہ جاہل بُڑھیا کے ہاتھوں شاہین پر ہونے والی مہربانی سے مختلف نہیں ہے۔ جس کو مخمل میں ٹاٹ کی پیوند کاری کی ناانصافی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کی افسوس ناک مثالوں کی ایک جھلک ''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ'' کے ترجمہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مولانا محمود الحسن کی رَفوگری سے پہلے (شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا) جو اصل کے مطابق اور معیاری ہے۔

مولانا محمود الحسن کی رَفوگری کے بعد (شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے) جس میں لفظ ''ہے'' کا حکم لگا کر انجانے میں مرکب غیر تام کا ترجمہ مرکبِ تام میں کیا جس کی وجہ سے غیر معیاری اور اصل سے خلاف قرار پا رہا ہے۔

دوسرا ترجمہ:۔ مولانا مفتی عزیز احمد بدایونی کا ہے جس کے زیادہ سے زیادہ پندرہ فیصد الفاظ ان کے اپنے ہیں جبکہ باقی سب کچھ کنزالایمان کے ہیں کیوں کہ انہوں نے بھی پیش لفظ میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ کنزالایمان کے مشکل اور متروک الفاظ کے متبادل آسان اور رائج

الوقت الفاظ استعمال کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کروں گا لیکن مولانا بدایونی بھی مولانا محمود الحسن کی طرح اپنے اس پاکیزہ عزم میں فائز المرام نظر نہیں آتے ہیں کیونکہ کنز الایمان کے جن جن مقامات پر انہوں نے کچھ کمی بیشی کی ہے وہ نقصان سے خالی نہیں ہیں جن کی مثالوں سے مشتے نمونہ از خروارے ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' کے درج ذیل ترجمے دیکھے جاسکتے ہیں:

کنز الایمان والا ترجمہ مفتی عزیز احمد بدایونی کی تسہیل سے پہلے (اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا) جو معیاری ہے اور جملہ اعتراضات سے پاک و محفوظ ہے۔

کنز الایمان والا ترجمہ مفتی عزیز احمد بدایونی کی تسہیل کے بعد (اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا ہے) جس میں ہے کا حکم لگا کر انجانے میں مرکبِ تام کا ترجمہ جملہ وکلام میں کرنے کی غلطی کی گئی ہے جو ناقابلِ معافی ہے۔

قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کی فطری شرائط سے آگاہ حضرات بالترتیب محمود الحسن کی رَفو گری اور مفتی عزیز احمد بدایونی کی تسہیل پر غور کریں گے تو ان حضرات کے اس کردار کو بُڑھیا کے ہاتھوں شاہین پر ڈھائے جانے والے مظالم سے مختلف نہیں پائیں گے۔ اگر فرق ہے تو صرف اس بات کا ہے کہ بُڑھیا نے شاہین پر اس کے ناخن، چونچ اور پَر کاٹ کر ظلم کیا تھا جبکہ ان حضرات نے شاہ عبد القادر اور امام احمد رضا خان کے معیاری ترجمہ کے آخر میں لفظ ''ہے'' کا حکم لگا کر اَنجانے میں مرکّب غیر تام کا ترجمہ مرکّبِ تام میں کر ڈالا جس کو سننے کے لیے لسانِ قرآنی کے اہلِ لغت تیار ہیں نہ اہلِ بلاغت اور سیبویہ اُسے گوارا کرتا ہے نہ تفتازانی کیونکہ مرکّبِ تام اور غیرِ تام کے احکام ہر لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں تو پھر یہ حضرات اپنے مذکورہ پاک عزائم میں کس حد تک فائز المرام ہوئے ہیں اور کس حد تک حضرت شاہ عبد القادر اور امام احمد رضا خان کی روح کو رنجیدہ کیا ہے اس کا فیصلہ وہی اہلِ فہم کر سکتے ہیں جو آیت کریمہ کی لُغوی، نحوی اور بلاغی حیثیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان تراجم کا جائزہ لیں۔

مرکبِ غیر تام آیت کا ترجمہ لفظ ''ہے'' کا حکم لگا کر کلام و جملہ میں کرنے کی اِس غلطی کا

پسِ منظر ہماری فہم کے مطابق دو وجہ سے خالی نہیں ہے:

پہلی وجہ:۔ یہ لکھتے وقت مترجمین نے مرکبِ تام اور مرکبِ غیر تام کی تمیز نہیں کی اور ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کی ترکیبی حیثیت کہ لفظ اللہ موصوف اور اس کے بعد لفظ ''الرَّحْمٰنِ، الرَّحِیْمِ'' بالترتیب اُس کی صفات ہیں اور صفت و موصوف سے مجموع مرکب جملہ ہوتا ہے نہ کلام بلکہ وہ جملہ کے مقابلہ میں ہمیشہ مفرد ہوتا ہے جسے مرکبِ ناقص بھی کہا جاتا ہے اور اُس کا ترجمہ بھی ہمیشہ مفرد کے انداز میں ہوتا ہے ورنہ معیاری ترجمہ کہلائے گا نہ اصل کے مطابق بلکہ غلطِ محض کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا ظاہر ہے کہ متن کی حقیقت جاننے کے بغیر ترجمہ کرنے کا نتیجہ ایسا ہی ہوتا ہے جو اِن تراجم کا ہوا ہے۔

دوسری وجہ:۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مترجمین کو یہاں پر متن کے مرکب غیر تام ہونے کا احساس تھا یعنی وہ اِس بات کو جانتے تھے کہ لفظ ''اللہ'' یہاں پر موصوف اور ''الرحمٰن الرحیم'' بالترتیب اُس کی صفات ہیں لیکن احساس کے باوجود ترجمہ والی زبان کو آیت کریمہ کی لسانی حیثیت پر ترجیح دی اور اصل کو فرع کی تابع کرنے کی معکوس العملی کا ارتکاب کیا جو نہایت نامعقول و نامسموع ہے۔

الغرض ترجمہ کی حیثیت سے یہاں پر لفظ ''ہے'' کہنے کا جواز ہے نہ لکھنے کا **توضیح بعد التوضیح** یہ کہ نہ صرف ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' بلکہ قرآن شریف کی ہر آیت کے ترجمہ کی درستی اور اُسے بامقصد بنانے کے لیے ناگزیر ہے کہ ترجمہ کی تعریف، غرض، موضوع کو پیشِ نظر رکھنے کے ساتھ جملہ شرائط کی بھی پابندی کی جائے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس آیت کا ترجمہ کرنا ہو اُس کے نزول سے مقصد کو سمجھا جائے ورنہ ترجمہ بامقصد نہیں ہوسکتا جس کے مطابق یہاں پر ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کے نزول سے مقصد سلف صالحین کی روشنی میں دو طرح ہے:

پہلا مقصد:۔ اِس سے جملہ خلائق کے وجود و آغاز بتانا ہے کہ دُنیا کی ہر شے کا وجود اور آغاز و شروع اللہ تعالیٰ کے کسی نہ کسی اسم سے مربوط ہے، اُس کا اثر ہے اور اُس کے بغیر لاشے و ہیچ ہے

حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اس کے مطابق لکھا ہے:

''ان الاسمآء الالٰھیہ سبب وجود العالم وانھا المسلطة علیہ والموشرة لذٰلك کان ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' عندنا خبر، ابتداء مضمر وھو ابتداء العالم وظھورہ کانہ یقول ظھور العالم ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' ای ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' ظھر العالم''(۱)

بزرگانِ دین کی یہ تصریح خصوصیت مقام سے قطع نظر مطلق ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کے بارے میں ہے جس کے مطابق قرآن شریف کی سورتوں کے شروع میں مذکور ہونے والے ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' سے مقصد سورتوں کے مندرجات اور خطابات و احکام سے متعلق یہ بتانا ہے کہ یہ سب کچھ اسماء اللہ سے مربوط اور اُن کے اثرات و تقاضے ہیں اور ہر حکم و مضمون کا اربعہ عناصر کے اِس عالمِ ناسوت میں ظاہر ہونا، موجود ہونا اور انسانوں کو پہنچنے تک جملہ عوامل کا آغاز و شروع اسمآء اللہ کے اثر سے ہے۔ ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کے نزول سے اِس مقصد کا تعلق اسمآء اللہ کی جامعیت سے ہے اِس کے مطابق علم نحو اور بلاغت کی روشنی میں اِس کی دو ترکیبیں ہو سکتی ہیں؛

پہلی ترکیب:۔ یہ خبر ہے مبتداء محذوف کے لیے تقدیرِ عبارت یوں ہوگی ''ابتداء العالم ثابت بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' اِس صورت میں پوری ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' میں صرف ایک جملہ ہوگا جو حرف ''با'' سے مستفاد ہے جبکہ اسم جلالت اپنی دونوں صفات یعنی ''الرَّحْمٰنِ، الرَّحِیْمِ'' سے مل کر اِسم کے لیے مضاف الیہ ہونے کے سوا کوئی اور ترکیبی حیثیت نہیں رکھتا چہ جائیکہ جملہ ہو۔

دوسری ترکیب:۔ اِس میں ایک جملہ بھی نہیں ہے بلکہ حرف ''با'' کا تعلق شروع کے ساتھ ہے تقدیرِ عبارت یوں ہوگی ''الابتداء بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' ظاہر ہے کہ ابتدا مصدر ہے

(۱) الفتوحات المکیہ، ج:1، ص:102، مطبوعہ دار صادر بیروت۔

جو فعل والا عمل تو کرتا ہے لیکن اپنے فاعل یا قائم مقام فاعل سے مل کر شبہ جملہ بھی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ جملہ ہو جو کسی نحو شناس سے پوشیدہ ہے نہ بلاغت شناس سے اِس صورت میں اِس کا معیاری ترجمہ (شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان بڑی رحمت والا ، اللہ کے نام سے شروع جو بے حد مہربان نہایت رحمت والا) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جس میں ترجمہ کے الفاظ بھی متن کے الفاظ کے مطابق اور اُن کے قائم مقام ہو رہے ہیں اور الفاظِ ترجمہ کی اجتماعی نوعیت بھی اُس کی اجتماعی نوعیت کے مطابق اور اُس کے قائم مقام ہے کہ یہ بھی اُس کی طرح غیر جملہ ہے۔

دوسرا مقصد:۔ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کے نزول سے ایک مقصد انسانوں کو یہ تعلیم دینا بھی ہے کہ ہر جائز کام کی ابتدا اِسی سے کریں اور کام اللہ تعالیٰ کے جس اسم کے زیر اثر ہو اُسی کی وساطت سے استعانت و برکت اور حسنِ انجام کی طلب ہو اِس اعتبار سے یہ معنوی طور پر انشاء و دُعا ہے اور علم نحو و بلاغت کے حوالہ سے اِس میں بھی دو ترکیبیں ہو سکتی ہیں ؛

پہلی ترکیب:۔ اِس کے حرف ''با'' کا تعلق فعل سے ہو گا اور تقدیر عبارت یوں ہو گی ''اَبْتَدِءُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' اِس کے مطابق پوری ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' میں صرف ایک جملہ ہے جس کا معیاری ترجمہ (شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان رحمت والا ، شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا) جیسے کسی بھی جملہ فعلیہ کے انداز پر کیا جا سکتا ہے۔

دوسری ترکیب:۔ حرفِ جار ''با'' کا تعلق ابتداء سے ہو گا اور تقدیر عبارت یوں ہو گی ''الابتداء بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' اِس کا معیاری ترجمہ (شروع خدائے رحمان رحیم کے نام سے ، اللہ نہایت رحمت والے بے حد رحم فرمانے والے کے نام سے ، اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا ، شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا) جیسے کسی بھی انداز

سے ہوسکتا ہے جس کے الفاظ مفردہ بھی ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ '' کے مفرد الفاظ کے مطابق اور اُن کے قائم مقام ہو رہے ہیں اور ہیئت اجتماعی کی نوعیت بھی۔

جمہور مفسرین کی روشنی میں مذکورہ چاروں احتمالات کے مطابق ترجمہ کے یہ چاروں انداز بھی جملہ اعتراضات سے پاک و محفوظ ہیں مقصدِ نزول پر منطبق ہونے کے ساتھ ترجمۃ القرآن کی تعریف پر بھی منطبق ہیں اور ترجمہ کی جملہ شرائط کے مطابق ہونے کے ساتھ بامقصد و معیاری ہونا اِن سب میں قدرِ مشترک ہے کہ کسی ایک کو بھی غلط نہیں کہا جاسکتا۔ باقی رہا یہ تصور کہ اِن میں سے راجح و مرجوح کا کیا تناسب ہے اور افضل و مفضول کی تفریق کیسی ہے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ ہم یہاں پر افضل و مفضول اور راجح و مرجوح کی تفصیل بیان کرنے کے درپے نہیں ہیں بلکہ ہمارا مقصد صحیح و سقیم کی تمیز بتانے کے ساتھ غلط ترجمہ کی راہوں کی نشان دہی اور صحیح ترجمہ کی صراطِ مستقیم بتانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس کے مطابق ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے مترجمین کی غالب اکثریت کی اِس اندھیر نگری میں رب الناس جَلَّ جَلَالُہٗ نے اپنے کچھ بندوں کو صحیح ترجمہ کرنے کی بھی توفیق بخشی ہے جو درجنوں غلط تراجم سے برعکس مذکورہ چار انداز میں پائے جاتے ہیں۔ (فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ)

دیباچہ الکتاب اور آغاز قرآن کی اِس آیت کریمہ ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ '' کے غلط تراجم کی بہتات کے مقابلہ میں صرف مذکورہ چار کی صحت کا یہ نقشہ اور یہ تفصیل پورے قرآن شریف کے تراجم کے لیے مشتے نمونہ از خروارے ہے یہاں پر پھر بھی غنیمت ہے کہ غلط تراجم کی گھٹا ٹوپ اندھیریوں میں چار کا اُجالا مل رہا ہے جبکہ آگے چل کر بعض مقامات کے تراجم میں ایک یا دو سے زیادہ صحیح و معیاری ترجمہ نہیں ملتے جو تمام شرائط پر پورے اُترتے ہو اور ترجمۃ القرآن کی تعریف اُن پر صادق آتی ہو نہ صرف اتنا بلکہ بعض مقامات کا ترجمہ اتنے خطرناک انداز سے کیا گیا ہے کہ صراحتاً معنوی تحریف ہیں۔ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع کی بحث میں اور خاص کر موضوع کے احوال سے بحث کے حوالہ سے کلام قدرے طویل ہوگیا ہے جو

مقتضائے مقام ہے کیوں کہ ترجمۃ القرآن کے موضوع یعنی آیاتِ قرآنیہ کے کیے جانے والے ترجمہ کے الفاظ کی مِن حیث المطابقت وعدم مطابقت احوال کی مذکورہ تقسیم اور ہر قسم کی مذکورہ تفصیل اور اُن کی عملی صورتوں کی جداجدا مثالیں پیش کرنا ناگزیر تھا کیوں کہ اِن کے بغیر بحث کا حق ادا ہونا ممکن نہیں تھا۔(وَاللّٰہُ الھَادِیُ اِلٰی سَبِیْلِ الرَّشَادِ)

دوسری بحث:۔ ترجمۃ القرآن کے جواز اورعدم جواز سے متعلق ہے جو اِس طرح ہے کہ کسی زمانہ میں قرآن شریف کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کے جواز وعدم جواز کی بحث چل گئی تھی اگرچہ مختلف بلدان وامصار کے علماء حق نے عدم جواز کے قول کو مسترد کرکے عملی طور پر کسی نہ کسی صورت میں ترجمۂ قرآن کے عمل کو جاری رکھا تاہم کچھ کتابوں سے یہ آواز بازگشت اب بھی سنی جاتی ہے اِس سلسلہ میں بے مقصد قیل وقال کی تطویل میں پڑنے یا علماء ہند کے عمل کو یا جامع ازہر یا کسی بھی مکتبہ فکر کے عمل کو جواز کے لیے شرعی دلیل بنانے کی بے معنویت میں پڑنے سے بہتر یہ ہے کہ اِس قصہ پارینہ کو نزاع لفظی پر محمول سمجھ کر عدم جواز کے قول کو مندرجہ ذیل کسی تاویل سے مؤول کیا جائے:

1. اُنہوں نے متن اور قرآنی الفاظ کے بغیر محض اُن کے ترجمہ کو قرآن شریف کے طور پر متعارف کرانے کو ناجائز قرار دیا ہوگا۔
2. اُنہوں نے معیاری ترجمہ کے لیے ناگزیر شرائط کی پابندی کیے بغیر ترجمہ کرنے کو ناجائز کہا ہوگا۔
3. اُن کی مراد غیر معیاری ترجمہ کرنا ہوگی جس کے عدم جواز میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے۔
4. اُن کے کلام میں ''لَا یَجُوْزُ تَرْجُمَۃُ الْقُرْآن'' سے مراد جواز فقہی نہیں بلکہ جواز عقلی ہے یعنی عدم امکان اور قرآن شریف کا ترجمہ ناممکن ہونے سے اُن کا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ آیات قرآنی کے اندر موجود جملہ علوم واسرار، اور تمام معارف وکمالات کا اظہار کرنا بشکل ترجمہ ممکن نہیں ہے تو اِس میں بھی کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ جب عدم جوازِ ترجمہ کا قول کرنے والوں سے حُسن ظن رکھنے کے

اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے اُن کے قول کو اِس قسم مصارف پر حمل کیا جا سکتا ہے تو پھر اس کارِ خیر سے مانع ہونے کے سوءِ ظن پر اصرار کرنے کا کیا جواز ہے جبکہ قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کا نہ صرف جواز بلکہ عام حالات میں اِس کا فرضِ کفایہ ہونا اور مخصوص حالات میں فرضِ عین ہونا بجائے خود نا قابلِ انکار حقیقت ہے، یہ اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ مقدس کتاب نہ صرف عرب کے لیے بلکہ جملہ اقوامِ عالَم کی ہدایت کے لیے نازل ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

''لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا'' (الفرقان:1) کہ سارے جہان کو ڈر سنانے والا ہو۔

نیز فرمایا؛ ''وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا'' (۱)

اور اے محبوب! ہم نے تم کو نہ بھیجا مگر ایسی رسالت سے جو تمام آدمیوں کو گھیرنے والی ہے خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا۔

نیز فرمایا؛ ''هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا'' (۲)

یہ لوگوں کو حکم پہنچانا ہے اور اِس لیے کہ وہ اس سے ڈرائے جائیں۔

نیز فرمایا؛ ''وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ'' (۳)

اور میری طرف اس قرآن کی وحی ہوئی ہے کہ میں اس سے تمہیں ڈراؤں اور جن جن کو پہنچے۔

جبکہ اللہ تعالیٰ نے اِسے معیارِ تعلیم ونصابِ تبلیغ کے طور پر تمام اقوامِ عالم کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے اور عرب کے علاوہ دوسری اقوام کی اِس سے ہدایت پانے کی امکانی صورت اُن کی زبانوں میں اِس کا ترجمہ، تشریح، تفسیر و تفہیم، ترجمانی و تاویل کرنے کے سوا کوئی اور نہیں ہے اور اہلِ علم جانتے ہیں کہ قرآن شریف کی تشریح، تفسیر اور تاویل و تفہیم اور ترجمانی میں سے ہر ایک ترجمہ کی نسبت آسان ہونے کے باوجود الفاظ قرآنی کے ترجمہ کی فہم پر موقوف ہے کہ جب تک آیات

(۱) السباء:28۔

(۲) ابراھیم:52۔

(۳) الانعام:19۔

قرآنی کے مفردات سے لے کر مرکبات تک کی دوسری زبان میں فہم نہیں ہوگی اُس وقت تک تفسیر درست ہوسکتی ہے نہ تشریح اور تفہیم ممکن ہوسکتی ہے نہ تاویل، نہ ترجمانی گویا آیاتِ قرآنی کے معیاری ترجمہ کی فہم اِن سب کے لیے اصل الاصول ہے، عرب کے علاوہ جملہ اقوام عالَم کی تعلیم وتبلیغ کے لیے بنیاد ہے اور مقصدِ نزول قرآن کی تکمیل ہے۔ ایسے میں اِسے ناجائز کہنے کا کوئی تصور ہی نہیں رہتا البتہ معیاری وغیر معیاری کی تمیز بھی فرض لازم ہے جس کے ذمہ دار ومسئول علماء کرام کے سوا کوئی اور نہیں ہیں۔

ہماری طرف سے تاویل اور حُسنِ ظن کا یہ انداز اُن حضرات کے بارے میں ہے جنہوں نے ''لایجوز'' اور ''لایمکن'' جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں جبکہ کچھ متاخرین حضرات نے صریح الفاظ میں اِسے حرام قرار دیا ہے جسے معقول کہا جاسکتا ہے نہ جائز۔ مثال کے طور پر السعودیۃ العربیہ کے شہر ریاض میں قضاء کے لیے جو درسگاہ بنام المعہد العالی للقضاء ہے اُس کے مدیر عالی جناب مناع القطان نے مباحث فی علوم القرآن کے نام سے کتاب لکھی ہے جس کے صفحہ 285 تا 290 میں ترجمۃ القرآن سے بحث کی ہے اور اسے حرام قرار دیا ہے، لکھا ہے؛

''لَا یجدالمرء ادنی شبهة فِیْ حُرْمَةِ تَرْجَمَةَ الْقُرْآنِ تَرْجمة حَرْفِیة فَاالْقُرْآن کَلَام اللّٰه المنزل عَلَی رسوله المُعجِزُ بِاَلْفَاظِهِ وَمَعَانِیْهِ اَلْمُتعبد بِتلَاوَتِهِ وَلَا یَقُوْلُ اَحَدٌمِّنَ النَّاسِ ان الکَلِمَة مِنَ الْقُرْآنِ اِذَاتَرْجَمت یقال فِیْهَاانّهَامن کلام اللّٰه فان اللّٰه لم یتکلم الا بمانتلوه بالعربیة ولن یتائی الاعجاز بالترجمة لان الاعجاز خاص بما انزل باللغة العربیة والذی یتقیه بتلاوته هو ذٰلك القرآن العربی المبین بالفاظه وحروفه وترتیب کلماته فترجمة القرآن الحرفیة علی هٰذامهما کان المترجم علی درایة باللغات واسالیبها ویترا کیبها تخرج القرآن عن ان یکون قرآنا''

اِس کے بعد لکھا ہے؛''ان ترجمة المعانی الاصلیة لا تخلوعن فساد فان اللفظ

الواحد في القرآن قد يكون له معنيان او معان تحتملها الآية فيضع المترجم لفظا يدل على معنى واحد حيث لا يجد لفظا يشاكل واللفظ العربي في احتمال تلك المعاني المتعدده وقد يستعمل القرآن اللفظ في معنى مجازي فياتي المترجم بلفظ يرادف اللفظ العربي في معناه الحقيقي ولهٰذا ونحوه وقعت اخطاء كثيرة فيما فيما ترجم لمعاني القرآن"(۱)

ظاہر ہے کہ محترم مناع القطان کے اِس کلام کے پہلے حصہ میں ترجمہ کی جس قسم کو "الترجمة الحرفية" سے تعبیر کرنے کے بعد حرام قرار دیا ہے اُس سے مراد وہی ہے جسے برصغیر پاک وہند کے کچھ اہل علم تحت اللفظ ترجمہ کہتے ہیں جس کی حقیقت ترجمۃ القرآن ہرگز نہیں بلکہ ترجمۃ الفاظ القرآن ہے جبکہ ترجمۃ القرآن اور ترجمۃ الفاظ القرآن میں زمین وآسمان کا فرق ہے کیوں کہ ترجمۃ القرآن کلام اللہ کے مظہر کا ترجمہ ہوتا ہے جو نہ صرف الفاظ بلکہ الفاظ ومعانی سے مجموعہ مرکب ہے الفاظ اپنے معانی پر دلالت کرنے کی حیثیت سے اور معانی الفاظ کے مدلول ہونے کی حیثیت سے اور ترجمۃ الفاظ القرآن جسے "الترجمة الحرفيه" اور "ترجمہ تحت اللفظ" جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے قرآن کا نہیں بلکہ اُس کے صرف حصۂ الفاظ کا ترجمہ ہوتا ہے۔ یعنی مرکب تام اور کلام اللہ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ قرآن شریف کے الفاظ من حیث الالفاظ المرتبۃ کی جگہ ترجمہ والی زبان سے الفاظ لائے جاتے ہیں جس پر حرام کا دفعہ لگانا تعجب کا باعث ہونے کے ساتھ قابلِ افسوس بھی ہے میری حیرت کی انتہا ہو رہی ہے کہ المعہد العالی للقضآء کی مدیریت جیسے عظیم منصب پر فائز شخص کا ایسی فضول بات لکھنا المیہ سے کم نہیں ہے۔

دوسرے حصہ میں ترجمہ کی جس قسم کو "ترجمة المعاني الاصلية" کے عنوان سے ذکر کرنے کے بعد اُس پر فساد کا حکم لگایا ہے دراصل یہ ترجمۃ القرآن کا وہ محور ہے جس کے اردگرد اُس کی تعریف، غرض، موضوع چکر لگا رہے ہیں اِس کے بغیر ترجمۃ القرآن کا تصور ہو سکتا ہے نہ اُس

(۱) مباحث في علوم القرآن، ص:288۔

سے غرض وغایت کا اور معانی اصلیہ سے مراد قرآنی آیات کے وہ مدلول ہیں جنہیں مفہوم اول بھی کہا جاتا ہے جنہیں اہل لسان محض سننے اور پڑھنے سے ہی پہچان جاتے ہیں اور غیر اہل لسان یعنی اہل عجم اُن علوم وفنون کے واسطہ سے پہچانتے ہیں جنہیں قرآن فہمی کے لیے عُلوم آلیہ کہا جاتا ہے جیسا علم تصریف، علم اشتقاق، علم متن لُغت، علم النحو، علم المعانی، علم البیان، علم البدیع وغیرہ اور قرآن شریف کے ترجمہ سے اصل مقصد بھی اِسی کے ساتھ مربوط ہے کہ ترجمہ کرنے والے کی غرض وغایت قرآنی آیات کے بنیادی اور اصل معانی سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے جس کے نہ صرف جواز پر بلکہ حسبِ ضرورت فرض لازم ہونے پر بھی عملی اجماع چلا آرہا ہے جیسا امام ابواسحاق الشاطبی المتوفی 790ھ نے لکھا ہے؛

"وکان ذٰلک جائزٌ باتفاق اھل الاسلام فصارھٰذا الاتفاق حجة فی صحة الترجمة علی المعنی الاصلی"(۱)

یعنی قرآنی آیات کے مفہوم اول کے اعتبار سے ترجمہ کے جائز ہونے پر اہل اسلام کا اتفاق ہے تو یہ اتفاق مفہومِ اول کے اعتبار سے ترجمہ کے جائز ہونے پر حجت بن گیا۔

ایسے میں مباحث فی علوم القرآن کے مصنف "مناع القطان" کا اِسے "لا یخلوعن فساد" کہنا بجائے خود فساد ہے، نہ صرف امام الشاطبی سے بلکہ جمہور اسلام سے خلاف ہے اور ترجمۃ القرآن کی نہ صرف جوازی صورت سے بلکہ واجبی نوعیت سے بھی انحراف ہے تو پھر اِسے لغو اور بے مصرف کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔ اِسی طرح مباحث فی علوم القرآن کے محولہ صفحات کے تیسرے مقام پر یہ کہنا کہ "وترجمة معانی القرآن الثانوية امر غیر میسور" یہ بھی بے مصرف ہے کیوں کہ نظمِ قرآن کے اعجازی پہلو سے لے کر اُس کی لسانی حلاوت تک اور امتیازی خصوصیات سے لے کر اُس کی لپیٹ میں پوشیدہ رُموز واسرار تک جتنے بھی معارف ہیں یہ سب کے سب اُس کے ثانوی مفہوم کے ساتھ متعلق ہیں۔ جو عام انسانوں کی فہم سے ماوراء ہونے کی بنا پر ترجمۃ القرآن سے جو غرض

(۱) الموافقات للشاطبی، ج:1، ص:239، مطبوعہ دارالکتب العربی بیروت۔

وغایت ہوتی ہے وہ بھی اِس سے متعلق نہیں ہوتی کیوں کہ قرآن شریف کا ترجمہ کرنے سے بنیادی مقصد اُس کے مفہوم اول سے دوسری زبان والوں کو آشنا کرنا ہوتا ہے کہ اُسے سمجھ کر اُس کے مطابق عقیدہ رکھیں اور عمل کریں جب ثانوی مفہوم اور اُس کے متعلقات عام انسانوں کی رسائی فہم اور اُن کے علم وعمل سے ماوراء ہیں تو پھر اُن کے ترجمہ کرنے کا کیا تصور باقی رہتا ہے ظاہر ہے کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف اُن سے متعلق ہے نہ غرض وغایت۔ نیز ترجمۃ القرآن تبلیغ اسلام اور تعلیم قرآن کے قبیل سے ہے جو عام انسانوں کے لیے ہوتی ہے جبکہ ثانوی مفہوم عام انسانوں کی تعلیم وتبلیغ کے لیے نہیں ہوتی تو پھر اُس کے ترجمہ کا کون سا مصرف باقی رہتا ہے۔

اِسی طرح مصنف کے کلام کا چوتھا حصہ جس میں مخصوص عنوان "الترجمۃ التفسیریہ" کے تحت لکھا ہے "ويحق لنا ان نقول ان علماء الاسلام اذاقاموا بتفسير للقرآن يتوخى فيه اداء المعنى القريب الميسور الراجح ثم يترجم هٰذاالتفسير بامانة وبراعة فان هٰذايقال فيه "ترجمة تفسير القرآن او "ترجمة تفسيرية بمعنى شرح الكلام وبيان معناه بلغةاُخرى ولا باس بذٰلك" یہ بھی بے مصرف اور غلط ہے اور ترجمۃ القرآن کو مفسرین کی متضاد آراء کا تابع کرنے کے مترادف ہے حالاں کہ یہ کسی مفسر کی رائے اور اُس کی ترجیح کے تابع ہونے کے بجائے مستقل فن ہے جو اپنی شرائط اور اُصول رکھتا ہے اور تفسیر سے جدا اور مستقل تعریف، غرض اور موضوع رکھتا ہے۔ اور عرفِ عام میں معنوی قرآن سمجھا جاتا ہے اور بغیر طہارت کے عدم جوازِ مَس کے حوالہ سے قرآن جیسے احکام رکھتا ہے۔

حقائق کی اِس روشنی میں کسی مفسر کی مخصوص رائے پر مبنی کسی تفسیر کو یا اُس کی تشریح کو ترجمۃ القرآن قرار دینے کا کیا تصور باقی رہتا ہے جبکہ خود تفسیر کے احکام ترجمہ کے احکام سے جدا ہیں اور اِن کی تعریف، غرض، موضوع بھی جدا ہیں جب کسی تفسیر وتشریح کو ترجمۃ القرآن کہنا جائز نہیں ہے تو پھر تشریح کی تشریح کو یا کسی تفسیر کی تشریح وتعبیر کو ترجمۃ القرآن کے طور پر متعارف کرنے کا کیا جواز ہے۔ الغرض ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے مباحث فی علوم القرآن کے مصنف

مناع القطان کا یہ مضمون نہ صرف اسلام کی فکر سے خلاف ہے بلکہ الترجمۃ التفسیریہ کے نام سے قرآن شریف کی معنوی تحریف کرنے کے لیے راستے کھولنے کے مترادف بھی ہے کہ جس کے ذہن میں تفسیر کے نام سے جو کچھ آئے اُس کے مطابق قرآن شریف کا ترجمہ کرے گا اور ہر مبتلاء بدعت اپنی ترجیح کو آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر وتشریح قرار دے کر ترجمہ کو اُس پر بنا کرے گا، اُسے تفسیری ترجمہ اور معنوی قرآن کہہ کر التباس الحق بالباطل کرے گا جو احبار ورہبان کے ہاتھوں تورات وانجیل پر ہونے والے مظالم سے مختلف نہیں ہوگا۔ موصوف کا یہ مضمون اس لیے بھی قابلِ افسوس ہے کہ اِس میں ترجمۃ القرآن کی نا قابلِ فہم تعریف کرنے کے بعد چار قسموں پر تقسیم کیا ہے جن میں سے اُس کے ماتحت چار قسمیں بتائی ہیں۔ اور اُس قسم کو فساد سے خالی نہ کہہ کر نا جائز ہونے کا تاثر دیا ہے جو پیشروانِ اسلام کی نگاہ میں متفقہ طور پر جائز ہے اور قرآن شریف کی تفسیر وتاویل اور ترجمانی کرنے کے لیے اصل الاصول ہے۔

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ موصوف کے اس پورے مضمون کو مِن وعن یہاں پر نقل کرنے کے بعد اُس کے مالہ وماعلیہ کا تجزیہ پیش کریں وہ یوں ہے:

”ونشات نولۃ الدولۃ الاسلامیۃ فی جزیرۃ العرب، ولاشك ان اللغۃ تحیا بحیاۃ امتھا وتموت بموتھا، فکانت نشاۃ الدولۃ الاسلامیۃ علی ھذاالنحو حیاۃ للغۃ العرب، فالقرآن وحی الاسلام، والاسلام دین اللہ المفروض، ولن یتاتی معرفۃ اصولہ واسسہ الا اذافھم القرآن بلغتہ، فاخذت موجۃ الفتح الاسلامی تمتد الی الالسنۃ الاخری الاعجمیۃ، فتعربھابالاسلام، وصارلزاما علی کل من یدخل فی حوزۃ ھذاالدین الجدید ان یستجیب لہ فی لغۃ کتابہ باطنًاوظاھرًا، حتی یستطیع القیام بواجباتہ، ولم یکن ھناك حاجۃ الی ترجمۃ القرآن لہ مادام القرآن قد ترجم لسانہ وعربہ ایماناوتسلیما۔

معنى الترجمة

والترجمة تطلق على معنيين:

اولهما: الترجمة الحرفية: وهى نقل الفاظ من لغة الى نظائرهامن اللغة الاخرى بحيث يكون النظم موافقا للنظم،والترتيب موافقا للترتيب۔

ثانيهما:الترجمه التفسيرية او المعنوية: وهى بيان معنى الكلام بلغة اخرى من غير تقييدبترتيب كلمات الاصل اومراعاة لنظمه۔

والذين على بصر باللغات يعرفون ان الترجمة الحرفية بالمعنى المذكورلا يمكن حصولهامع المحافظة على سياق الاصل والاحاطة بجميع معناه۔فان خواص تلك اللغة تختلف عن الاخرى فى ترتيب اجزاء الجملة۔ فالجملة الفعلية فى اللغة العربية تُبْدَءُ بالفعل فالفاعل فى الاستفهام وغيره، والمضاف مقدم على المضاف اليه، والموصوف مقدم على الصفة، الااذاريد الاضافه على وجه التشبيه مثلا كلجين الماء، او كان الكلام من اضافة الصفة، الى معمولها كعظيم الامل،وليس الشان كذلك فى سائر اللغات۔

والتعبير العربى يحمل فى طياته من اسرار اللغة مالايمكن ان يحل محله تعبير آخر بلغة اخرى، فان الالفاظ فى الترجمةلاتكون متساوية المعنى من كل وجه فضلا عن التراكيب۔

والقرآن الكريم فى قمة العربية فصاحة وبلاغة، وله من خواص التراكيب واسرار الاساليب ولطائف المعنى، وسائرآيات اعجازه مالا يستقل باداثه لسان۔

حكم الترجمة الحرفية

ولهذا لا يَجِدُ المرء ادنى شبهة فى حرمة ترجمة القرآن ترجمة حرفية،فالقرآن كلام الله المنزل على رسوله المعجز بالفاظه ومعانيه المتعبدبتلاوته،ولا يقول

احد من الناس ان الكلمة من القرآن اذاترجمت يقال فيهاانها كلام الله، فان الله لم يتكلم الا بمانتلوه بالعربية، ولن يتاتى الاعجاز بالترجمة، لان الاعجاز خاص بما انزل باللغة العربية۔والذى يتعبدبتلاوته هوذلك القرآن العربى المبين بِاَلْفَاظِهٖ وحروفه وترتيب كلماته۔

فترجمة القرآن الحرفية على هذا مهماكان المترجم على دراية باللغات واساليبها وتراكيبهاتخرج القرآن عن ان يكون قرآنا۔

الترجمه المعنوية

القرآن الكريم وكذاكل كلام عربى بليغ۔له معان اصلية، ومعان ثانوية۔

والمراد بالمعانى الاصلية المعانى التى يستوى فى فهمها كل من عرف مدلولات الالفاظ المفردة وعرف وجوه تراكيبها معرفة اجمالية۔

والمراد بالمعانى الثانوية خواص النظم التى يرتفع بها شان الكلام۔ وبهاكان القرآن معجزا۔

فالمعنى الاصلى لبعض الآيات قد يوافق فيه منثوركلام العرب او منظومه،ولا تمس هذه الموافقة اعجازالقرآن،فان اعجازه ببديع نظمه وروعَة بيانه،اى بالمعنى الثانوى۔ واياه عنى الزمخشرى فى كشافه بقوله:"ان فى كلام العرب۔خصوصا القرآن۔من لطائف المعانى مالا يستقل باداته لسان"۔

حكم الترجمة المعنوية

وترجمةمعانى القرآن الثانوية امرغير ميسور، اذ انه لاتوجد لغةتوافق اللغة العربية فى دلالة الفاظهاعلى هذه المعانى المسماة عند علماء البيان خواص التراكيب، وذلك مالا يسهل على احد ادعاؤه۔ وهومايقصده الزمخشرى من عبارته السابقه۔

فوجوه البلاغةالقرآنية فی اللفظ او التركيب۔تنكيرًا وتعريفًا، او تقديمًاوتاخيرًا، او ذكرًاو حذفًا،الى غيرذلك مماتسامت به لغة القرآن، وكان له وقعه فی النفوس۔ هذه الوجوه فی بلاغة القرآن لايفئ بحقهافی اداء معناهالغة اخرى، لان ای لغة لاتحمل تلك الخواص۔

اماالمعانی الاصلية فهی التي يمكن نقلهاالى لغة اخرى۔وقدذكرالشاطبی فی الموافقات المعانی الاصلية والمعانی الثانوية ثم قال: "ان ترجمة القرآن على الوجه الاول، يعنی النظرالى معانيه الاصلية ممكن، ومن جهته صح تفسيرالقرآن وبيان معانيه للعامة ومن ليس لهم فهم يقوى على تحصيل معانيه۔ وكان ذلك جائزًاباتفاق اهل الاسلام، فصارهذاالاتفاق حجة فی صحة الترجمة على المعنى الاصلی"۔

ومع هذا فان ترجمة المعانی الاصلية لاتخلو من فساد فان اللفظ الواحدفی القرآن قد يكون له معنيان او معان تحتملها الآية فيضع المترجم لفظا يدل على معنى واحد حيث لا يجد لفظا يشاكل اللفظ العربی فی احتمال تلك المعانی المتعددة۔

وقديستعمل القرآن اللفظ فِی معنی مجازی فياتی المترجم بلفظ يرادف اللفظ العربی فی معناه الحقيقی ولهذاونحوه وقعت اخطاء كثيرةفيما ترجم لمعانی القرآن۔

وماذهب اليه الشاطبی واعتبره حجة فی صحة الترجمة على المعنى الاصلی ليس على اطلاقه، فان بعض العلماء يخص هذا بمقدارالضرورة فی ابلاغ الدعوة۔ بالتوحيدواركان العبادات، ولا يتعرض لما سوى ذلك، ويؤمرمن ارادالزيادة بتعلم اللسان العربی۔

الترجمة التفسيرية:۔

ويحق لنا ان نقول: ان علماء الاسلام اذا قاموا بتفسير للقرآن، يتوخى فيه اداء المعنى القريب الميسور الراجح، ثم يترجم هذا التفسير بامانة وبراعة، فان هذا يقال فيه "ترجمة تفسير القرآن" او "ترجمة تفسيرية" بمعنى شرح الكلام وبيان معناه بلغة اخرى۔ ولا بأس بذلك، فان اللّٰه تعالٰى بعث محمدا ﷺ برسالة الاسلام الى البشرية كافة على اختلاف اجناسها والوانها "وكان النبى يبعث الى قومه خاصة و بعثت الى الناس كافة" وشرط لزوم الرسالة البلاغ، والقرآن الذى نزل بلغة العرب صار ابلاغه للامة العربية ملزما لها، ولكن سائر الامم التى لا تحسن العربية، او لا تعرفها يتوقف ابلاغها الدعوة على ترجمتها بلسانها۔ وقد عرفنا قبل استحالة الترجمة الحرفية وحرمتها۔ واستحالة ترجمة المعانى الثانوية، ومشقة ترجمة المعانى الاصلية وما فيها من اخطار، فلم يبق الان يترجم تفسير القرآن الذى يتضمن اسس دعوته بما يتفق مع نصوص الكتاب وصريح السنة الى لسان كل قبيل حتى تبلغهم الدعوة وتلزمهم الحجة۔ وترجمة تفسير للقرآن على نحو ما ذكرنا يصح ان نسميها بالترجمة التفسيرية۔ وهى تختلف عن الترجمة المعنوية وان كان الباحثون لا يفرقون بينهما، فان الترجمة المعنوية توهم ان المترجم اخذ معانى القرآن من اطرافها ونقلها الى اللغة الاجنبية، كما يقال فى ترجمة غيره: ترجمة طبق الاصل۔ فالمفسر يتكلم بلهجة المبين لمعنى الكلام على حسب فهمه، فكانه يقول للناس: هذا ما افهمه من الآية، والمترجم يتكلم بلهجة من احاط بمعنى الكلام وصبه فى الفاظ لغة اخرى۔ وشتان بين الامرين۔ فالمفسر يقول فى تفسير الآية: يعنى كذا، ويذكر فهمه الخاص۔ والمترجم يقول: معنى هذا الكلام هو عين معنى الآية، وقد عرفنا ما فى ذلك۔

وینبغی ان یؤکد فی الترجمةالتفسیریة انها ترجمة لفهم شخصی خاص، لا تتضمن وجوه التاویل المحتملة لمعانی القرآن، وانماتتضمن ماادرکه المفسر منها، و بهذا تکون ترجمة للعقیدة الاسلامیه ومبادئ الشریعة کماتفهم من القرآن۔

واذاکان ابلاغ الدعوة من واجبات الاسلام فان مایتوقف علی هذا البلاغ من دراسة اللغات ونقل اصول الاسلام الیها واجب کذلك۔ کماان معرفتنا لهذه اللغات بالقدر الضروری تمکننامن دراسة کتبهاللردعلی المبشرین والمستشرقین الذین غمزواعود الاسلام من بعید او قریب، وهذاهو ماعناه شیخ الاسلام ابن تیمیة فی کتابه"العقل والنقل"عندماقال:"وامامخاطبة اهل الاصطلاح باصطلاحهم ولغتهم فلیس بمکروه اذا احتیج الی ذلك، وکانت المعانی صحیحة۔ کمخاطبة العجم من الروم والفرس والترك بلغتهم وعرفهم، فان هذاجائز حسن للحاجة، و انماکرهه الائمة اذالم یحتج الیه"ثم قال:"ولذلك یترجم القرآن والحدیث لمن یحتاج الی تفهمه ایاه بالترجمة، وکذلك یقرا المسلم ما یحتاج الیه من کتب الامم وکلامهم بلغتهم، ویترجم بالعربیة، کماامرالنبی ﷺزیدبن ثابت ان یتعلم کتاب الیهود لیقرأ له ویکتب له ذلك۔ حیث لم یاتمن الیهود علیه"۔

واذاکانت الترجمة بمعناهاالحقیقی ولو للمعانی الاصلیة لاتتیسرفی جمیع آیات القرآن۔ وانماالمتیسر الترجمة علی معنی التفسیر کان من الضروری اشعار القارئ بذلك،ومن وسائله کتابة جمل فی حواشی الصحائف یبین بهاان هذااحدوجوه او ارجح وجوه تحتملهاالآیة "ولوقامت جماعة ذات نیاتٍ صالحة وعقول راجحة۔ وتولت نقل تفسیر القرآن الی بعض اللغات الاجنبیة، وهی علی بینة من مقاصده وعلی رسوخ فی معرفة تلك اللغات، وتحامت الوجوه التی دخل منها الخلل فی التراجم السائرة الیوم فی او ربا لفتحت لدعوة الحق سبیلا کانت مقفلة۔

ونشرت الحنفية السمحة فی بلاد طافحة بالغواية قاتمة“۔

اَقُولُ عَلَيْه الكَلام من وجوہ ﴿الاول﴾ علی قوله”ولم يكن هناك حاجة الی ترجمة القرآن له“لان الاعاجم الذين لم يشافهوا النبی ﷺ ولم يشاهدوا دواعی الايمان وبواعثه ولم يدخلوا فی الاسلام بتاليف القلوب ولا بالجبرولا بتحول الاحوال وتبدل الظروف۔

بل دخلوا فی الاسلام بدعوة الداعين النوابين له ﷺ والمبلغين بالقرآن وظاهران التبليغ القرآنی للاعاجم لايمكن بدون ترجمة القرآن بشتی معانيه فانفعالهم الايمانی موقوف علی سماع ترجمة القرآن وفهمه بمعنی لولم يسمعوا ولم يفهمُوا معانيه الأُوَل التی يقال لهاالمفهوم الاَوّل لامتنع الايمان به فهم محتاجون لامَحَالَةَ فی فهم القرآن الی ترجمته بالمعنی المتعارف او بمعنی التعبيرو الترجمانی عنه فكيف قولك”ولم يكن هناك حاجة الی ترجمة القرآن له“وايضًاليس بضروری لكل من يدخل فی الاسلام ان يعلم لسان القرآن ولغته كما هو المشاهدة فی الاعاجم المتداخلين فی حِصَارِالاسلام لان دخولهم فی الاسلام و ايمانهم به يستلزم حبهم للقرآن والتعظيم له ويعلم كل انسان ان تعلّم لسان القرآن لايلزم حبه ولا تعظيمه والا لايری من مسلمی الاعاجم احدفی الدنيا لايعلم العربية وهو خلاف الواقع مدی الايام من بدء اشاعة الاسلام الی الآن۔

فعامة الاعاجم وجمهورهم يحتاجون الی ترجمة القرآن بالمعنی المتعارف او بمعنی التعبيرمن العربی الی لغتهم او بمعنی الترجمانی لافرق بين مسلمهم وغير مسلمهم الاان التبليغ القرآنی المبنی علی الترجمة للمسلم لتكميل مقتضيات الايمان ولغيرالمسلم لدحوله فی الاسلام ولَاسَبِيل لنفی هذاالافتقار بتقدم الزمان وتاخره ولابتبدل الظروف والاحوال لان الحقائق لا تتبدل بتبدل الظروف

واقتضاء الاحوال وفی ضوء هذه الحقائق لا یبقیٰ للقول المذکورلمصنف مباحث فی علوم القرآن ایُّ جوازٍ۔

﴿والثانی﴾علی قوله(والترجمةتطلق علی معنیین)

اولهما:۔ الترجمة الحرفیة:وهی نقل الفاظ من لغة الی نظائرهامن اللغة الاخری بحیث یکون النظم موافقا للنظم،والترتیب موافقا للترتیب۔

ثانیهما:۔ الترجمه التفسیریة او المعنویة:وهی بیان معنی الکلام بلغة اخری من غیر تقییدبترتیب کلمات الاصل اومراعاة لنظمه۔

والذین علی بصر باللغات یعرفون ان الترجمة الحرفیة بالمعنی المذکورلایمکن حصولهامع المحافظة علی سیاق الاصل والاحاطة بجمیع معناه"

اقول اولًا:۔ علی تقسیمه المذکورلانه مع عدم النقل عن الاسلاف خلاف المشهورلان المشهورهوترجمة الالفاظ وترجمة الکلام والمرادمن ترجمة الالفاظ ترجمة الفاظ القرآن امامع قطع النظرعن کونهاکلاماواجزاء الکلام واِمّا مع اعتبارعدمهماومن ترجمة الکلام ترجمة القرآن من حیث انه کلام الله المجموع المرکب من الالفاظ والمعانی وترجمة الفاظ القرآن لیس لهاالاحکم التشریح والتعبیر عن معانیه اللغویة بلغة اخری فضلا عن الاحاطة بجمیع معناه وعن المحافظة علی سیاق الاصل لانهمایکونان فی ترجمة القرآن لافی ترجمة الفاظ القرآن فقوله"لا یمکن حصولهامع المحافظة علی سیاق الاصل والاحاطة بجمیع معناه"لایبقی له مصرف الجواز وظنی الغالب والله اعلم ان المصنف بنی قوله هذاعلی عدم التمیزبین ترجمة الفاظ القرآن وترجمة القرآن فلایغلط ان یقال ان قوله هذا بناء الغلط علی الغلط۔

وثانیًا:۔ علی قوله"بحیث یکون النظم موافقا للنظم والترتیب موافقا

للترتیب"لان موافقة الترتیب بین الترجمة والمتن معتبرفی ترجمة القرآن لافی ترجمة الفاظ القرآن مع انه تکرارمحض بلافائدة لان النظم بمعنی الالفاظ لایفهم بلا ترتیب فذکرالترتیب بعده لایخلوعن التکرارلارائحة فیه من المُفاد۔

وثالثًا:۔ علی قوله"الترجمة التفسیرية اوالمعنویه"لانه غیر ماثورعن الاسلاف وکیف یصّح نسبة الترجمة الی التفسیر اوالی المعنی وهی صفة الالفاظ لا التفسیر ولاالمعنی لانهاتستعمل علی معنیین الاول المعنی المصدری المتعارف"ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخرالتی تقوم مقامها"والثانی مجموعة الالفاظ العِوَضِیةاللتی هی موضوع ترجمة القرآن المبحوث عن عوارضاتها الذاتیه مثل الصحة والسقم والفصیح وغیرالفصیح وغیرها ولا ینسب احدهذین المعنیین الی احدمن التفسیروالمعنی فضلاالی کلیهما فهٰذا الاصطلاح الحدید"الترجمة التفسیريةوالمعنویه"لایخلو عن بدعة فلاینبغی الاصغاء الیه۔

﴿والثالث﴾ علی قوله"والتعبیرالعربی یحمل فی طیاته من اسرار اللغة مالایمکن ان یحل محله تعبیر اخربلغةٍ اخری فان الالفاظ فی الترجمة لاتکون متساویة المعنی من کل وجه فضلاعن التراکیب"بانه صریح فی ان الکلام کل الکلام کلام الله او کلام الناس فی اللغة العربیه لایمکن ترجمتهابلغة اخری و هذاظاهرالبطلان کماتری فی صحة ترجمة"بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ" باالاردوی"اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا،شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان رحم والا"فانظربنظرالانصاف فی ضوء شرائط الترجمة هل تری فیهمامن فطوروهکذافی ترجمة سورة الفاتحه(اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ٥ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ٥ مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ٥ اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ٥ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ٥ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ٥ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا

الضَّآلِّیْنَ)۔(سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہاں والوں کا بہت مہربان رحمت والا روزِ جزا کا مالک ہم تجھی کی عبادت کریں اور تجھی سے مدد چاہیں ہمیں سیدھا راستہ چلا راستہ ان کا جن پر تونے احسان کیا نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا،سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا بے حد مہربان نہایت رحم والا مالک روز جزا کا ہم تجھ ہی کی عبادت کریں اور تجھ ہی سے مدد چاہیں چلا ہم کو راہ سیدھی راہ اُن کی جن پر تونے انعام کیا نہ ان کی جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کی)لایوجدفی احدهاتین الترجمتین شیئ یکون خلاف الآیة ولاخلاف الشرائط وَاَلفَاظُهُمَاالمفردةُ تقوم الاَلفَاظَ المفردةَ فی جمیع آیات السورة والهیئةُ الاجتماعیةُ منهماتطابق الهیئةَ الاجتماعیه للاصل وتُفهَم منهماالمعانی الاُوَلُ من الایات ولایرادمن ترجمة القرآن الاهذاواماالمعانی الثوانی اللتی یقال لهاالمفوم الثانی من المعارف فی طی الفاظ الآیات وحَلَاوةنظمهاالمختصته بکلام الله فلایتعلق بهاترجمة القرآن لان المطلوب والغرض الوحیدمن ترجمةالقرآن هواظهارالمفهوم الاول لاهل اللسان الآخرالمترجم فیه لتبلیغهم احکام القرآن واماالمفهوم الثانی فلا یتعلق به الغرض من الترجمه والمرادمن المفهوم الاول الذی یفهمه اهل لسانه بمجردالسماع وغیرُاهلِ لسانِهِ بوسائل العلوم الآلیه الخادمه للقرآن مثل علم التصریف والنحو ومتن اللغة والاشتقاق والمعانی والبیان وهذاحال ترجمة القرآن باللسان العجمی واماصحة ترجمة الکتب العربیه بلسان العجم فلا تخفی علی اَحَدٍمن اَهلِ العلم وفی ضوء هذه الحقائق العلمیة لایبقیٰ لِموقِفِ مصنف مباحث فی علوم القرآن وَقَولِهِ المذکورمحالُ جوازٍکیف لاوهوخلاف الواقع کماتریٰ۔

﴿والرابع﴾ علی قوله"حکم الترجمةالحرفیه ولهذالایجد المرء ادنی شبة فی حرمة ترجمةالقرآن ترجمة حرفیة"بانه مجمل لم یمیزفیه بین الترجمة الحرفیة

"الـلـفـظية" لتعليم الطلبة كمايفعله المدرسون وبين الترجمة الحرفية لتبليغ الاعاجم والفرق بينهمامن وجوه؛

احدها:۔ الترجمة الحرفيه لتعليم الطلبه لاتكون الالترجمة الالفاظ المفرده المرتبة لـلـقرآن والترجمة الحرفيه لتبليغ الاعاجم لاتكون الالترجمةالقرآن و بينهمابونٌ بعيد۔

وثانيها:۔ الترجمة الحرفية لتعليم الطلبه لاتطلق عليهاالترجمة الافى لسان اللغة والترجمة الحرفيه لتعليم الاعاجم تطلق عليهاالترجمةفى لسان اللغة وفى لسان العرف كليهما۔

وثالثها:۔ باعتبارالحكم الشرعى بِاَنَّ الترجمة الحرفيةلتعليم الطلبه تجوز مطلقا لانها ترجمة الفاظ القرآن لاترجمة القرآن وظاهران الالفاظ المفردةللقرآن من حيث اللسانية والعربيه لايقال لهاالقرآن فترجمتهابمعنى تفهيم معناهابلغة اخرى على نهج التعريف اللفظى والتفسيراللغوى لايقال له الاالتفهيم والتعليم و لايمنع عنه الشرع بل هومطلوب الشرع وفرض على سبيل الكفايه واماالترجمة الحرفيه لغرض تبليغ القرآن ففيه تفصيل تجوزتارةً ولاتجوزاخرىٰ لانها ان كانت محاورة الترجمه مطابقة لمحاورة الآية وقليل ماهوفتجوز والافلا تجوز و هو الاكثروعدم جوازهافى ضوء الكتاب والسنة لايكون سوآءً بل يكون خطاءً دون الحرمة و يكون خطاء فحشاوحرامًاتارةًاخرى فعلى هذالايقال لقول مصنف "مباحث فى علوم القرآن" المذكورالسابق اعنى لايجدالمرء ادنى شبهة فى حرمة ترجمة القرآن ترجمة حرفية،الاخلاف الانصاف والمجمل المخل غاية الاخلال(فالله الهادى الى سبيل الرشاد)۔

﴿والخامس﴾ علی قوله"فترجمه القرآن الحرفية علی هذامهما کان المترجم علی درایة باللغات واسالیبهاوتراکیبهاتخرج القرآن عن ان یکون قرآنًا"بانه لایخلو المرادمن هذه الترجمة الحرفیه المخرجة للقرآن عن القُرآنِیة اماتشمل علی کِلی قسمَی الترجمة اللفظية الذین قدسردناهماقبیل الآن امالا تشمل القسمین بل احدالقسمین اماالترجمة الحرفية لالفاظ القرآن اللتی تکون لقصد التعلیم وتفهیم معانیهااللغویه بلغة اخری واماالترجمة الحرفية للقرآن اللتی تکون لغرض تبلیغ مقاصدالقرآن لاهل لغة اخری ان کان المراد هوالاول فقدذکرنامحذوره سابقاوان کان الثانی فالاخبارعنه باخراج القرآن عن القرآنیه لغولافائدة فیه کیف لاوالبلغاء متفقون علی ان الجملة الخبریه لاتخلو عن فائدةالخبر او لازم فائدة الخبر کماقال فی تلخیص المفتاح"لاشك ان قصدالمخبربخبره افادة المخاطب اماالحکم اوکونه عالمابه ویسمی الاول فائدةالخبروالثانی لازمها (۱)ولایخفی علی احدمن اهل العلم ان الترجمة الحرفیه لالفاظ القرآن لایقال لهاالقرآن لابلسان اللغة ولابلسان الشرع لاحقیقة ولامجازًاو لا عرفًا فلا توجدلهذاالخبر فائدة ما وان کان المرادهوالثالث فالحکم علیه باخراج القرآن عن القرآنیه لایکون صدقًا کلیالانه وان لم یطلق علیه القرآن لغة ولاشرعافقد یطلق علیه عرفاویعتقد فی العرف العام انه قرآن معنوی ویقال له القرآن مجازًامن قبیل المجازالمرسل علی سبیل اطلاق الکل علی الجزوقال مفتی الدیارالشامیه ابن عابدین فی فتاواه؛ "والاعجمی انمایسمی قرآنامجازاولذایصح نفی اسم القرآن عنه"(۲)ومع نفی

---

(۱) تلخیص المفتاح،بحث احوال الاسنادالخبری،ص:7۔

(۲) فتاوی ردالمحتارعلی الدرالمختارشرح تنویرالابصار،ج: 1،ص:358،مطبوعه المکتبه الماجدیه کوئٹه باکستان۔

اسم القرآن عنه فی لسان الشرع یجری علیه بعض احکام القرآن کعدم جواز المس الا بطهارة:قال مفتی الدیار المصریة فی المِائةِ العاشرة الهجریة زین الدین ابن نجیم:"ولو کان القرآن مکتوبابالفارسیة یحرم علی الجنب و الحائض مسه بالاجماع وهوالصحیح"(۱)وفی ضوء هذه الحقائق لایبقی لقول مصنف مباحث فی علوم القرآن السابق ذکرُهُ جواز۔

﴿والسادس﴾ علی قوله"القرآن الکریم و کذا کل کلام عربی بلیغ۔له معان اصلیة، ومعان ثانویة۔

والمراد بالمعانی الاصلیة المعانی التی یستوی فی فهمها کل من عرف مدلولات الالفاظ المفردة وعرف وجوه تراکیبها معرفة اجمالیة۔

والمراد بالمعانی الثانویة خواص النظم التی یرتفع بها شان الکلام۔ وبها کان القرآن معجزا۔"

یردعلیه انه صریح علی ان اشتمال الکلام البلیغ علی المعنیین المعانی الاصلیه والمعانی الثوانیه مختص باللسان العربی وهو خلاف الواقع بل مرادف لنفی الملاغة عن غیر العربیه من شتیٰ انواعهابل الواقع المشاهد بالاعین و المسموع بالآذان هووجود البلاغة فی کلام العرب والعجم کلیهما کماقال الله سبحانه وتعالیٰ "خَلَقَ الْاِنْسَانَo عَلَّمَهُ الْبَیَانَ" (۲)والبیان هوالمنطق الفصیح المعرب عمافی الضمیرولامعنی لِبَلَاغتِهِ سواهٰذاالمفهوم لان تعریف ائمة البلاغه مثل عبدالقاهر الجرجانی ویوسف السکاکی وعبدالرحمٰن القزوینی للبلاغة بانها۔مطابقة الکلام لمقتضی الحال مع فصاحتها مرادِفٌ لهٰذاالمفهوم لا فرق بینهما

(۱) البحرالرائق،ج:1،ص:212، مطبوعه دارالمعرفه بیروت لبنان۔

(۲) الرحمٰن:3،4۔

الا بـالاعتبـار کمالا یخفی علی اهل العلم لقدمن الله سبحانه وتعالیٰ به علی الانسان مطلق الانسان لا فرق فیه بین عربهم وعجمهم کماان خالقیةالله سبحانه وتعالیٰ امتنـان علی الانسان مطلق الانسان لا فرق فیه بین العرب والعجم هکذاالامتنان بتـعلیم البیان شامل باطلاقه للعرب والعجم فکل بیان کلام بلیغ وکل کلام بلیغ مشتـمل علی المعنیین المعنی الاول والثانی وبتعبیر اخر المفهوم الاول والمفهوم الثـانی ومع هذاالاشتراك لاینکرعن براعة العربیة و تفوّقهاعلی العجمیة فی قسمی الـدلالة دلالة عـلی المعانی الاصلیة ودلالة علی المعانی الثوانیه ولا یُصرَفُ النَظَرُ عـن وسـعة طرق استعمالاتها بالنسبةالی العجم لکن لا یلزم من براعة العربیه علی الالسن العجمیه فی البلاغة نفی البلاغة عن العجمه رأسًا۔

﴿والسابع﴾ عـلـی قـولـه"واذا کـانـت التـرجمة بمعناهاالحقیقی ولو للمعانی الاصلیه لا تتیسرفی جمیع آیات القرآن وانما المتیسرالترجمة علی معنی التفسیر" بـانـه اِحَالةٌ علی المجهول لانه لم یذکرالمعنی الحقیقی للترجمة الی الآن فکیف یَـصِـحُ قَـولُـه هـذاعلی سبیل الحوالة والنتیجةِ من الکلام السابق وامامـاذکره قبل هـذاتـحـت عـنـوان"مـعـنـی التـرجمة"بقوله"والترجمة تطلق علی معنیین اولهما التـرجـمة الـحـرفیـه وهی نقل الفاظ من لغة الی نظائرها من اللغة الاخری بحیث یـکـون النظم موافقا للنظم والترتیب موافقاللترتیب"فهو للترجمة الحرفیة حسب اصـطلاحه الحدید لاللترجمة العُرفیه وموضوع الکلام هو الترجمة العُرفیه بمعنی مـایـقال لهاترجمةالقرآن فی تعارف الناس ویظنهاالعوام والخواص قرآنامعنویا و یـجتـنـب الـمسلمون عن مسهابغیرطهارة فهٰذا البحث کله لمصنف مباحث فی علوم القرآن حَرِّی اَن یُتاسف علیه کُلَ التاسّف لکن لاعجب لان کل من یبحث عـن الشیئ ویـحـکـم عـلیـه بشتّی الانـواع بدون تصوره التام لاتکون نتیجته

الاهكـذافـمثـلـه كمثل الكاتب على المآء لايجدى نفعاوردالله سبحانه وتعالٰى علـى الحاكمين على الشيئ بدون العلم بقوله الكريم "وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا" (١) والتأسف عـلـى تـعـريـفـه المذكور للترجمة الحرفيه وهى نقل الفاظ من لغة الى نـظـائـرهـامـن الـلغة الاخرى لِاَنَّ مفهومه الصريح اجتماع الفاظ المتن مع الفاظ التـرجـمـه لان الـنقل الى النظائر لا يتصوربدون الاجتماع معها وبطلانه لايخفى عـلـى احـد فـضلا عن ان يكون معقولا ولعدم معقوليته لا يوجدله مثال لافى فى الـلغة ولافى الشرع والعرف وعندى ان ما اورده فى هذه الورطة العمياهو العُجبُ بـفـهـم الـلسـان العربى وظنُّهٗ بان فهم العربيه كافٍ لفهم القرآن وتفهيمِهٖ وتفسيرِه وتـرجـمـتِه مـابـعـده عـن الحقيقه فياللعَجب لهذاالعجب وجماعة الصحابه من الـمـهـاجـريـن والانـصـارالـذين نزل القرآن بلسانهم وكانوا اَعلَمَ الناس باصناف الـعـربية الـفـصحاء مع هذالم يستغنوا فى كثيرالمواضع من القرآن عن شرائط فهم الـقـرآن وتـرجمته روى الامام المحدث ابوعيسٰى الترمذى فى جامعه قال حدثنا عـلى ابن الخشرم عن الاعمش عن ابراهيم عن علقمه عن عبدالله ابن مسعودقال حـدثـنـاعيسٰـى ابـن يونس "كمانزلت الذين اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ" (٢)شَـقّ ذالك على المسلمين فقالوايارسول اللّٰه وايـنـالايـظـلـم نفسه قال ﷺ ليس ذالك انما هوالشرك الم تسمعوا ما "قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يَا بُنَيَّ لا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" (٣)،وهذاامير المومنين عـمـرابـن الـخـطـاب مع كونه اهل لسان القرآن وافصح العرب اِسْتِمَارُه العلميه

(١) النمل:84۔

(٢) الانعام:82۔

(٣) لقمان:13۔

لفهم تفسير بعض المواضع من القرآن مشهورلا يخفى على احد من اهل العلم فلو كان محض فهم العربية كافيالفهم القرآن وتفسيرِه و ترجمتِه لكان هآولاء السادات من المهاجرين والانصار امراء المومنين ومن بعدهم من تابعيهم باحسان لكمال فهم العربيه وتفوقهم على من بعدهم بالوف المراتب اولٰى به لكن لم يُنقِل عِن احدهم الاكتفأُ بفهم العربيه وعدم الاحتياج الى سائر الشرائط وايضا العربيه المستعملة الآن فى ديارالعرب لا يقال لهاانهاالعربيه المستعملة ايام نزول القرآن لان استعمال الالسسن واللغى يتبدل بمرورالايام حتى لا يبقىٰ الاالوحدة النوعية فلا فرق بين طلباء القرآن من العرب والعجم بل كلهم يحتاجون فى معرفة لغته ومحاوراته وكناياته الى معرفة طرق الاستعمال ايام النزول وفى هذا التناظر ادخلوا دواوين الشعرآء الجاهلين والاسلاميين والمخضرميين "الطبقات الثلاثه"فى نصاب الجوامع العلميه فظن كفاية فهم العربية لتفسير القرآن وترجمته لايخلو عن الخطاء وحاصل الرد على مصنف مباحث فى علوم القرآن ان تقسيمَهُ الترجمة الى الاقسام المذكوره غلط لاتطابقه الدراية ولاالرواية وتعريفه للترجمة الحرفية بانها نقل الفاظ من لغة الى نظائرهامن اللغة الاخرى مرادف لاجتماع الفاظ الاصل مع الفاظ الترجمة وبطلانه كماترى والحيثية فى قوله "بحيث يكون النظم مطابقاللنظم والترتيب مطابقاللترتيب"ليست فى محلها لانهاعلى ثلاثة اقسام؛

(١) الاطلاقيه وهى التى لاتفيد فائدة زائدة على المُحيّثِ۔

(٢) التقييديه هى التى تفيد تقييدالمحيث بقيدٍ خاصٍ۔

(٣) التعليلة هى التى تكون علة لَلمحَيّثِ وفى هنالايصّح اى قسم منها كمالايخفى على المُتَبصِّر اليقظان۔

ویفهم من تقسیمه الترجمة الى الاقسام المذكوره ومن حكمه على الترجمة الحرفية بحرمة الترجمة وعلى الترجمة المعنوية للمعانى الاصلية بالفساد وعلى الترجمة التفسيرية بالجواز والصحة انه لم يميز بين الترجمة والترجمانى ولا بين الترجمة بمعناهااللغوى والترجمة العُرفية وكان ينبغى له ان يعين اولا هذه المعانى ويوضح المناسبة بينهاو يشخص ترجمة القرآن على حسب تعارف الناس لان المتنازع فيه بالجواز وعدم الجواز هو هذاالمعنى لاالترجمة بالمعنى اللغوى ولابمعنى الترجمانى فمتى مالا يكون المفهوم مشخصًالايكون البحث الاعبثا كالكتابه على المآء فعلى هذاكان عليه حتمالازماتعريف ترجمة القرآن المتعارفه حسب ماروى عن الاسلاف بانهاتبديل الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الاخر التى تقوم مقامها كمافى الاتقان فى علوم القرآن للامام السيوطى وهوالمفهوم فى كل موضع من كتب الفقه حيثمايبحث عن جواز القرآئة فى الصلوٰة بترجمة القرآن او عدم جوازهاللعاجزعن قرائةنظم القرآن كماهو الظاهرعلى اهل البصيرة۔

حاصل الكلام فى تعريف الترجمة:۔

فى هذاالمفهوم المشخص المتعارف لترجمة القرآن ان تبديل الفاظ القرآن بالفاظ السان الآخر بمنزلة الجنس للنوع كالحيوان بالنسبة الى الانسان وقيام هذه الالفاظ مقام الفاظ القرآن بمنزلة الفصل القريب للنوع كالناطق لِلْاِنْسَان فكان التعريف المذكور مفيدًا تامًا للتصورالتام لحقيقة ترجمة القرآن والمراد من قيام الفاظ الترجمة مقام الفاظ القرآن ان تكون حاملة لجميع حيثياتها واحوالهامن حيث اللغة والصرف والنحو والبلاغة ومقصدالنزول وغيرها من الاحوال التى تعرفها العرب بنفس السماع والعجم بواسطة الفنون الآلية لفهم القرآن فكل ترجمة القرآن تكون حاملة لهذه الحيثية من المطابقه تكون صحيحا وحرى ان يقال لها ترجمة القرآن والقرآن

المَعْنَوِی و نصف القرآن و جائزًا بلا اختلاف و ھی المراد المشخّص المتنازع فیھا فی باب قرائۃ الصلٰوۃ اتجوز صلٰوۃ القاری بھا العاجز عن قرائۃ القرآن ام لا تجوز و کل ترجمۃ القرآن لاتکون حاملۃ لھذہ الحیثیۃ غلط لاینبغی ان تسمی بترجمۃ القرآن ولم یخطر علی قلب احد من مجتھدی الاسلام جواز القرائۃ بھا للعاجز عن قرائۃ القرآن فی الصلٰوۃ فافاد التعریف المذکور فائدتین بل اصولین مستقلین؛

اولھما:۔ کل ترجمۃ القرآن تطابق الفاظُھا الفاظَ القرآن و تقوم مقامھا فی جمیع حیثیاتھا المفیدۃ للمفھوم الاول الذی یفھمہ العرب بنفس السماع و العَجَمُ بواسطۃ الفنون الآلیۃ لفھم القرآن و تطابق ھیئتھا الاجتماعیۃ نوعیۃَ الھیئۃِ الاجتماعیۃِ لالفاظِ القرآن فھو صحیح لیس فی جوازہ اختلاف۔

وثانیھما:۔ کل ترجمۃ القرآن لا تکون بھذا الشان فھو غلط لیس فی عدم جوازہ اختلاف و تلوح منہ حقیقۃ اخری و ھی ان عدم المطابقۃ لہ کمیۃ تتنوع افرادھا و کیفیۃ تتشدد فی البعض تَتَضَعّف فی البض الآخر فلیس عدم المطابقۃ فی وصف مثل المخالفۃ فی وصفین او الاوصاف الکثیرۃ و کذا المخالفۃ الفاحشۃ لیست مثل الخلاف الخفیف و تتولد منہ ان لخطاء الترجمۃ وعدم جوازھا سُبُلٌ متفرقہ لا یدرکھا الا الفنون الآلیۃ لفھم القرآن و لایضع علیھا الاصبع و لایظھرھا الا العلوم الخادمۃ للقرآن بکثرۃ انواعھا کما قال الامام الراغب الاصفھانی "کل من کان حظہ فی العلوم او فر کان نصیبہ من علم القرآن اکثر" (۱) و سبیل صحۃِ الترجمۃِ و جوازِھا واحد لا تعدد فیھا و ھی المطابقۃ وقیام الفاظ الترجمۃ مقام الفاظ القرآن بان تکون الالفاظ المفردۃ للترجمۃ وفق الالفاظ المفردۃ للقرآن و نوعیۃ الھیئۃ الاجتماعیۃ لالفاظ الترجمۃ وفق

---

(۱) اصول تفسیر لامام الراغب الاصفھانی، ص: 597، المطبوع مع مفردات القرآن نورمحمد اصح المطابع کراتشی۔

نوع الهيئة الاجتماعية لالفاظ القرآن من حيث الاخبار والانشاء والتذكير والتانيث و غيرها بشتى انواعها وهذه الترجمة لحسنها وملاحتها ولا يفائها للمقصد من ابلاغ المفهوم الاول من القرآن للاعاجم يقال لها الترجمه وفق المحاورة والمراد بها وفق المحاورتين محاورة اللسان الذى ترجم فيه ومحاورة لسان القرآن فللترجمة وفق المحاوره ليس الاهذه الصورة الواحده وخلافه على ثلاثة اقسام؛

اولها:۔وفق محاورة لسان القرآن وخلاف محاورة لسان الذى ترجم فيه۔

وثانيها:۔وفق محاورة لسان الترجمه وخلاف محاورة القرآن۔

وثالثها:۔ خلاف كلتى المحاورتين وقد فرغت عن امثلتها التوضيحية فى اول باب هذا الكتٰب فالينظر هناك وفى هنا المقصد الوحيد لناهو النقد على مصنف مباحث فى علوم القرآن حضرت العلام مناع القطان حيث حكم على ترجمة القرآن باعتبار المعانى الاصليه بالفساد وجعلها محظوراولم يقنع بهٰذا المحذور الذى لم يوجد له اثرفى الاسلاف ولايَرْتَضِيهِ مزاج الاسلام كيف ياذن به الاسلام وهو يُنافى التبيغ بالمفهوم الاول من القرآن وضد لقوله سبحانه وتعالىٰ "يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا" (١)لان الرسالة الى جميع الناس عربهم وعَجَمهم كما هو المتبادرمن استغراق لفظ"الناس"وتاكيده بجميعا لايتم مقصدهاالا بالتفهيم ويعلم كل احد ان تفهيم كل فريق بلسانهم حسب تحاورهم فتفهيم العجم لايمكن بالعربى كمالايمكن تفهيم العرب الا بالعربى هذافى عموم الرسالة واما عموم الانداز بالقرآن لكل من بلغ من العرب والعجم فلا يكون الا بمعانيه الاصلية ومفاهيمه الاُوَل التى تفهمها العرب بنفس السماع والعجم

---

(١) الاعراف:158۔

بوسائل العلوم الآلية لفهم القرآن من التصريف والاشتقاق والنحو والمعانی والبيان وغير ذلك من لوازمهاولا يخفى على احد ان عالمی هذه الوسائط فی اقوام العجم عـددهـم قليل فی كل عصر كالملح فی الطعام وهم المكلفون بتفهيم اقوامهـم الجمهور بـمعانی القرآن الاصليه انذارًا وتبشيرًا كما قال سبحانه وتعالىٰ "وَلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ" (الرعد:7) وقـال ايضا "وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ" (۱) وقال رسول الله ﷺ "بلغوا عنی ولو آية" (۲) وقـال "فالْيبلِغِ الشاهدالغائب فرب مبلغ عسى ان يكون اوعى من سامع" (۳) فـكـل هـذه التبـليـغـات يـدور رحـاها حول المعانی الاصلية التكليفية للقرآن تاره بالترجمة وتارة بالترجمانی حسبما يقتضيه الحال والفرق بينهما من وجوه؛

احدهما:۔ التـرجمه هی ابدال الفاظ القرآن بالفاظ السان الآخرالتی تقوم مقامها والترجمانی هو التعبير عن المعانی الاصلية للقرآن بلغةٍ اُخرى۔

ثانيها:۔الترجمانی لا يتعلق الا بالمعانی فقط والترجمة تتعلق بالالفاظ والمعانی جميعا۔

ثالثها:۔ صِحّة الترجمانی تتوقف على صحة الترجمه سواء شعربه الترجمان او لم يشعر وصحة الترجمة لا تتوقف الاعلى شرائطها وصحة الترجمانی ليست من شرائطها فلا تصور لتوقفها عليها۔

رابعها:۔ ترجمة القرآن وان لم تكن القرآن حقيقة لكن اهل العرف وجمهورالناس يـعتـقـدون بقرآنيتها ويقولون لها القرآن المعنوی والترجمانی لم يُظَنَّ فی الاسلام بقرآنيته فضلًا من ان يُعَدّ قرآنا معنويا۔

---

(۱) فاطر:24۔

(۲) الجامع الصغيرمع فيض القدير،ج:3،ص:206،حديث:3159۔

(۳) بخاری، كتاب العلم،ج:1،ص:16۔

خامِسُہا:۔ ان ترجمة القرآن يثبت لها فی الشرع مالا يثبت للترجمانی من الاحكام مثل عدم جواز المس الا بعدالتطهير من الحيض و النفاس و الحدث حسب ما هو المشروح المبسوط فی كتب الفتاوی۔

التوضيح المزيد ودفع المظنه:۔

عسی ان يظن من تنقيدنا هذا علی مصنف مباحث فی علوم القرآن باننانُجِيزُ ترجمةالقرآن لكل من يعلم الفنون الآلية لفهم القرآن فی الجملة و ان لم يكن بارعا فيها فهو ظن باطل ولا نجيز تصوره فكيف نتفوه بموجبه و نعلم بلا تردد وارتياب ان اكثر التراجم للقرآن الكريم الملوثة بالاخطاء و الاغلاط نتيجة عدم براعة المترجمين فی هذه الفنون الخادمة للقرآن وفصلنااَمثِلَتَهَا فيما مضٰی من صفحات هذا الكتاب بلسان اردو فليرجع اليهاو كتبنا مرارافی اول باب هذاالكتاب فی ضمن شرائط الترجمة اَنّ براعة المترجم فی هذه العلوم الآليه هوالشرط الاول وملاك الامرلصحة الترجمة حتی لو كان قليل البضاعة فی علم واحد فقط مع الكمال فی سائرها لا يجوز له الخوضُ فی هذا الخطر المقتضی للاحتياط من جميع الجهات ولو كان فاقدا لشرط واحِدٍ فقط مع الاستجماع لِباقيهالايجيز له الشرع المحمدی علی صاحبه الصلوة والتسليم ان يدخل فی صف المترجمين لِلقرآن فيكون مثله كمثل الذی يعد نفسه فی عداد الشهداء بلطخ الدَم و كتبنا صريحا لامرةبل بمرات و كرات كثيرة بان ادراك المتن بجميع حيثياتها اللسانية و الفنيه هو الحجرالاساسی لصحة الترجمة وعليه تبتنی حقيقة الترجمة بمعنی ابدال الفاظ الاصل بالفاظ السان الآخر التی تقوم مقامها فقيام الفاظ الترجمة مقام الفاظ الاصل ومطابقتها فی جميع الحيثيات فرع هذا الاساس وبدونه خرط القتاد فترجمة القرآن بمعناها العرفی لا بمعنی الترجمة الحرفيه ولاالترجمة التفسيريه امر ممكن مطلوب فی الشرع، سهل

علـی الـمستـجـمع لشرائطها المُوَفّقِ مِن اللّٰه عزوجل ومُقتَضی الرسالة العامه للعرب ولـجـميع اقوام العجم واساس تبليغ الاسلام لان تبليغ الاسلام و دعوته للعجم لا تعترى بـنـائـه و استـحـكامه وتاثيره فی النفوس عن هذاالاساس اشعر به المبلغ بالقرآن او لم يشعر فكانت ترجمة القرآن بمعناها المذكور لازما لبدء دعوة الاسلام للاعاجم و اما بـعـدذلك لتوسيع دائرة تبليغ القرآن وتنوير قلوب الناس وامالة افئدتهم اليه ففی عموم الاحـوال فرض لا علی سبيل العين بل علی الكفايه كما هو المستفاد من قوله سبحانه وتـعـالـی "لَـوْلَا نَـفَـرَ مِـنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَـتَفَقَّهُوْافِی الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ" (۱) وفـی بعض الاحوال المخصوصه تكون فرضًا علی سبيل العين كما اذاكـان مُستـجـمِع الشرائط فی الخطة او الملكِ شخصاواحداوالناس مستفيضُون من ضياء المعانی الاصلية للقرآن ويستفهمونها فی لغتهم حسب محاوراتهم فوقتئذٍ ان لم يترجم لهم هذا الشخص الوحيد مع الاستطاعه يكون اثمااِثمَ تَارِكِ الفريضةِ العينيه۔

خلاصه البحث بعدالتفصيل:۔

(۱) ان الـمراد من ترجمة القرآن معناها العرفی فقط بمعنی ابدال الفاظ القرآن بالفاظ السان الآخرالتی تقوم مقامها۔

(۲) وهـی تـجوز لاهلها ولاتجوز لغير اهلها لا خلاف فی هذين الحكمين بين الاسلاف فـی جـميع المزاهب الاسلاميه والمراد من الاهل هوالذی يستجمع جميع شرائط الترجمه من عموم شرائط فن الترجمه الی خصوص شرائط ترجمة القرآن۔

(۳) الامـر الـمطلوب من ترجمة القرآن هو ابلاغ الناس من اهل لسان الترجمة ومن اليهم عـلـی المعانی الاصلية للقرآن فقط اماالمعانی الثوانيه والمعارف المثنية فی طی نظمه والحلاوة اللسانيه القرآنيه فلا يتعلق بها مقصد المترجم ولا يسئل اللّٰهُ سبحانه وتعالٰی

---

(۱) التوبة:122۔

اَحَدٌ مِن الناس عن عدم تحصليها لِاَنّها خارجة عن استطاعةِ الناس وَلَايُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّاوُسْعَهَا۔

(٤) ترجمة القرآن بمعناها المتعارف المعمول بها سهل لاهلها المستجمع للشرائط المُوَفّقِ من عنداللّٰه عزوجل وصعب غير ممكن الحصول على غير اهلها بفقد شرائطها وبعدم توفيقها منه سبحانه وتعالٰى۔

(٥) ترجمة القرآن احوط اصناف فن الترجمة لهاشرائط فوق شرائط مطلق الترجمة يفوت مقصد الترجمة بعدم مطابقتها او تخرج عن حد الترجمة۔

(٦) المرادمن ترجمة القرآن التى يبحث عنها فى كتب الفقه من حيث جواز الصلوٰة وعدم جوازها بقرائتها للعاجزعن قرائة نظم القرآن هى الترجمةالصحيحة التى يصدق عليها حاصل حدها بمعنى ابدال الفاظ القرآن بالفاظ السان الآخرالتى تقوم مقامها و هى الصادرة من اهلها المستجمعِ لجميع شرائطها۔

وهى المراد المطلوب وَالمقصد المحبوب والمرام المرغوب فى كل موضع قيل فيه بِجوازهَا او بضرورتهاالتبليغيه قال جاراللّٰه الزمخشرى فى كشافه تحت تفسير آيت رقم4،من سورة ابراهيم "وَمَآاَرْسَلْنَامِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّابِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَالْعَزِيْزُالْحَكِيْمُ "(فان قلت:لم يبعث رسول اللّٰه ﷺالى العرب وحدهم وانمابعث الى الناس جميعا۔قل ياايهاالناس انى رسول الله اليكم جميعا۔بل الى الثقلين وهم على السنة مختلفة،فان لم تكن للعرب حجة فلغيرهم الحجة، وان لم تكن لغيرهم حجة فلو نزل بالعجمية لم تكن للعرب حجة ايضا، قلت:لايخلواماان ينزل بجميع الالسنة او بواحدمنها،فلا حاجة الى نزوله بجميع الالسنة لان الترجمةتنوب عن ذلك وتكفى التطويلَ، فبقى اَن ينزل بلسان واحد، فكان اولى الالسنة لسان قوم الرسول لانهم اقرب اليه، فاذافهمواعنه وتبينوه وتنوقِلَ

عنہم و انتشرقامت التراجم ببیانہ و تفہیمہ، کماتری الحال و تشاھدھامن نیابۃ التراجم فی کل امۃ من امم العجم،مع مافی ذلک من اتفاق اھل البلادالمتباعدۃ و الاقطار المتنازحۃ و الامم المختلفۃ و الاجیال المتفاوتۃعلی کتاب واحد،واجتھادِھم فی تعلّم لَفظِہ و تعلّم معانیہ)فکَاَنَّ قولہ"کما تری الحال وتشاھدھا من نیابۃ التراجم فی کل امۃ من امم العجم الی قولہ"واجتھادِھم فی تعلّم لفظہ وتعلّم معانیہ"۔

خلاصۃُ مَافصّلناہ وعکسُ عملِ التبلیغ للاعاجم بالقرآن ومرآۃُ الحقائقِ العملیہ التی لا یمکن انکارھا ولذا لاتری احدامن المُفسِّیرین الذین جآؤ بتفسیر آیت رقم 4من سورۃابراھیم بعدالزمخشری ناقِدًا علیہ بل کلھم مستسلمون لدیہ تسلیمَ السکوت والرضا لان السکوت فی معرج البیان بیان حتی ان مصنّف الانصافِ فیماتضمنہ الکشاف من الاعتزال الامام ناصرالدین احمد ابن محمدالمالکی مع التزامہ النقدَ علی الزمخشری اظھرالرِّضَا بہ وقال"قال احمد جمیع الفصل مرضی"(۱)۔

وقال الامام ابو عبداللہ الانصاری القرطبی فی ضمن تفسیرہ للایۃ المذکورہ"ولا حجۃ للعجم وغیرھم فی ھذہ الآیۃ لان کل من تُرجِم لہ ما جآء بہ النبیﷺترجمۃ یفہمہا لزمتہ الحجۃ وقد قال اللہ تعالیٰ"وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا(۲)"۔

وقالﷺ"ارسل کل نبی الی امتہ بلسانھا وارسلنی اللہ الی کل احمرواسوَدَ من خلقہ"۔

وقالﷺ"والذی نفسی بیدہ لا یسمع بی احد من ھذہ الامۃ یھودی ولا نصرانی ثم لم یومن بالذی ارسلت بہ الا کان من اصحاب النار"(۳)

---

(۱) الانصاف فیما تضمنہ الکشاف من الاعتزال المطبوع مع الکشاف المجد الثانی، ص:366،مطبوعہ دارالمعرفہ بیروت۔

(۲) سباء:28۔

(۳) الجامع لاحکام القرآن،ج:5،ص:340، مطبوعہ مکتبۃ الغزالی دمشق الشام۔

وکل من تفکر فی ظاهر هذاالکلام ومضمراته من اوله الی آخره لم یجده الا موافقا لما قاله الزمخشری فی کشافه وقال الامام الشاطبی فی الموافقات فی اصول الدین بعدما نفی امکان الترجمة حسب المعانی الثوانی"فامّاعلی الوجه الاول فهوممکن ومن جهته صح تفسیرالقرآن وبیانُ معناه للعامة ومن لیس له فهم یقوی علی تحصیل معانیه، وکان ذلك جائزاً باتفاق اهل الاسلام فصارهذا الاتفاق حجة فی صحة الترجمة علی المعنی الاصلی۔"(۱)

وماظهره الشاطبی فی هذاالکلام علی سبیل النتیجه لیس الا فذلکة ما فصلناه لان من امعن النظر فی کلامه من صفحه 237الی هذه النتیجة یجده یدور رحاها علی نکتتین الاولی عدم امکان الترجمه حسب المعانی الثوانیه والمزایاالمختصة باصل المتن سیما نظم القرآن وهو کلام صادق لایمکن الانکار عنه وعدم امکان الترجمة بهٰذا المعنی لا یقتضی عدم صحة الترجمه العُرفیه لتفرق سبیلیهِما لان الغرض والغایة المقصودة من ترجمة القرآن هواطلاع اهل اللسان الآخر ومن الیهم علی المعانی الاصلیة للقرآن لیفهمهاالجمهورویعملوبهاواماالمعانی الثوانیه والمزایاالمختصه فلا یتعلق بهافهم جمهورالناس ولاالعمل بهافکیف یوثر فی صحة الترجمه العرفیه التی تساق لتبلیغ القرآن للعلم والعمل فمن هنا تبین ضیاء النهارمن ظلمه اللیل والحمدلله اولاوآخرا ظاهرا وباطنا۔

وقال المحقق علی الاطلاق کمال الدین ابن همام ناقلا عن الفتاوی الکافی"ان اعتاد القرائة بالفارسیة او اراد ان یکتب مصحفا بها یمنع وان فعل فی آیة او آیتین لا فَاِن کَتَبَ القرآن وتفسیرَکُلِّ حرفٍ وترجمتَه جاز"(۲)

---

(۱) الموافقات،ص:239،المطبوعه دارالکتاب العربی بیروت۔

(۲) فتاوی فتح القدیر شرح الهدایه،ج: 1،ص:248، المطبوع مکتبه نوریه رضویه سکهر باکستان۔

وهـذا الـكلام المتفق بين فقهاء الاسلام يشتمل على ثلاثة احكام الاول عدم جواز قرائة ترجمه القرآن فی الصلوة سيما للذى يعتاوه والثانی عدم جواز كتابة المصحف الشريف مجردا عن نظمه والثالث جواز كتابة نظم القرآن وتفسيرِهٖ وترجمتِهٖ وهذا يتشكل بشكلين الاول ان يكتب نظم القرآن اولًا وبعده ترجمتَهٗ وتفسيرَهٗ معا والثانی ان يكتب نظم القرآن ويكتفی بعده امابالترجمة فقط واما بالتفسير فقط فكما لايرتبط التفسير بالمعانی الثوانی والمعارف المثوية فی نظم القرآن هكذا لاترتبط الترجمةُ الا بالمعانی الاصليه المقصودة بتبليغ القرآن ولا يمكن ان يراد من الترجمة فی هنا الا معنا ها المتعارف بين الناس اعنی ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر اللتی تقوم مقمامها وعلى ضوء هذه الحقائق من اقوال الاسلاف ومقتضا تبليغ القرآن للاعاجم من اقتضاء ابلاغ المعانی الاصليةللقرآن الى اسماعهم وتفهيمهم اياها حسب المحاورتين محاورة القرآن ومحاورة اللسان الذى يترجم فيه لاكمال يقول مصنّف مباحث فی علوم القرآن "فان ترجمة المعانی الاصلية لا تخلو عن فساد"والاسف بعدالاسف عليه انّهٗ لم يكتف على هذه المجازفة بل تَوَغل فی المحذور وقال بعدما عنون بالترجمه التفسيرية "ويحق لنا ان نقول ان علماء الاسلام اذاقاموابتفسيرللقرآن يُتَوَخّٰى فيه اداء المعنى القريب الميسور الراجح ثم يترجم هذاالتفسير بامانة وبراعه فان هذايقال فيه"ترجمة تفسير القرآن" او "ترجمةتفسيرية"بمعنى شرح الكلام وبيان معناه بلُغَةٍ اُخرى"فانه صريح فی ان ترجمة القرآن بمعنى ترجمة التفسير للقرآن لا للقرآن بان تُفسّرَ الايه حسب ما يراه المفسِّر قريبا وراجحاثمّ يترجم هذاالتفسير۔

وهو كما ترى من الفساد وفتح الباب لكون القرآن متنازعا فيه لان ترجيح المفسر يختلف عن ترجيح المفسر الآخر ونتيجة فكره تباين ثمرة فكر الآخر واختلاف هذه الافكار الترجيحيه جار من اول الامرحتى من الصحابة والتابعين واَصحاب الاجتهاد

الی آخرالزمان فلو کانت ترجمة القرآن بمعنی ترجمة تفسیر القرآن کما یقول مناع القطان مصنف مباحث فی علوم القرآن تکون الترجمة تابعةً لتفسیر المفسِّر و تفسیر المفسر تابع لترجیحِهِ ونتیجتُهُ المنطقیةِ کونُ الترجمة تابعةً لترجیح المفسِّر واستصوَابِهِ وبُطْلَانُهُ اظهر من الشمس لان الترجمه سیما ترجمة القرآن لا تتبع الا نظم القرآن مع مراعاة جمیع شرائطها فَجَعلُهُ ترجمةالقرآن تابعةًلترجیح المفسِّرلا یقال له الافتح باب الفساد المفضیٔ الی تحریف القرآن بایدی اهل الهواء والبدع باسم الترجمه ولا یتوقف محذورُه بهذاالحدبل یفضی الی التضاد المعنوی فی القرآن کمافی قوله سبحانه وتعالی "وَفِی ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ"(۱)لان بعض علماء التفسیریفسِّرالبلآء العظیم بالنعمة العظیمة والخیروبعضهم بالامتحان والشرکما قال الامام ابوعبدالله الانصاری القرطبی فی الجامع لاحکام القرآن"الاشارة بذالکم الی التنجیة فیکون البلآء علی هذا فی الخیر ای تنجیتکم نعمة من الله علیکم وقال الجمهورالاشارة الی الذبح ونحوه والبلآء هنا فی الشر والمعنی وفی الذبح مکروه وامتحان"(۲)

وتَضَادُترجمةِ اَحَدِ هٰذین التفسیرین لترجمةِ التفسیر لآخر ظاهر لا یخفی علی احد ونتیجته لیست الا التضاد المعنوی المضاد لقوله سبحانه وتعالی "وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِغَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا"(۳)وهٰکذا فی جمیع الآیات التی تحتمل المعانی المتضاده علی السوآء فَمَثَلُ مصنّف مباحث فی علوم القرآن لا یکون فی تشریحه هذا الا کَمَثَلِ الذی یَفِرُّ من المطر ویقف تحت المیزاب۔

---

(۱) البقرہ:49۔

(۲) التفسیر القرطبی،ج:1،ص:387،مطبوعه مکتبة الغزالی دمشق الشام۔

(۳) النساء:82۔

﴿درءُ الشبهات﴾ فکر مصنف مباحث فی علوم القرآن ومن یاتم به یبتنی علی عدة شبهات ونری ان نبحث عنها حتی ینجلی ضوء الغلس من ظلمة الغلس ویَتَنَقَّحَ موضوع الکلام فیقال اولا ان القرآن کلام اللّٰہ سبحانه وتعالٰی، نظمه معجز لایمکن الاتیان بمثله کماقال سبحانه وتعالٰی "لَا یَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ کَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیرًا" (۱) وظاهر ان عدم امکان الاتیان بمثله غیرمختص بالمشرکین اوالا ناسی الموجودین ایام نزول القرآن بل هو بالنسبة الی جمیع الناس مسلمهم وغیر مسلمهم واولهم و آخرهم ومتعبدبتلاوة الفاظه المنظومة،برزخ بین النظم والنثرویابی نظمه المشاهدان یقال له المنظوم مطلقا ولا المنثورمطلقا بل یجده قارئه الیقظان وسامعه الفهیم منزلة بین المنزلتین ویحس بان منزلته هذه هی الفلسفة العظمی للاعجازه وظاهر ان هذه الخصال الاربعة لاتوجد واحد منها فی کلام الناس فضلا عن التمام الاربعة ولا یخفی علی احد من الناس ان ترجمته لاتکون الا بالفاظ الاعاجمُ وکلامِهم وهو لیس بکلام اللّٰہ ولا یصدق علیه القرآن ولا اعجازه ولا تعبّد التلاوة بِهِ ولاالواسطة بین الواسطتین المنظوم والمنثور بل لایکون الا احدهما المشخص والفاظ الترجمة لابُدمن ان تقوم مقام الاصل وتطابقها کما هوالظاهر من تعریف الترجمة اعنی ابدال الفاظ الاصل بالفاظ اللسان الآخرالتی تقوم مقامها۔ فکیف یتصورالتوافق والقیام مقامها مع تفاوت هذه الاوصاف وتقابلها بالایجاب والسلب وحاصل الاستدلال علیه بالتفصیل یکون هکذا

ترجمة القرآن غیرممکن

لانهایصدق علیهاعدم قیام الفاظها مقام الاصل

---

(۱) الاسراء:88۔

و کل مایصدق علیها عدم قیام الفاظها مقام الاصل غیرممکن

فترجمة القرآن غیرممکن

وجوابه ان هذاالاستدلال وان یعجب بصورته الناظر لایسر بفسادمادته الخاطر لان اشرف مقدمیه بنائه علی سؤالفهم والغلط فما شانه الا بناء الغلط علی الغلط۔ و تفصیله ان قیام الفاظ الترجمة مقام الفاظ الاصل ومطابقتها معها فی تعریف ترجمة القرآن اعنی ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التی تقوم مقامها لیس المرادمنه الابالنظرالی المعانی الاصلیة للقرآن التی یفهمهااهل لسان القرآن بنفس السماع والاعاجم بواسطة الفنون الآلیة لفهم القرآن کعلم التصریف والنحو والاشتقاق وعلم المعانی والبیان وغیرها من العلوم الخادمة للقرآن لان المقصود الاصلی من ترجمة القرآن هو اطلاع اهل اللسان الآخر ومن الیهم علی المعانی الاصلیة المتعلقة بتکلیف الناس بالعلم والعمل بها واما المعانی الثوانیه مثل الاعجاز وکلامیة اللّٰه والبرزخیت بین التحریر والبیان وبین النظم والنثر والتعبدبتلاوة الالفاظ وغیرها من العلوم والمعارف المثانیة فی طی نظم القرآن و سائر لوازماتها المختصة به فلا یتعلق بهاالمقصد من الترجمة لخروجها عن التکلیف ومسئولیت الانسان لان الله عزوجل لایکلف نفساالاوسعها و ادراکها غیر میسورلجمهورالناس بل لایعلمها الا الراسخون فی العلم واهل التوفیق الخاص منه سبحانه وتعالی وقلیل ماهم فاذالم یتعلق قیام الفاظ الترجمة مقام الفاظ القرآن الذی هوبمنزلة الفصل المُمَیِّز لترجمة القرآن الابالمعانی الاصلیه لم تکن صغری الدلیل المذکور اعنی یصدق علیها عدم قیام الفاظها مقام الاصل(بالنظر الی الاوصاف الاربعة المذکوره)الالغوّاوغلطا فلا یقال لهذاالدلیل الا بناء الغلط علی سؤ الفهم والغلط بالنظر الی متعلق الفصل المُمَیِّز لترجمة القرآن هکذاینبغی التحقیق بتوفیقه سبحانه و تعالی ومنه الهدایة الی سبیل الرشاد۔

﴿الشبة الثانية﴾ یقال عدم امکان الترجمة بالنظر الی المعانی الثوانیه و المعارف الخصیصة للقرآن یستلزم عدم امکان الترجمة بالنظر الی المعانی الاصلية لانها مکملاتها و متمماتها کما قال الامام الشاطبی فی الموافقات فی اصول الشریعه "فمثل هذه التصرفات التی یختلف معنی الکلام الواحد بحسبها لیست هی المقصود الاصلی ولکنها من مکملاته و متمماته" فظاهر علی کل احد ان کل شیءٍ فی الدنیا لا یکمل بدون مکمِّلاته ولا یتم بدون متمماته فکیف تتم ترجمة القرآن بالنظر الی المعانی الاصلیه بدون امکان ترجمة القرآن بالنظر الی المکمِّلات و المتممات۔ وعدمه ظاهر لا یخفی علی اهل العلم کما قال ابن قتیبة فی کتابه تاویل مشکل القرآن "ولذلك لا یقدر احد من التراجم علی ان ینقله الی شیئ من الالسنة" فعدمه لم لا یستلزم عدمه و حاصل الاستدلال یکون هکذا

ترجمة القرآن بالنظر الی معانیه الاصلیه غیر ممکن

لانها مکمّلة و متمّمة بالمعانی التی ترجمتها غیر ممکن

و کل ما هذا شانه فهو غیر ممکنٍ

فترجمة القرآن غیر ممکن

و جوابه بانه محض المغالطه و ان لم یمل عنه الغُمرُ الغافل لظاهر صورته لا یمیل الیه المجرب الخبیر لفسا مادته اعنی الصغریٰ التی قیل فیها بتکمیل الترجمة بالنظر الی المعانی الاصلية بالمعانی الثوانیه و تتمیمها بها وهو لیس الّا الکذب المحض او المغالطه المحضه بان المعانی الثوانیه بشتی انواعها مکملات المعانی الاصلية و متممتها کمثل المحسنات البدیعیة بالنسبة الی الکلام البلیغ ولا یتصور ربطها بالترجمة فضلا عن کونها مکملاتها کما قال الامام الشاطبی فی الموافقات فی اصول الشریعة "لیست هی المقصود الاصلی ولکنها من مکملاته و متمماته" و ان کان مظهر قول الشاطبی

ھذا ادنی ضوء المعانی الثوانیه والمعارف المثانی فی طی نظم القرآن کما لا یخفی علی اهل المعرفة ویعلم کل انسان بان هنا اُمورًا اربعة۔

احدها القرآن الکریم من حیث مصداقه یعنی کلام الله المنزل علی الرسول ﷺ المنقول عنه ﷺ نقلا متواترا لاشبهة فیه المجموع المرکب من النظم من حیث الدلاله ومن المعنی من حیث المدلول۔

وثانیها المعانی الاصلیة التی یفهمها العرب بنفس السماع والعجم بواسطة الفنون الآلیة لفهم القرآن۔

وثالثها المعانی الثوانیه المثانیه فی طی نظم القرآن التی لا یدرکهاالا الراسخون فی العلم الموفقون من عندالله عزوجل ونسبتها الی المعانی الاصلیه کمثل نسبة المحسنات البدیعیه الی الکلام البلیغ من التزیین والتتمیم والتکمیل وغیرها من الفوائد۔

ورابعها ترجمة القرآن بالنظر الی معانیه الاصلیة التکلیفةللعلم والعمل بهاوبالنظر الی معناها المتعارف اعنی ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التی تقوم مقامها و هذه الامور لایحمل بعضها علی بعض لِتَباینها مفهوماومصداقا ومزید توضیحهه مع التجزیة یکون هکذالایطلق القرآن علی شیئ من الامور الثلاثة المذکوره علی سبیل الحقیقه ای حقیقة کان لغویة، اوشرعیة او عقلیة فلا یمکن ان یقال"المعانی الاصلیة للقرآن قرآن"الا علی سبیل تعارف الناس والمجاز واماالامور الثلاثه فلا یمکن اطلاق شیئ منها لاعلی القرآن ولا بعضها علی البعض راسافلا یجوزان یقال "القرآن هو المعانی الاصلیة او المعانی الثوانیه"وکذالایمکن ان یقال"القرآن هوالترجمة"بای وجه الکلام حقیقة ومجازًا،وعرفا وهذاالتباین والتفریق بین الامور الاربعة لیس شیاء دقیقا اوعسیرالفهم بل فهمه یسیرعلی ذوی البصائرواما فاقدوالبصیرة الذین یعدون نفوسهم فی عِدَادِ العلماء ویشتهرون فی معاشرة المسلمین بالعلم والبصیرة من غیر

بصیرۃ فلیسوا بمخاطبین لنا ومقصدنا الوحیدمن ھذاالتحریر ھو تحویل اذھان ذوی البصائر الی ھذہ الحقائق لیکونوا حافظین لکتاب اللہ الکریم عن التحریف المعنوی باسم الترجمۃ وکتابنا ھذا مضنون بہ علی غیر اھلہ فلا یأخذوہ لایبذل الثمن ولا مجانا لانھم لایتأھلون لدرک حقائقہ فھو لاھل البصیرۃ خاصۃ۔وبعدھذہ المعترضۃ نعودالی موضوع الکلام ونقول کلماکانت ھذہ الامور الاربعۃ متغائرۃ المفھوم والمصداق وتأبی حقیقہ الحال من حمل بعضھا علی البعض وکانت المعانی الثوانیہ التی لا یمکن ترجمتھامن مکملات المعانی الاصلیۃ ومتمماتھا لامن متمّمات ترجمۃ القرآن بالنظر الی المعانی الاصلیۃ فکیف تصح صغری القیاس المذکور"لانھا مکملۃ ومتممۃ بالمعانی التی ترجمتھا غیرممکن"فحمل قولہ"مکملۃ ومتممۃ بالمعانی التی ترجمتھا غیرممکن"علی سبیل الحدالاوسط علی الضمیر المنصوب المتصل اعنی ھافی "لانھا" من حیث الحد الاصغر الراجع الی الترجمۃ من حیث الحد الاصغر لیس الا الکذب المحض فلم یتم التقریب فبقی دعویٰ عدم امکان ترجمۃ القرآن باعتبار المعانی الاصلیۃ بلا دلیل وبرھان۔

﴿الشبۃ الثالثہ﴾ یقال بعض الفاظ القرآن وکذابعض جملہ وآیاتہ ذومعنیین متضادین اواکثر ولا یوجد فی العجمۃ ما یقوم مقامھا من حیث الترجمہ وان وجد موافقالہ فی نفس اللغۃ یخالفہ من حیث الاستعمال اما بالنظر الی الحقیقہ والمجاز واما بالنظرالی المحاورۃ وغیرھا وصحۃ الترجمۃ لابدلھا من المطابقۃ فی کل الوجوہ المتعارفہ کما ھو المتبادر المتفاھم من تعریف الترجمۃ اعنی ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخرالتی تقوم مقامھا۔وظاھر ان قیام الفاظ الترجمہ فی العجمیۃمقام الفاظ القرآن فی جمیع حیثیاتھاواحوالھا ممالایکاد ان یوجد وحاصل الاستدلال علیہ علی سبیل الدلیل المباشریکون ھکذا

لولم یمتنع ترجمة القرآن

لماامتنع قیام الفاظ الترجمة مقام الفاظ القرآن من کل الوجوه

لکن قیام الفاظها مقام الفاظه من کل الوجوه ممتنع

فترجمة القرآن ممتنع

وجوابه انالانسلم صدق هذاالاستدلال لان الحکم فی تالیه بامتناع قیام الفاظها مقام الفاظه من کل الوجوه خطاء ومبنی علی سؤ الفهم حیث فهموامنه القیام والمطابقه فی ظاهر الاحوال وباطنهاوفی المعانی الاصلیة التکلیفیه التی یتعلق بها الغرض المطلوب من الترجمه وفی المعانی الثوانیه التی لایتعلق بها الغرض المطلوب من الترجمه فظنوان امتناعه یستلزم امتناع الترجمه وهوخلاف ماعلیه امرالترجمه من ان المراد من قیامها مقامها ومطابقتها معها لیس الا بالنظر الی المعانی الاصلیه التی یعلمها علماء العرب بنفس السماع وعلماء العجم بواسطة الفنون الآلیة لفهم القرآن وهو غیر ممتنع بل یسیر علی من یسره الله علیه ممن استجمع شرائط الترجمه ومع هذا لو اشکل فی المواضع الیسیره العدیده من القرآن وهوشاذونادربالنسبة الی جمیع آیات القرآن فحله یمکن فی ضوء فن الترجمه واصولها المسلمة المعمول بها بین اهل العلم وقدبینّت امثلتها فی اول باب هذاالکتاب فالینظرثمه۔واذکرایضا بعض اصولها المخصوصة بهذاالصنف فی البحث الآتی فی الباب الثالث المتعلق بالشرائط المخصوصة بترجمة القرآن واصولها وحاصل الجواب عن الشبهة المذکورة ودلیلها ان الحکم بامتناع المطابقة بین الفاظ الترجمه والفاظ القرآن خلاف الحقیقة وضد الانصاف فلا یصغیٰ الیه۔بل الانصاف ان یقال اغما لانف محرمی ترجمة القرآن انّ ترجمة القرآن حسب شرائطها واصولها فرض علی الکفایة لانها وسیلة التبلیغ المطلوب من الامه بقوله سبحانه وتعالیٰ"وَ اُوحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنذِرَکُم بِهٖ وَمَن

بَلَغَ"(۱)وبقوله ﷺ"بلغوا عنی ولو آية"

وكل وسيلة التبليغ فرض على الكفايه......فترجمة القرآن فرض على الكفاية

وينبغي ان يقال ايضا ان ترك ترجمة القرآن حسب مواقع الضرورة الداعيه من التبليغ بالقرآن معصية لانه اعراض عن المطلوب الشرعى الثابت من القرآن والسنة وكل اعراض عن المطلوب الشرعى الثابت من القرآن والسنه معصية،فترك ترجمة القرآن معصية۔

﴿الشبة الرابعه﴾ يقال ان عجائب القرآن لانهاية لهاولاتنقضئ بل تنكشف يوما فيوماحسب كثرة النظرفيه كماتشهدبه تجربة اهل النظروكشفُ اهل الكشف على ضد مايحدّده المقلّدون وكماجآء به الخبرالماثورعن النبیﷺ"كتاب الله حبل ممدود من السمآ الى الارض"(۲)۔

لايخفى على احدمن اهل البصيرة ان مدآياته من السمآء الى الارض ليس معناه الا الارتباط الباطنى الدائم المستمر المحيط لجميع اقطارالارض وحصص السمآء كما هوالمتبادرمن ذكرهما مطلقا وكذالمراد من عدم انقضآء عجائبه عدم تناهى معارفه العجيبه المثنية فى طى نظمه وتعاطف داله ومدلوله وايضا يعلم كل احد ان الفاظ ترجمته باى لغة كانت لاتفئ بهذاالارتباط والمعارف الغير المتناهيين لانها مخصوصة بلسان قوم خاص فى حصة من حصص الارض المعمورة فلا يمكن تصور امكان الوفاء وقيام الفاظ الترجمة مقام الفاظ القرآن وبدونه لايمكن الترجمة وحاصل الاستدلال فى هذا المنهج يكون هكذا

ترجمة القرآن غيرممكن

لانها لوكانت ممكنة لامكن قيام الفاظ ترجمتِهِ مقام الفاظه من حيث عدم متناهى

---

(۱) الانعام:19۔

(۲) جامع ترمذی،ج:2،ص:219،مطبوعه سعيد كمپنى كراتشى۔

المعارف العجیبه و الارتباط التام من السمآء الی الارض۔

لکن لایمکن قیام الفاظ ترجمتِهٖ مقام الفاظه من حیث عدم تناهی المعارف العجیبه

والارتباط التام من السمآء الی الارض

فترجمة القرآن غیرممکن

وجوابه بان هذاالقیاس لیس بشیٍٔ یعقل لعدم اتصال نسبتیه یعنی بین امکان الترجمه وبین امکان قیام الفاظها مقام الفاظ القرآن من جهة الحیثیة المذکوره لان الاتصال فی القیاس الاتصالی الاستثنائی حسب تفصیل المناطقه لایخلوعن ثلاث صور الاولیٰ یکون المقدم علة للتالی کما فی نحو"ان کانت الشمس طائفة فاالنهارموجود"۔

والثانیه علی عکس هذاکمایقال"ان کان النهار موجودًا فالشمس طالعة"۔

والثالثة یکون المقدم والتالی کلاهما معلولی شیٍٔ آخرکمایقال"ان کان النهار موجودًا فالفضآء مضئیة"

فظاهر ان المقدم فیه یعنی وجودالنهار والتالی یعنی اضائة الفضاء کلاهما معلولان لوجود الشمس کمالایخفی علی احد من اهل البصر وشرح الاتصال بین المقدم والتالی فی القیاس الاستثنائی الاتصالی بهذا النمط وان کان مشهوراعندالمیزانین لکن لایختص بهم بل لکونه حقیقة واقعیة یجری فی الالٰهیات ایضا کمایقال فی الصورةالاولی ان کان زید مومنا صادقابالنبی ﷺفهومحب له ﷺ

وفی الصورة الثانیة"ان کان زید محباله ﷺفهومومن صادق به ﷺفظاهر ان المحبة له ﷺوالرضا بحکمه کلاهما لازمان للایمان الصادق به ﷺفیصدق ان یقال لوکان زیدٌ محبا صادق ﷺفهوراضٍ بحکمه ﷺ"کلزوم وجودالنهار واضائة الحولطلوع الشمس وهکذافی سائرلوازمات الایمن مع الایمان کما بسطته کل البسط فی کتابی الآخر"اُصولِ تکفیر"وفی ضوء هذه الحقائق لایوجد الاتصال بین نسبتی المقدمتین

فی قیاس القائسین المذکورین لعدم التلازم بین امکان الترجمہ وبین امکان قیام الفاظ الترجمۃ مقام الفاظ القرآن من جھۃ الحیثیۃ المذکورہ کما لایخفی علی المستبصر الیقظان لان الترجمۃ لایمکن تصورھا بدون تصور الغرض المطلوب منھا وھو اطلاع اھل لسان الترجمۃ ومن الیھم علی المعانی الاصلیۃ للقرآن واما المعارف العجیبہ الغیر المتناھیہ واحاطۃ الارتباط من السمآء الی الارض فمن قبیل المعانی الثوانیہ لایتعلق بھا الغرض المطلوب من الترجمۃ وظاھر ایضاان العامل المختارفی عملہ ای العمل کان لایتصدی اولا وبالذات الاالغرض المطلوب ولا یکون مقصودہ الاصلی الاذاك فعدم لزوم امکان قیام الفاظ الترجمۃ مقام الفاظ القرآن من حیث المعارف العجیبہ الغیر المتناھیہ واحاطۃ الارتباط بین السمآء والارض والقدم والازلیۃ وغیرھا من الفضائل المختصۃ بالقرآن لایقدح فی جوازترجمۃ القرآن وامکانھا فھذاالاستدلال علی عدم امکان ترجمۃ القرآن بمعزل عن الدرایۃ والروایۃ فالینظر الذین یستدلون علی فساد لفساد ترجمہ القرآن وحرمتہ او علی عدم امکانہ بمثل ھذہ الھفوات الی شتی زوایاتنقیدنا علیھم بدقیق النظرھل یبدولھم شیئ لا یعقل اویردہ الدرایہ اوالروایۃ واتیقن بفضلہ وتوفیقہ سبحانہ وتعالٰی لایجدونہ الامزیل الشبھات والاوھام ولا نکتفی لجوازترجمۃ القرآن بھذاالقدر ولا نقف فی ھذاالموقف فقط بل نستدل علی رغم ھٰاولاء المانعین للامکانھا ونقول بتوفیقہ سبحانہ وتعالٰی "لولم تکن ترجمۃ القرآن ممکناالامکن نقیضہ وھوعدم ترجمۃ القرآن لکن عدم ترجمۃ القرآن لیس بممکن فترجمۃ القرآن ممکن" واماتفصیل اجزاء دلیلناھذا و تنقیحہ" فالمقدمۃ الاولی منھا بدیھیۃ من قبیل الاولیات لان العقل لایجوز اجتماع النقیضین ولاارتفاعھمافلاضرورۃ لطلب الدلیل علیہ واماالمقدمۃ الثانیہ التی استثنی فیھارفع التالی

اعنی لکن عدم ترجمۃ القرآن لیس بممکن فمبرھن بدلیل انہ مقتضا عموم الرسالۃ کما ھو المفھوم من قولہ سبحانہ وتعالٰی "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا" (۱) "يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا" (۲) "وَاُوْحِىَ اِلَىَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ" (۳) وقولہ ﷺ "بلغو عنی ولو آیۃ" (۴) وقولہ ﷺ "لا یسمع بی احد من ھذہ الامۃ یھودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یومن بالذی ارسلت بہ الا کان من اصحاب النار" (۵) وعموم رسالتہ ﷺ للعرب یقتضی التبلیغ بالقرآن وتعطیراذانھم بمعانیہ الاصلیۃ فی لسانھم سوآء کان المبلغ ھو ﷺ بشخصہ الشریف اوورثائہ من علماء الحق کثراللہ سبحانہ وتعالٰی سوادھم الی یوم القیامۃ وللعجم یقتضی ابلاغ معانیہ الاصلیۃ وتانسیھم باحکامہ التکلیفیہ وجذبھم الی معانیہ الفطریہ والی مایرغبھم الی النظر والتفکرفیہ فی السنتھم الاعجمیہ وھذالایمکن الابترجمۃ القرآن بالنظر الی معانیہ الاصلیہ التی یعلمھا العرب بنفس السماع والعجم بواسطۃ الفنون اللسانیہ الآلیۃ لفھم القرآن والعلوم الخادمۃ لہ وھذاھوالمعروف المتعامل بہ بالنظر الی تبلیغ الاعاجم بالمعانی الاصلیۃ للقرآن مدی الایام من بدء الاسلام الی الآن فی جمیع اقطارالارض والبلدان قضاءً لاقتضاء عموم رسالتہ ﷺ واداءً لفریضۃ ابلاغ

---

(۱) السباء:28۔

(۲) الاعراف:158۔

(۳) الانعام:19۔

(۴) جامع الصغیر مع فیض القدیر،حدیث نمبر: 3159،ج:3،ص:206،مطبوعہ دارالفکر بیروت۔

(۵) مشکوٰۃ الشریف،کتاب الایمان مع المرقات لملاعلی القاری،ج:1،ص:67۔

الاعاجم المعانی الاصلیه للقرآن کماقال الزمخشری فی کشافه"وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمۡ فَیُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ وَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ"(فان قلت:لم یبعث رسول اللّٰهﷺالی العرب وحدهم وانمابعث الی الناس جمیعا۔قل یایها الناس انی رسول الله الیکم جمیعا۔بل الی الثقلین وهم علی السنة مختلفة،فان لم تکن للعرب حجة فلغیرهم الحجة، وان لم تکن لغیرهم حجة فلو نزل بالعجمیة لم تکن للعرب حجة ایضا،قلت:لایخلواماان ینزل بجمیع الالسنة او بواحدمنها،فلا حاجة الی نزوله بجمیع الالسنة لان الترجمةتنوب عن ذلك وتکفی التطویلَ، فبقی اَن ینزل بلسان واحد،فکان اولی الالسنة لسان قوم الرسول لانهم اقرب الیه، فاذافهمواعنه وتبینّوه و تُنُوقِلَ عنهم وانتشرقامت التراجم ببیانه وتفهیمه،کماتری الحال وتشاهدهامن نیابة التراجم فی کل امة من امم العجم،مع مافی ذلك من اتفاق اهل البلادالمتباعدة والاقطار المتنازحة والامم المختلفة والاجیال المتفاوتةعلی کتاب واحد،واجتهادِهم فی تعلّم لَفظِهٖ وتعلّم معانیه)فَکَاَنَّ قوله"کما تری الحال وتشاهدها من نیابة التراجم فی کل امة من امم العجم الی قوله"واجتهادِهم فی تعلّم لفظه وتعلّم معانیه"۔

خلاصةُ مَافصّلناه وعکسُ عملِ التبلیغ للاعاجم بالقرآن ومرآةُ الحقائقِ العملیه التی لا یمکن انکارها ولذا لاتری احدامن المُفسِّیرین الذین جآؤ بتفسیر آیت رقم 4من سورة ابراهیم بعدالزمخشری ناقِدًا علیه بل کلهم مستسلمون لدیه تسلیمَ السکوت والرضا لان السکوت فی معرض البیان بیان حتی ان مصنّف الانصافِ فیماتضمنه الکشاف من الاعتزال الامام ناصرالدین احمد ابن محمدالمالکی مع التزامه النقدَ علی الزمخشری اظهرالرِّضَا به وقال"قال احمد جمیع الفصل مرضی"(۱)۔

(۱) الانصاف فیما تضمنه الکشاف من الاعتزال المطبوع مع الکشاف المجلد الثانی، ص:366،مطبوعه دارالمعرفه بیروت۔

والامـام ابو اسحاق الشاطبی فی موافقاته "فامّا علی الوجه الاول فهو ممکن ومن جهته صـح تـفسيـر القرآن وبيانُ معناه للعامة ومن ليس له فهم يقوى على تحصيل معانيه، و كـان ذلك جـائزاً باتفاق اهل الاسلام فصار هذا الاتفاق حجة فی صحة الترجمة علی المعنی الاصلی۔"(۱)

خلاصة البحث فی الباب:۔

(۱) وماذكرناه من الاشتباهات الاربعة بالنظر الى جواز ترجمة القرآن هی امهاتها التی تتولد منها الوساوس بشتى انواعها ونحن تركنا ذكرها لانا لم نر كبير فائدة فی آن نسردها بل اكتفينا بهذه الامهات المنتجة النتائج العقيمه ودء بنا لا فی هذا الكتاب فقط بل فی جميع تصانيفنا هو الاكتفاء بالاصول والامهات والاجتناب عن التطويل ونحن على يقين انشاء اللّٰه العلی الكريم بان ما اكتفينا به هنا هو كاف لازالة ای شبهة وشاف لجميع الوساوس المتولدة من الاسس المذكوره المنقلعة بالحقائق اللاتی سردناها بشرط ان ينظر فيها الناظرون بدق النظر ويتفكروا فی سابقها ولاحقها بفكر سليم صاف لاشرقی ولاغربی بل بخالص نور الايمان۔

(۲) ترجمة القرآن بالمعنى المتعارف اعنی ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التی تقوم مقامها لا يقال لها بالنظر الى المقصد انها جائز فقط بل فی جوازها تفصيل بانها تجب على سبيل العين تارة وعلى الكفايه تارة اخرى اعنی لا بالتعيين على شخص او اشخاص مخصوصين بل على جماعة المسلمين بالاجمال بحيث اذا اتى بها البض حصل المقصود وفی بعض الاحيان لا تجب بل تستحب لغرض التبليغ بالقرآن وهذه الاحكام الثلاثة لترجمة القرآن توابع لاحوال الناس بالنظر الى الظروف والمعاشره۔

(۱) الموافقات، ص:239، المطبوعه دار الكتاب العربی بيروت۔

(۳) مطابقة الفاظ الترجمة بالفاظ القرآن وقيامهامقامها المذكورفی تعريف ترجمة القرآن المتعارفه اعنی ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخراللتی تقوم مقامها۔المراد منه المطابقه بالنظر الی المعانی الاصلاالاصليةللقرآن التی يفهمها العرب بنفس السماع والعجم بواسطة الفنون الآلية لفهم القرآن والعلوم الخادمه له لان الفرض المطلوب من ترجمة القرآن هو ابلاغ هذه المعانی فقط لاهل اللسان الذی يترجم فيه ومن اليهم واما المعانی الثوانيه المثنيات فی طی نظم القرآن و المعارف والاسرار اللواتی لايدركها جمهورالعرب بنفس السماع ولاالعجم بوسيلة الفنون الآلية لفهم القرآن فلا يتعلق بهاالغرض المطلوب من الترجمه اذهی وراء فهم الجمهورمن اهل لسان القرآن حيث لا يفهونها بنفس السماع بدون توفيقه الخاص سبحانه وتعالٰی فضلا عن العجم فلا فرق بين العرب والعجم بالنظر اليهافلا يبقی ای فائدة لربط مقصد الترجمة بها وهكذا حال القرآن من حيث الارتباط بكل شیئ من السماء الی الارض ومن حيث القدم والازليه والبرزخيه بين الخطاب والكتاب وبين نظم الكلام ونثره لايتعلق الغرض المطلوب من الترجمة بهالكونهاخارجة عن المعانی الاصليه للقرآن وتسترهاعن فهم جمهورالناس حيث لايعلمها العرب فضلا عن العجم الا الراسخون فی العلم الموفقون منه سبحانه وتعالٰی بتوفيق خاص وماجاء فی بعض الروايات ان عمرابن الخطاب ﷺتعلم سورة البقرةفی اثنتی عشرة سنية كمافی الجامع لاحكام القرآن للامام ابی عبداللّٰه الانصاری القرطبی، ج: 1، ص:40،المطبوعه بمكتبه الغزالی دمشق الشام۔

وكذاماجاء فی عبداللّٰه ابن عمر (رَضِیَ اللّٰه تَعَالٰی عَنْهُمَا)انه تعلم سورة البقرة مدة ثمانی سنين كما فی الموطالِامام المالك،ص:190،مطبوعه ميرمحمدكراتشی باكستان۔

وماجاء عن ابن ابی مليكه فی ابی بكر الصديقﷺانه قال سئل ابوبكر الصديق ﷺفی

تفسیرحرف من القرآن فقال ای سمآء تظلنی و ای ارض تُقلنی و این اذھب و کیف اصنع اذاقلت فی حرف من کتاب اللّٰہ بغیر مااراد تبارک و تعالٰی(١)۔

کل ھٰذہ و امثالھا متعلقة بمعارف القرآن و اسرارہ التی لا یعلمھا جمھورالناس من العرب بنفس السماع فضلا عن العجم من ترجمة القرآن لانھا خارجة عن المعانی الاصلیہ التکلیفیہ ومثنیة فی طی نظم القرآن وبھٰذا الاعتبار یصح اطلاق لفظ المثانی"اسم مفعول جمع مکسرلمثنی من الثلاثی المجرد اعنی ثنی یثنی ثنیا بمعنی الطی و التلفیف"علی کل آیة القرآن الکریم کما ینبیٔ عنہ الفاظ الحدیث"لَاتَنْقَضِی عَجَائبہ"(٢)ولا یعلمھا الا الراسخون فی العلم بعضھم بمحض موھبة اللّٰہ عزوجل وبعضھم بعدالریاضة و اماتة النفس الامارة فی طلبھا حتی یصیر من المحدّثین والملھمین الموفقین الذین یرون مالایراہ جمھورالناس ویسمعون مالایسمعہ اکثر اھل الفضل و الکمال فضلا عن العوام۔وعمرابن الخطاب و ابنہ عبداللّٰہ (رَضِیَ اللّٰہ تَعَالٰی عَنْھُمَا)و امثالھمامن اکابر الصحابہ مع کونھم فائزین بھٰذہ السعادة العظمٰی قد خفی علیھم بعض خبایاالمعارف القرآنیہ وتفسیرُ بعض الالفاظ لابکونھا غریبة وحشیةغیرمانوس الاستعمال حتی یلزم کون القرآن غیر فصیح ویلزم کذب دعویٰ کونہ عربیامبینا ویُسرالفھم العیاذباللّٰہ بل لوسعة خبایاہ المخصوصة بہ وعدم تناھی زوایا مظاھرہ التی لاتوجد فی غیرہ فضلا عن الترجمة فلا یتعلق بھا الغرض المطلوب من ترجمةالقرآن لان المقصود الاصلی من ترجمة القرآن ھو اطلاع اھل لسان الترجمة ومن الیھم علی المعانی الاصلیة للقرآن التی یقال لھا المفھوم الاول ایضا

(١) الجامع لاحکام القرآن،للامام القرطبی الانصاری المجلد الاول، ص:34، مطبوعہ الغزالی الدمشق الشام۔

(٢) جامع الترمذی،باب فضائل القرآن،ج:2،مطبوعہ سعید کمپنی کراتشی۔

وکل تفسیر خفی علی صحابة الرسول ﷺ اهل لسان القرآن سیماالذین نزل حسب تحاورهم کما قال النبی ﷺ "فاکتبوهابلسان قریش فان القرآن انزل بلسانهم"(١) فهو من قبیل المعانی الثوانیه والمفهوم الثانی الذی هو وراء فهم جمهور اهل لسان القرآن وان کانوا قریشا مثل ابی بکر وعمر (رَضِیَ اللّٰه تَعَالٰی عَنۡهُمَا) وعدم فهمه لایقدح فی فضلهم کما لا یضر عربیة القرآن الفُصحیٰ ولایخرجه عن البلاغة لانه وراء المعانی الاول المتعلقه بعلم المخاطبین وعملهم والفصاحة والبلاغة لا یتعلقان بالمفهوم الثانی بل یُنۡظَرُ فیهمابالنظر الی المفهوم الاول والغرض المسوق له الکلام فقط کما یظهر من کتب البلاغه ولایخفی علی من مارس الفن وهولیس الاالمعانی الاصلیة للکلام فلا یلزم من عُسرفهم امثال هذه المعارف عُسرُفهم القرآن حتی یکون ضدالقوله عزوجل "وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ"(٢) ولاخروجُ القرآن من الفصاحة والبلاغة ولا عدم امکان الترجمة لان ترجمة القرآن لایتعلق الابالمعانی الاصلیة للقرآن وکذا حال القرآن من حیث حلاوته اللسانیه والاستلذاذالسماعیه والجَذبِ الحواریه لا یتعلق بها الغرض المطلوب من الترجمةفلا یبقی لتعلق الغرض المطلوب من الترجمة الاالمعانی الاصلیه التی یفهماجمهورالعرب بنفس السماع والعجم بوسیلة العلوم الآلیة لفهم القرآن کما هو المتعارف المشاهد فی علماء العجم المهرة فی الفنون الآلیة لفهم القرآن والعلوم الخادمة له واماجمهور العجم الذین لایعلمون العلوم الخادمه فلا سبیل لهم لفهمها الاالترجمه بمعناها المتعارف اعنی "ابدال الفاظ القرآن بالفاظ لسانهم التی تقوم مقامها" حسب الشرح الذی بسطناه للطالبین من اهل العلم واما الذین یرون فی صف علماء العجم لکن لا مهارة لهم فی الفنون والعلوم الخادمة

---

(١) بخاری شریف، ج:2، کتاب ابواب فضائل القرآن مطبوعه قدیمی کتب خانه کراتشی

(٢) القمر:17۔

للقرآن وان كانوامدرسين ومعلمى الناس و خطبائهم المشهورين بالعلم والفضل فهم فى ضوء تجربتنا فى حكم عوام الناس وجمهورهم وان كان بين الطائفتين بونا بعيدامن حيث العلم وعدمه والسائس والمسوس و الرائس والمرؤس والمقتدى والمقتدىٰ وغير ذالك فى الجهات الكثيره لأنّ ترجمة القرآن تقتضى الاحتياط كل الاحتياط من كل الوجوه ومشروطة بشروط كثيره بحيث لا تصح بفقد شرط واحد مع استجماع باقى الشرائط فضلا من ان يصح مع فقد الشرائط فوق الواحدومن شرائط صحتها وجواز الخوض فيها المهارة التامة فى جميع الفنون الآلية لفهم القرآن والعلوم الخادمه له مثل علم التصريف والنحو والاشتقاق ومتن اللغة وعلم المعانى والبيان والبديع قال امام البلاغة يوسف السكاكى؛

"ان الواقف على تمام مرادالحكم تعالٰى وتقدُّس من كلامه مفتقر الى هذين العلمين كل الافتقار فالويل كل الويل لمن تعاطى التفسير وهو فيهما راجل"(١)

وقال الامام الراغب الاصفهانى"كل من كان حظه فى العلوم اوفركان نصيبه من علم القرآن اكثر"(٢)

وقال الامام فخرالدين الرازى"ومتى تكلم فى القرآن من غير ان يكون متبحرا فى علم الاصول وفى علم اللغة والنحو كان فى غاية البعد عن اللّٰه"(٣)

وذكر المحدث الشوكانى القاضى بحوالة فضيل ابن عياض انه قال"لن تعلمو االقرآن حتى تعرفوااعرابه"(٤)

---

(١) مفتاح العلوم،ص:70،مطبوع دارالكتب العربيه بيروت۔

(٢) مقدمة التفسير للراغب الاصفهانى المطبوعه مع مفردات القرآن، ص:597، مطبع اصح المطابع كراتشى باكستان۔

(٣) التفسير الكبير،ج:7،ص:191،مطبوعه طهران۔

(٤) مقدمة التفسير فتح القدير،ج:1،ص:14،طبع دارالفكر بيروت۔

هذاشان تفسيرالقرآن لايمكن اداء حقه بدون العلوم الخادمه ويهلك متصديه بهلاكة الجهل كل الهلاك بدون المهارة فى الفنون الآلية لفهم القرآن فكيف يتصور صحة ترجمة القرآن بدون المهارة التامه فيها وشان ترجمة القرآن احوط واصعب واكثر شرطا من تفسيرالقرآن وكل ما يوجد ويُرىٰ من اغلاط التراجم فى الدنيا بالسنة مختلفه ليس الا من نتائج فقد الشرائط فى المترجمين وان كانت الدنياتقول لهم المحدث والمفسر والمدرس والمفتى وشيوخ الحديث والتفسير ومرشدالناس وتكفى لهذه الفاجعة مثالاترجمةآيت رقم 69من سورة البقره"اِنَّه يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ"ترجمهاالمترجمون بلسان اردو (حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زردرنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو) وترجمة هذه الترجمه بالعربى تكون هكذا(يقول الحق المتعال ينبغى ان يكون ثورااصفرلونه ينبغى ان يكون شديد الصفرة بان يكون سارًا للناظرين)ومفاسد هذه الترجمه تتجاوزعن ثلاثين اغلاطا بعضها ظاهرلكن لا يُحسّ به اكثراهل العلم وبعضهااظهر وافحش لايخفى على احد من علماء العربيه وهو ترجمة بقرة صفرآء يثور اصفرلان الثور مذكر وصفة الصفرآء للبقرة ضده لكون الف تانيثه مستلزم التانيث بان لايكون مدخوله الا مونثا كما لا يخفى على من له ادنى رائحة العربيه سيما علماء النحو فترجمة بقرة صفرآء بثوراصفر لا تختلف من آن تترجم الضان الصفرآء بكيش اصفراو ان تترجم المعز السودآء بتيس اسود او تترجم امرئة بيضآء برجل ابيض وهو كما ترىٰ من الفحش الاظهر فى ترجمة القرآن ولا حول ولا قوة الا بالله وامثال هآاولآء المترجمين ليسوا بآسافل العلماء ولا مجهول الذكر بل من مشاهيرالهند الى ان قال بانى باكستان محمدعلى جناح لاحد هآاولآء المترجمين اذكان مؤيداله فى مساعيه لتحريرالهند وتحريك الباكستان، "ومعى من علماء الهند فى ضدعلماء الذين مع نهروفى خلاف باكستان لحرى بان

یوذن بذھب"ومقصدنا الوحید من ھذاالمثال ھو تائید موقفنا المذکور بان المعیا ر لصحۃ ترجمۃ القرآن ھو استجماع الشرائط مع التوفیق من عنداللہ عزوجل لا شھرۃ المترجم بالعلم والفضل والدرس والفتویٰ وغیرذالک من الفضائل وعظیم الالقاب و من الشرائط الواجبتہ المھارۃ التامہ والرسوخ الکامل فی جمیع الفنون والعلوم الآلیۃ لفھم القرآن حتی لوکان الذی یتصدیٰ لترجمۃ القرآن قلیل البضاعۃ فی فن واحد فقط من ھذہ العلوم الوسیلۃ لفھم القرآن لایمکن لہ اداء حق الترجمہ ولا یجیز لہ الشرع للخوض فی ھذاالعمل والایکون مایظلمہ اکثرممایعدلہ کما رئیت فی ھذاالمثال۔

(٤) ترجمۃ القرآن بمعناھا المتعارف اعنی ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التی تقوم مقامھا سھل ویسیر لمستجمع شرائطھا الموفق منہ سبحانہ وتعالیٰ ولہ یجیز الشرع للولوج فیھاحسب مقتضاء الحال وجوبافی حین واستحبابا فی حین آخر وفرضا عینا فی شخص وکفایۃ فی الاشخاص اجمالا ووجودھا اولآء الکاملین المکمِّلین لمقاصد عموم الرسالۃ المبلّغین دعوتھا للاعاجم الحافظین لکتاب اللہ تعالیٰ من تحریفات الجاھلین لایفقدمدی الایام بل ھو مستمرمن ابتداء الاسلام الی ان تقوم الساعہ کما جآء فی الحدیث"یحمل ھذاالعلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاھلین"(١)

وھی غیر تیسربل صعب کل العصب علی فاقد شرائطھا لعدم التوفیق منہ سبحانہ وتعالی ولایجیزلہ الشرع للولوج فی ھذا الخطر وکل مایُری ویوجد من التراجم الصحیحۃ فی ای لسان من السنۃ الدنیا فھو من فیض جامعی الشرائط الموفقین من عنداللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ۔

وکل مایری من التراجم الغیر المعیاریہ فھو من فاقدی الشرائط الغیر الموفقین وھم

---

(١) مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، ص:36۔

الاکثرون بغالب الاکثیریه ومَثَلُ قلة الطائفة الاولیٰ السعیدة البارة فی مقابل هآاولآء الاکثرین کمثل قلة الملح فی الطعام حتی لایبعد ان یعد واحد منهم بالف من هآاولآء الاکثیرین کماقال البحری؛

ولم ازامثال الرجال تفاوتا لدے المجد حتی عدالف بواحد (۱)

(۵) والاصل الاصیل والحجر الاساسی لصحة ترجمة القرآن بمعناهاالمتعارف "ابدال الفاظ القرآن بالفاظ السان الآخرالتی تقوم مقامها" حسب التفصیل الذی فصلناه قبل بعداستجماع الشرائط بل قبلها هو التوفیق من الله عزوجل بمعنی ان استجماع الشرائط لایمکن بدون توفیق الله تعالیٰ وتوفیقه سبحانه وتعالیٰ فی هذاالشان لایظهر بدون استجماع الشرائط فالافتقار من کلی الجانبین مع اختلاف الجهة من حیث الوجود والظهور فالحکم علی ترجمة القرآن بالنظرالی المعانی الاصلیة للقرآن بالفساد و بالنظر الی المفردات المرتبه التی یقال لهانظم القرآن بالحرمة وعدم الامکان کماهو داب العلامه المناع القطان فی مباحث علوم القرآن بنائه علی اربع غفلات؛

احدها:۔ الغفلة عن تعریف ترجمة القرآن وعن الغرض المطلب منهاوعن موضوعها۔

ثانیها:۔ الغفلة عن شرائط الترجمه۔

ثالثها:۔ الغفلة عن استمرار وجود المتاهلین الموفقین لترجمة القرآن وعن تراجمهم الموجودة فی شتی السنة الدنیا وان کانت قلیل الوجود بالنسبة الی غیر المعیاریه کالملح فی الطعام۔

رابعها:۔ التلون بالظروف والمعاشره والتاثر من کثرة التراجم الغیر المعیاریة والیاس عن ایجادالترجمة المعیاریه التی تکون وفق المحاوره "محاورة لسان القرآن ومحاورة

---

(۱) خطبه تفسیر الکشاف، ج:1، ص:14، مطبوعه دارالمعرفه بیروت۔

السان الذی یترجم فیہ"اعنی حسب وفق المحاورتین فعلی ھذالایغلط ان یقال الدفعات المذکورہ من التحریم والفساد وعدم الامکان من مصنف مباحث فی علوم القرآن ومن الیہ من موافقیہ فی ھذاالحکم اِنَّہٗ بناء الغلط علی الغلط وھکذا قول علماء لجنۃ اھل الحدیث فی ترجمۃ القرآن باسم (معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اردو ترجمہ مع قرآنی گرامر) قالوافی ابتدائیتھا (ہم یہاں اپنے اس احساس کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس کی توثیق یا تائید بیسیوں دوسرے صاحبان علم نے بھی کی ہے اوران سب آراء کا ملخص یہ ہے کہ قرآن مجید کا کماحقہ ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں البتہ اس کی ترجمانی کی بہتر سے بہتر کوششوں اوراسالیب کو اختیار کیا جا سکتا ہے بس یہی ایک نقطۂ نظر ہے، جس کے پیش نظر ہر عہد کے مترجمین نے نئے سے نئے قرآنی تراجم پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔"(۱)

ترجمتہ فی اردو"نحن ھنا نریٰ ضروریا ان نبین احساسنا الذی وثقہ وایدہ العلماء الآخرون فوق اضعاف العشرین وملخص آراء کلھم ان ترجمۃ القرآن وفق اقتضاء حقہ فی لسان آخر غیر ممکن نعم یختارالجھدوالتفنن لترجمانیہ(للتعبیر عنہ) علی الوجھہ الاحسن فالاحسن فنظراالی ھذہ الفلسفہ فقط تسعدمترجموا کل عھد بایجادالتراجم الجدیدہ۔

وموقف السید ابی الاعلی المودودی بالنظرالی ترجمۃ القرآن لایتجاوز عن ھذا المنوال حیث قال بعدمااظھر عدم الرضابترجمۃ لفظیۃ "لفظی ترجمے کے طریقے میں کسر اورخامی کے یہی وہ پہلو ہے جن کی تلافی کرنے کے لیے میں نے ترجمانی کا ڈھنگ اختیار کیا ہے میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بجائے کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک

---

(۱) معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اردو ترجمہ مع قرآنی گرامر، ص: 9، مطبوعہ دارالسلام ہیڈآفس سعودیہ عربیہ الریاض، پاکستان ہیڈ آفس ومرکزی شوروم36لوئرمال سیکرٹریٹ سٹاپ لاہور۔

عبارت کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کردوں اسلوب بیان میں ترجمہ پن نہ ہو عربی مبین کی ترجمانی اردوئے مبین میں ہو۔"(۱)

ترجمته في العربي (للاجتناب عما في طريق الترجمة اللفظية من نقص وعدم كمال اخترت جهة الترجماني واجتهدت فيه عكس الباس الفاظ القرآن لباس اردو ان انقل المفهوم الذى جآء فى ادراكي والاثر الذى فاض على قلبي بعد قرائة جملة من القرآن الى لساني مع الجهد التام لصحته بان لايكون في جهة بيانه لون الترجمه يكون الترجماني لعربي مبين با اردو مبين" وكل هذه الاقوال وامثالها الكثيره في اى لغة ولسان كانت مع بنائها على الغفلات الاربعة المذكوره متلونة بلون البدعة المخترعة التي اخترعها العلامه مناع القطان في كتابه المذكور بعنوان الترجمة التفسيريه بعدماحكم على الترجمة الحرفيه اى اللفظية بعدم الامكان تارة وبالحرمة كرة اخرى وعلى الترجمة بالنظر الى المعاني الاصلية للقرآن بالفساد بعد الجواز حيث قال "ويحق لنا ان نقول ان علماء السلام اذاقاموا بتفسير للقرآن يتوخىٰ فيه اداء المعنى القريب الميسور الراجح ثم يترجم هذاالتفسير بامانة وبراعة فان هذا يقال فيه ترجمة تفسير القرآن او ترجمة تفسيرية بمعنى شرح الكلام وبيان معناه بلغة اخرى"

ومفاسد هذه الاقوال والآراء وان كثر في العهد الحاضر قائلوها اكثر لاتكادتحصىٰ لكن اصولها الاساسى لا تتجاوز عن الاربعة المذكورة سابقا فالينظر في ضوئهاحتى يتضح ويصفوضوء النهار من ظلمة الغلس وبهذاالقدر من الكلام على مصنف مباحث فى علوم القرآن العلامه مناع القطان نكتفي ونرجو كفايته لدرك الحقائق بتوفيقه عزوجل۔ اللهم انت تشهد وتعلم السرائر وضمائر القلوب وان جهدى هذاليس الا جهدالمقل

(۱) دیباچه تفهيم القرآن المطبوعه مع ج:1،ص:10،اداره ترجمان القرآن لاهور باكستان۔

لخدمة كلامك الكريم و حفظه عن التحريف المعنوى باى اسم كان سيما بجهة الترجمانى باسم الترجمه و بشكل ترجمة تفسير المفسر و ترجيحه و فكره الميسور له بعنوان الترجمه و انا متيقن حق التيقن على ان ترجمةالقرآن بمعناه العرفى اعنى ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التى تقوم مقامهالاتمكن بغير شرائطهاالفطريه و ان ترجمة القرآن وفق شرائطها سهل يسيرلمستجمعها الموفق من عندالله عزوجل و التراجم المكتوبة بايدى هآاولآء التراجمة السفرة مع قلتها بالنظر الى المكتوبه بايدى فاقدى الشرائط المملوئة بالاغلاط توجد فى مختلف الالسنة تكميلا لوعد حفظ القرآن منه سبحانه و تعالى وقد شاهدت انابنفسى من مكتوبتهابالفارسى و اردو و وجدتها غالب الصحه وفق الشرائط الاماشذوقليل ماهوعلى انه قابل الاصلاح وقدفصلت كلامن اولآء وهاولآء و نظرت تفصيلهما بنظرالتقابل فى تفسيرنا مدارج العرفان فعلى العلماء سيما الذين يتصددون لتعاطى معارف القرآن بعنوان الترجمه اوالترجمانى او التفهيم اوالتفسير والتاويل والتشريح و التفصيل ان يعطروا اذهانهم بمطالعته فانه النظاره التى يرئ فيها الصحيح والسقيم وذوالورم والسمين(فلله الحمداولا وآخراظاهرا وباطنا وهو ربى ورب العلمين۔

وبعد كلامنا هذاعلى العلامه مناع القطان ومن اليه اويدانيه فى موقفه المذكورنعود الى لساننا الوطنى اردو ونقول۔

تیسری بحث:۔ جوترجمۃ القرآن کی تاریخ کہ اس کا آغاز کب اور کیسے ہوا، اور اس کی ضرورت کہ دنیا کو اس کی ضرورت کیوں ہے اور اس کے دواعیات کیا ہیں، اور اس پر گزرنے والے مراحل کہ کن ادوار وتلونات سے گزرنے کے بعد موجودہ شکل میں آیا ہے اِن تینوں پر بالترتیب بحث کی جائے گی۔اس کے آغاز وشروعات کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ صحابی رسول حضرت سلمان

فارسی ﷺ نے اپنی قوم اور اہل فارس کی خواہش پر سورۃ الفاتحہ شریف کا فارسی زبان میں ترجمہ کر کے اس عظیم عمل کی بنیاد رکھی ہے لیکن ترجمۃ القرآن کی اہمیت اور اُس سے غرض و غایت کے تناظر میں دیکھا جائے تو نہ حضرت سلمان الفارسی ﷺ کے اس جزوی ترجمہ کو آغاز کار کہا جا سکتا ہے نہ کسی اور کے پورے ترجمہ کو کیوں کہ عموم رسالت کا ترجمان اور بلاغ للناس ہونے کی وجہ سے قرآن شریف کا ترجمہ کسی بھی عجمی کو تبلیغ بالقرآن کرنے کو لازم ہے عام اس سے کہ کسی ایک یا ایک سے زیادہ آیات کا ہو یا کسی ایک سورۃ یا چند سورتوں کا ہو یا پورے قرآن کا بہرحال دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے پہلے نارمل حالات میں غیر مسلم عجم کے لیے تبلیغ بالقرآن کا حق ادا ہونا اُس کے معیاری ترجمہ کے بغیر ممکن نہیں ہے کیوں کہ عموم رسالت اور اِبلاغ قرآن کا مقتضاء ہے کہ جب تک کسی غیر مسلم عجمی کو قرآن کی تبلیغ نہ پہنچائی جائے اُس وقت تک وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکلّف اور مسئول عن الاسلام نہیں ہوتا اور ایمان نہ لانے پر اُسے عذاب بھی نہیں دیا جاتا جیسا فرمایا ''وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا''(۱)، نیز فرمایا ''ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ''(۲) اور غیر مسلم عجم کو دعوت اور تبلیغ بالقرآن کرنے کی صرف دو صورتیں ہیں؛

پہلی صورت:۔ اُن کی خواہش کے مطابق قرآن شریف کا ترجمہ اُنہیں پہنچایا جائے چاہے تقریری ہو یا تحریری اور مقتضا الحال کے مطابق پیش کیے جانے والے اس ترجمہ کو جو معنوی قرآن کہلاتا ہے موثر کرنے کے لیے قرآنی اندازِ تبلیغ اختیار کیا جائے کہ جن آیات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے اُن کے حاصل مفہوم اور اصل مقصد کو اُنہیں ذہن نشین کرانے اور سہل الفہم بنانے کے لیے ان دلائل کو بروئے کار لایا جائے جو عرب و عجم سب کے نزدیک قابلِ قبول اور ناقابلِ انکار ہیں جن کو علمی زبان میں اولیات، فطریات، وجدانیات، مشاہدات اور مسلمات جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی غیر مسلم عجمی قوم کو شرک فی العبادۃ سے بچانے

---

(۱) الاسراء:15۔

(۲) الانعام:131۔

کے لیے دعوت توحید وایمان دیتے ہوئے آیت کریمہ ''یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ○ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ''(۱) کا اُس کی زبان میں ترجمہ اس طرح سمجھایا جاتا ہے کہ (میں تمہیں تمہارے خالق ومالک کا حکم پہنچا رہا ہوں وہ تم سب سے کہتا ہے، ''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ اُمید کرتے ہوئے کہ پرہیز گار بنو گے جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو تو اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ جبکہ تم جانتے ہو۔'') ترجمہ کے ذریعہ تبلیغ بالقرآن کے اس انداز سے اور وحدت استحقاق عبادت سے متعلق حکم الٰہی کو اُس کے عجمی بندوں کو پہنچانے کے اس کلام سے جو کلام اللہ کے ترجمہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے سننے والے عجمیوں کو اس سے مقصد کا پتہ چل جاتا ہے وہ سمجھ جاتے ہیں کہ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہم سے اپنی عبادت کا مطالبہ کیا ہے اور ساتھ ہی استحقاق عبادت اپنی ذات کے ساتھ خاص ہونے پر دلائل بیان کیے ہیں جو ہمیں اور ہم سے اگلوں کو پیدا کرنے اور زمین کو ہمارے لیے بچھونا آسمان کو چھت اور آسمان سے پانی نازل کرنے پھر اُس کے ذریعہ ہماری روزی کے لیے پھل پیدا کرنے جیسے عوامل میں پوشیدہ ہیں۔ اِس تصور سے توحید نا آشنا عجمیوں کے دل میں بت پرستی کے خلاف شک پیدا ہوتا ہے جبکہ اس سے پہلے انداد واصنام کا مستحق عبادت ہونے سے متعلق یک طرفہ تصور تھا کہ وہ اللہ وحدہ لاشریک کو بلاشرکت غیر مستحق عبادت سمجھنے والوں کو تعجب کی نگاہ سے دیکھتے تھے اب مذکورہ آیات کی الٰہی تبلیغ علی سبیل الترجمہ کا اثر یہ ہوا کہ انداد واصنام کی عبادت کا یکطرفہ تصور زائل ہوکر شک کے درجہ میں آ گیا کہ الٰہی تبلیغ میں مذکور دلائل واوصاف پر فائز اِلٰہ اور رواجی الٰہ میں سے کون ہے جو عبادت کا واقعی

(۱) البقرۃ:22-21۔

استحقاق رکھتا ہے۔ ابلاغ القرآن علی سبیل الترجمہ کے اس اثر کے بعد اگر وہ شرکی ماحول کی اندھی تقلید سے نکل کر عقل کی روشنی سے کام لیں اور برحق اِلٰہ کے مذکورہ اوصاف و دلائل کو اپنی نظر و فکر کا محور بنالیں تو کوئی بعید نہیں ہے کہ شک زائل ہو کر اُن کے دل میں برحق اِلٰہ کی وحدت استحقاق عبادت کا ظن یعنی غالب گمان پیدا ہو جائے جو مزید غور و فکر کے بعد یقین میں بدل سکتا ہے جسے علمی زبان میں علم الیقین کہتے ہیں اس انداز سے دائرہ اسلام میں آنے والوں کی متعدد مثالیں تاریخ اسلام میں موجود ہیں اور اگر وہ ابلاغ القرآن علی سبیل الترجمہ سے پیدا ہونے والے اس اثر و شک میں ہی رہتے ہیں یعنی شرکی ماحول کی اندھی تقلید سے آزاد دل و دماغ سے مذکورہ دلائل و اوصاف پر غور و فکر نہیں کرتے تو پھر تبلیغ بالقرآن علی سبیل الترجمہ کی اس حد پر اکتفا کرنے کی بجائے مسلم مبلغین پر لازم ہے کہ اُن پر مزید محنت کریں اور اُن کے شک کو زائل کر کے یقین کی طرف لانے کے لیے قرآن شریف کی اُن آیات سے کام لیں جو اولیات، فطریات، وجدانیات اور مشاہدات کے انداز میں اہل لسان یعنی عرب کے سامنے پیش کی گئی ہیں جن سے الٰہی تبلیغ کے مقاصد کو وہ محض سننے کے ساتھ ہی سمجھ جاتے ہیں غیر مسلم عجمیوں کا شک یقین میں بدلنے کے لیے اُن کی ترجمانی پیش کرنی ہوگی مثلاً ''اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ''(۱) کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ جو اِلٰہ تمہارا اور تمہارے آباء واجداد کا اور تمام اولین وآخرین کا بلا شرکت غیر خالق ہے کیا اُس کے ساتھ استحقاق عبادت میں کوئی اور شریک ہوسکتا ہے؟ اِسی طرح آیت کریمہ ''هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ''(۲) کی ترجمانی کر کے سمجھایا جائے کہ اگر زمین و آسمان کو پیدا کر کے تمہارے لیے روزی کا سامان کرنے والا کوئی ہے تو وہ سامنے لے آؤ ورنہ سوچو کہ تم اپنے خالق و رازق کے مقابلہ میں کس کی عبادت کرتے ہو؟

(۱) النحل:17۔

(۲) غافر:3۔

اِسی طرح آیت کریمہ ''هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا ''(۱) کی ترجمانی کر کے سمجھایا جائے کہ تم جانتے ہو کہ زمین کو تمہارے تابع کر کے اس سے تمہاری ضروریات پوری کرنے کا عمل اُس وحدہ لاشریک کے سوا کسی اور کا نہیں ہے تو پھر کسی اور کو اُس کے ساتھ شریک فی العبادۃ کرنے کا کیا جواز ہے؟ اِسی طرح آیت کریمہ ''قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ ''(۲) کی ترجمانی کر کے اُنہیں سمجھایا جائے کہ زمین سے بخارات کو آسمان کی طرف اوپر اُٹھا کر مخصوص غیبی اور خودکار نظام قدرت سے بارش برسانے کو اور اُس سے پیدا ہونے والے سامان رزق کو اگر اس کے خالق وحدہ لاشریک نے روک دیا جو صرف اتنے عمل سے ہی رُک جاتا ہے کہ بخارات کے اوپر جانے کا رُخ نیچے کی طرف موڑ دے جس کا انجام یہ ہوگا کہ کسی کو پینے کے لیے بھی پانی میسر نہ ہوگا چہ جائیکہ پوری دُنیا آباد ہوسکے جو بارش کے نظام سے آباد ہوتی ہے۔ غیر مسلم اہل عجم کو تبلیغ بالقرآن کر کے دائرہ اسلام میں لانے کے لیے یہ وہ آسان اور موثر طریقہ ہے جس سے عموم رسالت کا مفاد پورا ہونے کے ساتھ غیر مسلم عجمیوں پر اِتمام حُجت بھی ہو جاتا ہے کہ اِس کے بعد وہ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ ہم اِس سے غافل تھے اور ہمیں قرآن کی تبلیغ نہیں پہنچائی گئی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی مبلغ کا انداز خطاب بھی پیغمبری انداز تبلیغ کے مطابق ہو جس میں جارحیت ہوتی ہے نہ دل آزاری نہ کوئی اور ایسی کمزوری جو سامعین ومخاطبین کے لیے موجب نفرت ہو تبلیغ بالقرآن کے اس انداز سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں شامل ہونے والوں کی بے شمار مثالیں تاریخ اسلام میں موجود ہیں خاص کر خواجہ خواجہ گان معین الدین حسن خواجہ بزرگ چشتی اجمیری (نَوَّرَاللّٰهُ مَرْقَدَهُ الشَّرِیْفَ) نے اِسی اندازِ تبلیغ کی بدولت بت کدہ ہند کے ظلمات میں قرآن کا نور پھیلایا۔ الغرض جملہ اقوام عجم کو قرآن شریف کی تبلیغ پہنچانا مسلم

(۱) الملك:15۔

(۲) الملك:30۔

اُمہ پر اجتماعی فرض ہے جو عموم رسالت کا مقتضا اور فرمانِ الٰہی ''وَاُوحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْآنُ لِاُنْذِرَكُم بِهٖ وَمَن بَلَغَ ''(۱) کی تکمیل ہے، اور آیت کریمہ ''اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًی ''(۲) سے مطلوب ہے جبکہ حقائق کی روشنی میں غیر مسلم عجم کو تبلیغ بالقرآن کرنے کی صرف مذکورہ دو صورتیں ہیں؛

❶ تبلیغ القرآن بطریقہ ترجمۃ القرآن۔ ❷ تبلیغ بالقرآن بطریقہ ترجمانی قرآن۔

دعوتِ تبلیغ بالقرآن با مقصد اور نتیجہ خیز تب ہو سکتی ہے جب مقتضاء الحال کے مطابق ہو اور سامعین ومخاطبین کا حال، اُن کا معاشرہ و ماحول اور اُن کے رجحان طبع جیسے عوامل کبھی ترجمۃ القرآن کے مقتضی ہوتے ہیں کبھی ترجمانی کے جیسا مذکورہ مثالوں سے بھی واضح ہو چکا ہے کہ جو شخص کسی صاحبِ محراب ومنبر اور اسلامی مبلغ کا کلام نہیں بلکہ صرف اور صرف الٰہی تبلیغ اور خدائی دعوت سننے کی خواہش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا چاہتا ہے اُس کے سامنے کلام الٰہی مثلاً آیت کریمہ ''یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ''(۳) کی ترجمانی پیش کرنا مقتضاء الحال سے خلاف ہوگا کیوں کہ ترجمانی انسان کا کلام اور مبلغ کی کاوش ہے اسے کلام اللہ کہا جاسکتا ہے نہ معنوی قرآن اور فرمانِ الٰہی کہا جاسکتا ہے نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو خطاب جس کی لغوی، عقلی اور عرفی حیثیت کلام الٰہی کی ہرگز نہیں بلکہ کلام الٰہی سے معانی ومقاصد کی انسانی تعبیر کے سوا اور کچھ نہیں ہے جس میں کمی وبیشی بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی ہیئت کذائیہ کی تبدیلی جیسے تغیرات بھی۔ ایسے میں مسلم مبلغ پر فرض بنتا ہے

(۱) الانعام:19۔

(۲) القیامہ:36۔

(۳) البقرۃ:22-21۔

کہ "قال ربکم" کے قرآنی انداز تبلیغ کے مطابق محض ترجمہ پیش کرے اور خود کو محض ترجمان بمعنی مترجم کی حیثیت سے پیش کر کے ابلاغ القرآن بہ طریقہ ترجمۃ القرآن کرے جس کے اثرات ظاہر ہونے کے بعد ترجمانی کے موثر ہونے کے لیے بھی راہ ہموار ہوسکتی ہے جو مقتضاء الحال کے مطابق کہلائے گا۔

چند ناگزیر حقائق سے آگاہی:۔

عجم اقوام کو قرآن شریف کا پیغام اور رب الناس ﷻ کے احکام پہنچانے کا بے غبار و موثر ذریعہ ترجمۃ القرآن کے سوا اور کچھ نہیں ہے بشرطیکہ مخاطبین و سامعین اور اِسے پڑھنے والے معاند و متعصب نہ ہو، جہل مرکب میں مبتلا نہ ہو اور ترجمانی و تفسیر جیسے انسانی دخل عمل کے بغیر محض کلامِ الٰہی کو ترجمہ کے ذریعہ یعنی قرآن شریف کے الفاظ کے عوض اپنی زبان کے ایسے الفاظ میں سننا چاہتے ہوں جو الفاظ قرآنی کی متعارف حیثیات کے قائم مقام ہوسکیں جس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس حوالہ سے یہاں پر چند ناگزیر حقائق سے آگاہی ضروری ہے؛

1. نبی اکرم سید عالم ﷺ کے بعد مسلم مقتدرہ اور علماء امت پر ابلاغ القرآن فرض لازم ہے۔
2. ابلاغ القرآن عرب و عجم دونوں کو ایک انداز سے نہیں بلکہ عرب کو اصل قرآن پہنچانا ہوتا ہے جو کلام اللہ کہلاتا ہے کیوں کہ اہل لسان ہونے کے ناطے وہ سننے کے ساتھ ہی مقاصد کو سمجھ سکتے ہیں البتہ حسب ضرورت کچھ آیات کی ترجمانی یا تفسیر بھی ان کی رہنمائی کے لیے پیش کی جا سکتی ہے کیوں کہ کسی آیت کی تفسیر کو یا کسی لفظ کے متعدد معانی میں سے مرادِ الٰہی کے طور پر ایک کی تشخیص و تعیین میں مغالطہ یا عدم تیقن کلام الٰہی ہونے کے منافی ہوتا ہے نہ اس کی فصاحت و بلاغت کے جبکہ عجم کو اصل کے ساتھ اس کا ترجمہ پہنچانا بھی لازم ہے اس لیے کہ ترجمۃ القرآن کو متعدد وجوہ کی بنا پر متن قرآن لازم ہے کہ متنِ قرآن کے بغیر محض ترجمہ مروّج کرنا التباس الحق بالباطل پر منتج ہوسکتا ہے جیسا توراۃ و انجیل کے نام سے پائے جانے والے تراجم کی صورت میں سب کو معلوم ہے لیکن قرآن شریف کی حفاظت کے لیے وعدۂ الٰہی کا ثمرہ ہے کہ اسلام میں

متنِ قرآن کے بغیر محض ترجمہ پیش کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

۳ عجم کو ترجمۃ القرآن کی شکل میں ابلاغ القرآن کرنے میں مسلم وغیر مسلم کا فرق ہے کہ مسلم صاحبِ قرآن سید عالم ﷺ کی رسالت کو اُس کے جملہ لوازمات کے ساتھ تسلیم کرنے کے ساتھ اصحاب محراب ومنبر کو بھی مانتا ہے جس وجہ سے مسلم مبلغین کی طرف سے پیش کی جانے والی ترجمانی وتفسیر بھی اُن کے نزدیک قابلِ تسلیم ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان عجمیوں کو اصحاب محراب ومنبر کی طرف سے تبلیغ بالقرآن کی زیادہ ترصورتیں قرآن شریف کی ترجمانی، تفسیر، تاویل اور تفہیم کے انداز میں ہوتی ہیں، کبھی کبھار مخصوص مقاصد کے تحت ترجمہ بھی پیش کیا جاتا ہے اس کے برعکس غیر مسلم عجمیوں کے سامنے ترجمانی پیش کی جاسکتی ہے نہ تفسیر اگرچہ اپنی جگہ وہ تفسیر نبوی اور قطعی ویقینی ہی کیوں نہ ہو کیوں کہ جب وہ اللہ کے رسول کو ہی نہیں مانتے تو پھر اُن کے ورثاء ونائبین کی طرف سے پیش کی جانے والی تعبیر کیوں مانیں جس میں اصل سے کمی وبیشی کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ وہ صرف اللہ کو ماننے کی بنا پر یہی چاہتے ہیں کہ الفاظِ قرآنی کے عوض اپنی زبان کے ایسے الفاظ میں فرمانِ الٰہی کو سنیں، دیکھیں اور پڑھیں جو قرآنی الفاظ کے قائم مقام ہوسکیں یعنی عوضی الفاظ معوض عنہ الفاظ کی تمام حیثیات کے مطابق ہو جس کے بعد دونوں کے محاورے بھی ایک دوسرے کے مطابق ہوتے ہیں جس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ قرآنی الفاظ کے مطابق نپے تلے الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ غیر مسلم عجمی ابلاغ قرآن کے اس انداز پر اعتراض اس لیے نہیں کرسکتے کہ ایک زبان میں لکھی گئی کتاب چاہے انسان کی ہو یا اللہ تعالیٰ کی بہر حال دوسری زبان والوں کا اُس کے مندرجات سے آگاہی پانے اور مستفید ہونے کے لیے اس کے سوا کوئی اور سبیل نہیں ہے کہ اُس کے الفاظ کو اِس زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جائے جو لکھنے والے کی مراد پر دلالت کرنے سے لے کر اُن کی جملہ لسانی ومعنوی حیثیات کے قائم مقام ہوں جسے عرفِ عام میں ترجمہ کہا جاتا ہے جو اسلام کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ دوسرے تمام مذاہب میں بھی یکساں مروج ہے تورات و

انجیل کو دوسری زبانوں میں منتقل کر کے کتاب موسوی اور کتاب عیسوی کے نام سے جو مروج کیا گیا ہے یہ بھی اسی اُصول کے ماتحت ہے تو پھر تبلیغ بترجمۃ القرآن کے اِس انداز پر کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے اور اِس اُصول کی ابتدا اُس وقت سے ہوئی ہے جب سے انسانوں کی ارتقائی دُنیا میں ایک دوسرے کے علوم وایجادات سے استفادہ کرنے کا شعور اُجاگر ہوا جس کی تعیین سے تاریخ مکمل خاموش ہے۔

❹ کسی غیر مسلم عجم قوم یا جماعت کی طرف سے یہ معلوم ہو رہا ہو کہ وہ قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر مسلمان ہوگی اُس وقت مسلم مقتدرہ پر فرض لازم قرار پاتا ہے کہ اُن کی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کر کے اُنہیں پیش کرے اگر مسلم مقتدرہ موجود نہ ہو تو پوری مسلم اُمہ پر فرض بنتا ہے خاص کر علماءِ حق پر کہ یہ فریضہ انجام دیں۔ اسلام کا یہ اُصول آیت کریمہ ''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ''(۱) سے مستفاد ہے جو کسی اہلِ علم سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے۔

❺ کوئی غیر مسلم قوم یا جماعت مسلمانوں سے یہ تقاضا کرے کہ مسلم رہنماؤں کے دخل عمل اور اُن کی طرف سے ترجمانی وتفسیر کے بغیر ہماری زبان میں کلام اللہ ہمیں سمجھائیں تاکہ ہمیں اس پر غور کرنے کا موقع ملے۔ اِس صورت میں مسلم اُمہ پر علی العموم اور جن خواص سے تقاضا کیا جا رہا ہے اُن پر بالخصوص فرض بنتا ہے کہ اُن کی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ پیش کر کے اُنہیں اسلام کی حقانیت پر غور کرنے کا موقع فراہم کریں کیوں کہ کسی اَن پڑھ عجمی کے لیے بلا کم وکاست قرآن شریف کے معانی سمجھنے کی واحد سبیل یہی ترجمہ ہے۔

❻ یہود ونصاریٰ میں سے کوئی قوم یا کوئی بھی عجمی قوم یا جماعت کسی مسئلہ سے متعلق الٰہی حکم کے حوالہ سے قرآن شریف کا تقابل تورات وانجیل سے کرنا چاہے اور کہے کہ قرآن کا حکم اُن دونوں سے بہتر ثابت ہونے پر مسلمان ہوں گے اور تقابل کی صورت اس طرح ہوگی کہ تورات وانجیل کے نام سے اُن کے جو ترجمے پائے جاتے ہیں اُن کے ساتھ قرآن شریف کے

---

(۱) النحل:125۔

ترجمہ کا تقابل کیا جائے گا جس کے ساتھ متن قرآن کا ہونا بھی لازم ہے جو رہتی دُنیا تک تحریف سے محفوظ ہونے کی سند ہے۔ نیز ترجمہ کے غیر معیاری ہونے کی صورت میں اصل کے ساتھ تقابل کر کے مسترد کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ترجمہ کے نام سے اہل باطل اور نادان دوستوں کی بے مصرف کی بیشی اور معنوی تحریف کی نشان دہی کرنے والے اہل حق کے وجودِ مسعود سے زمین کبھی خالی نہیں ہوتی اِس صورت میں قرآن شریف کا ترجمہ اُن زبانوں میں کرنا فرض لازم قرار پاتا ہے ورنہ پوری اُمت گناہ گار ہوگی یہ اُصول بھی ''اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ''(۱) کے ماتحت ہونے کے ساتھ آیت کریمہ ''وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ''(۲) اور آیت کریمہ ''لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ''(۳) سے مستفاد ہے۔

❼ کسی غیر مسلم عجم قوم یا جماعت سے فقط اتنی اُمید ہو کہ وہ اپنی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر اُس پر ایمان لائے گی یا کم از کم اسلام کی طرف مائل ہوگی یا اسلام کے خلاف منفی پروپیگنڈا کا زہر پھیلانے سے باز آئے گی یا کسی بھی حوالہ سے اسلام کے حق میں سودمند ہونے کی اُمید ہونے کی صورت میں اُن کی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ پیش کرنا مسلم اُمت کی مذہبی ذمہ داری اور فرض لازم قرار پاتا ہے یہ بھی مذکورہ آیات سے مستفاد ہے جو کسی ایسے اہل علم سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جو اندھی تقلید کی قیود و بند سے آزاد ذہن کے ساتھ ان پر غور کرے۔

❽ دُنیا کی کسی زبان اور معاشرہ میں جب قرآن شریف کے غلط ترجمے مروج ہو رہے ہوں عام اس سے کہ مترجم غیر مسلم ہو یا مسلم اناڑی جو قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم سے اور

(۱) النحل:125۔

(۲) النحل:125۔

(۳) بنی اسرائیل:88۔

فنون آلیہ سے ہی بے خبر ہیں یا ان علوم وفنون میں نیم خواندہ اور ناقص ہوں یا ترجمہ کی شرائط کے جامع نہ ہو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو موجودہ دور میں غیر معیاری مترجمین کے اِن تمام طبقوں کے ہاتھوں لکھے ہوئے تراجم کی بہتات ہے جنہیں قرآن شریف کی معنوی تحریف کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ایسے میں اُسی زبان ومعاشرہ میں قرآن شریف کا معیاری ترجمہ پیش کرنا اُن علماءِ حق پر فرض قرار پاتا ہے جو شرائط کے جامع ہیں،فنِ ترجمہ سے لے کر ترجمۃ القرآن تک کے اُصولوں اور اس کے احتیاطی تقاضوں سے آگاہ ہیں ورنہ اِس شکر نماز ہر کی حوصلہ شکنی وانسداد کرنے کے بجائے دل میں کُڑھتے رہنے سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے کیوں کہ حدیث نبوی ﷺ ''مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ ''(۱) کے مطابق ترجمۃ القرآن کی شرائط کے جامع یہ مسعود الوجود حضرات ''اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ '' کے انحطاط کے بجائے ہاتھ اور زبان سے کام لینے کی ایمانی قوت پر فائز ہیں کہ قرآن شریف کو معنوی تحریف سے بچانے کے لیے معیاری ترجمہ لکھ کر ریکارڈ درست کر سکتے ہیں۔ایسے میں جامع الشرائط حضرات پر معیاری ترجمہ وجود میں لانے کی فرضیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

❾ کسی عجمی معاشرہ یا کسی قوم کو اسلام کے خلاف نفرت دلانے کی غرض سے دیدہ ودانستہ طور پر سازش کے تحت قرآن کا غلط ترجمہ شائع کیا جارہا ہو تو علم ہونے کے بعد مسلم اسٹیٹ پر فرض بنتا ہے کہ اُسی زبان میں معیاری ترجمہ شائع کر کے اُسے ناکام کرے اور مسلم اسٹیٹ کی عدم موجودگی میں پوری اُمتِ مسلمہ پر اور خاص کر جامع الشرائط علماءِ حق پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے جس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں پوری اُمت گناہ گار قرار پائے گی خاص کر صاحب استطاعت علماءِ حق کہ ترجمہ کی شرائط کے جامع ہونے کے باوجود حسبِ ضرورت اُس پر عمل نہ کرنے اور قرآن شریف کا دفاع اور اسلام کو سازش سے بچانے کی تدبیر نہ کرنے کی غفلت کی

(۱) صحیح مسلم شریف،باب کون النھی عن المنکر......

بنا پر بعید نہیں ہے کہ ''یُضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ''(۱) کی وعید کے تحت آجائے۔(اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ)

حاشیتی اضافہ:۔ اغیار کی اِس سازش کے انسداد کے لیے کیا قرآن شریف کا حقیقی ترجمہ پیش کرنے کے سوا کوئی اور مہذب طریقہ ہے؟ ہم 100% یقین کے ساتھ دُنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام کے خلاف اُٹھنے والی اِس انوکھی سازش کو دفع کرنے کے لیے قرآن شریف کا معیاری ترجمہ سامنے لائے بغیر چارہ نہیں ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ متنِ قرآن کے بغیر محض ترجمہ کے ناجائز ہونے اور اسلام میں اِس کی اجازت نہ ہونے کا اصل فلسفہ بھی یہی ہے کہ قرآن شریف کے اپنے الفاظ کو دیکھ کر ایسی سازشوں کا ازالہ کیا جائے جو مسلم اُمہ میں موجود جامع الشرائط علماء حق کے لیے آسان ہے۔ایسے میں ترجمۃ القرآن جیسے فی الجملہ فریضۂ اسلام پر حرمت وفساد اور عدم جواز جیسی دفعات لگانے والے حضرات کو اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ سامنے لائیں، بغیر اِس کے سازش سے اسلام کو بچانے کے لیے اُن کے پاس کیا سبیل ہے؟ کیا ترجمانی، ترجمۃ معانی القرآن، ترجمہ تفسیریہ، ترجمۃ تفسیر القرآن جیسے بے مقصد اور خودساختہ طریقوں سے اِس کا انسداد ممکن ہوسکتا ہے؟ کیا اِن خودساختہ اصطلاحات سے اغیار کو تقویت نہیں ملتی کہ وہ بھی یہی کہیں کہ ہم نے بھی قرآن سے جو معنیٰ تفسیر کے طور پر سمجھے اُن ہی کا ترجمہ کیا ہے اپنے اِس دعویٰ کی تائید کے لیے وہ قرآن شریف کے نادان دوستوں کے لکھے ہوئے غلط تراجم پیش کر کے اگر یہ کہیں کہ جیسا تم نے کیا ہم نے بھی ویسا ہی کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر جان کر سوچا جائے کہ اِن حضرات کے پاس کیا جواب ہے ظاہر ہے کہ شرمندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔(فَاِلَی اللّٰهِ الْمُشْتَكٰی)

۱۰ مسلم عجم کے کسی معاشرہ کے بارے یہ معلوم ہوجائے کہ وہ اپنی زبان میں قرآن شریف کے معانی سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں جس کی واحد سبیل ترجمہ ہے جس میں قرآن شریف کے

---

(۱) الاحزاب:30۔

الفاظ کو اُن کی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جائے جو الفاظِ قرآنی کے مطابق ہوں جس میں ترجمہ کے الفاظ متنِ قرآن کے الفاظ کی تعداد کے مطابق نپے تُلے ہوں اور ترجمانی و تفہیم اور تفسیر جیسے دخل عمل سے محفوظ ہو۔ اِس صورت میں ترجمہ القرآن وجود میں لانا اِستحباب کے درجہ میں ہوتا ہے۔

چند حقائق بطورِ نتیجہ:۔ ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے معروضی حالات کی اِس روشنی سے چند مزید حقائق نتیجہ کے طور پر آپ ہی سامنے آجاتے ہیں؛

1. ترجمہ، ترجمانی، تفسیر، تاویل، تفہیم کا آپس میں متبائن حقائق ہونا کہ ایک دوسرے پر صادق آتے ہیں نہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوسکتے ہیں بلکہ ہر ایک کے استعمال کے مواقع ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ترجمانی کی جگہ تفسیر جائز ہے نہ تاویل اور نہ تفہیم اِسی طرح برعکس بھی حالانکہ اِن چاروں میں متنِ قرآن سے کمی بیشی اور من پسند الفاظ اضافہ کرنے کے جواز جیسے انسانی عمل دخل کی بڑی گنجائش ہوتی ہے جو اِن سب میں قدرِ مشترک ہے جبکہ اِن کے مقابلہ میں ترجمہ ایسا عمل ہے جس میں متنِ قرآن سے کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہوتی، مترجم کو اپنی من پسند الفاظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، متنِ قرآن کی اجتماعی ہیئت نوعیہ میں کسی قسم کی تبدیلی لانا روا نہیں ہوتا بلکہ متن کی مکمل پاسداری واتباع ضروری ہوتی ہے جیسا ترجمہ کی تعریف ''ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التی تقوم مقامھا'' سے آپ ہی ظاہر ہو رہا ہے۔

2. تفسیر و تاویل کا مسلم معاشرہ کے ساتھ مختص ہونا کہ غیر مسلم معاشرہ میں معتبر نہیں ہیں جبکہ ترجمانی و تفہیم مسلم معاشرہ کے لیے قابلِ قبول ہونے کے ساتھ غیر مسلم معاشرہ میں بھی فی الجملہ کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں بشرطیکہ ان کی بنیاد ترجمہ پر استوار ہوگئی ہو یعنی اصالۃً نہیں بلکہ ترجمہ کی شکل میں پیش کیا گیا خطاب اللہ کے لیے موید وموضح اور تفہیم کے انداز پر ہو جبکہ ترجمۃ القرآن خطاب اللہ کو غیر مسلم عجم تک پہنچانے کا واحد ذریعہ ہے جس پر اُن کی طرف سے کسی قسم کا اعتراض ہوسکتا ہے نہ مسلم مبلغین کی طرف سے کمی بیشی کرنے کا شبہ۔

❸ ترجمۃ القرآن کی اہمیت واضح ہونے کے ساتھ اُس کا جامع النقیضین ہونا کہ ممکن بھی ہے لاممکن بھی۔ اہمیت اِس طرح کہ وہ تبلیغ بالقرآن کی ہر شکل کے لیے اصل الاصول و بنیاد ہے کہ اُس کے بغیر ترجمانی ممکن ہے نہ تفسیر اور تاویل کی گنجائش ہو سکتی نہ تفہیم کی۔ الغرض غیر مسلم عجم کو ابلاغ القرآن کرنے اور خطاب اللہ پہنچانے کا بے غبار طریقہ اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور جامع النقیضین اِس لیے کہ ترجمہ کی صحت کے لیے تمام واجبی شرائط کے جامع مترجم کے لئے ممکن ہے بلکہ سہل الحصول و آسان ہے جبکہ شرائط سے غافل مترجم کے لیے ناممکن ہے کیوں کہ وہ پوری عمر صرف کرے تب بھی معیاری ترجمہ وجود میں نہیں لاسکتا یہ الگ بات ہے کہ کودک نادان کا نشانہ کبھی نشانہ پر لگنے کی طرح اس کا کیا ہوا ترجمہ بھی کبھی کبھار درست ہو جاتا ہے جسے عوامی زبان میں بخت واتفاق کہتے ہیں۔

❹ غیر مسلم عجم تک دعوتِ اسلام پہنچانے کو ترجمۃ القرآن کا لازم ہونا کہ جب سے اسلام جزیرہ عرب کو فتح کرنے کے بعد اہل عجم کی حدود میں پہنچا اور عجم کی مختلف زبان بولنے والی قوموں کو دعوت الی القرآن کا پیغام پہنچانے لگا اُس وقت سے ہی ترجمۃ القرآن کا آغاز ہو گیا تھا کیوں کہ اس کے بغیر ترجمانی اُنہیں قناعت دلا سکتی ہے نہ تفسیر بلکہ موثر اور بے غبار انداز دعوت اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ مسلم مبلغین جو حقیقت میں پیغمبر کے نائب ہوتے ہیں اور داعی اللہ کہلاتے ہیں یعنی نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے وہ اِن غیر مسلم عجم کے سامنے اللہ کے کلام کا ترجمہ پیش کریں کہ تمہارا رب عزوجل تم سے یہ فرما رہا ہے اور نظامِ مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دے رہا ہے جب دعوت الی الایمان سے متعلق قرآن شریف کے کسی مناسب حال حصے کے ترجمہ سننے کی برکت سے وہ اِس پر دلائل سننے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تب دلائل پر مشتمل آیات کی ترجمانی بھی مفید ہو سکتی ہے اور تفہیم بھی ایسے میں ترجمۃ القرآن کا دعوت تبلیغ الی العجم کو لازم ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ لیکن اصل مقصد دعوت تبلیغ الی الایمان ہے اور غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں لانا ہے چاہے تبلیغ کے جس انداز سے بھی ہو اسی فلسفہ کی وجہ سے تاریخ اسلام یہ تفصیل بتانے سے خاموش ہے ورنہ مورخین اسلام کی نظر اگر دعوت الی الایمان کی نوعیت اور اس کی تفصیل پر ہوتی

تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ عجمیوں کی ہر زبان میں ترجمۃ القرآن کے فی الجملہ آغاز و ابتدا کی تاریخ بھی مرتب ہو چکی ہوتی لیکن ہر کام میں مقاصد پر نظر ہونے کی طرح یہاں پر بھی ذرائع تبلیغ کی تفصیل پر نہیں بلکہ صرف اور صرف دعوتِ تبلیغ دے کر اُنہیں نظامِ مصطفی ﷺ کے تحت لانے پر تھی۔ حقائق کی اس روشنی میں حضرت سلمان فارسی کے ترجمہ فاتحۃ القرآن کو بالیقین اِس کا آغاز کہا جا سکتا ہے نہ کسی اور کے ترجمہ کو کیوں کہ جب تاریخ ہی معلوم نہیں ہے تو پھر کسی کو اول قرار دینے کا تصور ہو سکتا ہے نہ آخر کہنے کا۔

اِس کے برعکس جنہوں نے جس جزوی ترجمہ کو یا پورے قرآن شریف کے کسی ترجمہ کو اِس عمل کا آغاز کہا ہے ہماری نظر مین وہ اُس کی اپنی سوچ ہے کہ اپنی معلومات کے مطابق کہا ہے جو واقعہ کی تصویر نہیں ہوسکتی کیوں کہ جب غیر مسلم عجم کو دعوتِ اسلام دینے کو ترجمۃ القرآن لازم ہے کہ اِس کے بغیر دعوت ایمان کی کوئی بھی صورت موثر و بے غبار نہیں ہوسکتی اور نا قابل اعتراض نہیں ہو سکتی اور یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ مبلغین اسلام نے دُنیا کی ہر قوم اور ہر زبان کے لوگوں کے پاس پہنچ کر اُنہیں اُن کی زبان میں دعوتِ اسلام دی ہے اور ترجمہ کی شکل میں اُنہیں قرآن پہنچایا ہے لیکن اُس کی تاریخ اور تفصیل کی نشان دہی کرنے سے تاریخ یکسر خاموش ہے۔ ایسے میں نہ دُنیا کی کسی زبان میں کیا گیا ترجمہ کو اِس عمل کا آغاز کہنا قرین انصاف ہوگا نہ عجم کے کسی خطہ میں کیے گئے ترجمہ کو عام اِس سے کہ ترجمہ تقریری ہو یا تحریری یعنی محض وقت کی ضرورت اور زبانی طور پر کیا گیا ہو جیسا دو فریقوں کے مابین ترجمان کی وساطت سے ہوتا ہے یا دستاویزی مکتوب کی شکل میں ہو جیسا متعارف تراجم کی صورت میں دیکھا جاتا ہے۔ نیز جزوی ترجمہ ہو یا قرآن شریف کے کچھ حصہ یا کچھ سورتوں کا یا پورے قرآن شریف کا بہر حال دُنیا کے کسی خطہ میں کیے گئے ترجمہ کو اِس کی تاریخ کہنا انصاف ہوگا نہ دُنیا کی کسی زبان میں کیے گئے ترجمہ کو، مگر یہ کہ جس کی تاریخ معلوم ہو اُس کے بارے میں ایسا کہنے میں حرج نہیں ہے جیسا دیارِ ہند کے اپنے وقت کی فارسی زبان میں حضرت شاہ ولی اللہ کا کیا ہوا ترجمۃ القرآن بنام فتح الرحمٰن کو اِس خطے کا اولین ترجمہ قرآن کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح

حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد اُن کے بیٹے شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر کے اُردو زبان میں کیے ہوئے تراجموں کو اِس خطے کی اُردو زبان کے اولین تراجم کہا جاتا ہے۔ جس کے مطابق اول الذکر کو اس خطے کی فارسی زبان کے مکمل تراجم کا آغاز اور ثانی الذکر دونوں کو اِس خطے کی اُردو زبان میں لکھے گئے مکمل تراجم کا آغاز کہنا درست قرار پاتا ہے کیوں کہ اِن کی تاریخ معلوم ہے۔

اِسی طرح کرہ ارض کے کسی بھی خطے اور زبان میں کیے گئے کسی ترجمہ کو اُس کا تاریخی پس منظر صاف وشفاف ہونے کی بنا پر صرف اُسی خطے کی زبان کے حوالہ سے اِس عمل کا آغاز کہنے میں قطعا کوئی حرج نہیں ہے۔ الغرض کرۂ ارض کے کسی خاص خطے اور خاص زبان سے قطع نظر علی الاطلاق کسی بھی ترجمہ کو اِس عمل کا آغاز اور اِس کی تاریخ نہیں کہا جاسکتا چاہے دُنیا کی جس زبان میں بھی کیا گیا ہو، اِس کے علاوہ ترجمۃ القرآن کے آغاز اور اِس کی تاریخ کی بحث میں پڑنے کا قطعا کوئی فائدہ نہیں ہے جتنا وقت اِس بے مقصد بحث میں ضائع کیا جاتا ہے اُسے اگر غلط تراجم سے قرآن شریف کو بچانے کے لیے صرف کیا جائے تو اسلام کی بڑی خدمت ہوگی۔ ہم اِس کتاب کے دوسرے باب کی پہلی بحث میں ترجمۃ القرآن کی فی الجملہ فرضیت اور اس کی اہمیت سے متعلق وضاحت کر آئے ہیں کہ یہ جتنا مشکل کام ہے اتنا آسان بھی ہے، مشکل اور نا قابلِ حصول اُن کے لیے ہے جنہیں ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع کا علم ہی نہیں ہے، شرائط کے جامع نہیں ہیں اور اِس کے احتیاطی تقاضوں سے آگاہ نہیں ہیں یعنی اِس پُر خطر کام کا حق ادا کرنے کی اہلیت کے بغیر مترجم بننے کی کوشش کرتے ہیں اور لہو لگا کر شہیدوں میں شمار ہونے کی طرح بغیر شرائط کے مترجمین کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ سے قرآن شریف کا معیاری ترجمہ وجود میں آنا جوئے شیر لانے سے مختلف نہیں ہے اور آسان اُن سعادت مندوں کے لیے ہے جو فنِ ترجمہ کے اُصول وشرائط سے آگاہی کے ساتھ ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں اور اِس کی واجبی شرائط کے جامع ہونے کے ساتھ اِس کے احتیاطی تقاضوں کو بھی بروئے کار لاتے ہیں گویا اِس شرف کے ساتھ فیض یابی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق یافتہ ہوتے ہیں۔ علماء حق کے لیے

ضروری ہے کہ ترجمۃ القرآن کی تاریخ جیسے مباحث میں اُلجھنے کے بجائے ترجمۃ القرآن کی اہمیت پر توجہ دیں کہ یہ اہل عجم کو دعوت اسلام دینے اور تبلیغ بالقرآن کی بنیاد ہے جس کی صحت کے بغیر قرآن شریف کی ترجمانی درست ہوسکتی ہے نہ تفسیر، اور تاویل معیاری ہوسکتی ہے نہ تفہیم اس کی کسی ایک شرط سے خلاف ہونے والا ترجمہ کے پڑھنے سے بے علموں کے ایمان کو نقصان پہنچ سکتا ہے چہ جائیکہ ایک سے زیادہ شرائط سے خلاف ہونے والے ترجمہ کی اجازت دی جائے جبکہ موجودہ دور میں نہ صرف علاقائی زبانوں میں کیے گئے اکثر تراجم فحش غلطیوں سے بھرے پڑے ہیں بلکہ پاکستان کی قومی زبان اُردو میں مختلف مکاتب فکر مشاہیر کے کیے گئے تراجم کی غالب اکثریت بھی غلط ہے، غیر معیاری ہیں اور قرآن شریف کی معنوی تحریف کے زمرے میں شامل ہیں جبکہ قرآن فہمی کے لیے فنون آلیہ وعلوم خادمہ سے نا آشناوہ حضرات جو ترجمہ سے استفادہ کے کوشاں ہوتے ہیں اور حقیقت سے نا آشنائی کی وجہ سے ترجمہ کے نام پر سامنے آنے والی ہر تحریر کو معنوی قرآن سمجھتے ہیں، انجام کار انجانے میں التباس الحق بالباطل کی ظلمت میں پڑجاتے ہیں یعنی علمی استفادہ اور نور قرآن سے روشنی پانے کے بجائے مرادِالٰہی سے برعکس معانی کو مقصدِ الٰہی کہہ کر گمراہ ہوجاتے ہیں۔ یہ ہوا قرآن شریف کے غلط تراجم پڑھنے والے اُن حضرات کا المیہ جو قرآن فہمی کے لیے موجود علوم آلیہ سے نا آشنا ہیں جبکہ قرآن شریف کے ترجمہ سے استفادہ کرنے والوں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو علماء اور اصحاب محراب ومنبر کہلاتے ہیں اور قرآن فہمی کے لیے موجود فنون آلیہ وعلوم خادمہ سے بھی قدرے شغف رکھتے ہیں لیکن عالم وفاضل اور مفتی ومدرس بلکہ شیخ الحدیث والتفسیر کہلانے والے اِن حضرات کی غالب اکثریت بھی اِس قابل نہیں ہوتی جو معیاری وغیر معیاری تراجم میں تمیز کر سکے یا دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ شرائط کے سانچہ میں فٹ اور اوٹ پٹانگ تراجم کی تفریق کرنے کے قابل نہیں ہیں کبھی کبھار اگر کچھ تمیز کر بھی لیتے ہیں تو وہ ان کے نظریہ سے خلاف دوسرے مسالک کے مشاہیر کے لکھے ہوئے تراجم سے متعلق ہوتی ہے اپنے بڑوں کے لکھے ہوئے تراجم کی بڑی سے بڑی غلطی بھی انہیں نظر نہیں آتی یعنی دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے اپنی آنکھ کا

شہتیر بھی نہیں۔ انجام کار مذکورہ علمی القاب کے لباس میں ملبوس ہونے کے باوجود قرآن شریف کے معنوی محافظ ہونے کے حوالہ سے بیکار و بے سود ہوتے ہیں، اور فنون آلیہ لفہم القرآن سے محروم طبقہ کے حکم میں شمار ہوتے ہیں جو مسلم اُمہ کے لیے المیہ ہے۔

طبقہ جامع الشرائط:۔

اِس کے برعکس علماء حق کے مقدس طبقہ میں کچھ اقل قلیل حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں جو فنونِ آلیہ لفہم القرآن میں ماہر ہوتے ہیں اور علوم خادمہ للقرآن اُن کی رگ وریشہ میں شامل ہو چکے ہوتے ہیں اور ترجمۃ القرآن کی شرائط واُصول اور اس کے احتیاطی تقاضوں سے بھی آگاہ ہوتے ہیں اور معیاری وغیر معیاری کی تمیز بھی کر سکتے ہیں جس میں پسند و ناپسند مترجمین کی تفریق بھی نہیں کرتے بلکہ مترجم کسے باشد اُس پر نظر رکھنے کی بجائے صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کون سا ترجمہ شرائط کے مطابق ہے کہ اُسے معیاری کہہ کر قبول کیا جائے اور دُنیا کو اُس سے استفادہ کرنے کی تبلیغ کی جائے اور کون سا ہے جو شرائط سے منحرف اور غیر معیاری ہے کہ اُسے مسترد کر کے دُنیا کو اُس سے اجتناب کرنے کی تبلیغ کی جائے۔ اِس طبقہ کا وجودِ مسعود اونچی دوکان پھیکا پکوان والے مذکورہ طبقہ کی بہتات کے مقابلہ میں اتنا قلیل ہے جتنا نمک طعام میں لیکن عددی قلت کے باوجود سب پر بھاری ہے اور سب پر اِس کا بول بالا ہے اور صحیح معنیٰ میں خادمِ قرآن کہلانے کے قابل ہے جس کے وجودِ مسعود کی برکات کا ثمر ہے کہ قرآن شریف معنوی تحریف سے محفوظ ہے۔ قرآن شریف کی حفاظت و اشاعت اور اِس کی خدمت کرنے کے شائق علماء حق کو چاہیے کہ قرآن شریف کے ترجمہ کے حوالہ سے بے سود پہلوؤں کو موضوع بحث بنا کر وقت ضائع کرنے کے بجائے اِس رُتبے کو پانے کی کوشش کریں اور اِس عظیم طبقہ کے ہم سفر وہم کار ہونے کے لیے محنت کریں جس کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم وفنون میں مہارت حاصل کی جائے اور معیاری وغیر معیاری تراجم کے مابین تمیز کے لیے ترجمۃ القرآن کی جملہ شرائط کا احاطہ کیا جائے اور جن خطوط پر چل کر اِس مقدس طبقہ نے یہ رُتبہ پایا ہے علم و عمل کے میدان میں ان سے روشنی لی جائے۔ ترجمۃ

القرآن کے حوالہ سے ہمارے نصف صدی سے زیادہ عرصہ کا تجربہ بتا رہا ہے کہ قرآن شریف اپنے نادان دوستوں اور نااہل مترجمین کے ہاتھوں جتنا مظلوم ہو رہا ہے شاید دُنیا کی کسی اور کتاب پر اتنا ظلم ہو رہا ہو۔ برصغیر پاک و ہند کی مختلف علاقائی زبانوں میں کیے گئے تراجم سے لے کر پاکستان کی قومی زبان (اُردو) میں پائے جانے والے سینکڑوں ترجموں میں ہمارے تجزیہ کے مطابق 95% غلط ہیں، غیر معیاری حضرات کے کیے گئے تراجم ہیں، شرائط سے خلاف اور ناقابلِ عمل ہیں، جن سے قرآن شریف کے حقیقی معانی معلوم ہونے کے بجائے اُن کے پڑھنے والے نیم خواندہ حضرات مغالطہ میں مبتلا ہو رہے ہیں، جن پر افسوس بالائے افسوس یہ کہ اِس زیاں کا اُنہیں احساس بھی نہیں ہو رہا۔ ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے معروضی حالات کی یہ تلخیاں اور قرآن شریف کی مظلومیت کا یہ المیہ کرۂ ارض کے صرف ایک براعظم ایشیاء کے چھوٹے سے حصہ (برصغیر پاک و ہند) سے متعلق ہے جبکہ دوسرے براعظموں اور شرق و غرب کی مختلف زبانوں میں لکھے گئے تراجم ہماری دسترس و اطلاع سے دور ہونے کی وجہ سے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں بعید از قیاس نہیں کہ وہ اِن سے بھی بدتر ہوں (فَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکٰی)۔ علماء دین اور اصحاب محراب و منبر حضرات دین کی حفاظت کے ذمہ دار و مسئول ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

''بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتٰبِ اللّٰہِ وَ کَانُوْا عَلَیْہِ شُھَدَآءَ''(۱)

یعنی کتاب اللہ کی حفاظت کے ذمہ دار کیے گئے ہیں اور اس کے نگران ہیں۔

جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ غیر ضروری مسائل میں الجھنے کے بجائے قرآن شریف کی حفاظت کا اہتمام کریں، ترجمۃ القرآن کی صحت اور معیاری ہونا حفاظت دین کی بنیاد ہے جبکہ غیر معیاری ترجمہ فساد فی الدین کی ماں ہے۔ ذرائع مواصلات کے موجودہ دور میں کرۂ ارض پر آباد مختلف زبان والے انسانوں کا ایک دوسرے سے بُعد اور بے خبری کی کیفیت بڑی تیزی کے ساتھ قرب و آگاہی میں بدلتی جارہی ہے آج اگر مشرق و مغرب کی دُنیا ایک شہر کی طرح ایک دوسرے

---

(۱) المائدۃ:44۔

کے قریب آ چکیں ہیں تو آئندہ چل کرایک محلّہ کی مانند اور بعدازاں گھر کے ایک کمرہ کی مانند ہونے والی ہے۔ الغرض جس طرح دُنیا کی ترقی کا حجم وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ بُعد کی منزلیں سمٹ کر قرب میں بدل رہی ہیں اسی تناسب سے دعوت وتبلیغ اسلام اور ابلاغ قرآن کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے جسے موثر ومعیاری بنانے کے لیے ترجمۃ القرآن کا معیاری ہونا ضروری ہے، اصل الاصول اور سب کی بنیاد ہے۔ جو طبقہ جامع الشرائط کے وجودِ مسعود سے وابستہ ہے الٰہیات کے ماہرین میں اگر اِس طبقہ کا وجود نہ ہوتو پھر برائے نام علماء سے حق کا دفاع ہی ممکن نہیں ہے چہ جائیکہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ وجود میں لانے کی اُمید ہو سکے کیوں کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہونے کی بنا پر سب سے اہم اور سب سے مشکل عمل ہے الٰہیات کے کثیر الانواع شعبہ ہائے علم اِس کے خادم ہونے کی وجہ سے اُن سب میں دسترس رکھنے والے اِس طبقہ جامع الشرائط کے سوا کسی اور کے لیے اِس میں آنے کا جواز ہے نہ صحیح وسقیم کے حوالہ سے لب کشائی کرنے کا۔

حاصلِ کلام:۔ ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے جامع الشرائط طبقہ کے علاوہ کسی اور کے لیے اِس عمل میں آنا جائز نہ ہونے کی طرح صحیح وسقیم کے حوالہ سے تراجم سے بحث کرنا بھی جائز نہیں ہے اور اِس طبقہ کا وجودِ مسعود ہمیشہ سے ہے، جس سے زمین کبھی محروم نہیں ہوتی۔

علماء حق کو مشورہ:۔

اسلامی اقدار سے آگاہ حضرات جانتے ہیں کہ مسلم اُمت کی سیاسی مقتدرہ ومرکز اِس بات کے ذمہ دار ومسئول ہوتے ہیں کہ عالمی سطح پر اُمت کے حقوق کی پاس داری کریں، ملک کی جغرافیائی حدود کی حفاظت کے ساتھ ملت کی بھی نگہبانی کریں لیکن خلافت راشدہ کے اختتام کے بعد شومئی قسمت شوقِ تاجداری اور شخصی اقتدار کی عفریت نے اِس رحمت سے اُمت کو محروم کر دیا اور مسلم قومی ریاستیں جو دوہرے تصورِ اقتدار پر قائم ہوتی ہیں یعنی سیاسی اقتدار اور مذہبی اقتدار یعنی

آدھا تیتر آدھا بٹیر اُن کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ مذہبی مقتدرہ یعنی اصحاب محراب ومنبر کو اپنے حق میں استعمال کریں جس کے لیے علماء سو اور کچھ گندم نما جو فروش مشائخ کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں تاہم حق بین، حق شناس اور حق گو علماء حق کے وجودِ مسعود سے زمانہ کبھی خالی نہیں ہوتا اللہ کے رسول سید عالم ﷺ نے اِن کے استمرارِ وجود سے متعلق فرمایا؛

"لَنْ تَزَالَ طَآئِفَةٌ مِنْ اُمَّتِي عَلَى الْحَقِّ لا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ"(۱)

دوسری روایت میں اِن کے کردار سے متعلق آیا ہے؛

"يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ،وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ،وَتَاْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ"(۲)

کرۂ ارض کے متباعد ومتباین حصوں میں پائے جانے والے یہ حضرات اگرچہ اپنی اپنی زبانوں، ماحول اور معاشرہ کے تقاضوں کے مطابق اسلام کا دفاع کررہے ہیں، اُمتِ مسلمہ کی شیرازی بندی کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لارہے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن شریف کی حفاظت کے لیے اور اِس کی حقیقی تعلیمات کو انسانوں تک پہنچانے کے ساتھ تحریف سے بچانے کے لیے ہمہ جہت مصروف عمل نظر آرہے ہیں علماء حق کہلانے کے قابل اس مقدس طبقہ کو ہمارا مشورہ ہے کہ علاقائی سطح پر یہ سب کچھ جاری رکھتے ہوئے عالمی سطح پر بھی مربوط ہونے کی ضرورت ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ تحریف واشتباہ سے قرآن شریف کو بچانے کے لیے علاقائی اور انفرادی طور پر انجام دیئے جانے والی ان کاوشوں کو اگر عالمی ارتباط کی شاہراہ پر لایا جائے تو اِس سے بڑی طاقت بن سکتی ہے جو زمانہ کی رفتار کا مقابلہ کرسکتی ہے اور دُنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کے نام سے قرآن شریف کی معنوی تحریف میں جو افزونی آرہی ہے اُس پر بھی قابو پایا جاسکتا ہے علماء حق جانتے ہیں کہ اسلامی احکام کی دو قسمیں ہیں:

---

(۱) بخاری مع شرح عمدة القاری، کتاب العلم، ج: 2، ص: 58، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت۔

(۲) مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم، ص: 36۔

پہلی قسم:۔ جن کا تعلق انسانوں کے عرف اور معاشرہ سے ہے جن میں بڑی لچک ہے اور اونچ نیچ کی کافی گنجائش ہے۔

دوسری قسم:۔ جو آفاقی اور بین الاقوامی ہیں۔

اقوام عجم کو خطاب اللہ پہنچانا یعنی آیاتِ قرآنیہ کے اصل معانی سے اُنہیں اُن کی زبان میں آگاہ کرنے کا فریضہ جو مسلم اُمت پر عائد ہوتا ہے یہ دوسری قسم کے زمرہ میں آتا ہے جس کے مطابق دُنیا کی جس زبان میں بھی قرآن شریف کا ترجمہ کیا جائے اُس میں قرآن شریف کے محاورہ کو اُس کے محاورہ کا تابع کرنے کے بجائے اُس کے محاورہ کو قرآن شریف کے محاورہ کا تابع اور اُس کی مطابق کرنا ضروری ہے ورنہ معنوی تحریف ہوسکتی ہے (العیاذ باللہ)۔ ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے اسلام کا یہ حکم بین الاقوامی ہونے کے ساتھ بین اللسانی بھی ہے کہ دُنیا کی ہر زبان میں کیے جانے والے ترجمۃ القرآن کا با محاورہ ہونا ضروری ہے جس میں ترجمہ والی زبان کا محاورہ قرآن شریف کے محاورہ کا تابع اور اُس کے مطابق ہوتا ہے یعنی ترجمہ دونوں محاوروں کے اِس طرح سے مطابق ہوتا ہے کہ قرآن شریف کا محاورہ اصل ومتبوع اور ترجمہ والی زبان کا محاورہ اُس کے تابع ہوتا ہے قرآن شریف کا معجزاور کلام اللہ ہونے کا ثبوت ہے کہ دُنیا بھر کی ایک دوسرے سے مختلف ومتبائن محاورہ والی زبانیں ترجمہ کے طور پر قرآن شریف کے محاورہ پر منطبق ہوتی ہیں شرط صرف یہ ہے کہ ترجمہ کرنے والا جامع الشرائط ہو خاص کر دونوں زبانوں پر مکمل عبور رکھتا ہو۔ حقائق کی اس روشنی میں دنیا کی مختلف زبانوں میں کیے گئے تراجم کو غلطی سے بچانے کے لیے اور غلط شدہ کی نشان دہی کے لیے علماءِ حق کے اِس مقدس طبقہ کا باہم ارتباط ناگزیر ہے یہ کام اسلامی احکام کی روشنی میں مسلم اسٹیٹ اور سیاسی مقتدرہ کی ذمہ داری ہے جو آسانی سے ایسا کرسکتا ہے جس کی عدم موجودگی میں اِس کی تمام تر ذمہ داری ومسئولیت علماءِ حق کے اِس مقدس طبقہ پر عائد ہوتی ہے۔ (فبارك الله فی اعمارھم وافاض علینا من فیوضاتھم)

ایک بے مقصد بحث کی نشان دہی:۔

برصغیر پاک وہند کے کچھ علماء نے ترجمۃ القرآن کے عنوان سے ہندوپاک کے کچھ مترجمین کا تذکرہ کرنے کے ساتھ اُن کے تراجم کی خصوصیات وتفردات بھی بیان کیے ہیں اور حضرت شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمہ فتح الرحمٰن کو اِس عمل کا آغاز قرار دیا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن لکھ کر اِس راہ کا قفل توڑ دیا ہے اور اِس عمل کو ناجائز کہنے والے علماء کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کردیا ہے جس کے بعد دوسرے مرحلے میں شاہ صاحب کے دو بیٹوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے بالترتیب مختلف انداز کے دو ترجمے لکھ کر اِس عمل کو مزید تقویت پہنچائی ہے جس کے بعد تیسرے مرحلہ میں مختلف مکاتب فکر کے لوگوں نے اِس پر طبع آزمائی کی ہے۔ یہ سلسلہ اِسی طرح ترقی کرتے کرتے موجودہ دور تک پہنچا ہے جسے مختلف مسالک کے مابین مقابلہ اور مسابقہ فی الترجمہ کا دور کہا جاسکتا ہے۔ ترجمۃ القرآن کی تاریخ اور اِس پر گزرنے والے مراحل بیان کرنے کے اِس انداز کے مقابلہ میں بعض حضرات نے ترجمۃ القرآن کے نام سے لکھی گئی ہر دستیاب تحریر کا تذکرہ کیا ہے جن کی تعداد ہزار سے بھی متجاوز ہے جبکہ ہم اِن دونوں طریقوں کو بے مقصد اور وقت کا ضیاع کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتے کیوں کہ قرآن شریف صرف برصغیر پاک وہند کے لیے نہیں بلکہ تمام کرۂ ارض کے باشندوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے تو پھر برصغیر پاک وہند کی تخصیص کا کیا جواز ہے اور صرف اِسی کے باشندے مترجمین اور اُن کے کیے ہوئے تراجم میں اِس عمل کے آغاز ومراحل بیان کرنے کی کیا تُک ہے جبکہ کرۂ ارض کے دیگر اہل عجم اور دوسرے براعظموں کے رہنے والے عجم کی اکثریت کے مقابلہ میں یہ نہایت قلیل ہیں کیوں کہ برصغیر پاک و ہند کا یہ خطہ صرف براعظم ایشیاء کے اِس گوشے کا ایک چھوٹا سا گوشہ ہے نیز قرآن شریف کا نور براعظم ایشیاء کے اِس گوشے میں پہنچنے سے بہت پہلے کرۂ ارض کے دوسرے حصوں میں پہنچا ہے وہیں سے دائرہ اسلام میں آنے والے عجمیوں اور اُن کی اولاد نے مسلم عرب کے ساتھ مل کر دعوتِ

اسلام کو وسعت دی جبکہ براعظم ایشیا کا یہ گوشہ اُس وقت قرآن کی خوشبو سے بھی مانوس نہیں تھا۔ اسلام کی تاریخ سے آگاہ حضرات جانتے ہیں کہ جیسا جزیرہ عرب کے قبائل میں اسلام پھیلنے کے لیے فتح مکہ کی مثال نہیں ملتی، اِسی طرح مختلف زبانوں والے عجم میں قرآن شریف کا پیغام پھیلنے کے لیے دو عجم بادشاہتوں یعنی فارس وروم کی فتح کی مثالیں بھی کہیں اور نہیں ملتیں اپنے وقت کی ان دوسپر طاقتوں کی وسیع مملکتوں میں کئی درجن مختلف زبانیں بولنے والی قومیں آباد تھیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اُنہیں دائرہ اسلام میں لانے اور آہستہ آہستہ اسلام کا شیدائی بنانے کے پس منظر میں مختلف عوامل کو دخل ہے تاہم تبلیغ بترجمۃ القرآن سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا خاص کر اُن قبائل وشخصیات کے حق میں جو کسی اسلامی مبلغ کی تفسیر وتاویل اور ترجمانی جیسے دخل عمل کے بغیر محض قرآن شریف کا ترجمہ اور فقط ترجمہ پڑھ کر اُس کی صداقت پر غور کرنا چاہتے ہوں اور کہتے ہوں کہ جب قرآنی آیات کے الفاظ کو ہماری زبان کے ایسے الفاظ میں بدل کر ہمیں دِکھایا جائے جو اُن کے قائم مقام ہوں تب ہم اُس کی صداقت پر غور کریں گے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ ترجمۃ القرآن کی حقیقت اور اس کی جامع ومانع تعریف بھی اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آیاتِ قرآنی کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جاتا ہے جو اُن کے قائم مقام ہوسکیں یعنی اُن کی جملہ حیثیات اور اہل فہم کے نزدیک متعارف حالات کے مطابق ہوں، اہل علم یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی غیر مسلم عجمی سے ایسا مطالبہ پیش آنے کی صورت میں قرآن شریف کا ترجمہ اُنہیں فراہم کرنا مسلم اُمت پر فرض لازم قرار پاتا ہے عام اِس سے کہ ترجمہ تقریری ہو یا تحریری، چند آیات یا چند سورتوں کا ہو یا پورے قرآن شریف کا۔ عجم کے طول وعرض میں قرآن شریف کی خوشبو پھیلنے کے اِس پس منظر میں یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ عجم مسلمانوں میں ایمان کے استحکام سے لے کر قرآن شریف کے ساتھ لگاؤ اور محبت تک اور قرآنی علوم ومعارف کے ساتھ دلچسپی سے لے کر اُس کے دفاع کے جذبہ تک جو بھی قابلِ تحسین کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے اس کی پشت پر قرآن شریف کی صوتی کشش، نظم کی جاذبیت،

معنوی تاثیر، فنی اور بلاغی اعجاز جیسے عامل کے ساتھ ترجمۃ القرآن کو بھی بڑا دخل ہے جس کے ذریعے عجم مخاطبین اُس کے اصل معانی سے آگاہی پا کر اُس کی طرف جھکتے ہیں، اُن کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے اور اپنی عملی زندگی کو اُس کے رنگ میں رنگنے کے کوشاں رہتے ہیں۔ ایسے میں ترجمۃ القرآن کو دُنیائے عجم کی مختلف زبانوں اور مختلف خطوں کے تناظر میں لینے کے بجائے صرف براعظم ایشیا کے اِس چھوٹے سے گوشہ یعنی برصغیر پاک و ہند میں محدود کرنے کو قرینِ انصاف نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ محدودیت کی یہ روِش قرآن شریف کی لامحدودیت کے منافی اور دُنیائے عجم کی مختلف زبانوں میں کیے گئے تراجم سے خلاف ہے تو پھر اِسے بے مقصد نہ کہیں تو اور کیا کہیں اِس کے بجائے اِن حضرات کو چاہیے تھا کہ اپنی رسائی فہم کے مطابق اِس محدود حصہ ارض میں کیے گئے جن تراجم کا تذکرہ کیا ہے اور اُن کے نقصانات اور فحش اغلاط کی طرف توجہ دیئے بغیر اُنہیں کافی وشافی ترجمہ کہنے کی بے احتیاطی کی ہے۔ اِس بے مصرف بحث اور غیر ذمہ دارانہ گفتگو کی جگہ اُن پر لازم تھا کہ اِن سب کو پیشِ نظر رکھ کر صحیح وسقیم کے تناظر میں دیکھتے، معیاری وغیر معیاری کی تفریق کرتے اور دُنیا کو یہ بتاتے کہ اِن میں کون کون سے ایسے ہیں جو شرائط سے خلاف اور غلط ہیں بے مقصد و ناقابلِ قبول ہیں کہ اُن سے اجتناب کیا جائے اور کون سے ایسے ہیں جو شرائط کے مطابق ہونے کی بدولت معیاری اور مفید مقصد ہیں کہ اُن سے روشنی لی جائے اِس کے ساتھ یہ بھی اُن پر لازم تھا کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع ضبطِ تحریر میں لا کر اور اُس کے تناظر میں اِن سب کا تجزیہ کرتے کہ کون کون سے ایسے ہیں جو ترجمۃ القرآن کی تعریف سے خلاف ہونے کی وجہ سے ترجمہ کہلانے کے ہی قابل نہیں ہیں اور کون سے ایسے ہیں جو ترجمۃ القرآن سے غرض وغایت کے مفید نہ ہونے کی وجہ سے بے مقصد و بے سود ہیں اور کون سے ایسے ہیں جن پر ترجمۃ القرآن کا موضوع صادق نہ آنے کی وجہ سے غیر معیاری و مردود ہیں۔ اہلِ علم سے مخفی نہیں ہے کہ کسی بھی تصنیف اور ترجمہ پر تبصرہ کرنے والے کی حیثیت امین کی ہوتی ہے خاص کر قرآن شریف کے کسی ترجمہ سے

متعلق مثبت یا منفی اظہارِ خیال کرنا زیادہ سے زیادہ احتیاط کا مقتضی ہے خدانخواستہ اگر کسی غیر معیاری اور غلط ترجمہ کی تحسین کی جائے اور انجانے میں اُسے کافی وشافی قرار دیا جائے تو یہ امانتداری کے خلاف ہوگا، غلط ترجمہ مروج ہونے اور لوگوں کو اس کی طرف مائل کرنے کے مترادف ہوگا جس کی اجازت اسلام میں نہیں ہے۔حقائق کی اس روشنی میں ہم یہاں پر اُن چند غلط تراجم کا مشتے نمونہ از خروارے ایک نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں جن کی اِن حضرات نے تحسین کی ہیں اور اُنہیں قرآن شریف کا شافی وکافی ترجمہ قرار دے کر کہا ہے کہ اِن کی موجودگی میں دوسرا ترجمہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سورۃ البقرہ، آیت نمبر 67 تا 71 ''قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ٥ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ٥ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ٥ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ'' اِن پانچ آیات کے درج ذیل تین ترجموں کے بگاڑ کو دیکھا جا سکتا ہے:

1 اور وہ زمانہ یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ تم ایک بیل ذبح کرو وہ لوگ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخرا بناتے ہیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا نعوذ باللہ جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے اپنے رب سے ہم سے بیان کردیں کہ اُس بیل کے کیا اوصاف ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بالکل بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو پٹھا ہو دونوں عمروں کے وسط میں سو اب زیادہ حجت مت کیجیو بلکہ کر ڈالو جو تم کو حکم ملا ہے کہنے لگے کہ اچھا یہ بھی درخواست کیجئے ہمارے لیے اپنے رب سے ہم سے یہ بھی بیان کردیں کہ اُس کا رنگ کیسا ہو آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو کہنے لگے کہ اب کی بار اور ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم

سے بیان کر دیں کہ اُس کے اوصاف کیا کیا ہو کیوں کہ ہم کو اس بیل میں قدرے اشتباہ ہے اور ہم ضرور انشاء اللہ تعالیٰ اب کی بار ٹھیک سمجھ جاویں گے موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ نہ تو ہل میں چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جاوے اور نہ اُس سے زراعت کی آبپاشی کی جاوے غرض ہر قسم کے عیب سے سالم ہو اور اُس میں کوئی داغ نہ ہو یہ سن کر کہنے لگے کہ اب آپ نے پوری بات فرمائی پھر اُس کو ذبح کیا اور اُن کی حجتوں سے بظاہر کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے۔'' یہ اشرف علی تھانوی کا کیا ہوا ترجمہ ہے۔

۲ ''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک بیل ذبح کرو وہ بولے کیا تم ہم سے ہنسی کرتے ہو؟ (موسیٰ نے) کہا کہ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ نادان بنوں اُنہوں نے کہا اپنے پروردگار سے التجا کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ بیل کس طرح کا ہو۔ (موسیٰ نے) کہا پروردگار فرماتا ہے کہ وہ بیل نہ تو بوڑھا ہو اور نہ بچھڑا بلکہ ان کے درمیان (یعنی جوان) ہو سو جیسا تم کو حکم دیا گیا ہے ویسا کرو۔ اُنہوں نے کہا اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ ہم کو یہ بھی بتادے کہ اُس کا رنگ کیسا ہو۔ موسیٰ نے کہا پروردگار فرماتا ہے کہ اس کا رنگ گہرا زرد ہو کہ دیکھنے والوں (کے دل) کو خوش کر دیتا ہو۔ اُنہوں نے کہا (اب کے) پروردگار سے پھر درخواست کیجئے کہ ہم کو بتادے کہ وہ اور کس کس طرح کا ہو کیوں کہ بہت سے بیل ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں (پھر) خدا نے چاہا تو ہمیں ٹھیک بات معلوم ہو جائے گی۔ موسیٰ نے کہا کہ خدا فرماتا ہے کہ وہ بیل کام میں لگا ہوا نہ ہو نہ تو زمین جوتتا ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتا ہو اس میں کسی طرح کا داغ نہ ہو کہنے لگے تم نے سب باتیں درست بتا دیں۔ غرض (بڑی مشکل سے) انہوں نے اس بیل کو ذبح کیا اور وہ ایسا کرنے والے تھے نہیں۔'' یہ فتح محمد جالندھری کا کیا ہوا ترجمہ ہے۔

۳ ''اور جب کہا موسیٰ نے واسطے قوم اپنی کے کہ تحقیق اللہ حکم کرتا ہے تم کو یہ کہ ذبح کرو ایک بیل کہا انہوں نے کیا پکڑتا ہے تو ہم کو ٹھٹھا کہا پناہ پکڑتا ہوں میں ساتھ اللہ کے یہ کہ ہوں میں

جاہلوں سے کہا اُنہوں نے دعا کر واسطے ہمارے رب اپنے سے بیان کرے واسطے ہمارے کیا ہے وہ بیل کہا تحقیق وہ کہتا ہے تحقیق وہ بیل نہ بوڑھا ہے اور نہ بچہ جوان ہے درمیان میں اس کے پس کرو جو کچھ حکم کیے جاتے ہو کہا اُنہوں نے دعا کر واسطے ہمارے رب اپنے سے بیان کرے واسطے ہمارے کیا ہے رنگ اس کا کہا تحقیق وہ کہتا ہے تحقیق وہ بیل ہے زرد ڈہڈہا ہے رنگ اُس کا خوش کرتا ہے دیکھنے والوں کو کہا اُنہوں نے دعا کر واسطے ہمارے پروردگار اپنے سے بیان کرے واسطے ہمارے کیا ہے وہ بیل تحقیق وہ بیل گیا اوپر ہمارے اور تحقیق ہم اگر چاہا اللہ نے البتہ راہ پانے والے ہیں کہا تحقیق وہ کہتا ہے تحقیق وہ بیل ہے نہ جوتا ہوا کہ پھاڑے زمیں کو اور نہ پانی پلاتا کھیتی کو تندرست ہے نہیں داغ بیچ اس کے کہا انہوں نے اب لایا تو سچ پس ذبح کیا اُنہوں نے اس کو اور نہ نزدیک تھے کہ کریں۔'' یہ شاہ رفیع الدین کا کیا ہوا ترجمہ ہے۔

اِن تینوں میں قدرِ مشترک اور بنیادی غلطی یہ ہے کہ اِن سب میں متن کے لفظ ''بَقَرَۃٌ'' سے مراد بیل لیا گیا ہے اور اُس کا ترجمہ بیل میں کیا گیا ہے جو غلط فحش ہے اور اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کیوں کہ یہاں پر اُس کے متعلق لفظ ''بَقَرَۃٌ صَفْرَآءُ'' استعمال ہوا ہے جو ''بَقَرَۃٌ'' سے مراد گائے ہونے پر قطعی دلیل ہے کیوں کہ لسانی اعتبار سے یہاں پر لفظ ''بَقَرَۃٌ'' موصوف اور ''صَفْرَآءُ'' اُس کی صفت ہے۔ نیز لفظ ''صَفْـرَآءُ'' میں جو الف ہے یہ اصل کلمہ سے زائد اور علامت تانیث ہے کہ جس کلمہ پر بھی یہ آجائے اُس کا مؤنث ہونا لازم ہے علم نحو کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے؛

''التانیث ولزومھا''(۱)

متن متین میں ہے؛''التـانیـث فبـاالالف متـحتم التاثیر بلاشرط ومتکرّر بلزومھا وضعا فیقوم مقام علتین''(۲)

یعنی الف علامت تانیث منع صرف کے دوسبب کے قائم مقام ہوتا ہے۔

---

(۱) ھدایۃ النحو بحث اسم غیر المنصرف۔

(۲) متن متین للامام النحاۃ فی الھند عبدالرسول بحث اسم غیر المنصرف۔

ایک:۔ جس کلمہ پر آیا ہے وہ مونث ہے۔

دوسرا:۔ تانیث اس کو لازم ہے کہ یہ جس کلمہ پر بھی آجائے وہ ہمیشہ مونث ہوتا ہے کہ مذکر پر آنا اِس کا ممکن نہیں ہے۔

اور سب جانتے ہیں کہ بیل مذکر ہے مونث نہیں تو پھر ''بَقَرَۃٌ صَفْرَآءُ'' کا ترجمہ ''زرد رنگ کے بیل'' میں کرنے کو غلط فحش کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے اِس کی ایسی مثال ہے جیسا ''امرۃٌ صَفْرَآءُ'' کا ترجمہ ''زرد رنگ کے مرد'' کیا جائے۔ الغرض یہاں پر آیت کریمہ میں بقرہ بنی اسرائیل سے متعلق لفظ ''بَقَرَۃٌ صَفْرَآءُ'' جو استعمال ہوا ہے یہ اِس بات پر قطعی دلیل ہے کہ اُس سے مراد گائے ہے بیل ہرگز نہیں، اِس کا ضروری لازمہ ہے کہ اِن پانچوں آیتوں میں جہاں پر بھی لفظ ''بَقَرَۃٌ'' آیا ہے یا اُس کی طرف راجع ہونے والے ضمائر استعمال ہوئے ہیں اِن سب کا مظہر و مصداق گائے ہے بیل کی گنجائش ایک میں بھی نہیں ہے لیکن افسوس کہ مترجمین نے مرادِ الٰہی سے برعکس اِن تمام مقامات کا ترجمہ بیل میں کیا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر ترجمہ کے پانچ مقامات پر ایسا کیا گیا ہے اور ثانی الذکر کے چھ مقامات میں جبکہ آخر الذکر ترجمہ کے سات مقامات میں یہ ظلم کیا گیا ہے جو نا قابلِ معافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس قسم کے تراجم اِس قابل ہی نہیں ہیں کہ انہیں ترجمۃ القرآن کہا جائے کیوں کہ ترجمۃ القرآن کہلانے کے قابل وہی ترجمہ ہوتا ہے جس پر ترجمۃ القرآن کی تعریف ''ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التی تقوم مقامھا'' صادق آسکے جو یہاں پر مفقود ہے کیوں کہ اِن میں متنِ قرآن کے لفظ ''بَقَرَۃٌ'' اور اُس کی طرف راجع ہونے والے ضمائر کو ترجمہ والی زبان کے جس لفظ میں بدلا گیا ہے وہ اُن کے قائم مقام اور مطابق نہیں ہے بلکہ ضد ہے کہ وہ مونث یہ مذکر ہیں کاش ان مترجمین کو ترجمۃ القرآن کی تعریف پیشِ نظر ہوتی یا اس کی شرائط کو ملحوظِ خاطر رکھتے تو ترجمۃ القرآن کے نام سے ایسے بگاڑ اور معنوی تحریف کی ایسی مثالیں کبھی قائم نہ کرتے۔ (فالی اللہ المشتکی)

اللہ ہی بہتر جانتا ہے ایسے سابقین کی تقلید کرنے والے وہ لاحقین جو مختلف چھوٹی چھوٹی اور علاقائی

زبانوں میں ترجمۃ القرآن لکھنے کا شوق پورا کرتے ہیں ان کی اندھی تقلید میں کیا کچھ نہ کرتے ہوں گے جبکہ ہمارے پیشِ نظر صرف مشاہیر کے تراجم ہیں چاہے جس مکتبہ فکر سے ہی متعلق کیوں نہ ہوں اور شرائط کے جامع ہوئے بغیر کسی بھی زبان میں ترجمہ کرنے والے غیر مشاہیر کو ہم لہولگا کر شہیدوں میں شامل ہونے والوں سے مختلف نہیں سمجھتے ہیں اسی وجہ سے اُن کے کیے ہوئے تراجم کا تذکرہ کرنے کو بھی وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں نہ صرف اتنا بلکہ غیر معیاری اور غلط تراجم کا تذکرہ کر کے انجانے میں اُنہیں قرآن شریف کی خدمت کہنا درج ذیل محذورات پر منتج ہوسکتا ہے:

1. ترجمہ خوانوں کی گمراہی کا سبب ہونا۔
2. ترجمہ کی شرائط سے بے خبر اور نااہل مترجمین کا حوصلہ بڑھانے کا سبب ہونا۔
3. قرآن شریف کے معانی ومقاصد کے حوالہ سے التباس الحق بالباطل کا سبب ہونا۔
4. اغیار کی نگاہ میں باعث تضحیک ہونا خاص کر یورپ وامریکا کے مستشرقین اور وہ غیر مسلم سکالرز جو قرآن فہمی کے لیے ضروری فنون کی سمجھ رکھتے ہیں اور اُس کی روشنی میں دونوں زبانوں کی حدتک صحیح وسقیم کی تفریق کر سکتے ہیں وہ قرآن شریف کے نادان دوستوں کے ہاتھوں اُس پر ہونے والے اِن مظالم پر یقیناً ہنستے ہوں گے۔
5. متعصب اغیار کی طرف سے اعتراض کا سبب ہونا کیوں کہ قرآن فہمی کے لیے علوم آلیہ کی سمجھ رکھنے کی وجہ سے صحیح وسقیم تراجم کی تفریق پر قادر اغیار میں دو طبقے ہیں:

پہلا طبقہ:۔ جس میں انصاف کا مادہ موجود ہے جس وجہ سے اسلام کے ان نادان دوستوں کی بے اعتدالیوں کو قرآن کی طرف منسوب نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ ان غلطیوں سے اسلام بھی بری ہے اور اُس کے دانا دوست بھی اور قرآن شریف کے حقیقی خادمین ان خرافات کو پسند کرتے ہیں نہ قرآن شریف کی طرف انہیں منسوب کرنا درست ہے اِس تصور کی حد میں وہ اِن نااہل مترجمین پر ہنسنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتے۔

دوسرا طبقہ:۔ جو انصاف سے خالی اور تعصب سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور ہر وقت اسلام پر اعتراض

کرنے کے لیے بہانہ کی تلاش میں ہوتا ہے دُنیا کی مختلف زبانوں میں کیے ہوئے اس قسم کے غلط تراجم کو وہ سب سے بڑا ہتھیار سمجھتے ہیں تو اِس سے فائدہ کیوں نہ اُٹھائیں۔

❻ معیاری و غیر معیاری تراجم کے مابین عدم تفریق کے مروج ہونے کے لیے سبب ہونا۔

تراجم سے بلا تفریق بحث کرنے والے حضرات اسلام کے خلاف پیدا ہونے والے ان تمام نقصانات کے ذمہ دار اور غلط تراجم لکھنے والوں کے جرم میں شریک ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اِن کے لکھنے والے حدیث نبوی ''مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ ''(۱) دوسری روایت میں فرمایا ''مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ ''(۲) کی رُو سے شرائط کے جامع ہوئے بغیر اس عمل میں آنے کا گناہ پا رہے ہیں جبکہ انہیں معیاری تراجم کے ساتھ یکساں ذکر کرنے والے یہ مصنفین و مؤلفین انہیں معیاری اور درست ہونے کی سند دے کر قرآن شریف کی رُو سے گناہ گار ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ ''(۳) اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن شریف کا غلط اور مرادِ الٰہی سے خلاف ترجمہ کرنا ایسا گناہ ہے کہ اس پر جہنمی ہونے کی وعید سنائی گئی ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ترمذی شریف کی روایات کے مطابق ''مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ '' و ''مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ '' اِسی طرح ابوداؤد کی روایت کے مطابق ''مَنْ قَالَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ ''(۴) یہ تمام تر روایات خبر احاد ہیں انفرادی طور پر ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جو یقین کا فائدہ دے لیکن اِن کے اجتماعی مفاد پر اسلامی عقیدہ

---

(۱) جامع الصغیر، حدیث نمبر8899، مع فیض القدیر، ج6، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت۔

(۲) ترمذی شریف، ج:2، ص:589، باب تفسیر القرآن مطبوعہ رحمانیہ لاھور۔

(۳) المائدۃ:2۔

(٤) ابو داؤد شریف، ج:2، ص:158، کتاب العلم مطبوعہ ایچ ایم سعید کراچی۔

قائم ہے اور بلاتفریق مسلک کل مکاتب فکر اہل اسلام کا اجمعی عقیدہ ہے کہ شرائط کی جامعیت کے بغیر قرآن شریف کا ترجمہ کرنا جائز ہے نہ تفسیر کرنا، عہد صحابہ سے لے کر آج تک کسی بھی فقہی مسلک کے قابلِ ذکر امام و مجتہد یا محدث و مفسر نے بغیر شرائط کے تفسیر کرنے کی اجازت نہیں دی ہے جب شرائط کے جامع ہوئے بغیر قرآن شریف کی تفسیر کرنا حرام وممنوع ہے اور مذکورہ حدیثوں کا مظہر و معصیت ہے تو پھر استجماع شرائط کے بغیر ترجمۃ القرآن کے عمل میں آنے کی اجازت کون دے سکتا ہے جبکہ ترجمہ کا عمل تفسیر کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہے، کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہے۔ ایسے میں غلط تراجم کو انجانے میں صحت کی سند دینے یا انہیں قرآن کی خدمت قرار دینے یا اُنہیں قابلِ فخر اور قابلِ تقلید کہنے کی جو مثالیں مختلف حضرات کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں ہم اُن سب کو اِس حوالہ سے بے احتیاط وخطا کار سمجھتے ہیں اور غلط ترجمہ لکھنے والوں کے ساتھ گناہ میں شریک سمجھتے ہیں۔ اِن حضرات پر لازم تھا کہ غلط تراجم کو صحت کی سند دینے کے بجائے صحیح وسقیم کی تمیز بتاتے اور دُنیا کو آگاہ کرتے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں اور مختلف زبانوں میں لکھے گئے تراجم میں کون کون سے معیاری ہیں، شرائط پر منطبق اور ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع کے مطابق ہیں کہ اُنہیں قرآن شریف کی خدمت سمجھ کر پیروی کی جائے، اور کون کون سے غیر معیاری، شرائط سے منحرف اور غلط ہیں کہ اُن سے اجتناب کیا جائے۔

نہایت قابلِ توجہ المیہ:۔

ترجمۃ القرآن کی تاریخ اور ادوار، مختلف زبانوں میں لکھے گئے تراجم پر تبصرہ کرنے والے حضرات کی اس اندھیر نگری سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ خود اس موضوع پر گفتگو کرنے کے اہل نہیں تھے ورنہ معیاری وغیر معیاری تراجم کا یکساں تذکرہ نہ کرتے، غلط تراجم کو قابلِ فخر اور کافی وشافی نہ کہتے اور شرائط سے منحرف تراجم کو صحت کی سند دینے کی جسارت کبھی نہ کرتے اِس اہم اور پُر خطر موضوع پر تبصرہ کرنے کے اہل صرف وہی ہو سکتے ہیں جنہیں عرف عام میں استعمال ہونے

والے ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع کا ادراک ہو، فنِ ترجمہ کی عمومی شرائط و اُصول سے لے کر ترجمۃ القرآن کی اضافی شرائط اور اِس کے احتیاطی تقاضوں کا شعور ہو کہ اس کی روشنی میں صحیح و سقیم کی تمیز کر سکیں۔

ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے ربط و یابس کو یکساں ذکر کرنے والے ان مبصرین میں بعض وہ ہیں جنہوں نے تراجم کی اکائیوں پر تبصرہ کیا ہے اور بعض نے دہائیوں کا تذکرہ کیا ہے اور صحیح و سقیم کی اس یکساں فہرست کو طویل سے طویل تر کرنے کے تسلسل میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی الجامعہ الاسلامیہ کے ایک ذمہ دار (ڈاکٹر احمد خان) نے ایک ہزار سے زائد تراجم کی دستاویزات کو متعارف کرایا ہے جسے مقدرہ قومی زبان اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ اسلامی سکالرز کی اس بے مصرف کاوش میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس میں اس موضوع کو سنجیدگی سے لیا گیا ہو جس کی واحد صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں تھی کہ سب سے پہلے عرف عام میں استعمال ہونے والے اس لفظ ''ترجمۃ القرآن'' کی جامع و مانع تعریف پیش کی جاتی اور اِس سے غرض و غایت اور اس کا موضوع جیسے کلیدی اُمور کا تعارف کیا جاتا بعد ازاں اس کی فطری شرائط اور احتیاطی تقاضوں کی تفصیل سے پردہ اُٹھایا جاتا تا کہ صحیح و سقیم کی تمیز کے لیے معیارِ ممیّز کا تعین ہوتا پھر اُس کی روشنی میں معیاری و غیر معیاری کو پرکھا جاتا اور معیاری کے محاسن و اہمیت ظاہر کر کے دُنیا کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی جاتی اور غیر معیاری کے خطرناک نتائج سے دُنیا کو آگاہ کیا جاتا یہ اِس لیے ضروری تھا کہ قرآن شریف کا ترجمہ فنِ ترجمہ کے ماتحت مستقل اور خاص فن ہے جس کا تصور اُس کی تعریف و غرض و موضوع کے بغیر نہیں ہو سکتا اور عام فنِ ترجمہ کے اُصول و شرائط سے اضافی کچھ احتیاطی اُصول اور اضافی شرائط کے ساتھ بھی مشروط ہے جس کے مطابق ہوئے بغیر اس کی صحت ممکن ہے نہ افادیت لیکن ترجمۃ القرآن کے نام سے لکھے گئے ہر رطب و یابس کو ایک نظر سے دیکھنے والے اِن حضرات پر افسوس کہ اِن میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو خود ان شرائط کا جامع ہو جبکہ صحیح و سقیم کو پرکھنے اور کھرے کھوٹا کی تمیز کرنے کے لیے شرائط کا جامع ہونا ضروری ہے جس کے بغیر رجم بالغیب تو ہو سکتا

ہے جبکہ نشانہ پر لگنا ممکن نہیں ہے ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے بحث کرنے والے حضرات کے معروضی حالات کی اس روشنی میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ غلط ترجمہ کرنے والے حضرات ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض وموضوع کی پہچان سے غافل اور شرائط سے بے خبر ہونے کی طرح اُنہیں درست قرار دینے اور اُنہیں معیاری تراجم کے ساتھ یکساں ذکر کرنے والے اِن حضرات کا دامن بھی اس دولت سے خالی ہے جو المیہ سے کم نہیں ہے ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ بعض علمی جامعات (یونیورسٹیاں) کچھ ایسے تھیس کے مقالہ جات پر بھی پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں دے رہی ہیں جو تراجم کے تنقیدی اور تقابلی جائزے سے متعلق ہیں اور شائع ہو کر مارکیٹ میں دستیاب ہیں جن میں غیر معیاری تراجم کو معیاری پر ترجیح دے گئی ہے، شرائط سے منحرف کو مستحسن قرار دیا گیا ہے اور ترجمۃ القرآن کی تعریف سے برعکس کو افضل بتایا گیا ہے افسوس اُن یونیورسٹیوں پر اور تھیس کے ایسے مقالہ جات کو ڈگری کے مستحق قرار دینے والے ممبران پر کہ وہ صحیح وسقیم کی تمیز کرنے سے ہی غافل ہیں اور تراجم القرآن کے مابین تقابلی جائزہ جیسی اہم ذمہ داری کو سطحی نظر سے دیکھ کر ڈگریاں جاری کر دیتے ہیں، جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے ایسے میں ہم اس موضوع کو نہایت قابلِ توجہ المیہ سمجھتے ہیں یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے، کوئی علاقائی اور جزوی نقصان پر منتج نہیں ہے بلکہ معنوی قرآن یعنی ترجمۃ القرآن سے متعلق ہونے کی بنا پر ملت کا نقصان ہے، قرآن شریف کی معنوی تحریف کی حوصلہ افزائی ہے اور اسلام کی بنیاد کو ہی متزلزل ومشکوک کرنے کے مترادف ہے، قرآن شریف کے نادان دوستوں کی اس نازیبا روش کا آغاز سعودیہ عربیہ کے علماء سے ہوا ہے کہ گورنمنٹ کی سرپرستی سے شہر ریاض میں قضاء کے لیے جو درسگاہ بنام المعہد العالی للقضاء قائم ہے اُس کے مدیر عالی جناب المناع القطان نے اپنی کتاب مباحث فی علوم القرآن کے ص 285 تا 290 میں التباس الحق بالباطل کے اس فساد کی بنیاد رکھی ہے کیوں کہ صاحب موصوف نے قرآن شریف کے الفاظ کے ترجمہ پر عدم امکان، ناجائز اور حرام جیسی دفعات لگانے کے بعد ترجمۃ القرآن پر بھی فساد کا دفعہ لگایا ہے کہ یہ بجائے خود ممکن ہونے کے باوجود فساد سے خالی نہیں ہے اِس کے بعد ترجمۃ القرآن

کے نام سے بدعت ایجاد کرتے ہوئے کہا کہ قرآن شریف کے ترجمہ کی صرف ایک صورت ممکن ہے کہ علماء پہلے اپنی ثواب دید کے مطابق آیات قرآنیہ کی تفسیر متعین کریں پھر اُس تفسیر کا ترجمہ امانتداری کے ساتھ پیش کریں جسے الترجمۃ التفسیریۃ، ترجمۃ تفسیر القرآن اور ترجمۃ معانی القرآن جیسے ناموں سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ مصنف مباحث فی علوم القرآن کی اس بدعت کے اثرات اب تک کن کن ملکوں میں پھیل چکے ہیں اُن کی تفصیل کا ہمیں علم نہیں ہے البتہ برصغیر پاک و ہند کے علماء کو ہم اس سے متاثر ہوتے دیکھ رہے ہیں اور اِس خطے کے جامعات میں بھی اس کا نفوذ ہو رہا ہے یہاں تک کہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد بھی اس کی لپیٹ میں آ چکی ہے جس کا نتیجہ ہے کہ اس کے ماتحت اداروں کے زیر اہتمام ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے منعقد ہونے والے پروگراموں کے لیے ترجمۃ القرآن لکھنے کے بجائے (ترجمۃ معانی القرآن) لکھا جاتا ہے جس پر واقفِ حال حضرات افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں، اِسے کہتے ہیں:

؎ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

الٰہیات کے حوالہ سے ناپختہ علماء اور عجمی اداروں کا حجاز سے اُٹھنے والے اس فتنہ سے متاثر ہونا تعجب کی بات نہیں ہے کیوں کہ قرآن فہمی کے حوالہ سے اہل عرب کو اپنے سے فائق و افضل سمجھنا اہل عجم کی فطرت میں شامل ہے اگر چہ قرآن فہمی کے لیے دوسری شرائط سے وہ عاری ہی کیوں نہ ہو اور تفسیرِ قرآن یا ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع سے ہی بیگانہ کیوں نہ ہوں پھر بھی یہ اُن سے حُسن ظن ہی رکھتے ہیں جسے ہم اندھی تقلید کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں جو قرآن فہمی کے لیے ضروری شرائط اور تفسیر و ترجمۃ القرآن کے احتیاطی تقاضوں اور ضروری شرائط جیسے حقائق سے غفلت کا نتیجہ ہے جس کی زندہ مثال ہے کہ پاکستانی سکالر مولانا عتیق الرحمٰن کیلانی ولد مولانا عبد الرحمٰن کیلانی مدرس کنگ سعود یونیورسٹی الریاض السعودیہ العربیہ نے اپنے والد کا کیا ہوا ترجمہ بنام تیسیر القرآن کے مقدمہ میں لکھا ہے؛

”مختلف زبانوں کا طالب علم ہونے کے ناطے میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی بھی

نص کا بعینہٖ ترجمہ کسی دوسری زبان میں پیش کرنا انسانی بساط سے باہر ہے۔انتہائی کامیاب مترجم بھی صرف قریب ترین مفہوم پیش کرسکتا ہے جس سے ''گزارا'' چل جاتا ہے یہ تو عام عبارات کا حال ہے۔قرآن کریم کی آیات تو ویسے بھی ''معجزہ'' ہیں۔ان کا ترجمہ کیسے ممکن ہے؟ یہی وجہ ہے کہ علماء نے ''ترجمہ قرآن'' کو غلط عبارت قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ درست عبارت ''ترجمہ معانی القرآن'' ہے۔''(۱)

اِسی طرح دو اور پاکستانی اہل حدیث سکالرز حافظ صلاح الدین یوسف اور مولانا محمد عبدالجبار کے اشتراک عمل سے وجود میں آنے والا ترجمہ بنام ''معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اردو ترجمہ'' کے مقدمہ میں اُس کے ناشر جو دارالسلام الریاض، لاہور کے مدیر بھی ہیں نے لکھا ہے؛

''اِس امر پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ ممکن نہیں بلکہ صرف ترجمانی ہی کا امکان ہے''

اور خود دونوں مترجمین نے اس کے مقدمہ میں حرف اول کے عنوان کے تحت لکھا ہے؛

''ہم یہاں اپنے اس احساس کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس کی توثیق یا تائید بیسیوں دوسرے صاحبان علم نے بھی کی ہے اور ان سب آراء کا ملخص یہ ہے کہ قرآن مجید کا کماحقہ ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں البتہ اس کی ترجمانی کی بہتر سے بہتر کوششوں اور اسالیب کو اختیار کیا جاسکتا ہے بس یہی ایک نقطۂ نظر ہے، جس کے پیش نظر ہر عہد کے مترجمین نے نئے سے نئے قرآنی تراجم پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔''(۲)

اہل بصیرت جانتے ہیں کہ ترجمۃ التفسیر، ترجمہ معانی القرآن اور ترجمانی قرآن یہ تینوں ایک ہی چیز سے عبارت ہیں جس کا تعلق قرآن شریف کے اُن معانی کے ساتھ ہے جو انسانی ذہن کی ترجیح

(۱) مقدمہ تیسیر القرآن،اسلامک پریس،دارالسلام،وسن پورہ لاہور،پاکستان۔

(۲) معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اردو ترجمہ مع قرآنی گرامر،ص:9، مطبوعہ دارالسلام ہیڈآفس سعودیہ عربیہ الریاض،پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم36لوئرمال سیکرٹریٹ سٹاپ لاہور۔

ہیں، جسے قبول کرنے کے لیے ترجمۃ القرآن کی تعریف تیار ہے نہ شرائط کیوں کہ وہ ایک سانچہ ہے، ایک معیار اور ترازو ہے جس میں کسی کی ذہنی ترجیح کو دخل ہوسکتا ہے نہ پسند کو اور دُنیا کی مختلف زبانوں کے الفاظ و محاورہ مختلف ہونے کے باوجود ترجمۃ القرآن ہونے کی حیثیت سے محاورہ قرآن کے تابع اور اُس کے مطابق ہوتے ہیں جس میں ذرہ برابر فرق کا بھی امکان نہیں ہے چہ جائیکہ اُسے انسانی ذہن کی ترجیح کا تابع کرنا جائز ہو ورنہ ایسا ہی ہوگا جیسا تورات وانجیل کے معانی کے ترجمہ کا ہوا ہے (العیاذ باللہ)۔

ایسے میں حجاز مقدس سے اُٹھنے والے اِس فتنہ کے مضمرات پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور عالمی سطح پر حق بین وحق گو علماء کرام کو اس حوالہ سے مل بیٹھنا پڑے گا۔ مدینہ، مکہ اور ریاض کی یونیورسٹیوں سمیت حجاز مقدس کے دوسرے تمام مراکز اور الٰہیات کی دانش گاہوں سے اصلاح احوال کی اُمید نہیں کی جاسکتی کیوں کہ اُن میں کسی نہ کسی حوالہ سے برصغیر پاک وہند کے نیم خواندہ علماء دخیل ہیں جو ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے صحیح وسقیم کی تمیز سے عاری ہونے کے باوجود مشیر کا کردار ادا کر رہے ہیں نہ صرف اتنا بلکہ اندھوں کی صفوں میں واحد العین کا عمل کر رہے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ السعودیۃ العربیہ کے فرماں روا کی طرف سے دُنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن شریف کا ترجمہ شائع کرنے اور تقسیم کرنے کے لیے جو اہتمام کیا جاتا ہے اُس میں سب سے زیادہ دخل عمل اِن حضرات کا ہوتا ہے اِس لیے ہم الجامعۃ الازہر، طہران یونیورسٹی، شام وعراق یونیورسٹیوں کے ارباب اقتدار کو دعوتِ توجہ دیتے ہیں کہ اس کے لیے مل بیٹھیں اور ترجمۃ القرآن کے لیے واجبی شرائط کے جامع علماء کی ٹیم بیٹھا کر ترجمہ کے حوالہ سے قرآن شریف کے تحفظ کا اہتمام کریں۔ (وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب)

ایک کثیر الورود اشتباہ کا ازالہ:۔

ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع مشخص کیے بغیر اِس سے گفتگو کرنے والے حضرات کی چھیڑی گئی دوسری مباحث کے بے سود و بے مقصد ہونے کی طرح یہ بھی بے مصرف ہے

کہ اُنہوں نے ترجمۃ القرآن کی خودساختہ تقسیم کرتے ہوئے کبھی ''تحت اللفظ ترجمہ اور بامحاورہ ترجمہ'' کہا ہے اور کبھی ''لفظی ترجمہ اور بامحاورہ ترجمہ'' کہا ہے اور کبھی ''ترجمۃ الفاظ القرآن اور ترجمۃ معانی القرآن کہا ہے اور کبھی ''تفسیری ترجمہ اور لفظ بہ لفظ ترجمہ'' کہا ہے جو حقیقت میں لُغت سے بھی خلاف ہے اور عرف سے بھی کیوں کہ عربی وعجمی دونوں میں یکساں استعمال ہونے والے اِس لفظ ''ترجمۃ القرآن'' سے متعلق اِس قسم کی تقسیم کی مثال لُغت میں ملتی ہے نہ عرف عام میں بلکہ اِس کی حیثیت خودساختہ تقسیم کے سوااور کچھ نہیں ہے جس میں لُغت وعرف دونوں سے خلاف اختراع کیا جا رہا ہے جو بدعت فی اللغۃ ہونے کے ساتھ بدعت فی العرف بھی ہے اور قرآن شریف سے متعلق ہونے کی بنا پر اِسے بدعت فی الاسلام بھی کہا جاسکتا ہے۔

یہ ایسا کثیر الورود اشتباہ ہے اور التباس الحق بالباطل کی انوکھی مثال ہے جس میں نیم خواندہ حضرات سے لے کر عوام تک کو مغالطہ ہوتا ہے یہاں تک کہ ہمارے تجربہ کے مطابق برصغیر پاک وہند کے ناواقف حال ماحول میں اِسے شہرت کا درجہ حاصل ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے جبکہ ترجمۃ القرآن کی حقیقت اوراس کی تعریف،غرض،موضوع سے آگاہ حضرات جانتے ہیں کہ بطور متقابل بیان کیے جانے والے ان آٹھوں الفاظ میں ایک بھی ایسا نہیں ہے کہ اُسے ترجمۃ القرآن کہا جاسکے یا ترجمۃ القرآن کا لفظ اُس پر صادق آسکے کیوں کہ لفظ ''تحت اللفظ ترجمہ'' اور لفظ ''لفظی ترجمہ'' اسی طرح لفظ ''ترجمہ الفاظ القرآن اور لفظ بہ لفظ ترجمہ'' ان چاروں کا حاصل مفہوم ایک ہے جو الفاظِ قرآن کے ترجمہ سے عبارت ہے جس کی حیثیت تعریف لفظی سے مختلف نہیں ہے جبکہ ترجمۃ القرآن کی حقیقت قرآنی الفاظ کے تعارف سے عبارت نہیں بلکہ وہ قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنے سے عبارت ہے جو اُن کے قائم مقام ہوسکیں یعنی اُن کی جملہ حیثیات کے مطابق ہوں اور ظاہر ہے کہ قرآن شریف صرف الفاظ سے عبارت نہیں ہے بلکہ الفاظ من حیث الدال اور معانی من حیث المدلول کے مجموعہ سے عبارت ہے جیسا اُصولِ فقہ کی

تمام کتابوں میں لکھا ہوا موجود ہے کہ "ھو اسم للنظم والمعنی جمیعا "(۱)۔ اِسی طرح اِن چاروں کے مدمقابل بیان کیے جانے والے مذکورہ الفاظ یعنی بامحاورہ ترجمہ، ترجمہ معانی القرآن، تفسیری ترجمہ اِن سب کی حقیقت بھی ایک ہے جو ترجمانی سے عبارت ہے کیوں کہ اِن حضرات کے نزدیک بامحاورہ سے مراد ترجمہ والی زبان کا محاورہ ہے کہ آیاتِ قرآنیہ کے جن معانی کو اپنی فہم ودانش کے مطابق درست وراجح سمجھا جائے اُنہیں ترجمہ والی زبان کے محاورہ میں پیش کیا جائے جس پر تفسیری ترجمہ کے ساتھ ترجمہ معانی القرآن اور ترجمانی جیسے الفاظ بھی صادق آتے ہیں کیوں کہ ان سب کا تعلق صرف معانی قرآن کے ساتھ ہے جبکہ محض معانی قرآن کو حقیقی قرآن نہیں کہا جاتا کیوں کہ حقیقی قرآن صرف معانی سے نہیں بلکہ الفاظ ومعانی دونوں کے مجموعہ سے عبارت ہے، ایسے میں اِن میں سے کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس پر ترجمۃ القرآن صادق آسکے کیوں کہ ترجمۃ القرآن کا لفظ اپنے متعارف معنیٰ میں محض الفاظ قرآن سے متعلق ہے نہ صرف معانی قرآن سے بلکہ قرآن اور صرف قرآن سے متعلق اور اُس کی صفت ہے اور اِس کی جامع ومانع تعریف یہ ہے کہ یہ آیاتِ قرآنیہ کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنے سے عبارت ہے جو اصل کے قائم مقام ہوسکیں یعنی اُن کی جملہ لسانی حیثیات سے لے کر متعارف احوال تک سب کے مطابق ہو، ترجمۃ القرآن کی اِس تعریف کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اِس عمل میں آنے والوں سے غلطی کا امکان نہیں ہوتا بشرطیکہ دوسری تمام شرائط اور احتیاطی تقاضوں پر بھی پوری طرح اترتا ہو، نیز ترجمۃ القرآن کے سانچے اور اس کی شرائط اور احتیاطی تقاضوں کے حامل ہوئے بغیر اِس عمل میں آنے والوں سے معیاری ترجمہ ممکن نہ ہونے کی طرح صحیح وسقیم کی تمیز بھی ممکن نہیں ہے ورنہ ایسا ہی ہوگا جیسا ترجمۃ القرآن کو بے مصرف تقسیم کرنے والوں نے کیا ہے جبکہ ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع کے ساتھ اس کی شرائط کو پیشِ نظر رکھنا ایک ایسا معیار ممیز ہے جو صحیح وسقیم کی

---

(۱) الحسامی، بحث کتاب اللہ تعالیٰ۔

حدیں جدا کر دیتا ہے جس کے مطابق قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے چاہے دُنیا کی کسی بھی زبان میں ہو صرف ایک صورت ہے جسے بامحاورہ کہا جاسکتا ہے لیکن یہ بامحاورہ اُس معنی میں نہیں ہے جو برصغیر پاک و ہند کے کچھ حلقوں میں مشہور ہے جس میں قرآن شریف کے معانی کو اپنی سمجھ اور ترجیح کی بنا پر ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے مطابق پیش کیا جاتا ہے چاہے قرآن کے محاورہ سے خلاف ہی کیوں نہ ہو العیاذ باللہ نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع اور اُس کی شرائط کے مطابق وجود میں آنے والا بامحاورہ ترجمہ وہی کہلاتا ہے جو دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو جس میں صرف حیثیت کی تفریق ہوتی ہے کہ لسانِ قرآنی کا محاورہ من حیث الاصل والمتبوع ضروری ہوتا ہے جبکہ ترجمہ والی زبان کا محاورہ اُس کا تابع اور فرع ہونے کی حیثیت سے ضروری ہے۔ نیز ترجمہ سے مقصد کے حوالہ سے بھی ضروری ہے کہ اِس کے بغیر ترجمہ سے مقصد کا حصول ممکن نہیں ہے ورنہ کسی ایک سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی غلط ہوگا جس کی مکمل تفصیل اور مثالیں اِس کتاب کے باب اول میں ہم بیان کرآئے ہیں جنہیں سمجھنا اور پیشِ نظر رکھنا ترجمہ سے شغف رکھنے والے ہر شخص کی ضرورت ہے۔

غیر معیاری تراجم کا ایک اور فساد:۔

ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع اور شرائط کو پیشِ نظر رکھے بغیر لکھے گئے تراجم سے اور اُنہیں قرآن شریف کی خدمت و تبلیغ قرار دینے کی بے احتیاطی سے جیسے مذکورہ اشتباہات اور التباس الحق بالباطل کی مذکورہ صورتیں پیدا ہو رہی ہیں ویسے ہی ایک اور فساد بھی جنم پا رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ دیکھ کر قرآن شریف کے کچھ نادان دوست ترجمۃ القرآن کے جواز و امکان سے ہی انکار کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں جس کی ایک قبیح مثال اِس وقت ''منهاج الفرقان بين علم الله وعلم الانسان'' کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے جو ڈاکٹر برہان احمد فاروقی لاہوری اور اُس کے حلقہ اثر سے متاثر سکالرز (خضر یسین لاہوری، انجینئر محمد علی مخدوم اور انجینئر حافظ عمران

حسین) کے اشتراک عمل سے لکھی گئی ہے اور ان سب کی فکری کاوش کا ثمر ہے۔ جس کے پیشِ لفظ کے آغاز میں لکھا ہے:

''قرآن مجید کو انسانی استعداد کے زائیدہ متون کی طرح فرض کر لینے کا اثر یہ ہے کہ انسانیت کی ہدایت کے لیے متبادل متون وضع کر لیے گئے اور اُن سے حاصل ہونے والے نتائج قرآن مجید سے حاصل ہونے والی ہدایت کے نتائج فرض کر لیے گئے ہیں۔

اِس کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ قرآن مجید سے زندگی میں کسی تبدیلی کی توقع مذہبی ذہن میں مایوسی کی حد تک ناپید ہو گئی۔''

اِس کے بعد مقدمہ کے پہلے صفحہ پر لکھا ہے: ''قرآن مجید کا ترجمہ ہو یا ترجمانی وہ قرآن مجید کا متبادل ہی متصور ہو سکتے ہیں۔ بظاہر قرآن مجید کا ترجمہ یا ترجمانی شاید نقصان دہ شے معلوم نہ ہو، توجہ کرنے سے یہ سوال ضرور پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا کلام اللہ کا متبادل وضع کرنا ممکن ہے؟ کیا الوہی کلام کو انسانی کلام کی صورت دینا خود ایک مستقل ''مفسدہ'' نہیں ہے؟ یقیناً یہ ایک مستقل مفسدہ ہے۔ علت جو بھی ہو، الوہی کلام سے محرومی فی نفسہٖ انسانیت کا اتنا بڑا نقصان ہے کہ کوئی مصلحت بھی اس کا ازالہ نہیں کر سکتی۔''

اور اِس کے بعد صفحہ 11 پر لکھا ہے: ''الوہی کلام سے حاصل ہونے والی ہدایت قرآن مجید میں اس طرح پوشیدہ نہیں کہ جسے غور وفکر سے دریافت کرنا پڑے، قرآن مجید خود ہی ہدایت ہے۔ قرآن مجید کو ہدایت کا ماخذ قرار دینا گمراہی کا دروازہ کھولنا ہے۔ قرآن مجید الوہی ہدایت کا ماخذ نہیں بلکہ خود الوہی ہدایت ہے۔ انسان کا غور وفکر الوہی بیان کو محکوم نہیں بنا سکتا اور نہ ہی الوہی ہدایت کو اپنے غور وفکر سے دریافت کر سکتا ہے۔''

اِس کے بعد 135 صفحات پر مشتمل اِس کتاب کو پانچ ابواب پر تقسیم کر کے پہلے باب کے تحت صفحہ 22 پر لکھا ہے: ''قرآن مجید کا ترجمہ ممکن ہے نہ ترجمانی ممکن ہے۔ قرآن مجید کو الوہی کلام اور اس کی ممتاز ومنفرد ہیئت کو الوہی معانی کے بیان کے لیے ناگزیر نہ سمجھا جائے تو پھر اس کا

ترجمہ ہیئت سے محرومی کے ساتھ ممکن ہو جائے گا۔ ترجمہ یا ترجمانی کرنے والا غیر شعوری طور پر دراصل قرآن مجید کو محض ایک عربی متن خیال کرتا ہے اور اسے ان ''ناگزیر اوصاف'' کا حامل متن نہیں سمجھتا جن سے قرآن مجید کا الوہی کلام ہونا مشروط ہے۔ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے والا غیر شعوری طور پر ان منکرات کو قبول کرنے کے بعد ترجمے کی جسارت کرتا ہے۔ قرآن مجید کو قرآن مجید یا الوہی کلام ماننے اور اس کی کلامی ہیئت کا ادراک کر لینے کے بعد اس عظیم کلام کا متبادل بیان وضع کرنے یعنی ترجمہ کرنے کی جرات کوئی نہیں کر سکتا۔ یاد رکھیے متن کا ترجمہ اس کا ''متبادل متن'' ہوتا ہے اور قرآن مجید کا متبادل غیر شعوری حالت میں ہی وضع کیا جا سکتا ہے ورنہ اس کا دور دور تک کوئی امکان نہیں ہے۔''

یہ پانچ ابواب دراصل قرآن شریف کے ترجمہ و ترجمانی کے ناجائز و حرام اور فساد و ناممکن ہونے کے مدعا پر پانچ انداز استدلال ہیں جن میں سے ہر ایک کی شمشیر قرآن شریف کے ترجمہ و ترجمانی میں سے ہر ایک کی گردن اُڑا رہی ہے اور ہر ایک کو قرآن شریف کا متبادل و متقابل اور اُس کی تصغیر و تقصیر قرار دے کر فساد و حرام جیسی دفعات کا زیر بار کر رہی ہے۔ ہم کو اِس کے مصنفین کی نیت پر شک کرنے کے ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اِس انوکھے آوازہ کا پس منظر معلوم کر سکتے ہیں البتہ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ جرائتیں اور تبلیغ بالقرآن کی راہیں مسدود کرنے کی یہ حرکتیں قرآن شریف کے کیے گئے غلط تراجم کے تلخ نتائج ہیں کہ اِن حضرات نے ترجمۃ القرآن کی تعریف و غرض سے منعکس اور اس کی واجبی شرائط سے خلاف تراجم کو اور ایسے تراجم پر مبنی ترجمانی کو دیکھ کر اتنی بڑی جسارت پر اُتر آئے کہ جس سے ابلاغ القرآن کرنے والے اہل حق کی تذلیل لازم آ رہی ہے، ترجمۃ القرآن و ترجمانی ناجائز ہونے کے ساتھ تفسیر کی راہیں بھی مسدود ہو رہی ہیں اِس کے برعکس ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ''**منہاج الفرقان بین علم اللہ وعلم الانسان**'' کے مصنفین قرآن شریف کے غیر معیاری تراجم اور اُن پر بنا ہونے والی ترجمانی پر نظریں محدود کرنے کے بجائے اگر معیاری تراجم کا مطالعہ کرتے یا فنِ ترجمہ کی تعریف، غرض، موضوع کو پیشِ نظر رکھتے

یا کم از کم ترجمۃ القرآن کی تعریف وغرض کا تصور رکھتے تو کبھی ایسی جسارت نہ کرتے کیوں کہ ترجمۃ القرآن جو عبارت ہے قرآن شریف کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنے سے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں یعنی اُن کے متعارف احوال وصفات اور حیثیات کے مطابق ہوں جس میں مترجم کی ذمہ داری اور اُس کے اختیار میں ایسے الفاظ کا انتخاب کر کے اُن کی اجتماعی ہیئت کو متن قرآن کی متعارف اجتماعی ہیئت کے مطابق کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جبکہ معانی بعینہٖ وہی رہتے ہیں جو قرآن شریف کے اپنے ہیں ایسے میں ترجمہ کو قرآن شریف کا متبادل کلام قرار دینے کا کیا جواز باقی رہتا ہے جبکہ کلام کا تصور ہی بغیر معنی کے ممکن نہیں ہے۔ اِس اختراعی اصطلاح کے بجائے اسے اصل سے حکایت اور اُس کی نقل کہنا چاہئے اور اِس کے الفاظ کو اُس کے الفاظ سے متبادل کہنا ہوگا جبکہ متبادل کلام قرار دینے کی اجازت اُس کی تعریف نہیں دے رہی، نیز متبادل الفاظ میں اور متبادل کلام میں بڑا فرق ہے کہ متبادل کلام پر لفظ کلام اور جملہ کا صادق آنا ضروری ہے کیوں کہ وہ طلب اور خبر میں سے کسی ایک کے افادہ سے خالی نہیں ہوتا جبکہ تبادلہ الفاظ میں ایسا ہونا ضروری نہیں ہے جبکہ ترجمۃ القرآن کی تعریف میں تبادلہ الفاظ کا ذکر ہے، تبادلہ کلام کا ہرگز نہیں ایسے میں ''منہاج الفرقان بین علم اللہ وعلم الانسان'' کے مصنفین کا یہ کہنا کہ ''قرآن مجید کا ترجمہ ہو یا ترجمانی وہ قرآن مجید کا متبادل ہی متصور ہو سکتے ہیں بظاہر قرآن مجید کا ترجمہ یا ترجمانی شاید نقصان دہ معلوم نہ ہو توجہ کرنے سے یہ سوال ضرور پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا کلام اللہ کا متبادل وضع کرنا ممکن ہے؟ کیا اُلوہی کلام کو انسانی کلام کی صورت دینا خود ایک مستقل مفسدہ نہیں ہے؟ یقیناً یہ ایک مستقل مفسدہ ہے علت جو بھی ہو اُلوہی کلام سے محرومی فی نفسہ انسانیت کا اتنا بڑا نقصان ہے کہ کوئی مصلحت بھی اُس کا ازالہ نہیں کر سکتی'' بے مصرف نہیں تو اور کیا ہے اِس کا مصرف وجواز تب ہی ہوتا جب ترجمہ سے کلام الٰہی کے معنی میں تبدیلی آتی جیسا غیر معیاری ترجموں میں ہوتا ہے، یا اُس کی جگہ محض ترجمہ کو کلام الٰہی قرار دیا جاتا جیسا یہود ونصاریٰ کے ناقص مشائخ وعلماءِ سوٗ کے ہاتھوں تورات وانجیل کے کیے گئے ترجموں میں ہوا ہے کہ اصل کلام اللہ کے بغیر اُس کے حسبِ منشاء ترجمہ وترجمانی کو کلام

اللہ قرار دے کر خلقِ خدا کے لیے اشتباہ پیدا کیا گیا ہے جبکہ اسلام اصل قرآن کے بغیر محض ترجمہ شائع کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا جب اصل قرآن خطابی ترجمہ کی صورت میں قبل الترجمہ اور کتابی ترجمہ کی صورت میں فوق الترجمہ موجود ہے اور ترجمہ میں اُس کے کسی لفظ کے معنی کو بدلا گیا ہے نہ اجتماعی نوعیت کی معنویت میں کوئی تبدیلی کی گئی ہے تو پھر ترجمہ کو اُس کے متبادل کلام قرار دینے کا کیا جواز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''منهاج الفرقان بين علم الله وعلم الانسان'' کے مصنفین نے اِس پوری تحریر میں قرآن شریف کے ترجمہ وترجمانی پر جتنے دفعات بھی لگائے ہیں اور جن زاویوں سے بھی اِن کے ناجائز وفساد ہونے کی کوششیں کی ہیں اُن سب کی عمارت اِسی ایک بنیاد پر قائم ہے کہ ترجمانی وترجمۃ القرآن کلام اللہ کے متبادل کلام ہیں، انسانی ذہن کے زائیدہ متن ومضامین ہیں اور کلامِ الٰہی کے معانی کا انتقال نہیں بلکہ انسانی علم ہیں جو علم الٰہی اور کلام الٰہی کے متبادل ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ فنِ ترجمہ اور خاص کر ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع سے غفلت کا نتیجہ ہے اور ترجمۃ القرآن کی شرائط سے بے توجہی کا ثمر ہے اِس لیے ہم اُن سے یہی کہیں گے کہ ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے اِن اُمور پر غور کریں اِس طرح بناء الغلط علی الغلط کی اِس بیماری سے آپ ہی شفا نصیب ہوگی ورنہ ترجمۃ القرآن کی حقیقت تک پہنچے بغیر اور اُس سے غرض وموضوع کو پیشِ نظر رکھے بغیر اِس میں گفتگو کرنے کا نتیجہ ایسا ہی ہوگا جو اِن حضرات کی تحریر میں دیکھنے کو مل رہا ہے۔

یہی حال مصنّفین کے دوسرے کلام ''قرآن مجید کا ترجمہ یا ترجمانی کلام اللہ ہونے کے بجائے انسانی کلام ہے جو اُلوہی ہدایت کی حامل ہے نہ متحمل ہے، انسانی کلام میں قرآن مجید کے معنی کی تفہیم ممکن نہیں ہے، اُلوہی اظہار بیان کو قرآن مجید نے انسان کے لیے چیلنج کے طور پر پیش کیا ہے اگر قرآن مجید کے معانی کا ابلاغ اُلوہی اظہارو بیان کے علاوہ میں ممکن ہوتا تو قرآن مجید اسے کبھی چیلنج بنا کر پیش نہ کرتا۔'' اِس کا وار بھی صرف اُن حضرات پر ہوسکتا ہے جو ترجمۃ القرآن کو کبھی تحت اللفظ ترجمہ اور بامحاورہ ترجمہ کی طرف تقسیم کرتے ہیں اور کبھی لفظی ترجمہ اور بامحاورہ ترجمہ کو ایک دوسرے کے مدمقابل قرار دے کر تقسیم کرتے ہیں اور کبھی تفسیری ترجمہ اور معانی قرآن کا ترجمہ جیسی

بے حقیقت بولیاں بولتے ہیں جیسا برصغیر پاک وہند کے بعض علمی حلقوں میں مشہور ہے جس کے پسِ منظر سے پردہ اُٹھانے کے ساتھ حقیقت سے دوری کی تفصیل بھی اِس تحریر کے گزشتہ صفحات میں ہم بیان کرچکے ہیں، جسے سمجھنے میں اِس مرض کا شافی علاج ہے۔

اِسی طرح مصنفِ مباحث فی علوم القرآن کے موقف پربھی اِس کا وار ہوسکتا ہے جس نے ترجمۃ القرآن کی حقیقت پرنظر رکھے بغیر اور واجبی شرائط کو خاطر میں لائے بغیر ترجمۃ القرآن کو''الترجمة الحرفيه ''اور'' الترجمة المعنوية '' کی طرف خودساختہ تقسیم کیا ہے بعدازاں''الترجمة الحرفيه''کو حرام وممنوع قرار دینے کے ساتھ''الترجمۃ المعنویۃ''پربھی فساد کی دفعہ لگائی ہے اس کے بعد لکھاہے:

''ويحق لنا ان نقول ان علماء الاسلام اذاقاموا بتفسير القرآن يُتَوَّخَيٰ فيه اداء المعنى القريب الميسور الراجح ثم يترجم لهذاالتفسير بامانة وبراعة فان هٰذا يقال فيه ترجمة تفسير القرآن او ترجمة تفسيرية بمعنى شرح الكلام وبيان معناه بلغة أُخرى''(۱)

ظاہر ہے کہ مدیرالمعہد للقضاۃ فی الریاض السعودیہ کے اِس موقف کا ترجمۃ القرآن کی حقیقت اوراس کی تعریف کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہے گزشتہ سطور میں ہم بیان کرآئے ہیں کہ مصنف مباحث فی علوم القرآن ترجمہ کی تعریف سے ہٹ کر اِس میں گفتگو کرتے ہیں اورانجام کار ترجمۃ القرآن کی حقیقت ترجمۃ معانی القرآن بتاتے ہیں یا قرآن شریف کی من پسند تفسیر کے ترجمہ کو ترجمۃ القرآن قرار دینے کی غلطی کرتے ہیں۔(لاحول ولا قوة الابالله)

ایسے میں''منهاج الفرقان بين علم الله وعلم الانسان ''کے مصنفین کی طرف سے اُٹھائے گئے جملہ اعتراضات والزامات کا مورد بھی ان حضرات اور اِن کے اِس عمل کے سواکوئی اور نہیں ہے جبکہ ترجمۃ القرآن کی حقیقت اور اِس سے متعلق اُمورثلاثہ کے سانچے میں فِٹ ہونے

(۱) مباحث في علوم القرآن،ص:288،مطبوعه كتب خانه رشيديه پشاور۔

کے ساتھ شرائط کے مطابق وجود میں آنے والے تراجم اِن سے بری الذمہ ہیں اِسی طرح صحیح ترجمہ پر بنا ہونے والی ترجمانی اور تفسیر بھی اِس قسم کے اعتراضات سے پاک اور الزامات سے محفوظ ہو سکتے ہیں لیکن ''منھاج الفرقان بین علم اللہ وعلم الانسان'' کے مصنّفین کی ٹیم پر افسوس کہ اُنہوں نے سب کو ایک نظر سے دیکھا اِس پر مستزاد یہ کہ ہر دو فریق بنیادی غلطی میں شریک ہیں وہ ہے ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع سے بے التفاتی اور شرائط سے غفلت ورنہ فریق اول یعنی برصغیر پاک وہند کے معدودے چند علماء سمیت مباحث فی علوم القرآن کے سعودی مصنف ''المناع القطان'' اگر ترجمۃ القرآن سے متعلق اُمورِ ثلاثہ اور شرائط کو پیشِ نظر رکھتے مذکورہ بے اعتدالیوں کا ارتکاب کبھی نہ کرتے اِسی طرح ''منھاج الفرقان بین علم اللہ وعلم الانسان'' کے مصنّفین کی ٹیم اگر مذکورہ اُمور کے ساتھ ترجمۃ القرآن کی شرائط کو ملحوظ خاطر رکھتے تو ترجمۃ القرآن کو قرآن شریف کے متبادل کلام قرار دینے کی جسارت کرتے نہ ترجمانی کو بلکہ یہ دونوں فریق اگر صرف ترجمۃ القرآن سے غرض وغایت یعنی مقصدِ ترجمہ کو ہی پیشِ نظر رکھتے پھر بھی ایسی غلطیاں نہ کرتے کیوں کہ وہ سمجھتے کہ قرآن شریف کا ترجمہ کرنے سے مقصد اُس کے اصل معانی سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے یعنی اُن معانی ومفاہیم سے جو جمہور الناس کے عقیدہ وعمل سے متعلق ہیں جن میں عرب وعجم کی تفریق ہے نہ مختلف زبان اور متفرق رنگ ونسل والوں کی۔ قرآن شریف سے مفہوم اول کہلانے والے یہ وہ معانی ومقاصد ہیں جنہیں اہل عرب محض سننے اور پڑھنے سے ہی سمجھ جاتے ہیں جبکہ اہل عجم فنون آلیہ لفہم القرآن اور علوم خادمہ للقرآن کے واسطہ سے سمجھتے ہیں جبکہ مفہوم ثانی کہلانے والے وہ معانی اور وہ رموز ومعارف جو نظم قرآن کے تہ در تہ میں مضمر ہیں اور جمہور الناس کی فہم وادراک سے ماوراء ہیں نیز اعجاز بیان اور تلاوت کا عبادت ہونے جیسے وہ ناگزیر وامتیازی اوصاف جن کا قرآن شریف کے سوا کسی انسانی کلام میں پایا جانا ممکن نہیں ہے اِن کے ساتھ ترجمۃ القرآن سے غرض وغایت کا قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے ہم ایمانی وثوق اور کامل یقین کے ساتھ یہ لکھ رہے ہیں کہ ترجمۃ القرآن سے مقصد کی اِن حدود کو سمجھنے والوں سے وہ غلطیاں

ہرگز نہیں ہوسکتیں جو مذکورہ دونوں فریقوں سے ہوئی ہیں باقی رہی "منہاج الفرقان بین علم اللہ وعلم الانسان" کے مصنفین کی وہ باتیں مثلاً لکھا ہے ("قرآن شریف علم ہے مآخذ علم نہیں۔" اور لکھا ہے "قرآن مجید کو ہدایت کا مآخذ قرار دینا گمراہی کا دروازہ کھولنا ہے، قرآن مجید اُلوہی ہدایت کا مآخذ نہیں بلکہ خود اُلوہی ہدایت ہے" اور لکھا ہے "نزول وحی کے ذریعہ سے علم اللہ انسان کا علم بن جاتا ہے یہ ایسا علم ہے جسے انسان اپنے معمول کے قوائے علمیہ سے حاصل کرسکتا ہے اور نہ معمول کی قویٰ سے اِس کی تصدیق کرسکتا ہے علم اللہ انسان کا جب بھی علم بنے گا وہ ایمانی علم ہوگا علمی ایمان ہرگز نہیں ہوگا۔")

کتاب کے پانچوں ابواب میں پھیلے ہوئے اِس قسم کے تمام جملوں کی حیثیت خیالی تصورات سے مختلف نہیں ہیں جن کا ربط علمی دنیا سے ہے نہ عملی ذمہ داری سے نیم خواندہ حضرات کا اِن سے مضطرب یا متحیر ہونا اُن کی علمی پسماندگی کا نتیجہ ہے جبکہ اہل بصیرت انہیں مجنون کے بَڑ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے۔ الٰہیات کے حوالہ سے علم کے متلاشیوں کا وقت ضائع کرنے میں اِن کی ایسی مثال ہے جیسا منطقی مسائل سے متعلق دُنیا کو مغالطہ دینے والوں نے کہا ہے "اول الفکرۃ آخر العمل واول العمل آخر الفکرۃ" جو واقفِ حال حضرات کے نزدیک آسان مسئلہ کو جان بوجھ کر معمہ بنانے کی غلطی سے خالی نہیں ہے جبکہ نیم خواندہ دُنیا کے لیے ضیاعِ وقت کا سامان ہے۔ (وَاللہُ الھَادِی اِلٰی سَبِیْلِ الرشادِ)

چوتھی بحث:۔ جو خالصتاً ترجمۃ القرآن سے متعلق ہے جسے اِس کتاب کی روح اور اصل مقصد کہا جاسکتا ہے گویا بابِ اول جو فنِ ترجمہ سے متعلق ہے اِس کے لیے بمنزلہ تمہید تھا ہر شخص سمجھتا ہے کہ فنِ ترجمہ کے اصول وضوابط اور شرائط سے خلاف ہونے والا ترجمہ چاہے جس کتاب کا بھی ہو معیاری ترجمہ نہیں کہلاتا اِسی طرح ترجمہ کی حقیقت یعنی اِس کی تعریف اور غرض سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی غلط ہوتا ہے چہ جائیکہ قرآن شریف کے کسی ایسے ترجمہ کو اُس کے مطابق اور معیاری کہا جاسکے

نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کلام اللہ ہونے کی وجہ سے اِس کے ترجمہ کی غلطی کسی دوسری کتاب کے غلط ترجمہ کی طرح محدود قبائح ونقصانات کی حامل نہیں ہوتی بلکہ اِس میں قدرے بے اعتدالی اور کسی ایک شرط سے خلاف ورزی بھی لامحدود غلطیوں پر منتج ہوسکتی ہے جس پر بِنا ہونے والی تفسیر درست ہوسکتی ہے نہ تاویل اور نہ عقیدہ وعمل۔ اِس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ چاہے دنیا کی جس زبان میں بھی کیا جائے وہ صرف اتنا نہیں ہے کہ اُس کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جائے جو اصل کے قائم مقام ہوں بلکہ اِس عمل میں کلام اللہ کی عظمت کے ساتھ اس کے نظم یعنی الفاظ کی ترتیب کو ملحوظِ خاطر رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے اور ترجمہ کے محاورہ کو اُس کے محاورہ کے مطابق کرنے کے ساتھ ایجاز واختصار کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے اور خطاب اللہ مع الرسول سے متعلق اسلامی تعلیمات کو مدنظر رکھنے کے ساتھ خطاب الرسول مع اللہ کے تقاضوں کو ذہن مین متحضر رکھنا بھی ناگزیر ہوتا ہے اسی طرح خطاب الخاص مراد عام کے انداز ادا کا حق نبھانے کے ساتھ خطاب العام مراد خاص کے انداز ادا کا حق پورا کرنا بھی ضروری ہوتا ہے نہ صرف اتنا بلکہ نظم قرآن کی لپیٹ میں پوشیدہ رموز واسرار اور ختم نہ ہونے والے علوم ومعارف کی اہمیت کو نہ بھولنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ترجمہ کا براہِ راست تعلق اُن معارف کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ ترجمۃ القرآن سے غرض وغایت اور بنیادی مقصد اُس کے الفاظ سے معلوم ہونے والے اُن معانی ومقاصد کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جنہیں مفہوم اول کہا جاتا ہے جنہیں اہل لسان یعنی اہل عرب محض سننے اور پڑھنے کے ساتھ ہی سمجھ جاتے ہیں اور اہل عجم اُن علوم وفنون کے واسطہ سے سمجھ لیتے ہیں جنہیں علوم آلیہ لفہم القرآن کہا جاتا ہے اِس کے باوجود ترجمہ میں ایسے الفاظ استعمال کرنا یا ایسا انداز اختیار کرنا جائز نہیں ہوسکتا جو اُن کے منافی ہو۔ ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے یہ وہ اُمور ہیں جن کے پیشِ نظر اِسے عام ترجمہ اور کسی بھی کتاب کے ترجمہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اِس میں ترجمہ کے عمومی اُصول وضوابط اور عام شرائط پر اکتفا کیا جاسکتا ہے بلکہ

اِس کے احتیاطی تقاضوں کی وجہ سے مترجم کی ذمہ داریوں کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ فنِ ترجمہ کے عمومی اُصول وضوابط میں اشتراک کے بعد یہ کچھ اضافی اور مخصوص شرائط کا بھی مقتضی ہے اِس بحث میں اُن کی تفصیل کا اہتمام کیا جاتا ہے، اِس سلسلہ میں اصل بات یہ ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ اہل عجم کو اِس کے ابلاغ کا حصہ ہے جسے تذکیر بالقرآن اور تبلیغ بالقرآن بھی کہا جاتا ہے عام حالات میں اِس کی شرعی حیثیت فرضِ کفایہ کی ہے جبکہ مخصوص حالات میں فرض عین بھی بن جاتا ہے بہر حال اِس کے جواز کے لیے صحت اولین شرط ہے یعنی قرآن شریف کے غلط ترجمہ کو جائز کہا جاسکتا ہے نہ اِس کی اجازت دی جاسکتی ہے اور اِس کی صحت کے لیے بنیادی شرط صرف ایک ہے وہ ہے اِس کی جامع و مانع تعریف کے مطابق ہونا اور اِس کی تعریف ہے ''ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التی تقوم مقامها ''یعنی قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہوسکیں جبکہ اِس کے مطابق ہونے کے لیے ترجمہ کے عمومی شرائط سے اضافی اور مخصوص شرائط ناگزیر ہیں۔ جن کی تعداد درج ذیل ہیں:

1. فن ترجمہ کے فطری اُصولوں کی پابندی۔
2. ترجمہ کی عمومی شرائط کی پابندی۔
3. جسب المواقع ترتیب متن کی پابندی۔
4. قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم وفنون کے متعارف اُصول وضوابط کی پابندی کہ اُن سے خلاف نہ ہو۔
5. عظمتِ شانِ الٰہی اور آدابِ شانِ نبوت سے متعلق اسلامی تعلیمات کی پابندی۔
6. ترجمہ کیے جانے والی آیات کے ایجاز واختصار کی پابندی کہ ترجمہ بلا ضرورت طویل نہ ہو۔
7. ترجمہ کیے جانے والی آیات کے سیاق وسباق اور مافیہ الکلام کی پابندی۔
8. آیت کریمہ کی لُغوی صفات کی تمیز کرنا کہ خاص ہے یا عام۔ مشترکہ ہے یا مؤول، ظاہر ہے یا

نص، مفسر ہے یا محکم وغیرہ نیز معنوی صفات کہ عبارۃ النص ہے یا اشارۃ النص دلالۃ النص ہے یا مقتضاء النص۔

9 تفسیر قرآنی، تفسیر نبوی اور اسلاف کی تفسیر کو پیشِ نظر رکھنا۔

10 متنِ قرآن کے کسی لفظ کو چھوڑنے سے اور اُس کے الفاظ سے بلاضرورتِ داعیہ اضافہ کرنے سے اجتناب کرنا۔

11 ترجمہ کے لیے استعمال کیے جانے والے الفاظ کا اور اُن کی ترتیب و انداز کا فصیح ہونا۔

12 نیت کا خالص ہونا۔

13 ہر قسم کے تعصب اور ذہنی ترجیح سے دل و دماغ کا پاک ہونا۔

14 عرفان نصیبی و توفیق الٰہی۔

مخصوص شرائط کی تفصیل اور فلسفہ:۔

1 فنِ ترجمہ کے عمومی اُصولوں کی پابندی اِس لیے ضروری ہے کہ ترجمۃ القرآن فن ترجمہ کے ماتحت خاص صنف ہے جبکہ عام کے ہر ضابطہ و اُصول کا ثبوت ہر خاص کے لیے ضروری ہوتا ہے ایسا ہی جیسا فلسفہ کے حصہ منطق میں کہا جاتا ہے ''کل ماھو مقوم العالی مقوم للسافل'' جس کے مطابق یہاں پر یوں کہا جاسکتا ہے ''کل ماھو مصحح العام مصحح للخاص'' مثال کے طور پر فن ترجمہ کے اُصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ متن کے جس لفظ کے دو ایسے مفہوم ہوں کہ دونوں متکلم کی مراد کے طور پر درست ہوں کہ ایک سے بھی انکار کی گنجائش نہ ہو اور ترجمہ والی زبان میں ہر ایک کے انفرادی اعتبار سے ترجمہ کے لیے الفاظ میسر ہوں لیکن دونوں کو یکساں شامل ہونے کے قابل لفظ ناپید ہو ایسی تمام صورتوں میں ایک کا ترجمہ تسلسل میں لے کر دوسرے کو بریکٹ میں کیا جاتا ہے مثال کے طور پر سورۃ البقرہ، 282 کے حصہ ''وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ'' کے ترجمہ میں ''اور ضرر نہ دے لکھنے والا اور نہ گواہ (یا ضرر نہ دیا جائے لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو)'' اِس کی پابندی اِس لیے ضروری ہے کہ اگر ایسا نہ کرے گا دو صورتوں سے خالی نہ ہوگا:

پہلی صورت:۔ ایک کے ترجمہ پر اکتفا کرے گا۔

دوسری صورت:۔ دونوں کا ترجمہ تسلسل میں کرے گا۔

جبکہ یہ دونوں غلط ہیں کیوں کہ ترجمہ کی تعریف سے ہی خلاف ہیں کیوں کہ ترجمہ کی تعریف ہے ''**ابدال لفظة بلفظة تقوم مقامها** ''یعنی اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا جو اُن کے قائم مقام یعنی اُن کے تمام متعارف حیثیات کے مطابق ہوں۔(۱)

ظاہر ہے کہ اول صورت میں ترجمہ والا لفظ دوسرے مفہوم کو شامل نہ ہونے کی وجہ سے اصل کے قائم مقام ہونے کا قابل نہیں ہے جبکہ دوسرے میں ہر مفہوم کے لیے جدا جدا الفاظ ہونے کی وجہ سے اُس کے قائم مقام اور اُس کی جامعیت کے مطابق نہیں ہے تو پھر قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے ایسے عمومی اُصولوں کی پابندی کو ناگزیر شرط کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔

❷ **ترجمہ کی عمومی** شرائط کی اجتمائی پابندی کا بھی تقریباً یہی فلسفہ ہے جو عمومی اُصولوں سے متعلق ابھی ہم نے بیان کیا فرق صرف اتنا ہے کہ وہیں پر ضابطہ کلیہ ''**کل اصول ضروری لصحة الترجمة العامة ضروری لصحة ترجمة القرآن** ''کے انداز پر تھا جبکہ یہاں پر''**کل ما هو شرط لصحة الترجمة العامة شرط لصحة ترجمة القرآن** ''کے انداز پر ہے جبکہ اُصول وضوابط اور شرط کے مابین فرق اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے ایسے میں اِس کتاب کے باب اول میں عام ترجمہ کے صحت کے لیے جتنی شرائط اور اُن کی جتنی مثالیں بیان ہو چکیں ہیں اُن سب کو یہاں پر بھی پیشِ نظر رکھا جائے۔

❸ **حسب المواقع** آیات قرآنیہ کی ترتیب کے مطابق کرنا اِس لیے ناگزیر ہے کہ بغیر کسی ناگزیر ضرورتِ داعیہ یا جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اُس کی تنگیِ دامن کے بغیر ترجمہ کو اصل کی ترتیب کے خلاف کرنا جائز نہیں ہو سکتا ورنہ بلاغت کے حوالہ سے آیت کریمہ کے معنوی حسن اور ترتیب

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج:1، ص:111، مطبوعه الحجازی بالقاهره۔

سے متعلقہ مقاصد کا اظہار ترجمہ میں ممکن نہیں رہے گا۔اِس لیے کہ آیاتِ قرآنیہ کی ترتیب میں فصاحت و بلاغت کو سب سے بڑا دخل ہے۔ جب آیت کریمہ کی ترتیب سے خلاف کی جانے والی تفسیر بھی معیاری نہیں ہوتی تو پھر متن کی ترتیب سے خلاف ترجمہ کے معیاری ہونے کا تصور ہی نہیں رہتا کیوں کہ تفسیر کے مقابلہ میں ترجمہ کا معاملہ زیادہ مشکل اور زیادہ قابلِ احتیاط ہوتا ہے اُصولِ تفسیر میں ترتیبِ متن کی مطابقت کو ضروری قرار دیا گیا ہے جیسا الاتقان فی علوم القرآن کے الفاظ''وَمراعاة التَالِیف''سے واضح ہے۔(۱)

اِس شرط کی خلاف ورزی کی مثالوں میں''بِسمِ اللّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ''شریف کا کیا گیا مندرجہ ذیل ترجمہ دیکھا جا سکتا ہے''شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے''جس میں متن کی ترتیب سے خلاف کر کے لفظ''اِسم''یعنی اسم اللہ کے مفہوم کو آخر میں رکھا گیا ہے جو کئی وجوہ سے غلط،خلاف الاصل اور متن کی بلاغی حیثیت کے منافی ہے جو کسی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جو''بِسمِ اللّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ''شریف کی بلاغی حیثیت کے ساتھ اُس کی عرفانی اور واقعی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کی اِس بے ڈھنگی کیفیت کا جائزہ لے۔

۲ قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم وفنون کی پابندی ناگزیر ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ اِس کے بغیر ترجمہ کا اصل کے مطابق ہونا ممکن نہیں ہے جیسا آگے بیان ہونے والی تفصیل سے واضح ہو جائے گا۔(انشاءاللہ تعالیٰ) اِس شرط کے مندرجہ ذیل حصے ہیں؛

(i) آیت کریمہ کی صرفی حیثیت ملحوظ رکھنا یعنی متن اگر اسم ہو ترجمہ بھی اسم کے انداز میں کیا جائے ورنہ فعل کا ترجمہ اِسم میں اور اِسم کا ترجمہ فعل میں کرنے سے اصل کا مفہوم بدل سکتا ہے۔اِسی طرح مفرد متن کا ترجمہ مفرد میں اور تثنیہ یا جمع والے متن کا ترجمہ تثنیہ وجمع کے انداز میں کیا جائے۔مذکر کا ترجمہ مذکر میں اور مؤنث کا ترجمہ مؤنث میں،فعلِ معلوم کا معلوم کے انداز میں اور مجہول کا ترجمہ بھی مجہول کے انداز میں کیا جائے ورنہ برعکس ہونیکی صورت میں ترجمہ کو اصل کے مطابق نہیں کہا

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن،ج:2،ص:185،مطبوعہ حجازی بالقاہرہ۔

جاسکتا مگر ترجمہ والی زبان کی طرف سے واضح مجبوری اور تنگی دامن کا عارضہ ہو لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ جیسا تفسیر اتقان کے الفاظ "قَالَ العلماء یَجِبُ عَلَی الْمُفَسِّرِ اَن یَتحرّٰی فِی التَّفْسِیْرِ مُطَابَقَةَ المُفَسَّرِ" سے واضح ہے۔(۱)

اِس کی خلاف ورزی کی مثال سمجھنے کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۷ "وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ" کے کیے گئے تراجم کے اِس نمونہ کو دیکھا جاسکتا ہے "اور چھوڑا اُن کو اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے" جس میں متن کے لفظ مؤنث "ظُلُمٰتٍ" جو "ظلمة" کی جمع اور مؤنث ہے کے ترجمہ میں "اندھیریوں میں" کہنے کے بجائے اندھیروں میں کہہ کر متن کی لسانی حیثیت سے خلاف کیا گیا ہے۔ اِسی طرح آیت کریمہ "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" (۲) کا کیا گیا یہ ترجمہ "ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب" جس میں ترجمہ والی زبان کی طرف سے کسی مجبوری کے بغیر متن کے اِسم فاعل لفظ "جَاعِلٌ" کا ترجمہ مستقبل میں کرنے کی غلطی کی گئی ہے جس کا منشاء شاید یہ ہو کہ مترجم نے اِسم فاعل کو یہاں پر عامل بنانے کی غرض سے اُس کے مفہوم کو مستقبل کی طرف موڑا ہو حالانکہ صفتِ الٰہی ہونے کے ناطے یہاں پر اِس قیاس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ جو کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جس کی اللہ تعالیٰ کی صفاتِ فعلیہ پر نظر ہو۔ ایک اور حیثیت سے اِس کی مخالفت کی مثال کے لیے آیت کریمہ "شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ" (۳) کے مندرجہ ذیل تراجم کو بھی دیکھا جاسکتا ہے (خود اللہ اِس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ گواہ ہے کہ کوئی عبادت کے قابل نہیں اُس کے سوا، اللہ کی گواہی ہے کہ کوئی معبود نہیں بجز اُس کے) یہ تراجم بالترتیب ڈپٹی نذیر احمد، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی اور عبدالماجد دریا آبادی نے کیے ہیں اور سب غلط ہیں کیوں کہ آیت کریمہ میں لفظ "شَهِدَ" علم تصریف کے

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:185، مطبوعہ حجازی بالقاھرہ۔

(۲) البقرۃ:30۔

(۳) آلِ عمران:18۔

مطابق ماضی کا صیغہ ہے جبکہ تراجم کا مذکورہ انداز اُس کے مطابق نہیں ہے کہ اول الذکر میں ترجمہ کے طور پر اُس کی جگہ ''گواہی دیتا ہے'' کہا گیا ہے جو اُس کا نہیں بلکہ لفظ ''اللہ یشھد'' کا ترجمہ ہے۔ اِسی طرح دوسرے میں ''اللہ گواہ ہے'' کہا گیا ہے جو اُس کا نہیں بلکہ لفظ ''اللّٰہُ شَھِید'' کا ترجمہ ہے جو آیت کریمہ میں نہیں ہے اِسی طرح آخر الذکر میں ''اللہ کی گواہی ہے'' کہا گیا ہے جو اُس کا نہیں بلکہ لفظ ''شھادۃ اللّٰہ'' کا ترجمہ ہے جو آیت کریمہ کا حصہ ہی نہیں ہے ایسے میں اِن میں سے کس کو آیت کریمہ کی صرفی حیثیت کے مطابق کہا جائے ظاہر ہے کہ ایک کو بھی نہیں مترجمین پر افسوس کہ یہ سب کچھ لکھتے وقت اتنا بھی نہیں سوچا کہ یہاں پر لفظ ''شَھِدَ اللّٰہُ'' کی جگہ لفظ ''اللہ شھید، شھادۃ اللہ'' جیسے کسی بھی لفظ کو استعمال کرنا جب مناسب نہیں تھا تو پھر اُس کے ترجمہ میں ایسے انداز اختیار کرنے کا کیا جواز ہے۔

نیز اصل سے عدول کرنے کے لیے ترجمہ والی زبان کی طرف سے بھی یہاں پر کوئی عارضہ یا کوئی لسانی مجبوری بھی موجود نہیں ہے بلکہ اصل کے مطابق ترجمہ ''اللہ نے گواہی دی کہ اُس کے سوا لائق عبادت کوئی اور نہیں، اللہ نے گواہی دی کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں'' جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا ہے تو پھر اصل سے خلاف کرنے کا کیا جواز ہے۔ ایک اور حیثیت سے مخالفت کی مثال کے لیے آیت کریمہ ''زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا'' (۱) کے کیے گئے درج ذیل تراجم دیکھے جاسکتے ہیں ''فریفتہ کیا ہے کافروں کو دنیا کی زندگی پر، دنیوی معاش کفار کو آراستہ پیراستہ معلوم ہوتی ہے، کافروں کو دنیا کی زندگی بھلی معلوم ہوتی ہے'' یہ تراجم بالترتیب مولانا محمود الحسن اور اشرف علی تھانوی اور مولانا وحید الزمان نے کیے ہیں اور سب غلط ہیں کیوں کہ آیت کریمہ کی صرفی حیثیت سے خلاف ہیں اِس کی تفصیل اِس طرح ہے کہ آیت کریمہ میں لفظ ''زُیِّنَ'' فعل مجہول ہے اور لفظ ''اَلْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا'' اُس کے لیے قائم مقام فاعل ہے جبکہ اول الذکر ترجمہ میں فعل مجہول کا ذکر ہے نہ اُس کے قائم مقام فاعل کا جیسا اِس کے انداز ''فریفتہ کیا ہے کافروں کو دنیا کی زندگی پر'' سے

---

(۱) البقرۃ:212۔

ظاہر ہے تو پھر اصل کے مطابق کیوں کہلائے۔ اِسی طرح آخر الذکر دونوں بھی دو وجہ سے اُس سے خلاف ہے:

پہلی وجہ:۔ وہ ماضی ہے یہ ماضی نہیں بلکہ حال کا انداز ہے۔

دوسری وجہ:۔ وہ مجہول ہے جبکہ اِن کا انداز معلوم کا ہے مجہول کا نہیں تو پھر اُس کے مطابق کیوں کہلائے۔

(ii) آیت کریمہ کی نحوی حیثیت ملحوظ خاطر رکھنا یعنی مرکّب تام اور جملہ کا ترجمہ بھی جملہ میں اور مفرد کا ترجمہ بھی مفرد میں، اِسم موصول کا ترجمہ بھی موصول کے انداز پر اور اِسم موصوف کا ترجمہ بھی موصوف کے انداز پر، علی ہٰذا القیاس ترجمہ کا آیت کریمہ کی نحوی حیثیت کے مطابق ہونا ضروری ہے ورنہ غلط ہوگا۔

اِس کی خلاف ورزی پر مشتمل غلط تراجم کی سینکڑوں مثالوں میں سے درج ذیل کو دیکھا جاسکتا ہے جو سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ '' کے ترجمہ میں کیا گیا ہے ''سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کی پرورش فرمانے والا ہے ۝ نہایت مہربان بہت رحم فرمانے والا ہے ۝ روز جزا کا مالک ہے'' یہ ترجمہ محض اِس وجہ سے غلط ہے کہ آیت کریمہ کی نحوی حیثیت سے خلاف ہے کیونکہ نحوی اُصولوں کے مطابق متن کی اِن تینوں آیات کا مجموعہ صرف ایک جملہ ہے اِس تفصیل کے ساتھ کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' میں مذکور اِسم جلالت موصوف ہے جس کے بعد چاروں الفاظ بالترتیب اُس کی صفات ہیں اور موصوف اپنی اِن چاروں صفات کے ساتھ مل کر مجرور ہے حرف جار ''ل'' کے لیے جبکہ جار اپنے مجرور سے مل کر باعتبار متعلق خبر ہے ''اَلْحَمْدُ'' کے لیے اور مبتداء وخبر مل کر جملہ اسمیہ لفظاً اور انشائیہ معناً قرار پاتا ہے جس میں نُحاۃ کی دو رائے ہیں نہ مفسرین کی۔

اِس کے مطابق درست ترجمہ یوں ہوسکتا ہے ''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو مالک سارے جہاں والوں کا ۝ بہت مہربان رحمت والا ۝ روز جزا کا مالک'' جس سے بے اعتنائی کرتے ہوئے مترجمین نے ''رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ، رَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ '' جیسے اوصاف مفردہ کا ترجمہ بھی جملہ میں کر دیا جسے سننے کے لیے سیبویہ تیار ہے نہ عبدالرحمٰن جامی، امام تفتازانی اِسے گوارا کرتا ہے نہ عبدالقاہر جرجانی۔

علم نحو کے حوالہ سے اِس اجمال کے بعد یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ لامحدود علم ہے جس کے دائرہ وسعت کو سمجھنے کے لیے امام الزجاج سے منقول مشہور قول کافی ہے اُنہوں نے کہا ہے ''اموت وفی قلبی من حتّٰی شیء ''یعنی مرتے دم تک میرے دل میں حرف (حتّٰی) سے متعلق شک رہے گا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کی شاخوں کی کوئی نہایت ہی نہیں ہے جن میں سے مشتے نمونہ ازخروارے درج ذیل سے روشنی لی جاسکتی ہے:

❶ آیت کریمہ کے الفاظ میں عامل ومعمول اور فاعل ومفعول بہ کی تمیز کر کے ترجمہ کو اُس کے مطابق رکھنا یہ اِس لیے ضروری ہے کہ اِس سے خلاف ہونے والے ترجمہ کو محاورۂ متن کے مطابق نہیں کہا جاسکتا اِس کی مثالوں کی ایک جھلک آیت کریمہ ''فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ''(۱) کے درج ذیل تراجم میں دیکھی جاسکتی ہے ''تو دُونا میوہ پیدا ہوا، تو پھل دگنا آئے'' یہ ترجمے بالترتیب مولانا وحید الزمان اور مولانا السید وجیہہ السیما عرفانی نے کیے ہیں جو اصل کے محاورہ سے سراسر خلاف ہیں کیوں کہ اُس میں لفظ ''اُكُلَهَا '' مفعول بہ ہے فعل متعدی ''اٰتَتْ ' کے لیے جبکہ اِن میں اُسے فاعل ظاہر کیا گیا ہے تو پھر اِس معکوس العملی کو اصل کے مطابق کون کہے۔ نیز اِن دونوں میں متن کے فعل متعدی یعنی ''اٰتَتْ '' کا ترجمہ فعل لازم میں کرنے کی بھی غلطی کی گئی ہے جیسا بالترتیب اِن کے مذکورہ الفاظ ''دونا میوہ پیدا ہوا، پھل دگنا آئے'' سے ظاہر ہے جو اردو محاورہ سے ذرہ برابر واقف شخص سے بھی پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے۔ آیت کریمہ کے ترجمہ میں اِس غلطی کی اصل وجہ مذکورہ شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے کیوں کہ علم نحو کے حوالہ سے آیت کریمہ کی مذکورہ حیثیت کو پیشِ نظر رکھ کر اُس کا معیاری ترجمہ (تو دیا اپنا پھل دگنا، تو پھر اِس بے ڈھنگا پن کی ضرورت ہی کیا ہے جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ شرط کی اہمیت کی غرض سے اُس کی خلاف ورزی کی دوسری مثال کے لیے آیت کریمہ کے

---

(۱) البقرۃ:265۔

حصہ ''لَا یَقۡدِرُوۡنَ عَلٰی شَیۡءٍ مِّمَّا کَسَبُوۡا ''(۲) کے درج ذیل تراجم دیکھے جاسکتے ہیں (قیامت کے دن اُن لوگوں کو اپنی کمائی میں سے کچھ ہاتھ نہ لگے گا، ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی، کچھ ہاتھ نہیں لگتا ایسے لوگوں کا ثواب اُس چیز کا جو اُنہوں نے کمایا، ریا کاروں کو اُس خیرات مین سے جو اُنہوں نے کی تھی کچھ بھی ہاتھ نہیں لگے گا، اِسی طرح یہ ریا کار لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہ کرسکیں گے، ایسے لوگ کچھ بھی نہ حاصل کرسکیں گے اپنی کمائی سے) یہ تراجم بالترتیب وحید الزمان، اشرف علی تھانوی، مولانا محمود الحسن، ڈپٹی نذیر احمد، فتح محمد جالندھری، مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے کیے ہیں جو سب کے سب غلط ہیں جس کی واضح وجہ آیت کریمہ کی مذکورہ نحوی حیثیت سے خلاف ہونا ہے کیوں کہ آیت کریمہ کے لفظ ''لَا یَقۡدِرُوۡنَ '' میں ''واؤ'' کی شکل میں جو ضمیر مرفوع متصل بارز ہے یہ فاعل کے طور پر ریا کاروں کی طرف راجع ہے جو آیت کریمہ کے سباق و ماقبل میں مذکور ہو چکی ہے مترجم کی ذمہ داری ہے کہ ترجمہ کے الفاظ و انداز کو اُس کے مطابق کرے جو (اپنی کمائی سے کسی چیز پر قابو نہ پائیں گے، وہ اپنی کمائی سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے، وہ قادر نہ ہوں گے اپنے کیے میں سے کسی چیز پر بھی) جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا ہے جس سے برعکس مترجمین نے جو انداز اپنایا ہے اس کا آیت کریمہ کی مذکورہ حیثیت سے کوئی ربط ہی نہیں ہے چہ جائیکہ اُس کے مطابق کہلائیں (فالی اللہ المشتکی)

ضروری وضاحت:۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ مذکورہ تراجم محض اِسی ایک شرط سے خلاف ہونے کی وجہ سے غلط ہیں تاکہ اِن میں موجود دوسری بے اعتدالیوں اور متعدد شرائط سے انحراف کو کالعدم سمجھا جائے نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ یہاں پر ہمارا مقصد صرف اِس ایک شرط سے خلاف ورزی کی مثال پیش کرنا ہے جبکہ ان میں پائی جانے والی دوسری بے اعتدالیوں کو دوسری شرائط سے انحراف کی مثالوں میں بیان کیا جاتا ہے کیوں کہ غلط تراجم کے سلسلہ دراز میں بہت کم ایسے ہیں جن میں صرف ایک شرط سے خلاف ورزی کی گئی ہو جبکہ غالب اکثریت میں متعدد شرائط سے انحراف ہوا ہے جن کی

(۱) البقرۃ:264۔

تفصیل کے لیے ہماری دوسری تصنیف تفسیر مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم کو دیکھا جا سکتا ہے جس میں کافی حد تک تفصیل سے بحث ہوئی ہے۔

❷ ضمائر کی تمیز پر نظر رکھنا ورنہ حاضر کا ترجمہ غائب میں یا غائب اور بعید کی طرف راجع ضمیر کا ترجمہ قریب و حاضر میں کرنے سے ترجمہ غلط ہوگا جس کی ایک مثال آیت کریمہ کے حصہ ''فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ''(۱) کا مولانا محمد جونا گڑھی کا کیا ہوا یہ ترجمہ ہے ''اگر یہ باز آجائیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے'' جو اصل سے خلاف اور غلط ہے کیوں کہ متن کے فعل ''انْتَهَوْا'' میں ''واؤ'' کی شکل میں جو ضمیر فاعل مرفوع متصل ہے حاضر نہیں بلکہ ضمیر غائب ہے تو پھر اُس کے ترجمہ میں لفظ ''یہ'' کہنے کا کیا جواز ہے جو حاضر کے ساتھ مختص ہے جبکہ اُس کا حقیقی ترجمہ ''پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے، پس اگر وہ اپنی شرارت سے منع ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے'' جیسے کسی بھی جائز طریقے سے ممکن ہے تو پھر مذکورہ شرط سے بے اعتنائی کا کیا جواز ہے۔

دوسری مثال جو اِس سے برعکس ہے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 229 کے ابتدائی حصہ ''اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ'' کا اشرف علی تھانوی کا کیا ہوا یہ ترجمہ ہے ''وہ طلاق دو مرتبہ کی ہے'' اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ لفظ ''یہ'' کہنے کی جگہ وہ کہنے سے ترجمہ اصل کے مطابق نہیں ہوتا یہاں پر بھی ایسا ہی ہوا ہے کیوں کہ جمہور مفسرین کے مطابق یہاں پر لفظ ''الطلاق'' پر آیا ہوا الف لام عہد کے لیے ہے جس سے مراد وہ طلاق ہے جو اِس سے قبل مذکور ہوئی ہے، جو سیاق وسباق کے مطابق غائب نہیں بلکہ حاضر میں شمار ہوتی ہے جس کے مطابق آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ ''یہ طلاق دو بار تک ہے، طلاق دو بار تک ہے'' جیسے کسی بھی انداز میں کیا جا سکتا ہے تو پھر اِس بے ڈھنگا پن کو اصل کے مطابق کون کہہ سکتا ہے۔

❸ ترجمہ کیے جانے والی آیات کریمہ اگر ''اِنَّ'' سے مخفف ''اِنْ'' پر مشتمل ہو۔ ایسے تمام مواقع پر

(۱) البقرۃ، 192۔

اُس کی قسموں پر مکمل تسلی ویقین ضروری ہے کہ آیا وہ ''اِنَّ'' سے تخفیف پا کر استعمال ہونے والی کون سی ''اِن'' ہے باعمل ہے یا بے عمل اِس کی تفصیل اِس طرح ہے کہ ''اِنّ''مثقلہ سے مخفف ہو کر ''اِنْ'' کی شکل میں استعمال ہونے والے اِس لفظ کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم:۔ جسے علم نحو کی اصطلاح میں مُلغی العمل کہا جاتا ہے یعنی عمل ساقط کرنے والا کیوں کہ لفظ ''اِنّ'' کا جو مشہور عمل ہے کہ اسم کو منصوب اور خبر کو مرفوع کر دیتا ہے جیسا کہا جاتا ہے ''ان زیدًا قــائمٌ ''اِس صورت میں اُس کا عمل ساقط ہو جاتا ہے جس وجہ سے اِس کی ظاہری صورت اُس ''اِن'' کے ساتھ مشابہ ہو جاتی ہے جسے ''اِن'' نافیہ کہتے ہیں یعنی جن دو اسموں پر داخل ہوتا ہے اُن کے مابین نسبت کو نفی کرنے کے سوا کوئی اور لفظی عمل نہیں کرتا جیسا کہا جاتا ہے ''اِنْ زیدٌ قــائم ''یعنی زید قائم نہیں ہے جو اس کے آنے سے قبل ''زیــدٌ قــائم '' کی نسبت ثبوتی پر مشتمل تھا اب منفی ہو گیا اِس التباس واشتباہ سے بچنے کے لیے ''اِن''ملغی العمل کے بعد لام کے استعمال کو ضروری قرار دیا گیا ہے جسے لام فارقہ کہا جاتا ہے یعنی ''اِن'' نافیہ اور ''اِن''ملغی العمل کے مابین فرق بتانے والا۔

دوسری قسم:۔ جسے باعمل کہا جاسکتا ہے یعنی ''اِنَّ '' ثقیلہ سے مخفف ہو کر لفظ ''اِن'' کی صورت میں آنے کے بعد بھی ''اِنَّ '' والا عمل کرتا ہے یہ قسم ''اِنْ'' نافیہ کے ساتھ مشابہ نہیں ہے جس وجہ سے اِس کے بعد لام استعمال کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

قرآن شریف میں بکثرت استعمال ہونے والے لفظ ''اِنْ'' کے حوالہ سے اِس تفصیل کی روشنی میں اُس کی اِن قسموں کو پیشِ نظر رکھنے کی شرط سے کون انکار کر سکتا ہے جبکہ اِس سے غفلت کی صورت میں لام فارقہ کو لام ابتدائیہ تاکید یہ سمجھنے کی غلطی کا قوی امکان موجود ہوتا ہے جس کی ایک مثال آیت کریمہ کے حصہ ''وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآ لِّيْنَ ''(۱) کے مندرجہ ذیل تراجم کو دیکھا جا سکتا ہے (اور بے شک اِس سے پہلے تم ضرور گمراہوں میں سے تھے، اور بے شک تم اُس کی ہدایت

---

(۱) البقرۃ:198۔

سے پہلے ضرور بھٹکنے والوں میں سے تھے) یہ ترجمے بالترتیب میرے استاذ الحدیث جو اپنے وقت کے غزالی زمان اور کامل ولی اللہ تھے مولانا سعید احمد کاظمی نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْف نے اور میرے اُستاذ بھائی پنجاب حکومت کے اپنے وقت کے اُمورِ مذہبیہ کے وزیر شیخ الحدیث ڈاکٹر مفتی غلام سرور القادری رحمۃ اللہ علیہ نے کیے ہیں جنہیں محض اِس وجہ سے معیاری نہیں کہا جاسکتا کہ اِن میں مذکورہ شرط سے بے التفاتی کی گئی ہے۔ ورنہ متن کے لفظ ''لَمِنَ الضَّآ لِّیْنَ'' کا ترجمہ اول الذکر ''تم ضرور گمراہوں میں سے تھے'' جیسے تاکیدی انداز میں کرتا نہ ثانی الذکر ''ضرور بھٹکنے والوں میں سے تھے'' جیسے موکد انداز میں کرتا یہ بے اعتدالیاں محض اِس وجہ سے ہوئی ہیں کہ حضرات نے متن کے لفظ ''لَمِنَ الضَّآ لِّیْنَ'' پر آیا ہوا لام کو لام فارقہ کے بجائے لام ابتدائیہ تاکیدیہ تصور کیا جس کی یہاں پر گنجائش نہیں تھی ایسے میں تراجم کے اِس انداز کو بناء الغلط علی الغلط کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اِس سے برعکس ''اِن'' عاملہ اور ''اِن'' غیر عاملہ نیز لام ابتدائیہ تاکیدیہ اور لام فارقہ کی مذکورہ تفصیل کو پیشِ نظر رکھ کر آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ ''اور بے شک اِس سے پہلے تم بہکے ہوئے تھے، اور بے شک اِس سے قبل تم گمراہ تھے'' جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا ہے جو اسلاف کے تراجم میں بھی ملتا ہے۔

ایک اشتباہ کا ازالہ:۔ ممکن ہے کہ یہاں پر کسی کے دل میں یہ تصور آجائے کہ لام ابتدائیہ تاکیدیہ کی طرح اُس لام کو بھی علم نحو کی بعض کتابوں میں لام ابتدائیہ کہا گیا ہے جو لفظ ''اِن'' ملغی العمل کے بعد لازم الاستعمال ہوتی ہے۔ ایسے میں ممکن ہے کہ اِسے لام ابتدائیہ کہنے والے نحاۃ کے نزدیک اِس میں بھی اُس کی طرح تاکید کا اِفادہ پایا جاتا ہو جس کے مطابق آیت کریمہ کے مذکورہ تراجم کے جواز کا پہلو نکل آتا ہے۔

اِس کا جواب یہ ہے کہ علم نحو کی کتابوں میں اِس حوالہ سے جو کہا گیا ہے درست ہے لیکن ابتدائیہ کہلانے کی بنا پر تاکید کے افادہ کا تصور کرنا غلط ہے کسی نحوی نے اِس میں تاکید کے افادہ کا تصور

کیا ہے نہ کسی بلاغی نے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائیہ کہلانا اِن دونوں کے مابین قدرِ مشترک ہونے کے ساتھ فارقہ اور تاکیدیہ ہونے کی تفریق ہے جس میں نحاۃ کے دورائے ہیں نہ بلغاء کی اِس کی ایسی مثال ہے جیسا حیوان کہلانا انسان اور فرس کے مابین قدرِ مشترک ہے جبکہ حیوان ناطق اور حیوان ساحل ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

❹ آیت کریمہ کی نحوی حیثیت کے ذیل میں یہ بھی ضروری ہے کہ جس آیت کریمہ کا ترجمہ کیا جارہا ہو اُس میں موجود ضمائر کی نوعیت کا ادراک ہو مستتر ہونے کی صورت میں اُس کا ترجمہ بھی مستتر انداز میں کرنا ضروری ہے اور بارز ہونے کی صورت میں اُس کا ترجمہ بھی اُس کے مطابق بارز انداز میں کرنا ضروری ہے ورنہ ترجمہ کا معیار گر سکتا ہے اِسی طرح ضمیر کے مرجع اور اُس سے مراد کو بھی اُس کی ذات کے تناظر میں دیکھ کر اُس کے مطابق الفاظ استعمال کرنا ضروری ہے ورنہ ترجمہ اصل متکلم کی مراد سے خلاف ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد ومنشاء سے خلاف ہونے والے ترجمہ کا نقصان کسی دنیوی کتاب کے منشاء سے خلاف ہونے والے نقصان کی طرح محدود نہیں ہے اِس لیے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کہ مبادا کسی بھی ضمیر کا ترجمہ وتعبیر منشاءِ الٰہی کے خلاف نہ ہو ورنہ کیا سے کیا بن سکتا ہے اور نہ سہی فصاحت سے منافی ضرور ہوگا اور اہل علم جانتے ہیں کہ فصیح وبلیغ کلام کا ترجمہ اگر غیر فصیح وبلیغ انداز میں کیا جائے تو وہ اصل کے مطابق نہیں کہلائے گا اِس کی ایک مثال کے لیے آیت کریمہ "وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ "(۱) کے اِن تراجم کو دیکھا جا سکتا ہے (اور ڈرو اُس دن سے کہ پھیرے جاؤ گے اُس دن خدا کی طرف، اور اُس دن سے ڈرو جس دن تم سب کے سب خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے، اور ڈرتے رہو اُس دن سے کہ جس دن لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف) انہیں محض اِس وجہ سے معیاری اور اصل کے مطابق نہیں کہا جا سکتا کہ اِن میں ضمیر مجرور متصل جو لفظ "فیہ" میں ہے کا ترجمہ ضمیر میں کرنے کے بجائے اسم ظاہر میں کیا گیا ہے جو اصل کے قائم مقام نہیں ہو سکتا یہ تراجم بالترتیب الشاہ مفتی مظہر اللہ الدہلوی، حجۃ الاسلام فرمان علی

---

(۱) البقرۃ:281۔

اور مولانا محمود الحسن نے کیے ہیں مترجمین پر افسوس کہ جب اصل کے مطابق ترجمہ (اور ڈرو اُس دن سے جس میں اللہ کی طرف پھیرے جاؤ گے، اُس دن سے ڈرو جس میں پھیرے جاؤ گے اللہ کی طرف) جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا ہے جو پیشِ نظر شرط کے مطابق ہونے کے ساتھ ترجمہ کی تعریف پر بھی منطبق ہیں تو پھر شرط سے انحراف کر کے اِس بے ڈھنگا پن کی راہ چلنے کا کیا جواز تھا۔

دوسرے انداز کی مثال کے لیے قرآن شریف کے اُن مقامات پر غور کیا جاسکتا ہے جن میں ضمیر مخاطب خاص لیکن مراد عام ہے جس کے متصلاً بعد ضمیر مخاطب خاص اور مراد بھی خاص ہے۔ مثال کے طور پر ''مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ''(۱) اِس میں ضمیر مخاطب (ک) کی صورت میں بظاہر یکساں چار ضمیر مذکور ہوئے ہیں جبکہ جمہور مفسرین کے مطابق اول الذکر تین خطاب خاص مراد عام کے قبیل سے ہیں جس کا مظہر ہر سننے والا اور کوئی بھی مخاطب ہوسکتا ہے جبکہ آخر الذکر خطاب اور مراد دونوں خاص کے قبیل سے ہے جس کا مظہر نبی اکرم سید عالم ﷺ کے سوا کوئی اور نہیں ہے حقیقت کی اِس روشنی میں مترجم پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہر ایک کی تعبیر واظہار اُس کی شان کے لائق انداز میں کرے، مثال کے طور پر (اے سننے والے تجھے جو بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچے وہ تیری اپنی طرف سے ہے اور اے محبوب ہم نے تمہیں سب لوگوں کے لیے رسول بھیجا، اے انسان تجھے جو بہتری پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پہنچے وہ تیری طرف سے ہے اور اے نبی ہم نے تمہیں تمام انسانوں کے لیے رسول بھیجا ہے) جیسے کسی بھی انداز میں کرے جو با محاورہ یعنی دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ دوسری تمام شرائط پر بھی منطبق ہیں اور ہر اعتبار سے بامقصد و بے غبار ہیں بخلاف اُن تراجم کے جن میں ضمائر کے اِس اُصول سے خلاف کیا گیا ہے اِس میں مترجمین کے دو طبقے ہیں۔ ایک کا اندازِ ترجمہ اِس طرح ہے:

1 ''اے انسان تجھ کو جو کوئی خوشحالی پیش آتی ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے

---

(۱) النسآء:79۔

اور جو کوئی بدحالی پیش آوے وہ تیرے ہی سبب سے ہے اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔''

2 ''اے انسان جو کچھ کہ تجھ کو بھلائی پہنچے تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو کچھ تجھ کو برائی پہنچے تو وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے اور اے محمد ہم نے تجھ کو بھیجا ہے لوگوں کا پیغمبر بنا کر۔''

3 ''اے آدم زاد تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی شامتِ اعمال کی وجہ سے ہے اور اے محمد ہم نے تم کو لوگوں کی ہدایت کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔''

4 ''جو پہنچے انسان تجھ کو کوئی بھلائی تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو پہنچے تجھ کو کوئی برائی تو وہ تیری طرف سے ہے اور ہم نے بھیجا ہے آپ کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر۔''

یہ چاروں بالترتیب اشرف علی تھانوی، عاشق الٰہی میرٹھی، فتح محمد خان جالندھری اور حافظ صلاح الدین یوسف کے کیے ہوئے تراجم ہیں جن میں پہلے تینوں ضمائر کا ترجمہ درست کیا گیا ہے جبکہ چوتھے کی تعبیر و ترجمہ اُس کے شایانِ شان کرنے کی کوشش کے باوجود نبھا نہ سکے کیوں کہ بعض نے اس کی تعبیر و ترجمہ کے طور پر ''اے محمد'' کہا جیسا دوسرے اور تیسرے میں اور بعض نے لفظ ''آپ'' کہا جیسا اول الذکر اور آخر الذکر میں ہے جبکہ یہ دونوں اندازِ تخاطب محاورہ سے خلاف ہیں کہ اردو محاورہ میں خطاب اللہ مع الرسول کی تعبیر و ترجمہ میں لفظ ''آپ'' کہنے کی قطعاً کوئی مثال موجود نہیں ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''یا محمد'' کہہ کر خطاب کرنے کی کوئی مثال قرآن شریف کے محاورہ میں موجود نہیں ہے اسی طرح اردو محاورہ میں بھی لفظ ''اے محمد'' کہہ کر خطاب کرنے کا محاورہ موجود نہیں ہے گویا ترجمہ کا یہ انداز دونوں زبانوں کے محاورہ سے خلاف ہے تو پھر انہیں آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ کون کہے۔

پیشِ نظر آیت کریمہ کے مترجمین کے دوسرے طبقہ کے تراجم اس طرح ہیں (تمہیں جو کوئی اچھائی پہنچتی ہے تو وہ محض اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور جو کوئی برائی پہنچتی ہے وہ تو تمہارے اپنے سبب سے ہوتی ہے اور اے پیغمبر ہم نے تمہیں لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے، تجھے جو بھی سکھ پیش آیا

ہے وہ بس اللہ ہی کی طرف سے ہے اور جو دکھ پہنچتا ہے وہ تیرے اپنے ہی سبب سے ہے اور ہم نے آپ کو انسانوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے) یہ دو بالترتیب مولانا مفتی تقی عثمانی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے کیے ہوئے ترجمے ہیں جو آیت کریمہ میں مذکور پہلے تینوں ضمائر کی تعبیر و ترجمہ واضح نہ کرنے میں شریک ہیں۔ چوتھی ضمیر کی تعبیر و ترجمہ کے حوالہ سے ایک دوسرے سے متضاد ہیں کہ اول الذکر نے اُس کا حق نبھایا ہے جبکہ آخر الذکر نے اُس کا ترجمہ لفظ ''آپ'' میں کر کے ترجمہ والی زبان کے محاورہ کو ''ناراض'' کر دیا ہے۔ اِن دو طبقوں میں آیت کریمہ میں مذکور ضمائر کے حوالہ سے جزوی بے توجہی کی گئی ہے جبکہ آیت کریمہ کے کچھ تراجم ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن میں ضمائر کے حوالہ سے خطاب خاص مراد عام اور خطاب اور مراد دونوں خاص کی تفریق سے مکمل بے توجہی برتی گئی ہے جس کی مثال کے لیے مولانا محمد جونا گڑھی کے اِس ترجمہ کو دیکھا جا سکتا ہے ''تجھے جو بھلائی ملتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تیرے اپنے نفس کی طرف سے ہے ہم نے تجھے تمام لوگوں کو پیغام پہنچانے والا بنا کر بھیجا ہے'' جس میں سابق الذکر دونوں ضمیر منصوب متصل اور آخر الذکر میں مقصد کے حوالہ سے جو فرق ہے اُسے ایک مقام پر بھی ظاہر نہیں کیا گیا ہے تو پھر اسے کامل غفلت کیوں نہ کہا جائے۔ جبکہ متن سے مراد کے اظہار سے قاصر تفسیر بھی معیاری نہیں ہوتی چہ جائیکہ ایسے ترجموں کو درست کہا جائے حالانکہ ترجمہ کا معاملہ تفسیر کی بہ نسبت زیادہ قابل توجہ اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہے۔ تفریق المراد فی الضمائر والخطاب کی اہمیت کا نتیجہ ہے کہ اِس قسم آیات کی تفسیر کرتے ہوئے جمہور مفسرین نے ہر ایک سے مراد الٰہی کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے طور پر مالکی المذہب مفسر ابوعبداللہ القرطبی المتوفی 1273ھ نے لکھا ہے:

''والخطاب للنبی ﷺ والمراد امته ما اصابكم يا معشر الناس من خصب واتساع رزق فمن تفضل الله عليكم وما اصابكم من جدب وضيق رزق فمن انفسكم''(۱)

---

(۱) الجامع للاحكام القرآن، ج:5، تحت الاية المذكورہ۔

حنفی المذہب مفسر الشیخ السید محمود البغدادی الالوسی المتوفی 1270ھ نے لکھا ہے:

"والخطاب فیہ کما قال الجبائی وروی عن قتادہ عام لکل من یقف علیہ لا للنبی ﷺ"(۱)

شافعی المذہب مفسر جلال الدین السیوطی المتوفی 910ھ نے لکھا ہے: "ما اصابك ایھا الانسان"

اس کے بعد آیت کریمہ میں آخر الذکر ضمیر سے مراد بتاتے ہوئے لکھا ہے:

"وارسلناك یا محمد"(۲)

جعفری المذہب مفسر الفضل ابن الحسین الطبرسی المتوفی 548ھ نے لکھا ہے:

"ھٰذا خطاب للنبی والمراد به الامة"(۳)

حنبلی المذہب مفسر عبدالرحمٰن ابن الجوزی المتوفی 597ھ نے لکھا ہے: "فی الخطاب بھٰذا الکلام ثلاثة اقوال احدھا انه عام فتقدیرہ ما اصابك ایھا الانسان قاله قتادہ والثانی انه خطاب للنبی ﷺ والمراد به غیرہ ذکرہ الماوردی"

اس کے بعد آیت کریمہ میں مذکور اول الذکر ضمائر کے خطاب کو خاص مراد العام قرار دیتے ہوئے لکھا ہے: "لان الایة عامة"(۴)

معتزلی المذہب مفسر جاراللہ الزمخشری المتوفی 538ھ نے لکھا ہے:

"ما اصابك یا انسان خطابا عاما"(۵)

---

(۱) تفسیر روح المعانی، ج:5، تحت الایة المذکورہ۔

(۲) تفسیر جلالین علی ھامش الفتوحات الالٰھیہ، ج:1، تحت الایة المذکورہ۔

(۳) مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ج:3، تحت الایة المذکورہ۔

(۴) زادالمیسر فی علم التفسیر، ج:1، تحت الایة المذکورہ۔

(۵) الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون فی وجوہ التاویل، ج:1، تحت الایة المذکورہ۔

ایسے میں یہ تراجم نہ صرف مرادِ الٰہی کو ظاہر کرنے سے قاصر ہیں بلکہ جمہور مفسرین سے بھی خلاف ہیں تو پھر تفریق خطاب کی پہچان کا ترجمہ کی صحت کے لیے شرط ہونے سے کون انکار کرسکتا ہے جبکہ اسلاف نے قرآنی محاورہ کی اِس قسم تفریقات کو مستقل عنوان کیساتھ ذکر کیا ہے جس سے اہم مقصد مفسر ومترجم کی رہنمائی کرنا ہے کہ تفسیر وترجمہ کو اِس کے مطابق کرے جیسا امام جلال الدین السیوطی نے لکھا ہے:

''النوع الحادی والخمسون،فی وجوہ مخاطباته،قال ابن الجوزی فی کتابه النفیس الخطاب فی القرآن علی خمسة عشر وجها،وقال غیرہ علی أکثر من ثلاثین وجها،

أحدها خطاب العام والمراد به العموم کقوله الله الذی خلقکم.

والثانی خطاب الخاص والمراد به الخصوص کقوله أکفرتم بعد إیمانکم یأیها الرسول بلغ.

الثالث خطاب العام والمراد به الخصوص کقوله یأیها الناس اتقوا ربکم لم یدخل فیه الأطفال والمجانین.

الرابع خطاب الخاص والمراد العموم کقوله یأیها النبی إذا طلقتم النساء افتتح الخطاب بالنبی والمراد سائر من یملك الطلاق وقوله یأیها النبی إنا أحللنا لك أزواجك''(۱)

اِس کی روشنی میں دیکھا جائے تو پیشِ نظر آیت کریمہ ''مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا '' کے آخرالذکر ضمیر منصوب متصل کا ذکرالخاص والمراد بہ الخاص کے قبیل سے ہونے میں کسی کو شک ہوسکتا ہے اور نہ اول الذکر دونوں کا ذکرالخاص والمراد بہ العموم کے قبیل سے ہونے میں۔

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن،ج:2،ص:33،مطبوعہ الحجاز بالقاہرہ،مصر۔

ایک اشتباہ کا ازالہ:۔

ہمارے اِس جزم و یقین کے اظہار پر کہ آیت کریمہ ''وَاَرْسَلْنٰكَ'' کے خطاب خاص والمراد بہ الخاص کے ترجمہ میں لفظ ''آپ'' استعمال کرنا اردو محاورہ سے خلاف ہے اور اِسی طرح لفظ ''اے محمد'' کہنا دونوں محاوروں سے خلاف ہے ممکن ہے کسی کو یہ اشتباہ ہو جائے کہ اردو زبان کے محاورہ میں قابلِ تعظیم ہستیوں کی بابت اِس انداز کلام کو مہذب اور باادب سمجھا جاتا ہے جیسا کہا جاتا ہے ''آپ ﷺ نے فرمایا ہے'' اِسی طرح کسی صحابی یا کسی امام مذہب کا تذکرہ ہو رہا ہو اثناء کلام اُن سے متعلق بھی ایسا کہا جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا اور آپ نے منع کیا تو پھر آیت کریمہ کے ترجمہ میں نامناسب اور بے محاورہ کیوں کہلائے؟ اِسی طرح ''اے محمد'' بھی کوئی اجنبی لفظ نہیں ہے بلکہ یہ عربی کے ''یا محمد'' کا ترجمہ ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا ''یـا مـحـمـد ارفع راسك واشفع تشفع وسل تعط''(۱)

نیز کچھ صحابہ کرام سے بھی اِس طرح کی ندا کا ثبوت ملتا ہے تو پھر آیت کریمہ کے ترجمہ میں ''اے محمد'' کہنے کو دونوں محاوروں سے خلاف کیوں کہا جائے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ انسانوں کا ایک دوسرے کے حوالہ سے گفتگو کرنا یا ایک دوسرے سے بالمشافہ کلام کرنا الگ چیز ہے جس پر قرآن شریف کے ترجمہ کو قیاس نہیں کیا جا سکتا یہ اتنا قابلِ احتیاط عمل ہے کہ مفسر کے لیے جائز ہونے والے بہت سے انداز بھی یہاں پر جائز نہیں ہوتے چہ جائیکہ انسانوں کے حوالہ سے ہونے والی گفتگو پر اِسے قیاس کرنا جائز ہو سکے نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے جس میں قرآن شریف کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جاتا ہے جو اُن کے قائم مقام اور اُن کی متعارف حیثیات کے مطابق ہو سکیں۔ انسانوں کی گفتگو میں ایک دوسرے کے مراتب کے تناظر سے آپ کہنا مستحسن امر ہے، مہذب انداز کلام ہے اور اردو محاورہ میں مشہور و مانوس

---

(۱) مسلم شریف، کتاب الشفاعہ۔

بھی ہے لیکن اِس کا ترجمۃ القرآن سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کہ اِس پر قیاس کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ سے خطاب کے ترجمہ میں آپ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو آپ کہہ کر پکار رہا ہے یا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یا کسی پیغمبر یا کسی بھی مسلمان کی طرف سے اللہ تعالیٰ سے خطاب کے ترجمہ میں آپ کہا جائے جیسا کسی بندہ کو آپ کہہ کر پکار رہا ہے اِس کی کوئی مثال اردو محاورہ میں موجود نہیں ہے اور مانوس الاستعمال ومتعارف نہیں ہے۔ جن حضرات نے قرآن شریف کے ایسے مخصوص مقامات کا ترجمہ اِس انوکھے انداز سے کیا ہے زبان دانی میں اُن کا کوئی مقام ہے نہ سُخن شناسی میں اُردو زبان کے حوالہ سے اُن کی حیثیت ایسی نا قابلِ قبول وغیر معتبر ہے جیسا قرآن وحدیث کے حوالہ سے طبقہ مولدین کا کلام نا قابل قبول ہے۔

اشتباہ کے دوسرے حصہ کا بھی تقریباً یہی حال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرنے میں لفظ ''یا محمد'' کہنے کا محاورہ قرآن وسنت کی زبان میں نہیں ہے جہاں تک حدیث مسلم کے حوالہ سے ''**ارفع راسئك يامحمد**'' کا تصور ہے اُس کا تعلق دارِ دنیا سے نہیں بلکہ دارِ آخرت سے ہے اور آخرت کا معاملہ دُنیا سے مختلف ہے ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیے جا سکتے جبکہ اللہ کے رسول سید عالم ﷺ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وجیہہ ہیں، معظم ہیں اور محبوب ومکرم ہیں جس وجہ سے ان کے ساتھ اللہ کا خطاب عام خطاب کی طرح نہیں بلکہ خطاب الکرامہ کہلاتا ہے جس وجہ سے پورے قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی لفظ ''یا محمد'' کہہ کر خطاب نہیں فرمایا۔ پیشروانِ اسلام نے اِس کا فلسفہ یہ بتایا ہے کہ لفظ ''محمد'' رسول اللہ ﷺ کے لیے اِسم محض ہے اور محض اسم سے پکارنے میں تکریم وتعظیم کا وہ انداز نہیں ہوتا جو اوصاف سے پکارنے میں ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے ساتھ خطاب تکریم چاہتا ہے۔ حضرت امام جلال الدین السیوطی نے فرمایا:

''**ولم يقع فى القرآن الخطاب بيامحمد بل اَيُّهَا النَّبِىُّ، يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ تعظيما له وتشريفا وتخصيصا له بذالك عما سواه وتعليما للمومنين ان لا ينادوه باسمه**''(۱)

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:33، مطبوعہ الحجازی بالقاہرہ مصر۔

قاضی عیاض المتوفی ۵۴۴ھ نے الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ ﷺ میں اپنے سے پیشرو اسلاف وصلحاء کے حوالہ سے لکھا ہے:

''قال بعضهم ومن فضله اَن الله تعالیٰ خاطب الانبياء باسمائهم و خاطبه بالنبوة و الرسالة فی کتابه فَقَال اَيُّهَاالنَّبِیُّ، يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ''(۱)

ایک اور مقام پر فرمایا جو ملا علی القاری کی ممزوج شرح کے ساتھ اِس طرح ہے:

''ولا تنادوه باسمه ای العلم نداء کمناداة بعضکم بعضا ای باسمه الذی سماه به ابواه ولکن عظموه باطنا و وقروه ای ظاهراونادوه باشرف ما يحب ای مايعجبه ان ينادیٰ به ای من وصف رسالة او نعت نبوة بان تقولوا يا رسول الله،يا نبی الله ای امثالهما من نحو يا حبيب الله يا خليل الله وهٰذا فی حياته و کذابعدوفاته فی جميع مخاطباته ''(۲)

سید محمد البغد ادی الالوسی نے سورۃ النور، آیت نمبر 63 کے تحت محض اسم کے ساتھ اللہ کے رسول سیدِ عالم ﷺ کو یاد کرنے کو ممنوع قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''وفی احکام القرآن للسيوطی ان فی هٰذاالنهی تحريم ندائه ﷺ باسمه والظاهر استمرار ذٰلك بعدوفاته الی الآن''(۳)

ملا علی القاری نے اسلام کے اِس حکم کے دوام وبقاء اور قیامت تک جاری بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''واعلم انه ينبغی هذه المراعاة ايضا بعد وفاته عليه الصلاة و السلام فی مسجده لاسيماعندمشهده و کذاعند قراء ة حديثه ومسنده و کذاعند سماع

---

(۱) الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ،ج:1،ص:111،مطبوعہ دارالکتب العربیہ بیروت۔

(۲) الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ مع شرح ملا علی القاری،ج:2، ص:64، مطبوعہ دارالکتب العربیہ بیروت۔

(۳) تفسیر روح المعانی،ج:18،ص:225،مطبوعہ دارالاحیاء التراث العربی۔

القرآن وتفسیر الفرقان کما اشار الیہ سبحانہ وتعالٰی بقولہ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ﴾(۱)وقال تعالٰی﴿لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُم بَعْضًا﴾(۲)ای برفع الصوت فوق صوتہ او بندائہ باسمائہ فلا تقولوا یامحمد یا احمد بل قولوا یا نبی اللہ و یارسول اللہ کما خاطبہ بہ سبحانہ وعظم شانہ‘‘(۳)

سلف صالحین کی ایسی تصریحات کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خطاب اور مختص ضمائر کے ترجمہ میں اے محمد کہنے کو معیاری ترجمہ کہا جا سکتا ہے نہ بامحاورہ، مرادِ الٰہی کے مطابق کہا جا سکتا ہے نہ مفسرین کے مطابق بلکہ اِس کی حیثیت ترجمہ کے نام سے مفسرین کی نقل کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ بغیر شرائط کے مترجم بننے کے شائق حضرات نے تفسیر کی کتابوں میں ایسا دیکھ کر اُسے ترجمہ بنا دیا جس سے اُن مفسرین کی روح کو بھی تکلیف پہنچ رہی ہوگی کیوں کہ اُنہوں نے یہ لفظ تفسیر کے طور پر لکھا ہے ترجمہ کے نہیں جبکہ مفسر کو بہت کچھ کہنے اور لکھنے کی گنجائش ہوتی ہے جو مترجم کے لیے جائز نہیں ہوتی۔

5 ترجمہ کیے جانے والی آیات کی نحوی حیثیات کے سلسلہ میں لفظ ’’ظن‘‘ کا مفہوم بھی ہے جو اِس طرح ہے کہ علم نحو اور لُغت کے مطابق لفظ ’’ظن‘‘ سے بننے والے فعل چاہے ماضی ہو یا مستقبل بہرحال اُس کے بعد لفظ ’’اَنّ‘‘ آ جائے جیسے آیت کریمہ ’’وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ‘‘(۴)یا ’’اَنّ‘‘ سے

---

(۱) فصلت:26۔

(۲) النور:63۔

(۳) شرح شفاء للقاضی عیاض، شرح ل لِمُلا علی القاری، ج:2، ص:62، مطبوعہ دارالکتب العلمیۃ بیروت لبنان۔

(٤) القیامہ:28۔

مخفف ''اَن'' آ جائے جیسے آیت کریمہ ''اِنَّـهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ '' (الانشقاق،14) تو ایسے تمام مقامات پر ظن یقین کے مفہوم میں ہوتا ہے یعنی لفظ ''اَنّ'' و ''اَن'' فعلِ ظن کو ظنیت سے نکال کر یقین میں کرنے کے لیے آتے ہیں۔ مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں ہے:

''الظَنُّ اِسمٌ لِمَا يَحصل عَن اَمَارَةٍ وَمَتىٰ قَوِيَتْ اَدَتّ اِلَى العلمِ وَمَتىٰ ضَعُفَ جِدًّا لَـم يَتَجَاوَز حَدَّ التَوَهمِ وَمَتىٰ قَوِىَ اَوْتُصُوِّرَتَصوُّرَالقَوِىِ اُستُعمِلَ مَعَهٗ اَنَّ المُشَدَّدَةُ وَاَن الـمُـخَـفَـفَّة مِـنهَـا وَمَتىٰ ضَعُفَ اُستُعمِل اِنّ وَاِن المُختَصة بِالمَعدُومين مِنَ الـقَـولِ وَالـفعلِ فقوله ''اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ'' و كذا يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا اللّٰه فَمِنَ اليَقِين ''(۱)

اِس کا مفہوم یہ ہے کہ ظن کسی چیز کی علامت سے حاصل ہونے والے علم کا نام ہے اور یہ جب قوی ہوتا ہے یقین تک پہنچتا ہے اور جب زیادہ ضعیف ہوتو وہم کے درجہ سے آگے تجاوز نہیں کرتا اور جب قوی یا قوی کی طرح متصور ہوتو اُس کیساتھ'' اَنَّ'' اور کبھی'' اَنّ'' سے مخفف ''اَن'' بھی استعمال کیا جاتا ہے اور جب ضعیف ہوتو اُس کے ساتھ ''اِنّ'' اور اِس سے مخفف ''اِن'' استعمال کیے جاتے ہیں جو قول وفعلِ معدوم کے ساتھ خاص ہے تو اللہ کا فرمان ''اَلَّـذِيْـنَ يَـظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ '' اور اِسی طرح ''يـظـنـون انهم ملقوا اللّٰه ''یقین کے قبیل سے ہیں جس میں وہم اور خیال کا تصور ہی نہیں ہے۔

نہ صرف اتنا بلکہ ''اَن'' ثقیلہ یا خفیفہ اپنے مابعد سے مل کر مصدر منسلخ ہونے کے بعد محلا منصوب ہوتا ہے اور فعلِ ظن کے لیے ایسا مفعول بہ ہوتا ہے جو دوسرے مفعول بہ کا بھی قائم مقام ہوتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے مبتداء کی قسم ثانی ''اَ قـائـم الـذيدان '' میں لفظ ''الـذيدان'' قائم کے لیے فاعل ہونے کے ساتھ قائم مقام خبر بھی ہے جو کسی بھی نحو شناس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ فعل ''ظن'' کے

(۱) مفردات القرآن الاصفهانی،ص:319۔

ایسے تمام مواقع پر دوسرے مفعول بہ کو صراحتاً ذکر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ افعال قلوب کے زمرہ میں فعلِ ظن جو قرآن شریف کے بے شمار جگہوں میں استعمال ہوا ہے نحوی اصولوں کی اِس روشنی میں اُن کے ترجمہ کی ایک مثال آیت کریمہ ''الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُوا رَبِّهِمْ''(۱) کے تراجم ''جنہیں یقین ہے کہ اُنہیں اپنے رب سے ملنا ہے، جنہیں اپنے رب سے ملنے کا یقین ہے، جو یقین رکھتے ہیں کہ بے شک ہم نے اپنے رب سے ملنا ہے'' جیسے کسی بھی انداز میں کیا جا سکتا ہے جو علم نحو کے اِس اُصول کے مطابق ہونے کے ساتھ دوسری تمام شرائط پر بھی منطبق ہیں بخلاف اُن تراجم کے جو علم نحو سے مستفاد اس اُصول کی شرط کو پامال کر کے لکھے گئے ہیں یا لکھے جا رہے ہیں جیسے درج ذیل تراجم (جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے عنقریب ملنے والے ہیں، جو اِس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں، جن کو خیال ہے کہ وہ روبرو ہونے والے ہیں اپنے رب کے، خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رب سے، جن کو خیال ہے کہ وہ ضرور اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں) یہ تراجم بالترتیب مفتی غلام سرور القادری، مفتی تقی عثمانی، مولانا محمود الحسن، اشرف علی تھانوی، عاشق الٰہی میرٹھی کے کیے ہوئے ہیں اور سب اِس وجہ سے غلط ہیں کہ اِن میں علم نحو کے مذکورہ اُصولوں سے غفلت برتی گئی ہے۔ اول الذکر میں اگرچہ ظن کو خیال کے معنی میں لینے کی غلطی سے اجتناب کیا گیا ہے تاہم فعل ظن کے بعد مذکور ہونے والے ''اَن'' کا اپنے صلہ سے مل کر مصدر منسلخ ہونے کے اُصول کو پامال کیا گیا ہے نہ صرف اتنا بلکہ اِس کے ساتھ لفظ ''عنقریب'' کا بے مصرف اضافہ کر کے ترجمہ کی تعریف سے ہی عدول کیا گیا ہے جو قابلِ معافی نہیں ہے جبکہ اُس کے بعد والے چاروں میں علم نحو کے مذکورہ دونوں اُصولوں سے خلاف کیا گیا ہے جنہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرات نے یہ سب کچھ لکھتے وقت علم نحو کی اہمیت کو بالائے طاق رکھا تھا اور فعل ظن سے متعلق علم نحو کی کتابوں میں پڑھے ہوئے مذکورہ اُصولوں کو کتابوں میں بھول گئے تھے (فالی اللہ المشتکی)

---

(۱) البقرۃ:46۔

6 ترجمہ کیے جانے والی آیات کی نحوی حیثیات کے سلسلہ دراز میں اِس بات کو سمجھنا بھی ضروری ہے کہ آیت کریمہ موصول ہے یا مفصول یعنی عطف کے قبیل سے ہے یا بغیر عطف کے اور موصول ہونے کی صورت میں حرف واصل یعنی حرف عطف کی نوعیت پر اطمینان ہونا ضروری ہے (و، ف، ثم، حتّٰی، او، اِما، اَم، لا، بَل، لکن) کی فہرست میں موجود کون سا حرف ہے اور کس مقصد کے لیے استعمال ہوا ہے مثلاً (ثم) ہے تو تاخر زمانی کے لیے ہے یا تاخر کلامی یا تاخر رتبی کے لیے اِسی طرح اگر (او) ہے تو اُس سے مقصد کو جاننا ضروری ہے کہ اختیار کے لیے ہے یا اباحت کے لیے، شک کے لیے ہے یا تشکیک یا ابہام کے لیے یا تنویع و تقسیم کے لیے تقریبا یہی صورتیں (اِما) میں بھی ہوسکتی ہیں اور اسی طرح اگر (اَم) ہے تو تسلی ہونا ضروری ہے کہ متصلہ ہے یا منقطعہ ورنہ بے اطمینانی و نا سمجھی کی وجہ سے ایک کا ترجمہ دوسرے میں کرنے کی غلطی ہوسکتی ہے جو معنوی تحریف کہلائے گی (اعاذنا اللہ منہ)

اِسی طرح اگر (لکن) ہے تو دیکھنا ہوگا کہ اس کے ساتھ (واو) ہے یا نہیں یہ تمیز اس لیے ضروری ہے کہ (لکن) کا حروف عاطفہ میں شمار ہونے اور عطف کا کردار ادا کرنے کے لیے مسلمہ شرط ہے کہ اُس کے ساتھ (واو) نہ ہو ورنہ (ولکن) ہونے کی صورت مین (لکن) عطف کے لیے ہرگز نہیں بلکہ استدراک کے لیے متعین ہوجاتی ہے اور عطف کے لیے (واو) مشخص ہوجاتی ہے گویا جس آیت کریمہ میں بھی (ولکن) ہو وہاں پر عطف اور استدراک کا اجتماع ہوتا ہے اور یہ بمنزلہ استثناء منقطع ہوتا ہے جس کے مابعد والے جملہ کا مفہوم ماقبل والے جملہ کے مفہوم کے منافی ہونے کے باوجود آپس میں معطوف و معطوف علیہ کہلاتے ہیں اور کلام کی استثنائی صورت اُس کی عطف والی صورت پر غالب ہوتی ہے کیوں کہ مستثنیٰ منقطع حقیقت مین مستقل کلام ہوتا ہے علم نحو کے ہمع الھوامع شرح جمع الجوامع للسیوطی میں ہے:

''لانه فی حکم جملة منفصلة عن الاولیٰ''(۱)

یعنی مستثنیٰ منقطع پہلے والے جملہ سے جدا مستقل جملہ کے حکم میں ہے۔

---

(۱) ھمع الھوامع، ج:1، ص:223، مطبوعہ منشورات الرضی قم ایران۔

مترجم پر لازم ہے کہ قرآن شریف کے ایسے تمام مقامات کا ترجمہ کرتے ہوئے اِس اُصول کو پیشِ نظر رکھ کر ترجمہ والی زبان سے اِس کے مطابق الفاظ و انداز اختیار کرے ورنہ ترجمہ غلط ہو سکتا ہے جسے اصل کے مطابق اور معیاری نہیں کہا جا سکتا جس کی مثالوں کے لیے مشتے نمونہ از خروارے سورۃ البقرہ، آیت 57 کے حصہ ''وَلٰکِنْ کَانُوْا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ'' کے درج ذیل تراجم کو دیکھا جا سکتا ہے (اور لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے، ولیکن آپ اپنا ہی نقصان کرتے رہے، اور لیکن تھے وہ اپنے آپ ہی پر ظلم کرتے) جو محض اِس وجہ سے غلط ہیں کہ اِن میں علم نحو کے مذکورہ اُصول سے خلاف کیا گیا ہے ورنہ اول الذکر اور آخر الذکر میں لکھا گیا لفظ (اور) کا کیا جواز ہے ظاہر ہے کہ مترجمین نے اِسے آیت کریمہ کے حصہ (ولکن) میں مذکور (واو) کا متبادل اور اُس کا ترجمہ کے طور پر لکھا ہے جبکہ مذکورہ اُصول کے مطابق اُس کی عطف والی حیثیت (لکن) کی استدراک و استثنائی حیثیت کے غلبہ کی وجہ سے مغلوب اور غیر موثر ہو چکی ہے اور اُس کا مابعد ماقبل سے متصل نہیں بلکہ منقطع ہو چکا ہے اِسی طرح ثانی الذکر ترجمہ میں (ولیکن) کہنے کا بھی جواز نہیں ہے کیوں کہ یہاں پر اول الذکر اور آکر الذکر سے برعکس متن کے لفظ (و) کو ترجمہ کا جزو بنانے کے لیے اعادہ کیا گیا ہے، بہر حال ترجمہ کے اِن دونوں طریقوں میں آیت کریمہ میں مذکور لفظ (ولکن) کے واو کی عطف والی حیثیت کو موثر سمجھ کر ایسا کیا گیا ہے جو اُس کی نحوی حیثیت سے غفلت کا نتیجہ ہے انجام کار اِن تراجم کی حیثیت مفصول متن کا ترجمہ موصول میں کرنے کی غلطی سے مختلف نہیں ہے جبکہ اُس کی مذکورہ نحوی حیثیت کے مطابق ترجمہ (ہاں اپنی جانوں کا بگاڑ کرتے تھے، لیکن اپنی جانوں پر ہی ظلم کرتے تھے، مگر اپنی جانوں کا ہی نقصان کرتے رہیں'' جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے، اسلاف کے کیے ہوئے معیاری تراجم میں اِس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

اِس کی **دوسری مثال** سورۃ البقرہ، آیت نمبر 272 کے حصہ ''وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ '' کے درج ذیل ترجموں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے (اور لکن اللہ راہ پر لاوے جس کو چاہے، و لیکن خدا تعالیٰ جس کو چاہیں ہدایت پر لے آئیں، اور لیکن اللہ تعالیٰ خود ہی اختیاری ہدایت کی توفیق

دیتا ہے جسے چاہتا ہے) اِن تینوں کی غلطی کی بھی وہی وجہ اور وہی تفصیل ہے جو سابقہ مثال میں بیان ہوئی ہے کیوں کہ علم نحو کے مذکورہ اُصول کے حوالہ سے لفظ (وَلٰکِن) اور (وَلٰکِنَّ) میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے کہ دونوں کی استثنائی واستدراکی حیثیت عطف کی حیثیت پر غالب ہو کر اُسے معنوی طور پر کالعدم کر رہی ہے گویا اِن کی غلطی کی حیثیت بھی پہلے کی طرح بناء الغلط علی الغلط یا بنا الغلط علی الغفلہ سے خالی نہیں ہے۔ یہ تراجم بالترتیب مولانا محمود الحسن اور اشرف علی تھانوی اور مولانا نعمت اللہ چشتی نے کیے ہیں یہاں پر بھی پہلی کی طرح آیت کریمہ کی نحوی حیثیت کے مطابق ترجمہ (ہاں اللہ راہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے، ہاں اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے، لیکن اللہ ہدایت دے جسے چاہے) جیسے کسی بھی انداز میں ممکن ہے لیکن صرف اُن خوش نصیبوں کے لیے جو آیت کریمہ کے مذکورہ نحوی حیثیت کے ساتھ دوسری تمام شرائط کا بھی ادراک رکھتے ہوں ورنہ ایسا ہی ہوگا جیسا مترجمین نے کیا ہے یا کر رہے ہیں۔

7 ترجمہ کیے جانے والی آیت کریمہ کی نحوی حیثیت کے سلسلہ دراز میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ آیت کریمہ کا کوئی حصہ مصدر ہونے کی صورت میں مترجم کو اُس کے متعلق پوری طرح بصیرت ہونا ضروری ہے کہ آیا نفس مصدر ہے یا مصدر معلوم یا مجہول، نیز حاصل بالمصدر معلوم ہے یا حاصل بالمصدر مجہول ورنہ ایک کی جگہ دوسرے کا ترجمہ کرنے کی غلطی ہو سکتی ہے جیسا سورۃ بقرہ، آیت 164 کے ابتدائی حصہ ''اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' کے کیے گئے تراجم (بے شک آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے، بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، بے شک تخلیق میں آسمانوں کی اور زمین کی، بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں، بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں، بے شک آسمان وزمین کے پیدا کرنے میں، بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں) یہ تراجم بالترتیب غزالی زمان سید احمد سعید الکاظمی، مفتی غلام سرور القادری، ڈاکٹر طاہر القادری، حافظ صلاح الدین یوسف ومعاونین، مولانا محمود الحسن، اشرف علی تھانوی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، فتح محمد جالندھری اور مولانا مفتی تقی عثمانی جیسے

مشاہیر نے کیے ہیں جو محض اس وجہ سے غلط ہیں کہ ان میں متن کے لفظ (خـــلـــق) جو مصدر بمعنی حاصل بالمصدر المجہول ہے ترجمہ نفس مصدر میں کیا گیا ہے جیسا اُن کے الفاظ (پیدا کرنے، تخلیق، بنانے) سے صاف ظاہر ہے کیوں کہ اُردو محاورہ میں یہ تینوں الفاظ نفس مصدر کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں جبکہ آیت کریمہ میں لفظ (خلق) نفس مصدر کے مفہوم میں ہونا ممکن نہیں بلکہ حاصل بالمصدر المجہول کے مفہوم میں متعین ہے۔

اِس کی تفصیل اِس طرح ہے کہ پیش نظر آیت کریمہ کے آٹھوں حصوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پر دلیل کے طور پر سمجھانے کے لیے نازل فرمایا ہے اور قرآن شریف میں جہاں کہیں بھی توحید کی کوئی دلیل بیان ہوئی ہے وہ اَوّلیّات، فطریات، وجدانیات، حدسیات اور محسوسات ومشاہدات جیسے بدیہیات سے خالی نہیں ہے کیوں کہ بدیہیات کو سمجھنے میں مسلم وغیر مسلم اور موحد ومشرک کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ یہاں پر بھی جن آٹھ چیزوں یعنی زمین وآسمان کی پیدائش کا نظام، دن رات کے بدلتے آنے کا نظام، لوگوں کے فائدے پر مشتمل ہو کر کشتی کا دریا میں چلنے کا نظام، بارش برسائے جانے کا نظام، پانی کے سبب سے مردہ زمین کو زندہ کرنے کا نظام، اُس کے سبب سے جملہ انواع حیوانات کو پھیلانے کا نظام، ہواؤں کی گردش کا نظام، زمین اور آسمان کے درمیان غیبی حکم کا تابع بادل کا نظام۔ اِن میں سے ایک ایک نظام کو اللہ تعالیٰ نے دلیل توحید کے انداز میں بیان فرمایا ہے اور اِن کو نازل کرنے سے بنیادی مقصد وعبارۃ النص اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ لوگ اِن کو سمجھنے کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی وحدۃ استحقاق عبادت کو سمجھ سکیں کیوں کہ اِن میں سے ہر ایک نظام کا صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے پر سب کو یقین ہے، جس میں مسلم وغیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے جبکہ اللہ کی توحید یعنی وحدۃ استحقاق عبادت اور بلا شرکت غیر تنہا لائق عبادت ہونے پر سب کو یقین حاصل نہیں ہے بلکہ مسلم وموحد کے سوا باقی انسانوں میں بعض کو اِس سے انکار ہے جبکہ بعض کو شک ہے تو پیش نظر آیت کریمہ میں اِن نظام ہائے متعددہ کے ذریعہ اُنہیں سمجھایا جا رہا ہے کہ جب تم سمجھتے ہو کہ اِن میں سے ہر ایک کا خالق ومالک صرف وہی غیبی

طاقت ہے جس کو اللہ کہا جاتا ہے، تمہیں یقین ہے کہ اِن نظاموں کا خالق و مالک ہونے میں وہ تنہا وحدہ لاشریک ہے تو پھر اُس کا لائق عبادت ہونے میں وحدہ لاشریک اور تنہا و یکتا ہونے پر یقین کیوں نہیں کرتے حالانکہ تم اِس بات کو بھی جانتے ہو کہ جو ہستی بھی اِن نظاموں کا بلا شرکت غیر خالق و مالک ہو مستحق عبادت بھی وہی ہو سکتی ہے اور توحید فی القدرۃ والاحسان کے اِن تمام نظاموں کا تعلق بدیہیات کے نوع مشاہدات کے قبیل سے ہے اِس لیے کہ ہر شخص زمین و آسمان کی پیدائش کے نظام سے لے کر فضا میں حکمِ الٰہی کے پابند بادل کے نظام اور اِس سسٹم کو آنکھوں سے دیکھ کر یقین کر لیتا ہے کہ اِس کا خالق و مالک صرف اللہ یعنی وہی غیبی طاقت ہے۔ اِس کے ساتھ پیش نظر آیت کریمہ کی ترکیبی حیثیت کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے وہ اِس طرح ہے کہ آیت کریمہ کے مذکورہ تمام حصے اپنے اپنے متعلقات سے مل کر لفظ ''اِنَّ'' کے لیے خبر مقدم ہیں جبکہ آیت کریمہ کا آخری حصہ ''لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ'' اِس کے لیے اسم مؤخر ہے جس کے مطابق علم نحو کے تقاضے سے پوری آیت کریمہ چھ ترکیبوں میں اِس طرح تقسیم ہوتی ہے:

① ''اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ''

② ''اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ''

③ ''اِنَّ فِی الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ''

④ ''اِنَّ فِیْ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ''

⑤ ''اِنَّ فِیْ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ''

⑥ ''اِنَّ فِی السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ''

اِن حقائق کو پیش نظر رکھنے والے کسی بھی اہل علم سے مخفی نہیں رہ سکتا کہ اِن تراکیب میں سے پہلی قسم میں مذکور ''خلق'' مخاطبین کے لیے مشاہدات و محسوسات کے قبیل سے تب ہو سکتا ہے کہ جب حاصل بالمصدر مجہول کے معنی میں ہو ورنہ نفس مصدر کے مفہوم میں ہونے کی صورت میں محسوس و

مشاہدہ کے قبیل سے ہونا ممکن نہیں ہے۔ اِس لیے کہ ''خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' بمعنی آسمان و زمین کو پیدا کرنے اور بنانے کے مفہوم میں اُس وقت کا واقعہ ہے جبکہ وقت بھی نہیں تھا اور انسانوں سے غیب تھا اور غیب وہ چیز ہے جس کا ادراک عقل سے ہوسکتا ہے نہ حواس سے جبکہ آیت کریمہ دلیل توحید کے قبیل سے ہونے کی بناء پر مُدرَک بالعقل والحواس ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے چہ جائیکہ غیب ہو۔ ایسے میں آیت کریمہ ''اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' کا ترجمہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں کرنا درست ہوسکتا ہے نہ پیدا کرنے میں کرنا کیوں کہ یہ نفس مصدر اور مقولہ فعل سے ہونے کی بناء پر اُس وقت کے ساتھ خاص ہوتا ہے جس میں واقع ہوا ہے جبکہ آیت کریمہ کا تعلق وقت نزول سے لے کر قیامت تک وجود میں آنے والے انسانوں کے ساتھ ہے ایسے میں آیت کریمہ کا ترجمہ ''آسمانوں اور زمین کے بنانے اور پیدا کرنے'' کے ساتھ کرنے کو کسی صورت بھی جائز نہیں کہا جاسکتا، متن کے مطابق اور معیاری ترجمہ نہیں کہا جاسکتا بخلاف حاصل بالمصدر معلوم یا حاصل بالمصدر مجہول کے اِس لیے کہ یہ فاعل کے ساتھ یا مفعول بہ کے ساتھ قائم ہونے کی وجہ سے سریع الزوال نہیں ہوتا بلکہ حاصل بالمصدر مجہول مفعول بہ کی صفت اور اُس کے ساتھ قائم ہونے کی بناء پر اُس کی تا دیر بقاء کے مطابق باقی رہ سکتا ہے پیش نظر آیت کریمہ یعنی ''اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' (۱) میں لفظ ''خلق'' کا یہی حال ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش والی صفت حاصل بالمصدر مجہول کی شکل میں اِن کے ساتھ ایسی قائم ہے کہ جب تک وہ موجود ہیں یہ بھی موجود ہے۔ اِسی فلسفہ کا نتیجہ ہے کہ ہر دورِ تاریخ کا انسان اِن کی پیدائش کا مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے یعنی اِن کی مخلوقیت و موجودیت اور اِن کو وجود میں لائے جانے کے بعد انہیں حاصل ہونیوالی وہ کیفیتِ تسخیر جو اِن کا اپنے خالق و مالک کی طرف محتاج اور اُس کے حکم کے تابع و مسخر ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔ کسی بھی وقت انسان اِس کا مشاہدہ کرسکتا ہے اور کر رہا ہے۔ الغرض آیت کریمہ میں لفظ ''خلق'' حاصل بالمصدر المجہول کے معنی میں ہی متعین ہے۔ جس کے مطابق آیت کریمہ کا معیاری

---

(۱) البقرة:164۔

ترجمہ (بے شک آسمانوں اورزمین کی پیدائش میں، بالیقین آسمانوں اورزمین کی ساخت میں، بلاشبہ آسمانوں اورزمین کی بناوٹ میں) جیسے کسی بھی انداز میں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اُردو محاورہ کے مطابق پیدائش، بناوٹ اور ساخت جیسے الفاظ مصدر مجہول کے انداز پر ہوتے ہیں جو علمی زبان میں مقولہ کیف کے قبیل سے کہلاتے ہیں اور قابلِ ادراک ومحسوس ہوتے ہیں جس وجہ سے اِن کا آیت کریمہ کے مصدر بمعنی حاصل بالمصدر المجہول کے متبادل اور اُس کا قائم مقام ہونا درست ہونے کے ساتھ مقصدِ نزول کے بھی مطابق ہے۔

8 ترجمہ کی صحت کے لیے آیت کریمہ کی نحوی حیثیت کی تمیز کے سلسلہ دراز میں یہ بھی ہے کہ آیت کریمہ کا کوئی لفظ اسم جنس کے قبیل سے ہو جو کبھی مذکر کے لیے، کبھی مونث کے لیے اور مفرد کبھی جمع کے لیے استعمال ہوسکتا ہے یعنی سب کے لیے استعمال ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے ایسے تمام مواقع پر مترجم کو پوری طرح بصیرت حاصل ہونا ضروری ہے کہ یہاں پر کس انداز سے استعمال ہوا ہے ورنہ مذکر کے لیے استعمال ہونے والے مقام کا ترجمہ مونث میں یا اِس سے برعکس اور مفرد کے لیے استعمال ہونے والے مقام کا ترجمہ جمع میں یا اِس سے برعکس کرنے کی غلطی ہوسکتی ہے جس کی مثالوں کے لیے مشتے نمونہ ازخروارے پیشِ نظر آیت کریمہ کے تیسرے حصہ (وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ)(۱) کے درج ذیل تراجم کو دیکھا جاسکتا ہے (اُن کشتیوں میں جولوگوں کے فائدے کا سامان لے کر سمندر میں تیرتی ہیں، اور کشتیوں میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر چلتی ہیں، اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں اور اسباب لے کر، اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں لے کر جو نفع دیتی ہیں لوگوں کو، اور کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان لے کر سمندر میں چلتی ہیں، اور کشتیوں اور جہازوں میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر رواں ہیں، اور جہازوں میں جو لوگوں کے فائدے کی چیزیں (یعنی مال تجارت) سمندر میں لے کر چلتے ہیں، کشتیوں کا لوگوں کو نفع

(۱) البقرة:164۔

دینے والی چیزوں کو لیے ہوئے سمندروں میں چلنا، اور کشتیاں جو دریاؤں میں لیے چلتی ہیں اُس کو جو لوگوں کو نفع دے، اور جہازوں (اور کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کو نفع پہنچانے والی چیزیں اُٹھا کر چلتی ہیں، اور اُن کشتیوں میں جو دریا میں وہ سامان لے کر چلتی ہیں جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے، اور کشتیوں میں جو کہ چلتی ہیں سمندر میں سامان لے کر جو کہ نفع دیتا ہے لوگوں کو، اور جہازوں میں جو دریا میں لوگوں کو نفع دینے والی چیزیں لے کر چلتے ہیں، اُن کشتیوں میں جو لوگوں کے لیے مفید اشیاء لیے سمندروں میں چلتی ہیں، اور کشتیوں میں وہ جو چلتی ہیں سمندر میں ساتھ اُن چیزوں کے جو نفع دیتی ہیں لوگوں کو، اور کشتیوں (جہازوں) میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں مال تجارت وغیرہ دریا میں لے کر چلتے ہیں، اور جہازوں میں جو لوگوں کے فائدے کی چیزیں یعنی مال تجارت سمندر میں لے کر چلتی ہیں، اور اُن کشتیوں میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں میں چلتی ہیں)
یہ تراجم بالترتیب اِن مشاہیر کے کیے ہوئے ہیں مفتی تقی عثانی، مفتی عزیز احمد بدایونی، مولانا محمود الحسن، اشرف علی تھانوی، عاشق الٰہی میرٹھی، علامہ وحید الزمان، فتح محمد جالندھری، عبدالماجد دریا آبادی، مفتی مظہر اللہ دہلوی، مولانا محمد جونا گڑھی، مولانا سید محمد کچھوچھوی، ڈاکٹر طاہر القادری، مولانا مفتی غلام سرور القادری، مولانا نعمت اللہ چشتی نظامی، مولانا عبدالحق دہلوی، مولانا عبدالرحمٰن کیانوی، حافظ صلاح الدین یوسف و شرکاء، سید فرمان علی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، غزالی زمان سید احمد سعید کاظمی جن میں سے بعض نے آیت کریمہ کے لفظ (الفلک) کے ترجمہ کے لیے لفظ (کشتیاں، کشتیوں) جیسے جمع کے الفاظ استعمال کیے ہیں جسے ایک غلطی کہا جا سکتا ہے کہ مفرد مونث کا ترجمہ جمع مونث میں کیا ہے جبکہ بعض نے (جہازوں) کہہ کر دو غلطیاں کی ہیں جو مفرد مونث کا ترجمہ اُس کی ضد یعنی جمع مذکر کی صورت میں ہے جبکہ آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ (اور کشتی کہ دریا میں لوگوں کے فائدے لے کر چلتی ہے، اور کشتی جو دریا میں وہ کچھ لے کر چلتی ہے جو لوگوں کو نفع دے) جیسے کسی بھی انداز میں ہو سکتا ہے جو آیت کریمہ کی نہ صرف نحوی حیثیت بلکہ جملہ حیثیات کے مطابق ہونے کے ساتھ مقصدِ نزول کے بھی مطابق ہے اور ترجمۃ القرآن کی تعریف پر بھی منطبق ہے کہ وہ قرآن

شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہو سکیں۔(۱)

جبکہ یہاں پر آیت کریمہ میں لفظ (الفلك) کا مفرد مونث میں استعمال ہونا امرِ یقینی ہے کیوں کہ اُس کے بعد صفت کے طور پر اسم موصول وصلہ (التی تجری) مفرد مونث ہیں جس میں مذکر کا تصور ہو سکتا ہے نہ جمع کا۔ ایسے میں کثیر تعداد میں مترجمین کے مذکورہ انداز کو آیت کریمہ کے مطابق کون کہہ سکتا ہے ہاں اُن حضرات کی بات ہی اور ہے جنہیں ترجمۃ القرآن کی حقیقت کا اِدراک ہے نہ اُس کی تعریف کا، اُس کی شرائط کا احاطہ ہے نہ احتیاطی تقاضوں کا، اُن کے سامنے ترجمۃ القرآن کے نام سے جو کچھ بھی آتا ہے اُسے معنوی قرآن کہتے جاتے ہیں جو اُن کی ذہنی پسماندگی اور بے بضاعتی کا نتیجہ ہے قرآن شریف کے غلط تراجم مروج ہونے کے المیہ میں ایسے حضرات کو بڑا دخل ہے ورنہ ترجمہ پڑھنے والوں میں اگر 10% بھی اہل شعور ہوتے تو ایسا المیہ کبھی نہ ہوتا مترجمین نے یہاں پر صرف اِسی ایک جگہ غلطی نہیں کی بلکہ اس کے بعد آیت کریمہ کے لفظ (فی البحر) کے ترجمہ میں بھی اِسم جنس (بحر) کا ترجمہ جمع میں کرنے کی غلطی کی ہے جیسا سید احمد سعید الکاظمی، مفتی تقی عثمانی اور صلاح الدین یوسف ومعاونین کے ترجموں میں ہوا ہے۔ اور اس کے بعد آیت کریمہ کے آخری حصہ "والسحاب المسخر بین السماء والارض" میں مذکور اِسم جنس (سحاب) کے ترجمہ میں بھی کچھ مترجمین نے یہی روش اختیار کی ہے جیسا اشرف علی تھانوی کے ترجمہ میں ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات اگر ترجمۃ القرآن کی تعریف کو پیشِ نظر رکھتے تب بھی ایسی غلطی کبھی نہ کرتے اِسی طرح آیت کریمہ کے سیاق وسباق پر نظر رکھتے پھر بھی ایسا نہ کرتے لیکن سب سے آنکھیں پھیر کر وہ کچھ لکھ دیا جسے آیت کریمہ کا معیاری ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے میں اِسم جنس کے مواقع استعمال کی تمیز کو ترجمہ کی صحت کے لیے شرط کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔

9 ترجمہ کی صحت کے لیے آیت کریمہ کی نحوی حیثیات کی تمیز کے سلسلہ میں واو عاطفہ، واو استینافیہ

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج:1، ص:111، مطبوعہ حجازی بالقاهرہ۔

اور واو حالیہ کے مابین تمیز بھی ضروری ہے کیوں کہ اِن سے مقاصد جدا ہیں اور اِن کی حقیقتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں جس کے مطابق واو عاطفہ سے مقصد اُس کے ماقبل و مابعد کو ایک حکم کے ماتحت بتانا ہوتا ہے۔ نیز دونوں کے اعراب بھی ایک جیسے ہوتے ہیں جس وجہ سے انہیں آپس میں تابع ومتبوع اور معطوف ومعطوف علیہ کہا جاتا ہے جبکہ واوِ استینافیہ سے مقصد مستقل کلام ہوتا ہے کہ جس جملہ پر بھی داخل ہوتا ہے وہ اپنے ماقبل و مابعد سے جدا ہوتا ہے جس وجہ سے اسے جملہ معترضہ بھی کہتے ہیں اور اِس واو کو واو استینافیہ کہنے کی طرح واوِ اعتراضیہ بھی کہا جاتا ہے جبکہ اِس جملہ کا ماقبل کے اعراب اور اُس کے حکم سے کسی قسم کا بھی اعرابی ربط نہیں ہوتا جس وجہ سے اِس کے متعلق ''لا محل لها من الاعراب '' کہا جاتا ہے اور واوِ حالیہ سے مقصد اُس سے ماقبل جملہ میں موجود کسی ذوالحال کی ہیئت کذائیہ بتانا ہوتا ہے اور اس کے مابعد مذکور ہونے والا جملہ حالیہ کہلاتا ہے اور محل نصب میں ہوتا ہے یعنی منصوب ہونے کے سوا کسی اور اعراب کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ گویا حقیقت اور مقاصد کے حوالہ سے یہ تینوں ایک دوسرے کی ضد ہیں جس وجہ سے ایک کی جگہ دوسرے کو استعمال کرنا جائز نہیں ہوتا ورنہ کلام بلاغت کے دائرہ سے نکل جائے گا تو پھر ایک کا ترجمہ دوسرے میں کرنے کو جائز کون کہہ سکے لیکن اِس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ برصغیر پاک وہند کے بڑے بڑے مشاہیر نے اِس سے غفلت برتی ہے جس کی مثالوں کے لیے مشتے نمونہ از خروارے سورۃ الصّف شریف کی آیت نمبر 5 کے حصے ''وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ لِمَ تُؤْذُونَنِي وَقَدْ تَعْلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ '' کا مولانا محمود الحسن کا کیا ہوا یہ ترجمہ دیکھا جا سکتا ہے (اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم میری کیوں ستاتے ہو مجھ کو اور تم کو معلوم ہے کہ میں اللہ کا بھیجا آیا ہوں تمہارے پاس) جسے اصل کے مطابق اور معیاری نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ آیت کریمہ کے حصہ (وَقَدْ تَعْلَمُونَ) پر آئی ہوئی واو عاطفہ نہیں بلکہ حالیہ ہے جس میں نحاۃ کے دو رائے ہیں نہ بلغاء کی اور مفسرین کا اختلاف ہے نہ اہل لُغت کا تو پھر اُس کا معیاری ترجمہ (جبکہ تم جانتے ہو کہ میں اللہ کا بھیجا آیا ہوں تمہارے پاس، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں بالیقین اللہ کا رسول

ہوں تمہاری طرف) جیسے کسی بھی انداز میں کرنے کے بجائے لفظ (اور) کہہ کر واوِ عاطفہ کے انداز میں کرنے کا کیا جواز ہے ظاہر ہے کہ اِس غلطی کا پسِ منظر ترجمہ کی صحت کے لیے مذکورہ شرط سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے بطورِ دانے از انبارے دوسری مثال ''فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ''(۱) جس میں شرط وجزا کے مابین یعنی (فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا) اور (فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ) کے مابین مذکور فعل یعنی (وَلَنْ تَفْعَلُوْا) جملہ استینا فیہ ہے جس پر آئی ہوئی واوِ عاطفہ نہیں بلکہ واوِ استینا فیہ ہے جس میں کسی حوالہ سے بھی دورائے نہیں ہیں جس کے مطابق آیت کریمہ کا با مقصد اور معیاری ترجمہ (پھر اگر نہ لاسکو ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے تو ڈرو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، پھر اگر نہ کر سکیں ہم بتائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ کرسکو گے تو ڈرو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں) جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا ہے جو واوِ استینا فیہ سے مقصد کو ظاہر کرنے کے ساتھ واوِ عاطفہ کے اشتباہ سے بھی محفوظ ہے اور ترجمہ کی تعریف پر منطبق ہونے کے ساتھ جملہ شرائط کے بھی مطابق ہے۔لیکن اِس کی توفیق اُن ہی کو نصیب ہوسکتی ہے جو شرائط کا احساس رکھتے ہیں اور ترجمۃ القرآن کے احتیاطی تقاضوں کی پابندی کرتے ہیں ورنہ ایسا ہی ظلم ہوگا جیسا عام تراجم کی شکل میں ملتا ہے۔(اعاذنا اللہ منہ)

ایک اشتباہ کا ازالہ:۔ یہاں پر ممکن ہے کسی کے دل میں یہ تصور پیدا ہو جائے کہ ترجمہ کے اِس انداز کو ترجمۃ القرآن کی تعریف پر منطبق کیونکر کہا جائے جبکہ اِس میں مذکور الفاظ (ہم اعلان کرتے ہیں، اور ہم بتائے دیتے ہیں) متن کے کسی لفظ کے عوض نہیں ہیں جبکہ ترجمہ کے ہر لفظ کا متن کے کسی لفظ عوض ہونا ضروری ہے کیوں کہ ترجمہ کی تعریف ہے کہ وہ اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہوسکیں جیسا ''ابدال لفظةٍ بلفظة تقوم

---

(۱) البقرۃ:24۔

مـقـامـهـا "(۱) یہاں پر آیت کریمہ میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہے کہ ترجمہ کے اِن اضافی الفاظ کو اُن کا عوض کہنا درست ہو؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ قرآن شریف کے الفاظ مُعوّض عنہ ہونے کی حیثیت سے دو قسم ہیں:

پہلی قسم: جو حقیقتاً مذکور ہوں، **دوسری قسم:** جو حکماً مذکور ہوں۔

جس میں مذکورِ التزامی، مذکور اقتضائی، دلالۃ النص، اشارۃ النص اور بیانِ ضرورت جیسے تمام اُمور شامل ہیں پیشِ نظر آیت کریمہ اور اس کے معیاری ترجمہ میں بھی ایسا ہی ہے کہ بادی النظر میں جس لفظ کو متن سے اضافہ اور بلاعوض تصور کیا جا رہا ہے۔ حقیقت میں وہ مذکور التزامی ہے کیوں کہ واوِ استینا فیہ کے تصور کو اس کا تصور لازم ہے نہ صرف اتنا بلکہ ملزوم کے طور پر واوِ استینا فیہ کے وجود کو اِس کا وجود بھی لازم ہے فرق صرف وجود حقیقی اور وجود حکمی کا ہے جیسا مذکور التزامی کہنے سے آپ ہی پہچانا جاتا ہے۔

یہی صورت واوِ حالیہ کے ترجمہ کی بھی ہے کہ اُس کے تصور کو بھی حال کا تصور لازم ہے جبکہ عطف اور اُس کے لوازمات اور احکام کا تصور واوِ استینا فیہ میں ہے نہ واوِ حالیہ میں۔ حقائق کی اِس روشنی میں واو کی صورت میں استعمال ہونے والے اِن تینوں متضاد حقائق کی تمیز کو ترجمہ کی صحت کے لیے شرط قرار دیئے بغیر کون رہ سکتا ہے ورنہ ایک کا ترجمہ دوسرے میں کرنے کی غلطی ہو سکتی ہے۔ جس کی مثال کے لیے مشتے نمونہ از خروارے مفتی تقی عثمانی کے اِس ترجمہ کو دیکھا جا سکتا ہے (پھر بھی اگر تم یہ کام نہ کر سکو، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکو گے تو ڈرو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے) جس میں واوِ استینا فیہ کا ترجمہ اُس کے لازم میں کرنے کے بجائے واوِ عاطفہ میں کیا گیا ہے جو قابلِ معافی نہیں ہے ترجمہ کی حد سے نکلنے اور غلط قرار پانے کے لیے اتنا ہی کافی تھا جتنا اُردو مترجمین کی غالب اکثریت نے کیا ہے لیکن مفتی تقی عثمانی صاحب نے اِس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج:1، ص:111، مطبوعہ حجازی بالقاہرہ۔

واوِ استینافیہ کے مابعد جملہ مستانفہ معترضہ کو ماقبل والے جملہ شرطیہ پر معطوف ظاہر کرنے کے لیے اُردو رسم الخط کے مطابق عطفیہ (،) بھی لگا دیا۔ (فیاللعجب لھذاالعجب)

ضروری وضاحت:۔ قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم اور فنون خادمہ والی شرط کے سلسلۂ دراز میں علم نحو کے تحت جن اُصولوں کو ہم نے یہاں پر ذکر کیا، اِس سے ہمارا مقصد اہل علم کو اِس طرف متوجہ کرنا ہے کہ اِس فن کے کسی بھی لسانی اُصول وضابطہ سے غفلت پر مشتمل ترجمہ درست نہیں ہوسکتا بلکہ ترجمۃ القرآن کے معیاری ہونے کے لیے اِس کی پابندی ایسی ضروری ہے جیسا انسانی بدن کے لیے ریڑھ کی ہڈی۔ نیز اِن میں نحاۃ کی دو رائے ہیں نہ بلغاء کی بلکہ سب کے مابین متفقہ ہیں جبکہ راجح و مرجوح اور راجح وارجح اور فصیح وافصح کے حوالہ سے اختلافی اُصولوں کی کوئی حد ہے نہ نہایت اور ترجمۃ القرآن کسی نحوی یا کسی بلاغی کی شخصی یا انفرادی رائے پر نہیں بلکہ جمہور اہل فن کے نزدیک متعارف اُصولوں پر مبنی ہوتا ہے اِس لیے ہم نے اِن ہی پر اکتفا کیا ورنہ علم نحو کے ہر اُصول اور ہر پہلو کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جیسا حضرت فضیل ابن عیاض ن (نَوَّرَاللّٰـهُ مَـرْقَدَهُ الشَّرِيْفَ) نے فرمایا: "لن تعلموا القرآن حتی تعرفوا اعرابہ"(۱)

مخصوص شرائط کا اجمال:۔

❶ **فنِ ترجمہ** کے فطری اُصولوں کو پیشِ نظر رکھنا ورنہ کسی ایک اُصول وضابطہ سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوگا۔

❷ ترجمہ کی **عمومی شرائط** کو پیشِ نظر رکھنا ورنہ کسی ایک شرط سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی قرآن شریف کا درست ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوگا۔

❸ **آیت کریمہ کی ترتیب** ملحوظ خاطر رکھنا کہ بغیر کسی ناگزیر ضرورت داعیہ یا جس زبان میں

---

(۱) مقدمہ تفسیر فتح القدیر لمحمد ابن علی الشوکانی الصنعانی المتوفی 1250ھ، المطبوعہ دارالفکر بیروت۔

ترجمہ کیا جا رہا ہے اُس کی تنگیِ دامن کے بغیر ترجمہ کو اصل کی ترتیب کے خلاف کرنا جائز نہیں ہو سکتا ورنہ بلاغت کے حوالہ سے آیت کریمہ کے معنوی حسن اور ترتیب سے متعلقہ مقاصد کا اظہار ترجمہ میں ممکن نہیں رہے گا۔ اِس لیے کہ آیاتِ قرآنیہ کی ترتیب میں فصاحت و بلاغت کو سب سے بڑا دخل ہے۔ جب آیت کریمہ کی ترتیب سے خلاف کی جانے والی تفسیر بھی معیاری نہیں ہوتی تو پھر متن کی ترتیب سے خلاف ترجمہ کے معیاری ہونے کا تصور ہی نہیں رہتا کیوں کہ تفسیر کے مقابلہ میں ترجمہ کا معاملہ زیادہ مشکل اور زیادہ قابلِ احتیاط ہوتا ہے اُصولِ تفسیر میں ترتیبِ متن کی مطابقت کو ضروری قرار دیا گیا ہے جیسا الاتقان فی علوم القرآن کے الفاظ ''وَمُرَاعَاۃُ التَالِیُف ''(۱) سے واضح ہے۔

اِس شرط کی خلاف ورزی کرنے کی مثالوں میں ''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ''شریف کا کیا گیا مندرجہ ذیل ترجمہ دیکھا جا سکتا ہے''شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے''جس میں متن کی ترتیب سے خلاف کر کے لفظ''اِسم''یعنی اسم اللہ کے مفہوم کو آخر میں رکھا گیا ہے جو کئی وجوہ سے غلط، خلاف الاصل اور متن کی بلاغی حیثیت کے منافی ہے جو کسی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جو''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ''شریف کی بلاغی حیثیت کے ساتھ اُس کے عرفانی اور واقعی حیثیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کی اِس بے ڈھنگی صورت کا جائزہ لے۔

۲ قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ عُلوم وفنون کو ملحوظ خاطر رکھنا کہ اُن میں سے کسی کے اُصول وضوابط سے برعکس نہ ہو ورنہ آیت کریمہ کا حقیقی مفہوم اور اُس کا مقصدِ نُزُول دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ اِس شرط کے مندرجہ ذیل حصے ہیں؛

(i) آیت کریمہ کی صرفی حیثیت کو ملحوظ رکھنا یعنی متن اگر اسم ہو تو ترجمہ بھی اسم کے انداز میں کیا جائے ورنہ فعل کا ترجمہ اِسم میں اور اِسم کا ترجمہ فعل میں کرنے سے اصل کا مفہوم بدل سکتا ہے۔

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:185، مطبوعہ حجازی بالقاہرہ۔

اِسی طرح مفرد متن کا ترجمہ مفرد میں اور تثنیہ یا جمع والے متن کا ترجمہ تثنیہ وجمع کے انداز میں کیا جائے۔ مذکر کا ترجمہ مذکر میں اور مؤنث کا ترجمہ مؤنث میں، فعلِ معلوم کا معلوم کے انداز میں اور مجہول کا ترجمہ بھی مجہول کے انداز میں کیا جائے ورنہ برعکس ہونے کی صورت میں ترجمہ کو اصل کے مطابق نہیں کہا جاسکتا مگر یہ کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے واضح مجبوری اور تنگی دامن کا عارضہ ہو یا کوئی بلاغی یا محاورتی عارضہ کا غلبہ ہو لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ جیسا تفسیر اتقان کے الفاظ ''قَالَ العلماء يَجِبُ عَلَى الْمُفَسِّر اَن يَتَحرىٰ فِي التَّفْسِيْر مُطَابَقَة المُفَسَّرِ'' سے واضح ہے۔(۱)

اِس کی خلاف ورزی کی مثال سمجھنے کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۷ ''وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ'' کے کیے گئے تراجم کے اِس نمونہ کو دیکھا جاسکتا ہے ''اور چھوڑا اُن کو اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے''، جس میں متن کے لفظ مؤنث ''ظُلُمٰتٍ'' جو ''ظلمة'' کی جمع اور مؤنث ہے کے ترجمہ میں ''اندھیریوں میں'' کہنے کے بجائے اندھیروں میں کہہ کر متن کی لسانی حیثیت کے خلاف کیا گیا ہے جس میں مترجمین کی غالب اکثریت مبتلا ہے۔

اِسی طرح سورۃ البقرہ، آیت نمبر 30 ''اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً'' کا کیا گیا یہ ترجمہ ''ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب''، جس میں ترجمہ والی زبان کی طرف سے کسی مجبوری کے بغیر متن کے اِسم فاعل لفظ ''جَاعِلٌ'' کا ترجمہ مستقبل میں کرنے کی غلطی کی گئی ہے جس کا منشاء شاید یہ ہو کہ مترجم نے اِسم فاعل کو یہاں پر عامل بنانے کی غرض سے اُس کے مفہوم کو مستقبل کی طرف موڑا ہو حالانکہ صفتِ الٰہی ہونے کے ناطے یہاں پر اِس قیاس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ جو کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جس کی اللہ تعالیٰ کی صفاتِ فعلیہ پر نظر ہو۔

(ii) آیت کریمہ کی نحوی حیثیت ملحوظ خاطر رکھنا یعنی مرکّب تام اور جملہ کا ترجمہ بھی جملہ میں اور

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:185، مطبوعہ حجازی بالقاہرہ۔

مفرد کا ترجمہ بھی مفرد میں، اِسم موصول متن کا ترجمہ بھی موصول کے انداز پر اور اِسم موصوف کا ترجمہ بھی موصوف کے انداز پر، علیٰ ہٰذا القیاس ترجمہ کا آیت کریمہ کی نحوی حیثیت کے مطابق ہونا ضروری ہے ورنہ غلط ہوگا۔(۱)

اِس کی خلاف ورزی پر مشتمل غلط تراجم کی سینکڑوں مثالوں میں سے درج ذیل کو دیکھا جا سکتا ہے جو سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' کے ترجمہ میں کیا گیا ہے ''سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کی پرورش فرمانے والا ہے○ نہایت مہربان بہت رحم فرمانے والا ہے○ روز جزا کا مالک ہے'' یہ ترجمہ محض اِس وجہ سے غلط ہے کہ آیت کریمہ کی نحوی حیثیت سے خلاف ہے کیونکہ نحوی اُصولوں کے مطابق متن کی اِن تینوں آیات کا مجموعہ صرف ایک جملہ ہے اِس تفصیل کے ساتھ کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' میں مذکور اِسم جلالت موصوف ہے جس کے بعد چاروں الفاظ بالترتیب اُس کی صفات ہیں اور موصوف اپنی اِن چاروں صفات کے ساتھ مل کر مجرور ہے حرفِ جار ''ل'' کے لیے جبکہ جار اپنے مجرور سے مل کر باعتبار متعلق خبر ہے ''اَلْحَمْدُ'' کے لیے اور مبتداء وخبر مل کر جملہ اسمیہ لفظاً اور انشائیہ معناً قرار پاتا ہے جس میں نُحاۃ کی دو رائے ہیں نہ مفسرین کی۔ اِس کے مطابق درست ترجمہ یوں ہوسکتا ہے ''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو مالک سارے جہان والوں کا○ بہت مہربان رحمت والا○ روز جزا کا مالک'' جس سے بے اعتنائی کرتے ہوئے مترجمین نے ''رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○اَلرَّحْمٰنِ، رَّحِیْمِ○مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' جیسے اوصاف مفردہ کا ترجمہ بھی جملہ میں کر دیا جسے سننے کے لیے سیبویہ تیار ہے نہ عبدالرحمٰن جامی، امام تفتازانی اِسے گوارا کرتا ہے نہ عبدالقاہر جرجانی۔

(iii) آیت کریمہ میں واقع الفاظ کی اشتقاقی حیثیت کو پیشِ نظر رکھنا ورنہ ترجمہ کا اصل کے

---

(۱) (i) الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:185، مطبوعہ حجازی بالقاہرہ

(ii) مقدمہ روح المعانی المطبوعہ مع الجلد:1، ص:5، مطبوعہ احیاء التراث العربی بیروت۔

مطابق ہونے کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔جس کی مثال کے لیے سورۃ النمل، آیت نمبر ۲۸ ''فَانظُرْ مَاذَا یَرْجِعُوْنَ'' کا یہ ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے''پھر دیکھو وہ کس بات کی طرف رجوع کرتے ہیں'' جسے اِس مفروضے پرپہنا کیا گیا ہے کہ یہاں پر متن کے لفظ ''یرجعون'' رُجوع سے مشتق ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔اِس کی تفصیل اِس طرح ہے کہ قرآن شریف میں اِس مادہ سے یعنی (ر،ج،ع) سے بنے ہوئے جتنے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں اُن میں سے بعض رجوع سے بنے ہیں اور بعض رَجْعٌ سے بنے ہیں جبکہ رجوع کے دو مفہوم ہیں؛

اوّل:۔ جس شخص یا جس جگہ یا سمت سے آگے بڑھا ہے دوبارہ اُسی کی طرف لوٹنا۔

دوم:۔ کسی قول وفعل اور کردار سے لوٹنا یعنی اُسے ترک کیا جائے۔

اِسی طرح لفظ''رجع'' کے بھی دو مفہوم ہیں:

اوّل: کسی کی بات کا جواب دینا۔ **دوم:** اِعادہ ہونا یا اِعادہ کرنا۔

قرآن شریف کے متعدد مقامات پر استعمال ہونے والے اِن الفاظ سے مرادی مفہوم کو متعین سمجھنے کے لیے کلام کے سیاق وسباق پر نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے جس کے بغیر ایک کی جگہ دوسرے مفہوم کا مغالطہ ہوسکتا ہے،جیسا یہاں پر مترجمین کو ہوا ہے۔آیت کریمہ''فَانظُرْ مَا ذَا یَرْجِعُوْنَ'' (۱) میں سیاق وسباق کا تقاضا اِس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ یہاں پر لفظ''یرجعون'' رجوع سے نہیں بلکہ رَجع سے مشتق ہے اور جواب دینے کے مفہوم میں متعین ہے۔جمہور مفسرین کا موقف بھی یہی ہے جس میں بُلغاء اور نُحاۃ کی دو رائے ہیں نہ مفسرین کی، اہلِ لُغت کی نہ بُلغاء کی۔(۲)

(iv) آیت کریمہ کی نفسِ لُغت جسے علمی زبان میں متن لُغت کہا جاتا ہے کو پیشِ نظر رکھنا کہ

---

(۱) النمل:28۔

(۲) مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی،مادہ(ر،ج،ع)۔

ترجمہ کے الفاظ اُس کے مفہوم سے مختلف نہ ہوں ورنہ ترجمہ غلط ہوگا۔جس کی مثال کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر۴۶ ''اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَاَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ'' کا یہ ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے''وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اِس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے ربّ سے اور اِس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ بے شک اپنے ربّ کی طرف واپس جانے والے ہیں''جس میں متن کے لفظ''ظن'' کا ترجمہ''خیال''میں کرنے کی غلطی کی گئی ہے حالانکہ اِن کی حقیقتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں کہ ظن تصدیقات کے قبیل سے ہے جبکہ خیال تصور کی قسم ہے جس وجہ سے ایک کی جگہ دوسرے کو استعمال کرنا جائز نہیں ہوتا جب ایک کی جگہ دوسرے کا استعمال جائز نہیں ہے تو پھر ایک کا ترجمہ دوسرے میں کیوں کر جائز ہوگا۔(۱)

(v) علمِ بلاغت کے اُصولوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا تاکہ ترجمہ آیت کریمہ کی بلاغی حیثیت کے مطابق ہوسکے ورنہ غلط ہوگا اِس کی مثال بھی نمبر 4 کی مذکورہ مثالوں میں دیکھی جاسکتی ہے جس میں علم المعانی کے مطابق حصر والی آیت''وَاَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ'' کا ترجمہ بغیر حصر کے سادہ انداز میں کیا گیا ہے جسے اصل کے مطابق نہیں کہا جاسکتا۔اِسی فلسفہ کی بناپر علمِ بلاغت کی دونوں قسموں یعنی علم المعانی اور علم البیان میں مہارت کے بغیر قرآن شریف کا ترجمہ وتفسیر کرنے کو ہلاکت کہا گیا ہے۔(۲)

(vi) اسلامی عقائد یعنی علم کلام کے حوالہ سے مسلّمات اسلامیہ کو پیشِ نظر رکھنا ورنہ ترجمہ اصل کے مطابق اور معیاری کہلانے کے قابل نہیں ہوگا اِس کی خلاف ورزیوں کی مثالیں سمجھنے کے لیے مشتے نمونہ از خروارے سورۃ آلِ عمران، آیت نمبر 2 کے لفظ ''الحیّ'' کے اِس ترجمہ''وہ

---

(۱) (i) مفردات القرآن امام الراغب الاصفھانی،مادہ(ظ،ن،)۔

(ii) تفسیر روح المعانی،ج:1،ص:249،تحت الایت نمبر46،سورۃ البقرۃ۔

(۲) مفتاح العلوم للسکاکی،ص:70مطبوعہ بیدارقم تحت بحث علم المعانی والبیان۔

ہمیشہ زندہ'' کو دیکھا جا سکتا ہے جو علم کلام میں صفاتِ باری تعالیٰ کی قسمیں اور ہر قسم کی جدا جدا حقیقت اور مختلف احکام جو بیان ہوئے ہیں اُن سے خلاف ہے تو پھر متن کے مطابق کیوں کہلائے۔ اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفت نہ صرف صفتِ مشبّہ ہے اور ذاتِ الٰہی کو لازم ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی اُن قسموں میں بھی شامل ہے جن کو صفتِ حقیقیہ محضہ کہا جاتا ہے جن کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی اور چیز کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا جس سے بے اعتنائی کرتے ہوئے مترجمین نے یہاں پر تصویر کے صرف ایک رُخ کو پیشِ نظر رکھا کہ یہ صفتِ مشبّہ ہے اور ذاتِ الٰہی کو لازم ہے اُس کی ذات ہمیشہ قائم ودائم ہونے کی طرح یہ بھی ہمیشہ قائم ودائم ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی صفت ہونے کی نوعیت کو نہیں دیکھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات حقیقیہ محضہ کے قبیل سے ہے جس میں کسی غیر کی طرف اضافت بھی معتبر نہیں ہوتی چہ جائیکہ ہمیشگی کو اُس کا جزو بنانا جائز ہو کیونکہ ہمیشگی جس کی بھی ہو زمانہ کی ہی صفت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے غیر ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ حقیقیہ محضہ ہونے کی اِس حقیقت کے مطابق ترجمہ ''آپ زندہ، اپنے آپ زندہ، خودزندہ، ازخودزندہ'' جیسے کسی بھی بے غُبار انداز میں کرنا ممکن ہے تو پھر اُسے چھوڑ کر ترجمہ کو تصویر کے ایک رُخ پر بنا کرنے کا کیا جواز ہے۔ جو علمِ کلام سے غفلت کا نتیجہ ہے جس سے بچنے کے لیے اسلاف نے ترجمہ وتفسیر کے لیے علم العقائد والکلام کو ضروری شرط قرار دیا ہے۔(۱)

(vii) آیت کریمہ جس فن کے زاویہ علم سے متعلق ہو اُس کے متعلق مترجم میں شعور ہونا ضروری ہے ورنہ ترجمہ نہ صرف غلط ہوگا بلکہ اغیار کے لیے موردِ الزام بھی بن سکتا ہے جس کی مثالیں سمجھنے کے لیے سورۃ آلِ عمران، آیت نمبر ۲۷ ''تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ'' کے کیے گئے تراجم کا یہ نمونہ دیکھا جا سکتا ہے ''تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن

---

(۱) (i) الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:181، مطبوعه قاهره مصر۔

(ii) مقلمه تفسیر البحر المحیط، المطبوعه الحلد الاول، ص:7، مطبوعه دار الفکر بیروت۔

کو رات میں داخل کرتا ہے" جو لسانِ قرآنی کے محاورہ کے مطابق تو درست ہے جبکہ اُردو محاورہ میں ایسا نہیں ہے بلکہ ترجمہ میں اِس کے مطابق الفاظ استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے جو آسانی سے ہوسکتا ہے تاکہ یہ تصور ہی پیدا نہ ہونے پائے کہ رات کو دن میں داخل کرنا ممکن ہے نہ دِن کو رات میں داخل کرنا کیوں کہ یہ آپس میں ضدین ہیں اور ضدین کا جمع ہونا معتاد حالات میں محال ہے۔ جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"لَا الشَّمْسُ يَنۢبَغِىْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ "(۱)

اِس کا مفہوم یہ ہے کہ نظامِ شمسی کی سلامتی میں سورج کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ سکے اور نہ رات دِن پر سبقت کرسکے۔

ایسے میں مذکورہ شرط کی اہمیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے جس کے بغیر ترجمہ کا معیاری ہونا ممکن نہیں ہے کیوں کہ ترجمہ کی حقیقت "ابدال لَفظةٍ بِلَفظةٍ تقُوم مَقامها " کے سوا اور کچھ نہیں ہے، یعنی متن کے لفظ کو ترجمہ والی زبان کے لفظ کے ساتھ بدلنا جو اصل کے قائم مقام ہوسکے۔ (۲)

حقیقت کا اظہار:۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یورپ و امریکہ کے مستشرقین کی طرف سے یا کسی بھی دشمنِ اسلام کی طرف سے اِن تراجم کو سامنے رکھ کے قرآن شریف کے ناقابلِ عمل کتاب ہونے اور اسلام کے ناقابلِ عمل مذہب ہونے کا اعتراض اُٹھایا جائے کہ مسلمانوں کی کتاب پوری دنیا کے مشاہدہ کے خلاف پر مشتمل ہے چنانچہ اِسے تسلیم کرنے کے لیے کوئی شخص تیار نہیں ہے اِن حالات میں اِس کا جواب اِن مترجمین سے ہوسکتا ہے نہ اِن کے پڑھنے والوں سے بلکہ ایسے تراجم کے سبب مسلمانوں کو شرمندگی کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا جس کے واحد ذمہ دار یہ مترجمین ہیں۔

حقیقت کی اِس روشنی میں علماءِ حق پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ایسے غیر محتاط اور غیر معیاری تراجم

(۱) یٰسٓ:40۔

(۲) الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:111، مطبوعہ حجازی بالقاھرہ۔

کی نشان دہی کر کے اِن کی ذمہ داری اُٹھانے سے دستبردار ہو جائیں اور قرآن شریف کے ترجمہ کے حوالہ سے درست ریکارڈ کی تبلیغ کریں اور یاد رکھیں کہ اِس حوالہ سے معیاری اور غیر معیاری کی تمیز اگر نہ بتائی جائے تو پھر آگے چل کر کسی وقت بھی اغیار کی طرف سے اعتراضات کے دروازے کھولے جاسکتے ہیں، جس کا نتیجہ اسلام کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔

(viii) عظمتِ شانِ الٰہی، آدابِ نبوی اور شعائر اللہ کے مراتب کو ملحوظِ خاطر رکھنا جو تہذیب الکلام کے تحت درج ہونے کے ساتھ الٰہیات میں بھی نہایت اہم چیز ہے بصورتِ دیگر ثواب کے بجائے گناہ ہونے کے ساتھ ترجمہ بھی غلط ہوسکتا ہے جن کی مثالوں کے لیے بالترتیب سورۃ آلِ عمران، آیت ۱۴۲، اور سورۃ الضُّحیٰ، آیت 7، 8 کے کیے گئے تراجم کو دیکھا جاسکتا ہے ("ابھی تک معلوم نہیں کیا اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم نہیں کیا ثابت قدم رہنے والوں کو"، "اور پایا تجھ کو بھٹکتا ہوا پھر راہ سمجھائی"، "اور اللہ نے آپ کو نادار پایا سو مالدار بنادیا") ظاہر ہے کہ کسی بھی حوالہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف بے علمی کی نسبت کرنا سوء ادب ہونے کے ساتھ خلافِ واقعہ بھی ہے۔ اِسی طرح پیغمبرِ اکرم رحمتِ عالم ﷺ کی طرف بھٹکنے اور نادار و مفلس ہونے جیسی کمزوریاں منسوب کرنا بھی سُوء ادب سے خالی نہیں ہے۔ یہی حال اُن تراجم کا بھی ہے جن میں اِس ناگزیر شرط سے بے توجہی کرتے ہوئے اللہ کی تعظیم و آداب کو انسانوں کی تعظیم و آداب پر قیاس کر کے اُس وحدہ لاشریک کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں یا انسانوں کے باہمی گفتگو کرنے کے انداز پر اُس وحدہ لاشریک کو یاد کیا گیا ہے جن کی شرعی حیثیت بدعت فی الترجمہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اِس شرط کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے الاتقان فی علوم القرآن اور تفسیر روح المعانی دیکھی جاسکتی ہیں۔(۱)

(۱) (i) تفسیر الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:181۔

(ii) مقدمة التفسير الكاشف المطبوعه مع الجلد الاول، ص:9 مطبوعه دار العلم بيروت۔

(iii) مقدمه روح المعانی، ج:1، ص:6۔

(ix) آیت کریمہ کے ایجاز واختصارِ لفظی کوملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کیوں کہ بے مصرف تطویل پر مشتمل ترجمہ اصل کے مطابق اور معیاری کہلانے کے قابل نہیں ہوسکتا،قرآن فہمی کے لیے ناگزیرعلوم آلیہ کے زمرہ میں ایجاز کے نام سے یہ ایسا باریک ولطیف فن ہے کہ اصل معنی مقصودی سے ایک لفظ زیادہ کرنا بھی اِس کے منافی ہے اگرچہ وہ معنی مقصودی کے متعلقات اور اُس کے لوازمات ومناسبات میں شامل ہوتب بھی فن بلاغت اُسے قبول کرنے کے لیے تیارنہیں ہے۔جوعلمِ بلاغت کی کتابوں سے آشنائی رکھنے والے حضرات سے مخفی نہیں ہے،بلاضرورت اصل معنی مرادی سے کسی جملہ کا اضافہ کرنا تو بڑی بات ہےفن بلاغت کے آئمہ اِس حوالہ سے حروف کی بھی ذہنی پیمائش کرتے ہیں اورکسی ضرورت داعیہ کے بغیرایک حرف زیادہ لانے کوبھی غیر مستحسن سمجھتے ہیں۔جیسے مغنی اللبیب عن کُتب الاعاریب میں اِس کے متعلق مستقل باب باندھ کرلکھا ہے:

”یَنبَغِی لِلمُعرب اَن یَتخَیَّرَ مِنَ الْعِبَارَاتِ اَوْ جزَھَا وَ اَجْمَعَھَا لَلمَعْنی المرادِ فَیَقُوْل فِي نَحوِضُرِبَ،فعل ماضِ لَمْ یُسَمَّ فَاعِلُہٗ وَلَا یَقُوْل مَبنِیٌ لِمَالَمْ یُسَمَّ فَاعِلُہٗ لِطُولِ ذٰلِکَ“(۱)

یہاں جس بات کوتطویل قراردے کراُس سے بچنے کا کہا گیا ہےاورجس مختصرکلام کواِس پر ترجیح دی جارہی ہےاُن کے مابین جملہ کانہیں بلکہ تعدادحروف کے موازنہ کے حوالہ سےصرف ایک حرف کافرق ہے۔اِس کے چندسطر بعدلکھا ہے:

”فی الواو، حرف عطف لمجرد الجمع“ اَوْ ”لمطلق الجمع ولا یقول للجمع المطلق“

یہاں بھی صرف ایک حرف کا فرق ہے۔اسی طرح علم بلاغت کی باریکی ولطافت اورضرورت واہمیت کوواضح کرنے کے سلسلہ میں تلخیص المفتاح اوراُس کی شروح مختصرالمعانی ومطول میں بھی

(۱) مغنی اللبیب عن کتب الاعاریب،ج:2،ص:740مطبوعہ دارنشرِ الکتب الاسلامیہ لاھور۔

ایجاز واطناب ومساوات کی بحث میں کسی ضرورت داعیہ کے بغیر مقصود اصلی سے زیادہ الفاظ پر مشتمل ہونے والے کلام کو متکلم کی عاجزی اور اُس کلام کی کمزوری اور ضعف کی دلیل قرار دیتے ہوئے متعدد مثالیں بیان کی ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کے اِس کلام کا:

''لَایُسْئَلُ عَمَّا یَفْعلَ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ''(۱)

مِن حَیثُ البلاغت شاعر کے اِس کلام سے موازنہ کرکے آیت کریمہ کو اعلیٰ اور اُس کے ہم معنی اس شعر: ؎

ونُنکِرُ ان شِئنَا عَلَی النَّاسِ قَوْلَھُمْ　　وَلَا یُنْکِرُوْنَ القَولَ حِیْنَ نَقُولُ

کو کمزور اور ضعیف اور ادنیٰ سمجھے جانے کی واحد وجہ اِس کے الفاظ کے زیادہ ہونے کو قرار دیا گیا ہے جبکہ مفہوم دونوں کا ایک ہے کہ دونوں متکلم یعنی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اور شعر میں شاعر اپنی بالا دستی ظاہر کرنے کے ساتھ دوسروں کی زیر دستی اور اپنی طرف اُن کی محتاجی کا اعلان کرنا چاہتا ہے جس پر اوّل کلام ''آیت کریمہ'' مختصر الفاظ کے ساتھ دلالت کر رہا ہے جبکہ دوسرے کلام ''مذکورہ شعر'' زیادہ الفاظ کے ساتھ دلالت کر رہا ہے۔ اسی طرح کا فیصلہ آئمہ بلاغت نے ایک ہی مضمون کے اظہار کے لیے کیے گئے مندرجہ ذیل دو شعروں سے متعلق کیا ہے: ؎

یَصُدُّعَنِ الدُنیااِذَاعَنَّ سُودَدٌ　　وَلَوبَرَزَت فِی زِیِّ عَذرَاء نَاھِدِ

جس میں شاعر نے عزت وسرداری ملنے کی توقع کی خاطر محبوب سے محبوب دُنیوی آسائشوں سے منہ موڑ کر محنت ومشقت اور غربت کی زندگی اپنانے کی عادت کا اظہار کیا ہے اور اسی مضمون اور مقصد کے اظہار کے لیے دوسرے شاعر کا جو کلام ہے یعنی:

وَلَستُ بِمَیَّالٍ اِلٰی جَانِبِ الغِنٰی　　اِذَاکَانَتِ العُلیاءُ فِی جَانِبِ الفَقرِ (۲)

---

(۱) الانبیاء:23۔

(۲) المطوّل مع التلخیص ومع شرح میر السید السند،ص:300،مطبوعہ بیدار قم ایران۔

اِس کو مقابلۂ بلاغت وموازنۂ فصاحت کے ترازو میں پہلے کے ساتھ تولنے کے بعد پہلے کو اِس پر فضیلت دیکر اِس کے مرجوح ہونے کا فیصلہ محض اِس وجہ سے کیا گیا ہے کہ اِس کے چند حروف پہلے کے حروف سے زیادہ ہیں ورنہ مقصد کے اظہار کے حوالہ سے قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔

علم نحو وبلاغت کی کتابوں میں آئمہ بلاغت کی یہ تصریحات اور معنیٰ مقصودی کی ادائی میں بلا ضرورت زیادہ الفاظ سے بچنے کے لیے یہ اہتمام اور قوانین وضوابط محض اِس مقصد کے لیے مُدَوّن ہوکر بلاغت نام پائے ہیں کہ قرآن فہمی کے لیے اِن سے مدد لی جائے، اِن کو بطور آلہ استعمال کرکے قرآن شریف کی بلاغت کو سمجھا جائے اور آیاتِ قرآنیہ کا ترجمہ اِن کے خلاف نہ کیا جائے۔ اِسی مقصد کی بنیاد پر المطول والمختصر المعانی جیسی دقیق کتب بلاغت کے پڑھنے اور پڑھانے کو عبادت سمجھا جاتا ہے ورنہ اِن میں اور کسی دوسری دُنیوی کتاب میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا، مقامِ افسوس نہیں تو اور کیا ہے کہ تین چار سال لگا کر محنت شاقہ سے یہ فن حاصل کرنے کے بعد جائے استعمال میں اِسے نظر انداز کیا جاتا ہے، اُسے پیش نظر رکھ کر روشنی لینے کے بجائے پس پشت ڈال کر اندھیرے کا سفر اختیار کیا جاتا ہے اور قرآن شریف کا ترجمہ اُس کے خلاف کرکے معکوس العملی کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ایسے غیر محتاط اور غیر معیاری مترجمینِ قرآن پر افسوس کرتے ہوئے امام البلاغت یوسف السکاکی نے قرآن فہمی کے لیے علمِ بلاغت میں مہارت کو ضروری شرط اور ناگزیر ضرورت قرار دینے کے بعد لکھا ہے؛

”فَالوَيْلُ كُلُّ الوَيْلِ لِمَن يَتَعَاطَى التَفْسِيرَ وَهُوَفِيهِمَا راجل“(۱)

یعنی پوری طرح ہلاکت ہے اُس شخص کے لیے جو علم المعانی وبیان میں پیدل وتہی دست ہوتے ہوئے قرآن شریف کی تفسیر کرنے بیٹھ جاتا ہے۔

اِسی طرح کل مکاتب فکر اہل اسلام کے متفقہ امام التفسیر الراغب الاصفہانی نے قرآن فہمی کے لیے علمِ بلاغت کی تینوں قسموں یعنی علم المعانی، بیان اور بدیع میں مہارت کو ناگزیر شرط قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

---

(۱) مفتاح العلوم حصہ بلاغت، ص:70، مطبوعہ بیدار قم ایران۔

"وَلَاحَظَّ فِي مَعْرِفَتِهِ لِمَن لَمْ يَتَوَفَّرْ نَصِيبُهُ مِنَ الْبَلَاغَةِ"(۱)

یعنی قرآن فہمی میں اُس شخص کا حصہ نہیں ہوسکتا جسے علم بلاغت میں وافر حصہ نصیب نہ ہو۔

جب علم بلاغت کے اُصولوں کو پیشِ نظر رکھے بغیر آیاتِ قرآنیہ کی معیاری تفسیر کرنا ممکن نہیں ہے تو پھر ترجمہ کیوں کر ممکن ہوگا جبکہ قرآن شریف کے ترجمہ کا معاملہ تفسیر سے زیادہ مشکل ہے، کثیر الشرائط اور ہمہ جہت مقتضی احتیاط ہے۔

❺ آیت کریمہ کے سیاق وسباق اور کلام کے موضوعِ سخن کو ملحوظ خاطر رکھنا تاکہ ایک سے زیادہ معانی کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ سے مرادی مفہوم۔ نیز حقیقی مفہوم میں یا مجازی معنی میں استعمال ہونے والے الفاظ سے مرادی مفہوم کی پہچان ہو سکے جس کے بغیر آیت کریمہ کا اصل مقصد دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ لِسانِ قرآنی میں استعمال ہونے والے بعض الفاظ اتنے کثیر الجہات ہوتے ہیں کہ اُن سے مرادی مفہوم کی پہچان کے لیے کلام کے موضوعِ سُخن اور اِس کے سیاق وسباق پر نظر رکھنے کے سوااور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔

اِس کی خلاف ورزی کرنے کی مثالوں میں سورۃ البقرہ، آیت نمبر 28 ''كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ'' کے مندرجہ ذیل ترجمہ کو دیکھا جاسکتا ہے'' کافرو تم خدا سے کیونکر منکر ہو سکتے ہو جس حال میں کہ تم بے جان تھے تو اُس نے تم کو جان بخشی پھر وہی تم کو مارتا ہے پھر وہی تم کو زندہ کریگا پھر اُسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے'' جس میں متن کے لفظ''كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ'' کے مصداق کو کافروں کے ساتھ مختص قرار دے کر اُس کے عموم سے خلاف کیا گیا ہے جو سیاق وسباق سے غفلت کا نتیجہ ہے کیوں کہ یہاں پر اِس سے ماقبل ومابعد کی آیات میں عموم ہی عموم ہے کہ مسلم وغیر مسلم دونوں کو یکساں تبلیغ کی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدۃ استحقاقِ عبادت سے انکار کرنے کی کوئی واقعی وجہ موجود نہیں ہے

(۱) مقدمة التفسير المطبوعه مع مفردات القرآن، ص:585، مطبوعه اصح المطابع کراچی۔

جبکہ اُس وحدہ لاشریک کو تنہا مستحق عبادت سمجھنے اور ماننے کے لیے اُس کا نظامِ احیاء و اماتت کافی وشافی دلیل موجود ہے اور تم سمجھتے ہو کہ احیاء و اِمَاتت کے اِس نظام میں وہ لاشریک ہے جو بلاشرکت غیر مستحق عبادت ہونے کے مُوجِب ہے لیکن مترجمین نے سیاق وسباق کے اِس عموم سے بے التفاتی کرتے ہوئے عام کا ترجمہ خاص میں کر کے واقعہ سے خلاف کرنے کے ساتھ جمہور مفسرین سے بھی انحراف کیا ہے جو نا قابلِ معافی ہے۔ اِس لیے کہ یہ ترجمہ کی روح ''ابدال لـفظةِ بلفظةِ تقوم مقامها ''(۱) سے ہی خلاف ہے جو مذکورہ شرائط کو پامال کرنے کا نتیجہ ہے ایسے میں مذکورہ شرط کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے؟(۲)

❻ آیت کریمہ کی لُغوی صفات اور فقہی اقسام کو ملحوظ خاطر رکھنا کہ جس لفظ یا جس مجموعہ کلام کے مفہوم کو مرادِ الٰہی سمجھ کر دوسری زبان میں منتقل کیا جارہا ہے جب تک مکمل یقین حاصل نہ ہو کہ وہ از قبیل خاص ہے یا عام، مشترک ہے یا مؤول، مطلق ہے یا مقید، ظاہر ہے یا نص، مفسر ہے یا محکم، خفی ہے یا مشکل، مجمل ہے یا متشابہ، حقیقت ہے یا مجاز، صریح ہے یا کنایہ۔ اِس حیثیت سے یقین حاصل ہونے کے بعد نفس مفہوم کی حیثیت کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ جب تک مترجم کو اُس کی نوعیت پر یقین نہ ہو کہ آیت کریمہ کے جس مفہوم کو میں دوسری زبان کی طرف منتقل کر رہا ہوں یہ عبارۃ النص کے قبیل سے ہے یا اشارۃ النص کے، دلالۃ النص ہے یا اقتضاء النص اُس وقت تک ترجمہ کے لیے مناسب الفاظ استعمال کرسکتا ہے نہ مناسب انداز۔

اِس شرط کی خلاف ورزی کی مثال کے لیے بھی مذکورہ بالا مثال دیکھی جائے کہ مترجمین نے متن کے لفظ ''کَیْفَ تَـکْـفُـرُوْنَ ''کے فاعل ومخاطب جو سیاق وسباق کے مطابق عام ہے اور مسلم وغیر مسلم، موحد ومشرک سے لے کر ہر اُس انسان کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری و

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:111، مطبوعه حجازی بالقاهره۔

(۲) مقدمه تفسیر البحر المحیط، المطبوعه الجلد الاول، ص6: مطبوعه دار الفکر بیروت۔

ساری نظام اِحیاء واماتت کو سمجھتا ہے کہ اِس میں اُس کے ساتھ کوئی اور شریک نہیں ہے۔ معروضی حالات کی اِس روشنی میں مترجمین کا اُسے کافروں کے ساتھ مختص کرنا عام کا ترجمہ خاص میں کرنے کی غلطی سے خالی نہیں ہے۔(۱)

۷ آیت کریمہ کی تفسیرِ قرآنی ''القرآن یُفَسِرُ بَعضُہُ بعضًا'' کو ملحوظ خاطر رکھنے کے بعد بالترتیب تفسیر نبوی ﷺ اور کل مکاتب فکر اسلاف کے ذخیرہ تفسیر کو ملحوظ خاطر رکھنا، اِس لیے ضروری ہے کہ آیت کریمہ یا اُس کا کوئی حصہ اگر خفی، مشکل یا مجمل کے قبیل سے ہو یا کسی بھی وجہ سے مرادی مفہوم پر دلالت کرنے میں واضح نہ ہو تو اُس کی پہچان کے یہی ذرائع ہیں جن کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر درست ترجمہ ممکن نہیں ہوسکتا۔

جس کی مثال کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 228 ''وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ'' کا کیا گیا مندرجہ ذیل ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے ''مردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے'' جو قرآنی تفسیر کے خلاف ہونے کیساتھ تفسیر نبوی اور جمہور مفسرین کرام سے بھی خلاف ہے کیوں کہ قرآن شریف کے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر مردوں کی مطلق فضیلت و برتری کا فرمایا ہے جو آیت کریمہ ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ'' جیسے نصوص کے عموم سے مفہوم ہو رہا ہے۔ اللہ کے رسول سید عالم ﷺ نے فرمایا؛

''لَوْ کُنْتُ آمِرًا اَحَدًا اَنْ یَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْئَۃَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِھَا لِمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَھُمْ عَلَیْھِنَّ مِنْ حَقٍّ''(۲)

مفسرین کرام نے بھی قرآن وسنت کی اِس روشنی کے مطابق پیش نظر آیت کریمہ میں لفظ ''درجة'' کو اُس کے عموم واطلاق پر ہی جاری رکھا ہے۔ ایسے میں اِس شرط کی اہمیت سے انکار

---

(۱) (i) تفسیر الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:181۔

(ii) مقدمہ روح المعانی، ج:1، ص:6۔

(۲) ابوداؤد شریف۔

کون کرسکتا ہے اِس کا ماخذ بالترتیب مندرجہ ذیل آیت وحدیث اور تصریح اسلاف ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

''وَاَنزَلْنَآاِلَيْكَ الذِّكْرَلِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ ''(۱)

یہ قرآن ہم نے تم پر نازل کیا کہ تو اُنہیں بیان کرے وہ جو اُن کی طرف نازل کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے پوچھنے پر صحابیِ رسول معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا؛

''اَقْضِى بِكِتٰبِ اللّٰهِ قَالَ فَاِنْ لَمْ تَجِدْفِي كِتٰبِ اللّٰهِ قَالَ فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فَاِنْ لَمْ تَجِدْ فِي سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَلَا فِي كِتٰبِ اللّٰهِ تَعَالٰى قَالَ اَجْتَهِدُ بِرَائِى وَلَا آلُو فَضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَدْرَهُ فَقَالَ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِىْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لِمَا يَرْضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ''(۲)

سُنَنِ ابوداوٗد کی تخریج کے مطابق یہ حدیث اگرچہ قضاوۃ سے متعلق ہے تاہم بزرگانِ دین نے قرآن وسُنت کی فہم کے حوالہ سے اِس ترتیب کو اصل الاصول قرار دیا ہے جو اہلِ علم سے مخفی نہیں ہے تو پھر قرآن شریف کے ترجمہ وتفسیر کے لیے اِس کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔

قرآن وسُنت کی خدمت میں عمریں گزارنے والے علماءِ کرام نے لکھا ہے؛

''اِذَالَمْ نَجِدِ التَّفْسِيْر فِي الْقُرْآن وَلَا فِي السُّنَّةِ رَجَعْنَا فِي ذٰلِكَ اِلَى اَقْوَالِ الصَّحَابَةِ فَاِنَّهُمْ اَدْرٰى بِذٰلِكَ لِمَا شَاهَدُوْا مِنَ الْقَرَائِنِ وَالْاَحْوَال اللتى يَخْتَصُّوْا بِهَا وَلِمَا لَهُمْ مِنَ الْفَهْمِ التَّام وَالْعِلْم الصَّحِيْح وَالْعَمَلِ الصَّالِح لَا سِيَّمَا علمائهم و كبرائهم كَالْخُلَفَاء الرَّاشِدِيْن وَالْاَئِمَة الْمهتدين المهديين كَعَبْدُ اللّٰهِ ابنِ مَسْعُوْد رضی اللہ عنہ فَاِذَالَمْ تَجِد التَّفْسِيْر فِي الْقُرْآنِ وَلَا فِي السُّنَّةِ وَلَا

(۱) النحل:44۔

(۲) سُنن ابو دائود شریف،ج:2،ص:149،کتاب القضاء۔

وَجَدْتَهُ عَنِ الصَّحَابَةِ فَقَدْ جَآءَ كَثِيرٌ مِنَ الْأَئِمَّةِ فِي ذٰلِكَ''(۱)

ماضی قریب کے ایک مدبّرِ فی القرآن مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے؛

''معانی وحقائق کی طرح قرآن اپنی ادبی ونحوی مشکلات کے حل کے لیے بھی سب سے زیادہ مستند مرجع وماٴخذ ہے اس حقیقت کو ہمارے پچھلے علماء نے بھی تسلیم کیا ہے۔''(۲)

❽ آیت کریمہ کی حیثیتِ تشبیہ کو ملحوظ خاطر رکھنا (دوسری شرط کی مذکورہ تفصیل کے بعد یہ شرط تخصیص بعد التعمیم کے قبیل سے ہے) یہ اِس لیے کہ جب آیت کریمہ یا اُس کا کوئی حصہ حقیقت، مجازِ مرسل اور کنایہ میں سے کسی ایک کے قبیل سے بھی نہ ہو تو اُس کا تشبیہ کے قبیل سے ہونا امر یقینی بن جاتا ہے اور تشبیہ پر مشتمل کلام اپنی باریک لطافتوں، گونا گوں قسموں اور بیان کے متنوع رموز واسرار کا حامل ہونے کی وجہ سے علم بیان کی جان سمجھا جاتا ہے جس بناء پر علم بلاغت کا حصہ ہونے کے باوجود اُس سے جدا نوعیت کے حامل ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اسی اہتمام کے باعث علم بلاغت کی جملہ مباحث میں اس کو سب سے زیادہ کثیر الجہات اور زیادہ قابل توجہ سمجھا جاتا ہے قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے آیت کریمہ کی اس حیثیت کو ملحوظ خاطر رکھنے کو ناگزیر شرط قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ آیت کریمہ کا تشبیہ کے قبیل سے ہونے کی صورت میں جب تک مُترجم کو اُس کی نوعیت پر یقین نہ ہو کہ یہ تشبیہ کی کونسی قسم ہے استعارہ ہے یا تشبیہ بلیغ اُس وقت تک درست ترجمہ کرنا ممکن نہیں ہوگا کیوں کہ علاقہ تشبیہ پر مشتمل ہونا اِن دونوں کے مابین قدر مشترک ہونے کے باوجود تشبیہ کی یہ دونوں قسمیں آپس میں ضدین کی حیثیت رکھتی ہیں، اِس لیے کہ استعارہ میں مشبّہ کسی انداز سے بھی مذکور فی الکلام نہیں ہوتا جبکہ تشبیہ بلیغ میں اُس کا مذکور فی الکلام ہونا ضروری ہے اور نہ سہی کم از کم منوی فی الکلام ہونا تو ناگزیر ہے۔ ایسے میں مترجم کو تشبیہ کی نوعیت پر یقین نہ ہونے کی صورت میں استعارہ کے قبیل سے

---

(۱) مقدمہ تفسیر البیضاوی المسماۃ بمرآۃ التفسیر، ص:1،مطبوعہ المیزان اُردو بازار لاہور۔

(۲) مقدمہ تدبر قرآن،ج:1،ص:15،مطبوعہ دارالاشاعت اسلامیہ امرت روڈ لاہور۔

آیت کا ترجمہ تشبیہ بلیغ کے انداز میں یا تشبیہ بلیغ کے قبیل سے آیت کریمہ کا ترجمہ استعارہ کے انداز میں کرنے کی غلطی کرسکتا ہے صرف اِس حد تک نہیں بلکہ تشبیہ کی نوعیت پر یقین ہوجانے کے بعد اگر وہ استعارہ کے قبیل سے ہے تو اِس بات پر بھی یقین ہونا ضروری ہے کہ آیت کریمہ اُس کی کونسی قسم میں شامل ہے آیا استعارہ تمثیلیہ ہے یا تخییلیہ، ملکّیہ ہے یا مصرّحہ ورنہ ایک کی جگہ دوسرے کے انداز کا ترجمہ کرنے کی غلطی کرسکتا ہے جس کو قبول کرنے کے لیے آیت کریمہ کی بلاغت تیار نہیں ہے۔ اِسی طرح اگر تشبیہ بلیغ کے قبیل سے ہے تو اِس بات پر بھی مترجم کو یقین ہونا ضروری ہے کہ اُس کی کونسی قسم میں شامل ہے آیا تشبیہ بلیغ کی وہ قسم ہے جس میں مشبّہ بھی مشبہ بہ کی طرح ملفوظ و مذکور فی الکلام ہوتا ہے یا اُس زمرہ میں ہے جس میں مشبّہ محذوف فی الکلام ہوتا ہے یا وہ ہے جس میں مشبہ مذکور ہوتا ہے نہ محذوف و مقدّر بلکہ صرف اور صرف منوی ہوتا ہے۔ یہ اِس لیے ضروری ہے کہ تشبیہ بلیغ کی پہلی دو قسموں کے اور تیسری قسم کے ترجموں کے انداز میں فرق ہوتا ہے کہ پہلی دو قسموں کے ترجمہ میں مشبّہ کو ترجمہ میں ظاہر کرنا ضروری ہوتا ہے جبکہ تیسری قسم کے ترجمہ میں اُس کو ظاہر نہ کرنا ضروری ہے ورنہ ایک کی جگہ دوسرے کا ترجمہ کرنے سے تشبیہ کی حقیقت میں اشتباہ ہوگا، متن کی بلاغت کے منافی ہوگا اور مرادِ الٰہی کے اظہار کے بجائے اُس کی مخالفت ہوگی۔

اس شرط کی خلاف ورزی کی مثال کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 18 ''صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ'' کے مندرجہ ذیل ترجمہ کو دیکھا جاسکتا ہے ''وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں چنانچہ اب وہ واپس نہیں آئیں گے'' جس میں مشبّہ کے لیے لفظ ''وہ'' لاکر متن کی بلاغی حیثیت سے خلاف کیا گیا ہے، اِس لیے کہ یہاں پر منافقین کو بہرے، گونگے اور اندھے کے ساتھ جو تشبیہ دی گئی ہے یہ مفسرین کرام کی تصریحات کے مطابق دو حال سے خالی نہیں ہے:

ایک بعید سا **احتمال** یہ ہے کہ یہ استعارہ تبعیہ ہے۔

دوسرا **احتمال** جو قوی اور مختار عند المحققین ہے یہ کہ تشبیہ بلیغ کی وہ قسم ہے جس میں مشبہ صرف

منوی ہوتا ہے ترجمہ کو اِن میں سے جس پر بھی استوار کیا جائے لفظ ''وہ'' لاکر مشبہ کو ذکر کرنا جائز نہیں ہوتا استعارہ کی صورت میں اِس لیے کہ اُس میں مشبہ کسی طرح بھی مذکور نہیں ہوتا اور تشبیہ بلیغ کی صورت میں اِس لیے کہ یہاں پر متن اُس کی تیسری قسم کے قبیل سے ہے کہ مشبّہ صرف منوی ہے جس کو ترجمہ میں ملفوظ کرنے سے ترجمہ اصل کے مطابق نہیں ہوتا۔

حقائق کی اِس روشنی میں مذکورہ شرط کی اہمیت میں شک کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے، اِس کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے اسلاف نے لکھا ہے:

''وَلاحظَ فِی مَعرِفَتِہٖ لِمَنْ لَمْ یَتَوَفَّر نَصِیْبُہٗ مِنَ الْبَلَاغَۃِ''(۱)

یعنی قرآن شریف کی فہم میں اُس کا نصیبہ نہیں ہوسکتا جس کا نصیبہ علمِ بلاغت میں نہیں ہے۔

اِسی سلسلہ میں تفسیر کشاف کے مقدمہ میں جارہ اللہ الزمخشری کی مشہور عبارۃ کی تشریح کرتے ہوئے اُس کے محشی میر السید السند نے لکھا ہے؛

''ان الاطلاع علی فرائدہ والکشف عن وجوہ خرائدہ لا یحصِلُ الا بِھَا فَھُوَ لَھُمَالَا لغیرِھِمَا''(۲)

یعنی قرآن شریف کے رُموز واسرار پر اطلاع پانا اور اُس کے معارف کے خوبصورت چہروں کو کھولنا علم المعانی وعلم البیان کے بغیر ممکن نہیں ہے گویا قرآن فہمی کے اصل آلہ اور ذرائع یہی ہیں۔

❾ **اصل** کے کسی لفظ یا کسی حصہ کو چھوڑنے سے اجتناب کرنے کیساتھ اُس کے الفاظ پر اپنی طرف سے کچھ اضافہ کرنے سے بھی اجتناب کرنا ورنہ اصل کے کسی حصہ سے بے اعتنائی کرنے کی صورت میں اگرچہ وہ متروک لفظ صرف ایک حرف ہی کیوں نہ ہو اصل کا مفہوم تبدیل ہوسکتا ہے اور متن پر اضافہ کرنے سے ترجمہ کی حد سے نکل کر تشریح وتفسیر کی حد میں داخل ہوگا

(۱) مقدمہ التفسیر امام الراغب الاصفہانی، ص:585 مطبوعہ اصح المطابع آرام باغ کراچی۔

(۲) حاشیہ میر السید السند علی الکشاف، ج:1، ص:16 مطبوعہ دار المعرفت بیروت۔

جبکہ آیت کریمہ کے معیاری ترجمہ میں تشریح وتفسیر ہوتی ہے نہ اصل مفہوم کی تبدیلی ایسے میں اِن دونوں سے اجتناب کا قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کے لیے شرط قرار پانا عین مقتضائے فطرت ہے۔

اِس کی مثال کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 228 ''وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ'' کا کیا گیا مندرجہ ذیل ترجمہ دیکھا جائے ''اور شریعت کے موافق عورتوں کا مردوں پر وہی سب کچھ حق ہے جو مردوں کا عورتوں پر ہے'' جس میں لفظ ''وہی سب کچھ حق ہے جو مردوں کا عورتوں پر ہے'' جیسے الفاظ کو متن پر اضافہ کر کے عورتوں کے لیے وہ تمام حقوق بتائے گئے ہیں جو مردوں کے لیے ثابت ہیں حالانکہ آیت کریمہ سے یہ مقصد ہرگز نہیں ہے۔ ورنہ عورتوں سے متعلق مخصوص حقوق مَردوں کے لیے بھی اور مَردوں سے متعلق مخصوص حقوق عورتوں کے لیے ثابت ماننا پڑے گا جو قرآن وسنت کے منافی اور مضحکہ خیز ہے۔ اور متن کے کسی لفظ کو چھوڑنے کی مثالوں میں وہ تمام تراجم شامل ہیں جن میں آیاتِ کریمہ کی ابتداء میں آئے ہوئے حروفِ عاطفہ یعنی ''واؤ'' اور ''فا'' کے ترجمہ سے بے اعتنائی کر کے اَنجانے میں موصول متن کو مفصول بنایا گیا ہے جو نا قابلِ معافی ہے۔ اِس شرط کی اہمیت سے متعلق امام جلال الدین السیوطی نے لکھا ہے:

''وَاَنْ یَتَحَرَّزَ فِی ذٰلِكَ مِنْ نَقْصٍ لِمَا یُحْتَاجُ اِلَیْهِ فِی ایضَاحِ الْمَعْنٰی اَوْزِیَادَة لَا تلیق بالغرض''(۱)

⑩ ترجمہ کے لیے استعمال کیے جانے والے الفاظ اور اُن کے اندازِ ترتیب کا فصیح و بلیغ ہونا اِس لیے ضروری ہے کہ انسانوں کے کسی بھی فصیح و بلیغ کلام کا ترجمہ اگر فصاحت و بلاغت کے منافی کلام سے کیا جائے تو اُسے معیاری ترجمہ نہیں کہا جاتا۔ جب انسانی کلام کا یہ عالَم ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے اِس معجز کلامِ مقدس کا غیر فصیح و بلیغ انداز میں کیا جانے والا ترجمہ کیونکر معیاری قرار پائے گا۔ اِس کے متعلق امام سیوطی نے لکھا ہے:

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:185، مطبوعہ حجازی بالقاہرہ۔

''یَجِبُ عَلَی الْمُفَسِّرِ اَنْ یَتَحَرّٰی فِی التَّفْسِیْرِ مُطَابَقَۃَ الْمُفَسَّرِ''(۱)

یعنی قرآن شریف کے جس لفظ اور جس حصہ کی تفسیر وترجمہ کررہا ہے ترجمہ کو اُس کے مطابق کرنا واجب ہے کیوں کہ ترجمہ قرآن کی صورت میں مفسر یعنی متن آیت کریمہ ہے جو فصیح بھی ہے بلیغ بھی، لہٰذا ترجمہ کے الفاظ وانداز کا اُس کے مطابق فصیح وبلیغ ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ترجمہ اصل کے مطابق نہیں ہوگا۔

اِس کی خلاف ورزی کی مثال میں ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' شریف کا کیا گیا مندرجہ ذیل ترجمہ دیکھا جائے ''شروع اللہ کے نام سے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے'' جس میں اُس کی نحوی حیثیت کیساتھ بلاغی حیثیت کا بھی خون کیا گیا ہے اِس لیے کہ نحوی اُصولوں کے مطابق اِسم جلالت یہاں پر موصوف اور لفظ ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' اُس کی صفت بعد الصفت ہیں اور ترکیب توصیفی یعنی صفت وموصوف کا مجموعہ مرکب جملہ ہوتا ہے نہ کلام بلکہ جملہ کے مقابلہ میں مفرد ہی ہوتا ہے جبکہ لفظ ہے جملہ کی علامت وپہچان ہے جس کو مفرد کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ حقیقت کی اِس روشنی میں اِن تراجم کو متن کی فصاحت کے مطابق نہیں کہا جاسکتا بلکہ اِس کے علاوہ بھی کئی وجوہ سے غلط ہے۔ کیوں کہ یہ متن کی لُغوی حیثیت کے منافی ہونے کیساتھ اُس کی نحوی اور بلاغی حیثیت کے بھی خلاف ہے جو کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا جو متن کی لُغوی، نحوی اور بلاغی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اِس کا جائزہ لے۔

(۱۱) نیت کا خالص ہونا کہ حسب استطاعت قرآن شریف کا حق ادا کرنے اور اِس سے مقصدِ الٰہی کو دوسری زبان میں منتقل کرکے قرآن شریف کی تبلیغ اور اللہ تعالیٰ کی رضا پانے کے سوا اور کوئی دنیوی مقصد ہرگز نہ ہو ورنہ دنیوی مقصد کی دست آوری ہو یا نہ ہو بہر تقدیر قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کرنے کے لیے توفیق ایزدی میسر نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:185، مطبوعہ حجازی بالقاہرہ۔

''لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ''(۱)

یعنی اُس کے معارف کا اِدراک نہیں کر سکتے مگر پاک لوگ۔

ظاہر ہے کہ طہارت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظاہری، دوسری باطنی۔

ظاہری طہارت یہ کہ جسمانی طور پر پاک ہو اور باطنی یہ کہ بداعتقادی، تنگ نظری، جہل مرکب اور تعصب جیسی آلودگی سے محفوظ ہو۔ اِسی طرح مَس کی بھی دو قسمیں ہیں؛

پہلی قسم:۔ مسِ مصحف ہے کہ قرآن شریف کو یا اُس کے کسی حصے کو ہاتھ لگایا جائے۔

دوسری قسم:۔ مَسِ معارف ہے کہ آیاتِ قرآنی میں موجود معارف کا اِدراک کیا جائے اور یہ آیت کریمہ جملہ خبریہ ہونے کی بناء پر مس کی دوسری قسم میں ظاہر ہے جس میں پہلی قسم کا احتمال بھی موجود ہے کہ لفظ کے اعتبار سے خبر اور معنیٰ کے اعتبار سے اِنشاء مراد ہو جس کے پیشِ نظر فقہاء کرام نے بغیر طہارت کے قرآن شریف کے ہاتھ لگانے کو ناجائز قرار دیا ہے جو بجائے خود درست ہونے کے باوجود اس کے ظاہری مفہوم کو نہیں پہنچ سکتا کہ اِس میں لفظاً معناً خبر مراد ہو جس کے مطابق اپنی ذہنی ترجیح کو اصل بنا کر قرآن شریف کو اُسی کی طرف کھینچنے والے کو اس کی حقیقی سمجھ نصیب نہ ہونے کی خبر دی گئی ہے اِس قسم کے ظاہر الدلالت نصوص کے ہوتے ہوئے معیاری ترجمہ کے لیے مذکورہ شرط کے ضروری ہونے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔

جن کی مثالوں میں اُن تراجم کو دیکھا جا سکتا ہے، جن کو مترجمین نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں ناموری کے لیے یا اپنے مخصوص مسلکی نظریات ثابت کرنے کے لیے اور آیاتِ قرآنی سے اپنی ذہنی ترجیحات و نظریہ کی تائید ظاہر کرنے کے لیے لکھا ہے جو بجائے خود المیہ ہے کیوں کہ جو حضرات عرفان آشنا نہیں ہیں یا کسی ذہنی ترجیح، ماحولیاتی اثر اور مذہبی عصبیت کے اسیر ہیں یا خُلوصِ نیت کی سعادت سے محروم ہیں وہ اِس عظیم منصب کے لیے آگے آنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ''(۲) اور مذہبی عصبیت کے حصار میں محصور

---

(۱) واقعہ:79۔

(۲) الواقعہ:79۔

ایسے ناتوان ومحروم طبقہ سے متعلق امام غزالی نے فرمایا ہے:

”لو اجتمع علیه الاولون والآخرون لم یقدروا علی نزع البدعة مِن صَدرِهِ بَلِ الهوی وَالتَعَصُّبُ وَبُغضُ خُصُوم المُجَادِلِین و فرقة المخالفین یَستَولِی عَلَی قَلبِهِ وَیَمنَعُهُ مِن ادراك الحق حتی لو قیل له هل تُرید اَن یَّکشِفَ اللّٰه تَعَالٰی لك الغِطَاءَ وَ یُعَرِّفَكَ بِالعیان ان الحق مع خصمك لکره ذٰلك خیفة ان یفرح به خصمه هٰذا هو الداء العضال الذی استطار فی البلاد والعباد وهو نوع فساد آثره المجادلون بالتعصب“(۱)

اِس کا مفہوم یہ ہے کہ متعصب بدعت پرست کے دل سے اِس گمراہی کو نکالنے کے لیے اگر اولین وآخرین سب جمع ہو کر کوشش کریں پھر بھی نہیں نکال سکتے بلکہ خواہش پسندی اور عصبیت اور مخالفین کو نیچا دکھانے کی فکر اُس کے دل پر سوار ہو کر حق کی پہچان سے اُسے منع کر رہی ہے اور اُس کی حق جوئی سے محرومی کا یہ عالَم ہے کہ اگر اُسے یہ کہا جائے کہ اگر اللہ تعالیٰ خود بالمشافہ تجھ سے کہے کہ تیرا مخالف فریق حق پر ہے کیا تو اِسے پسند کرے گا تو وہ خوش ہونے کے بجائے ناپسند کرے گا کیوں کہ وہ اپنے مخالف فریق کی خوشی کو برداشت نہیں کر سکتا یہ وہ لاعلاج مرض ہے جو ملکوں میں اور خلق خدا میں پھیل چکا ہے اور یہ فساد کی ایک قسم ہے جس کو متعصب مجادلین نے پسند کیا ہے۔ ایسے میں مذکورہ شرط کی اہمیت سے انکار کی کیا مجال ہو سکتی ہے۔(۲)

۱۲ کسی ذہنی ترجیح سے مُترجم کے ذہن کا پاک اور محفوظ ہونا۔ یہ اِس لیے ضروری ہے کہ جو شخص کسی بھی مَن پسند کی ترجیح اور رجحان کو لے کر ترجمہ کرنے بیٹھ جائے گا تو وہ آیت کریمہ کے حقیقی مفہوم کو تلاش کر کے اُس کی اتباع کرنے اور ترجمہ میں اُسی کو ظاہر کرنے کے بجائے آیت

---

(۱) ۲۹۔ احیاء علوم الدین، ج:1، ص:79، مطبوعه بیروت۔

(۲) (i) الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:182، مطبوعه حجازی بالقاهره۔

(ii) مقدمه تفسیر مهائمی، ص:6، مطبوعه عالم الکتب بیروت۔

کریمہ کا رُخ اپنے مقصد کی طرف کرنے کی کوشش کرے گا، خود کو اُس آیت کریمہ کے تابع کرنے کے بجائے اُسے اپنے رجحان کے تابع کرے گا اور ترجمہ میں حقیقت کو ظاہر کرنے کے بجائے اپنی ترجیح کو ہی ظاہر کرے گا تو پھر معیاری ترجمہ کرنے کی توفیق ممکن نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

''لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ''(۱)

کسی ذہنی ترجیح سے پاک وآزاد ذہن والے ہی اِس کے معارف کو پاسکیں گے۔

اِسی فلسفہ کی بنیاد پر سلف صالحین نے مذکورہ قبائح کو قرآن فہمی کی راہ سے مانع اور حجاب قرار دیا ہے۔(۲)

۱۳ عرفان نصیبی وتوفیق الٰہی، یہ اِس لیے ضروری ہے کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ وجود میں لانے کے لیے مذکورہ تمام شرائط محض اسباب کے درجہ میں ہیں جن کے بغیر معیاری ترجمہ وجود میں لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اِن تمام شرائط واسباب کا اجتماعی وجود معیاری ترجمہ کے لیے علت تامہ ہے کہ اِس کے بعد قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کا وجود میں آنا امر یقینی ہو اِس کا وجود ضروری اور تخلف ممتنع ہو۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ اِس کے لیے علت تامہ صرف اور صرف توفیق الٰہی ہے کہ اُس وحدہ لا شریک رحیم وکریم کی توفیق جب تک میسر نہ ہو اُس وقت تک مقصد حاصل نہیں ہوسکتا جبکہ اِس کی سعادت نصیب ہونے کے بعد ہی اجتماع شرائط واسباب کا یہ عمل ثمر آور ہو جاتا ہے اور توفیق الٰہی کی یہ عرفان نصیبی اُن ہی حضرات کو میسر ہوتی ہے جن کو عالم باعمل کہا جاتا ہے، جو ''یَـنـفَـوْن

(۱) واقعہ:79۔

(۲) (i) اِحیاء علوم الدین، ج:1، ص:284، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت۔

(ii) الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:182، مطبوعہ قاہرہ مصر۔

عَنہ تَحرِیفَ الغَالِینَ وَانتِحَالَ المُبطِلِینَ وَ تأوِیلَ الجاھلین ''(۱) کے مظہر ہوتے ہیں، جو''مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَه اللّٰهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعلَم ''(۲) کے مصداق ہوتے ہیں گویا توفیق الٰہی اور عرفان نصیبی کی یہ شرط قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کرنے کی سعادت پانے کے لیے اصل الا صول اور بنیاد ہے۔(۳)

اِس کے علاوہ اِس شرط کی سابقہ شرائط کے ساتھ ایک ربط یہ بھی ہے کہ یہ اُن سب کے موثر ہونے کے لیے کلیدی کردار ہونے کے باوجود خود اَمرِ محسوس نہیں ہے کہ مشاہدہ میں آسکے بلکہ خالص فیض ربی اور باطنی رابطہ ہے جس کی بدولت مترجم کو باقی تمام شرائط پر فائز ہونے کی سعادت بھی نصیب ہوتی ہے۔ نیز سابقہ تمام شرائط اِسی ایک کے مظاہر اور یہ تنہا اُن سب میں ظاہر ہے اور مترجم کے دل ودماغ اور زبان قلم میں اُن سب کا اجتماعی وجود اس کی موجودگی پر دلیل اور اس کی پہچان ہے اور اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس کی برکت سے باقی تمام شرائط کے مطابق ترجمہ کے لیے استعمال کیے جانے والے الفاظ کی آورد نہیں بلکہ آمد ہوتی ہے جو محض عطیہ الٰہی ہے۔

اِین سعادت با زورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

الغرض اِن تینوں یعنی نمبر 9، 10، 11 کی خلاف ورزی پر مشتمل ہونے کی وجہ سے نا قابلِ قبول اور غیر معیاری قرار پانے والے تراجم کی مثالوں کو سمجھنے کے لیے مختلف حضرات کی طرف سے کئے گئے مندرجہ ذیل تراجم دیکھے جاسکتے ہیں:

(i) سورۃ البقرہ، آیت نمبر 69 ''قَالُوادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَاقَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ'' کے ترجمہ میں کہا گیا ہے'' کہنے لگے کہ اچھا یہ بھی درخواست کردیجئے ہمارے لیے اپنے رب سے ہم سے یہ بھی بیان کردیں کہ اُس کا رنگ کیسا ہو

(۱) مشکوٰۃ شریف، ص:36، کتاب العلم۔

(۲) تفسیر روح المعانی، ج:1، ص:91۔

(۳) الاتقان فی علوم القرآن، ج:2، ص:181، مطبوعہ حجازی بالقاہرہ۔

آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو''۔

اہل علم جانتے ہیں کہ یہاں پر مترجمین نے لفظ ''صَفْرَآءُ'' کا ترجمہ ''زرد رنگ کے بیل'' کرنے کی جو خطرناک غلطی کی ہے اِس کی اصل وجہ دسویں شرط کی خلاف ورزی کے سوااور کچھ نہیں ہے کہ ہندوستان کے گاؤ پرستوں کی تاریخ میں بیل کی عبادت دیکھ کر گاؤ پرستی کو بیل کے ساتھ مختص ہونے کو ذہن میں راسخ کرلیا اور اُسے ذہنی ترجیح بنا کر آیت کریمہ کو بھی اُس پر منطبق کیا اور انسانی فطرت کا حصہ ہے کہ اپنے نظریہ اور اپنی ذہنی ترجیح کو چاہے وہ جس حوالہ سے بھی ہو پسند کرتا ہے، اُسی طرف مائل اور اُس کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ سچ فرمایا گیا ہے:

''حُبّكَ الشيئَي يُعْمِي وَيُصِمُّ'' یعنی کسی بات کو پسند کرنا تجھے اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے۔

اور اِسی بہراپن واندھاپن کا نتیجہ ہے کہ آیت کریمہ میں مترجمین کو الف تانیث نظر نہیں آیا اور علم نحو کی کتابوں میں ہزار بار پڑھی اور سنی ہوئی بات کو پیش نظر رکھنے سے قاصر رہے کہ لفظ ''صَفْرَآءُ'' جیسے اسماء پر آئی ہوئی الف ممدودہ ہر جگہ میں علامت تانیث ہوتا ہے اور کسی بھی جگہ میں آیا ہو اِس علامت تانیث والے اسم کو مونث ہونا لازم ہے کہ یہ جس اسم میں بھی ہو اُس کا مونث ہونا ضروری اور مذکر ہونا ممنوع ہے۔ علم نحو کی ہر کتاب میں موجود ہے کہ علامت تانیث والا یہ الف علمی زبان کے مطابق منع صرف کے دو سبب کے قائم مقام ہونے پر دلیل کے طور پر لکھا ہے: ''التانيث ولزومها''

ان حقائق کی روشنی میں آیت کریمہ میں مذکور لفظ ''بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ'' کا ترجمہ ''زرد رنگ کے بیل'' میں کرنے کی غلطی عورت کا ترجمہ مرد میں اور شجر کا ترجمہ حجر میں کرنے کی غلطی سے مختلف نہیں ہے اِس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی غافل شخص لفظ ''شاۃ صفر آء'' کا ترجمہ ''زرد رنگ کا بکرا'' کرے جو قابل معافی نہیں ہے۔ مترجمین کی اِس غلطی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ یہاں پر لفظ ''صَفْرَآءُ'' کی لغوی حیثیت کو نہیں سمجھتے تھے کیوں کہ وہ عربی زبان کے کسی معمولی پڑھے لکھے شخص سے بھی

پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے کہ یہ مونث کا صیغہ ہے اور یہ بھی نہیں ہے کہ وہ اِس پر آئے ہوئے ''الف'' ممدودہ کی حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے کیوں کہ علم نحو کے ابتدائی طلباء بھی جانتے ہیں کہ یہ الف اصلی نہیں بلکہ زائد اور علامت تانیث ہے جس کے مدخول کا مونث ہونا لازم ہے کہ یہ جس اِسم پر بھی آئے اُس کا مونث ہونا ضروری اور مذکر ہونا ممنوع ہے اور یہ بھی نہیں کہ وہ گائے اور بیل کے مابین تمیز کرنے سے قاصر تھے نہیں ایسا ہرگز نہیں کیوں کہ بے پڑھے لکھے بچے بھی سمجھتے ہیں کہ گائے مؤنث اور بیل مذکر ہے بلکہ اِس کی واحد وجہ شرط نمبر 12، 13 کے خلاف ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ مترجمین نے عہدِ قدیم کے گاؤ پرستوں کی تاریخ میں بیل کی پرستش دیکھ کر یہ عقیدہ جمالیا کہ مصر کے گاؤ پرستوں کے ماحول میں عمریں گزارنے والے بنی اسرائیل بھی گائے کی نہیں بلکہ بیل کی عبادت کرنے کے دلدادہ تھے جس وجہ سے قاتل کا پتہ لگانے کے لیے اُنہیں بیل ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اِس تصور کو ذہنی ترجیح بنا کر آیت کریمہ کا ترجمہ کرنے بیٹھ گئے تو شرائط کی طرف پشت کرتے ہوئے آیت کریمہ کو اُسی پر چسپاں کرلیا۔ آیت کریمہ کی لُغوی اور لسانی حیثیت کے خلاف کرنے کے ساتھ اُس کی واقعی حیثیت کو بھی بگاڑ دیا ہے جس کے پس منظر میں شرط 12، 13 سے خلاف ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اِن تراجم کا شرط (13) سے خلاف ہونا محتاجِ بیان ہی نہیں ہے کیوں کہ عرفان کی سعادت جس مترجم کو نصیب ہو وہ ایسی غلطی کبھی نہیں کرسکتا اور شرط نمبر (12) سے خلاف ہونا بھی واضح ہے کہ بقرہ بنی اسرائیل سے متعلقہ اِس آیت کریمہ میں اگر بیل کو ذہنی ترجیح نہ بنایا گیا ہوتا تب بھی ایسی غلطی نہ کی جاتی۔ ایسی دل خراش مثالوں سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ وجود میں لانا کتنا مشکل کام ہے (وَاللّٰهُ الهَادِی اِلَی سَبِیْلِ الرِشَاد)

(ii) سورۃ الرحمٰن، آیت نمبر 22 ''يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ'' کے ترجمہ میں کہا گیا ہے ''حضرت علی ﷛ اور حضرت فاطمہ (رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهَا) جیسے والدین سے امام

حسن اور امام حسین (رَضِیَ اللّٰہ تَعَالٰی عَنْہُمَا) جیسی اولاد پیدا ہوتی ہے" جو لسانِ قرآنی کی لُغوی حیثیت کے منافی ہونے کے ساتھ سیاق وسباق کے بھی خلاف ہے اور نا قابلِ فہم ہونے کے ساتھ لسانی قواعد کے بھی خلاف ہے جس کا پسِ منظر مترجم کا اپنے مخصوص نظریہ کو اصل قرار دیکر آیت کریمہ کا رُخ اُدھر موڑنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے ظاہر ہے کہ اخلاص نیت اور عرفان کی توفیق میسر ہونے کی صورت میں ایسی غلطیوں کا ارتکاب کبھی نہیں کیا جاسکتا۔

(iii) سورۃ البقرہ، آیت نمبر 60 "وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا" کے ترجمہ میں کہا گیا ہے "جب قوم نے موسیٰ سے پانی کا مطالبہ کیا تو ہم نے اُنہیں کہا کہ اپنی قوم کو پہاڑ پر لے جاؤ وہیں جا کر اُنہوں نے دیکھا کہ پانی کے بارہ چشمے پھوٹ رہے تھے"۔ الغرض جس مترجم نے بھی مذکورہ شرائط میں سے کسی سے بے اعتنائی کی ہے ٹھوکر ہی کھائی ہے طبقہ مبتدعین اور اہلِ ہوا کے لکھے ہوئے تراجم کا زیادہ تر حصہ ایسی ہی لغویات پر مشتمل ہے جو ترجمہ کہلانے کے قابل ہی نہیں ہے چہ جائیکہ معیاری ہو۔

حقائق کی اِس روشنی میں مذکورہ شرائط کی اہمیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے یا وہ کون سا اہل علم ہوسکتا ہے جو ان کے بغیر قرآن شریف کا معیاری ترجمہ وجود میں لانے کو امر ممکن کہہ سکے۔

مخصوص شرائط کی تفصیل:۔

پہلی شرط:۔ فنِ ترجمہ کے فطری اُصولوں کو پیشِ نظر رکھنا اِس لیے ضروری ہے کہ ترجمۃ القرآن اپنے عرفی مفہوم کے اعتبار سے فنِ ترجمہ کے ماتحت خاص صنف ہے جبکہ عام کے تمام لوازمات اور تقاضوں کا ثبوت خاص کے لیے ضروری ہوتا ہے جیسا فلسفہ کی قسم منطق میں کہا جاتا ہے "کُلُّ مُقَوِّمٍ للعالی مُقَوِّمٌ للسافل" اِس کلیہ کی روشنی میں یہ اُصول کہ "کل ماھو ضروری للفن ضروری لصنفه" بھی بدیہیات کے قبیل سے شمار ہوتا ہے۔

اُردو زبان میں اِس سے خلاف کیے گئے تراجم کی ایک مثال تیسرے پارے کے آغاز"تِلْكَ الرُّسُلُ"(۱) کا ترجمہ ہندوستان کے مشہور عالم وحید الزمان نے کیا ہے"یہ پیغمبر (یا سب پیغمبر)"جوفن سے خلاف ہونے کی بنا پر غلط ہے کیوں کہ حرف"یا"کے ساتھ بریکٹ میں معیاری ترجمہ کا کوئی حصہ لکھنے کے لیے جو مصرف ہوتا ہے وہ یہاں پر موجود نہیں ہے۔ وہ یہ ہے کہ آیت کریمہ کے اندر کوئی لفظ ایسا ہو جس کے دو مفہوم ہوں اور دونوں درست ہوں۔ مفسرین کرام کی طرف سے بھی کسی ایک کو ترجیح نہیں دی گئی ہو اور علوم آلیہ کی روشنی میں بھی کسی ایک کو ترجیح نہ دی جا سکتی ہو اور مفسرین کرام نے بھی اُن دونوں کو یکساں انداز میں بیان کرتے آئے ہوں۔ ایسے میں مترجم کو مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ایک پر اگر اکتفا کرتا ہے تو ترجیح بلا مرجح کا محذور لازم آتا ہے اور دونوں کا ترجمہ ظاہر کرنے سے ترجمہ کا معیار گر جاتا ہے کیوں کہ ڈبل ترجمہ کرنے سے جہاں متن کی مخالفت ہوتی ہے وہاں متن سے اضافی الفاظ کی طوالت بھی ہوتی۔ ایسے میں سوائے اِس کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ اُن میں سے ایک کو ترجمہ کے تسلسل میں ظاہر کرے اور دوسرے کو بریکٹ میں بیان کرے اور ساتھ حرفِ"یا"لا کر متن کے اعجاز کے ساتھ اپنے عجز اور ترجمہ والی زبان کی کوتاہی دامن کا بھی اشارہ دے کہ کلام الٰہی کے اِس لفظ کے مطابق لفظ لانے سے عاجز ہوں۔

قرآن شریف میں موجود اِس کی متعدد مثالوں میں سے ایک آیت کریمہ"وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ"(۲) بھی ہے کہ مفسرین کرام کے مطابق لفظ"بَلَآءٌ"کا ایک مفہوم آزمائش کے ہیں جس کے مطابق اِس پوری آیت کا ترجمہ"اور اِس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی"جیسے الفاظ میں ہوگا۔ اور دوسرا مفہوم انعام کے ہیں۔ جس کے مطابق پوری آیت کریمہ کا ترجمہ"اور اِس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑا انعام تھا"جیسے الفاظ میں ہوگا۔

---

(۱) البقرۃ:253۔

(۲) البقرۃ:49۔

ایسے میں ترجمہ کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے ''اور اِس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی (یا بڑا انعام)'' کہنے یا اِس کے برعکس ''اور اِس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑا انعام تھا (یا بڑی آزمائش)'' کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں ہے لیکن یہاں پر پیشِ نظر آیت کریمہ میں ایسا نہیں ہے کیوں کہ اُس کے ہر دو جزو صرف ایک مفہوم کے حامل ہیں اِس لیے کہ ''تلک'' اِسم اشارہ ہے اور ''الرسل'' رسول کی جمع مکسر ہے جس کے ترجمہ میں ''یہ رسول ہیں'' کہنے سے دونوں مفہوموں کا اظہار ہو جاتا ہے تو پھر تراجم کے اِس انداز کو اصل کے مطابق کون کہے، مگر وہ جن کو معیاری ترجمہ کی اہمیت کا احساس ہے نہ فطری شرائط کا ادراک جن سے ہم کو گلہ ہے نہ شکوہ کیوں کہ اِس پوری تحریر میں ہمارے مخاطب صرف وہی حضرات ہیں جو قرآن شریف کے معیاری ترجمہ کی اہمیت اور اُس کے لوازمات سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی غفلت برت رہے ہیں۔

دوسری مثال:۔ ''وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ''(۱) کا ترجمہ ہندوستان کے دو مشہور عالم اشرف علی تھانوی اور فتح محمد جالندھری نے کیا ہے جو بالترتیب اِس طرح ہیں؛

1. ''اور کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی گواہ کو۔''
2. ''اور کاتب دستاویز اور گواہ (معاملہ کرنے والوں کا) کسی طرح کا نقصان نہ کریں۔''

یہ دونوں ترجمے ایک دوسرے سے متضاد ہونے کے باوجود دونوں غلط ہیں متضاد اِس لیے ہیں کہ اول الذکر متن کے لفظ ''ولا یضار'' کو صیغہ مجہول سمجھنے پر مبنی ہے جبکہ ثانی الذکر اُسے صیغہ معلوم سمجھنے پر مبنی ہے جیسا ان کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے۔ غلط اِس لیے ہیں کہ احتیاطی تقاضوں کے حوالہ سے اُصولِ ترجمہ کے خلاف ہیں کیونکہ فنِ ترجمہ کے عمومی اُصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب متن کا کوئی لفظ دو متضاد مفہوم رکھتا ہو اور ہر ایک درست ہو اور کسی ایک کو واضح ترجیح بھی نہ ہو جبکہ اُن متضاد مفاہیم میں سے ہر ایک کے حوالہ سے ترجمہ کے لیے انفرادی الفاظ دستیاب ہوں لیکن کوئی ایسا جامع لفظ ترجمہ والی زبان میں دستیاب نہیں ہے جو اصل کے قائم مقام اور اُس کی

---

(۱) البقرة:282۔

جامعیت کے مطابق ہو سکے۔ ایسے تمام مواقع پر فنِ ترجمہ کا احتیاطی اُصول یہ ہے کہ ایک کے حوالہ سے ترجمہ کو تسلسل میں رکھ کر دوسرے کے حوالہ سے ترجمہ کو یائے تنویعیہ کے ساتھ بریکٹ میں کیا جائے جس کے مطابق پیشِ نظر لفظ کا احتیاطی ترجمہ ''نہ کسی لکھنے والے کو ضرر دیا جائے نہ گواہ کو (یا نہ لکھنے والا ضرر دے نہ گواہ، اور نہ کسی لکھنے والے کو ستایا جائے نہ گواہ کو (یا اور نہ لکھنے والا ستائے اور نہ گواہ) جیسے انداز میں کیا جاسکتا ہے۔ ایسے مواقع پر ترجمۃ القرآن میں اس عمومی اُصول پر عمل کرنے سے تین فوائد بھی واضح ہوں گے:

1. ہر احتمال کے مطابق متن کا ترجمہ پورا ہوگا۔
2. نظمِ قرآن کا اعجاز واضح ہوگا کہ وہ اپنی جامعیت میں ایسا معجز ہے کہ دوسری زبان اُس کے برابر نہیں ہوسکتی۔
3. ترجمہ کی حیثیت سے کلام اللہ کا احتیاطی تقاضا پورا ہوگا۔

باقی رہا یہ تصور کہ آیت کریمہ کے پیشِ نظر الفاظ میں مذکورہ متضاد معنی کیسے موجود ہیں؟

تو یہ اِس طرح ہے کہ لفظ ''لایضآر'' علم تصریف کے مطابق بابِ ''مفاعلہ'' سے نہی کا صیغہ ہے اور مضاعف ہے۔ جس کی تعلیل کے بعد استعمالی صورت معلوم و مجہول دونوں کو شامل ہوتی ہے فرق محض اعتبار کا ہوتا ہے کہ معلوم المراد ہونے کی اصل صورت قبل التعلیل ''لایُضارِر'' ہے جبکہ مجہول المراد ہونے کی اصل صورت قبل التعلیل ''لایُضارَر'' ہے لیکن تعلیل کے بعد جو استعمالی اور عملی صورت ہے اُس میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے بلکہ معلوم و مجہول دونوں کے لیے ''لایضآرّ'' پڑھا جاتا ہے۔ معلوم المراد ہونے کی صورت میں آیت کریمہ کا ترجمہ ''اور ضرر نہ دے کاتب اور نہ گواہ'' جیسے انداز میں ہوگا جبکہ اُس کی ضد یعنی مجہول المراد ہونے کی صورت میں ترجمہ ''اور نہ کسی لکھنے والے کو ضرر دیا جائے اور نہ گواہ کو'' جیسے مجہول کے انداز میں ہوگا۔

انفرادی طور پر دونوں کے ترجمے درست ہونے کے باوجود اُردو زبان میں یہاں پر کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہے جو اصل کی جامعیت کے قائم مقام اور اُس کے مطابق ہو سکے۔ ایسے میں

مترجم کے لیے فنِ ترجمہ کے مذکورہ عمومی اُصول پر عمل کرنا ضروری اور ناگزیر قرار پاتا ہے ورنہ ترجمہ ایسا ہی غلط ہوگا جیسا اشرف علی تھانوی اور فتح محمد جالندھری کے مذکورہ ترجموں میں ہوا ہے کیوں کہ مترجم اگر اِس احتیاطی اُصول پر عمل نہ کرے گا تو پھر دو صورتوں سے خالی نہ ہوگا۔

1. دونوں کے حوالہ سے ترجمہ کو تسلسل میں کرے گا۔
2. صرف ایک کے حوالہ سے ترجمہ پر اکتفا کرے گا جیسا مذکورہ مترجمین نے کیا ہے جبکہ یہ دونوں غلط ہیں کہ ترجمہ کی تعریف سے ہی خلاف ہیں کیوں کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف کہ ''وہ قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام اور اُن کے مطابق ہوسکیں'' یہی تقاضا کرتی ہے کہ یہاں پر ترجمہ کے طور پر ایک ہی لفظ استعمال کیا جائے جو متن کے لفظ ''لا یضآر'' کے قائم مقام اور اُس کے مطابق دونوں متضاد معنی کو شامل ہو جبکہ یہ چیز مذکورہ دونوں ترجموں میں دوربین میں بھی کہیں نظر نہیں آرہی تو پھر انہیں ترجمہ کی تعریف سے خلاف اور غلط محض نہ کہیں تو اور کیا کہیں لیکن الناس عنہ غافلون۔

دوسری شرط:۔ ترجمہ کی عمومی شرائط کا اجتماعی وجود ترجمۃ القرآن کی صحت کے لیے ضروری ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ عام ترجمہ کی شرائط کی بہ نسبت ترجمۃ القرآن کی خاص شرائط میں دو قسم کی تخصیص ہے؛

(i) یہ خاص کلام اللہ کے ترجمہ کی صحت سے متعلق ہیں جبکہ عام ترجمہ کی شرائط کسی بھی کلام کے ترجمہ کی صحت سے متعلق ہوسکتی ہیں عام اِس سے کہ اللہ کا کلام ہو یا انسانوں کا۔

(ii) عربی سے دوسری زبان میں ترجمہ کی صحت سے متعلق ہیں بخلاف عام شرائط کے کہ وہ عربی سے عجمی میں ترجمہ سمیت کسی بھی عجمی زبان سے دوسری عجمی میں ترجمہ کی صحت سے متعلق ہوسکتی ہیں۔

حقائق کی اِس روشنی میں عمومی شرائط کے اجتماع کو ترجمۃ القرآن کی صحت کے لیے ضروری کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔

خلاصۃ الکلام:۔ کسی بھی عام شرط سے خلاف ہونے والا ترجمہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کہلانے کے قابل نہیں ہوتا۔ اِس کی مثال یوں سمجھی جائے کہ کسی ترجمہ کے بامقصد اور ترجمہ کی تعریف پر منطبق ہونے کی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بامحاورہ ہو یعنی دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو ورنہ غلط ہوگا ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہونے کی بناپر غلط قرار پانے والے تراجم کی ایک مثال سورۃ البقرہ، آیت نمبر 197 کے حصہ ''وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ '' کا کیا گیا وہ ترجمہ ہے جسے السعودیۃ العربیۃ کی سرپرستی میں اہل حدیث علماء کرام کی دورُکنی ٹیم نے کیا ہے جس میں مولانا حافظ صلاح الدین یوسف اور مولانا محمد عبدالجبار کا نام سرفہرست ہے جسے ادارہ دارالسلام ہیڈ آفس الریاض السعودیہ العربیہ نے شائع کیا ہے اور پاکستان میں اسلام آباد، کراچی اور لاہور کے شورومز سے تقسیم ہورہا ہے اُس کا نام ہے ''معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اُردو ترجمہ'' اس میں پیشِ نظر آیت کریمہ کا ترجمہ کیا گیا ہے ''اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی سے اُس کو جانتا ہے اللہ'' جسے ترجمہ والی زبان کے محاورہ کے مطابق نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ اُردو محاورہ سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ اِس آیت کریمہ کا اُردو محاورہ کے مطابق ترجمہ ''اور تم جو بھلائی کرو اللہ اُسے جانتا ہے، اور جو نیکی کرو اللہ اُسے جانتا ہے، اور جو کارِ خیر کروگے اللہ اُسے ظاہر کرے گا'' جیسے کسی انداز کے بغیر ممکن نہیں ہے جو اُردو محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ متن کے محاورہ کے بھی مطابق ہیں لیکن مترجمین نے ترجمہ والی زبان کے محاورہ کو پسِ پشت ڈال کر تمام توجہ متن کی ترتیب پر مرکوز کی اور یہ نہیں جانا کہ متن کی ترتیب بحال رکھنے کی شرط صرف اُن جگہوں میں موثر ہے جہاں پر ترجمہ والی زبان کا محاورہ متن کی ترتیب کے مطابق ہورہا ہو ورنہ ترجمہ کے محاورہ کو متن کی ترتیب پر ترجیح ہوتی ہے کہ اِس میں ترجمہ سے مقصد کی تکمیل ہونے کے ساتھ متن کے اصل کلام یعنی کلام نفسی کے ساتھ بھی مطابقت ہوتی ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسا اللہ تعالیٰ نے مختلف عجمی زبان بولنے والے کچھ حضرات کے اصل کلام کو قرآن شریف کی خاص عربی زبان میں نقل فرمایا ہے جس میں دونوں زبانوں کی ترتیب غالب اکثریت سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے اِس کے

باوجود حکایت وترجمہ والی قرآنی زبان کے محاورہ کو محکی عنہ والی عجمی زبان کے محاورہ سے خلاف نہیں کہا جاسکتا ورنہ نقل وحکایت اصل کے مطابق ہوگی نہ ترجمہ جو کلام العجم کی نقل وترجمہ پر مشتمل تمام آیات کے کذب پر منتج ہوگا العیاذ باللہ۔ جس وجہ سے متن کی ترتیب کو محاورہ پر ترجیح دینے کو درایت تسلیم کرتی ہے نہ روایت۔ ورنہ ترجمہ ایسا ہی بے ڈھنگا اور کریہہ فی السمع ہوگا جیسا پیشِ نظر ترجمہ میں ہوا ہے۔ نیز ترجمۃ القرآن سے اصل مقصد ترجمہ والی زبان والوں کو بلاکم وکاست قرآن شریف کے مقاصد سے آگاہ کرنا ہے جو بامحاورہ ترجمہ کے بغیر ممکن نہیں ہے اور بامحاورہ ترجمہ وہی کہلاتا ہے جو اصل کے معانی ومقاصد کی فہمائش کے حوالہ سے دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو جس میں اصل کا محاورہ بطور متبوع ضروری ہے جبکہ ترجمہ والی زبان کا محاورہ اُس کے تابع اور اُس پر متفرع ہونے کی حیثیت سے ضروری ہے جس سے درج ذیل اُصول وجود میں آتے ہیں:

پہلا اُصول:۔ ترجمہ کے عرفی معنی اور اس کی تعریف پر منطبق اور بامقصد ترجمہ ہمیشہ بامحاورہ ہوتا ہے، بے محاورہ ترجمہ مفیدِ مقصد نہیں ہوسکتا۔

دوسرا اُصول:۔ ترجمہ والی زبان کا محاورہ متن کی ترتیب کا نہیں بلکہ اُس کے محاورہ کا تابع ہوتا ہے۔

تیسرا اُصول:۔ ترجمہ کی زبان کو متن کی ترتیب کا تابع کرنا ایسا ہی غلط ہے جیسا متن کے محاورہ کو ترجمہ کے محاورہ کا تابع کرنا غلط ہے۔

چوتھا اُصول:۔ جس جگہ ترجمہ کی زبان کا محاورہ متن کی زبان کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ اِس کی ترتیب بھی اُس کی ترتیب کے مطابق ہونا ممکن ہو وہیں پر ترجمہ کی صحت کے لیے ترتیبِ متن کی پابندی بھی شرط ہوتی ہے جس کے بغیر ترجمہ غلط ہوسکتا ہے۔

پانچواں اُصول:۔ جس جگہ دونوں محاوروں کو ملحوظ خاطر رکھ کر ترجمہ کو بامحاورہ کرنے میں متن

کی ترتیب بحال رہنے کا امکان نہ ہو ہیں پر ترتیبِ متن کی پابندی والی شرط غیر موثر بلکہ کالعدم ہوتی ہے کیوں کہ ترجمہ سے اصل مقصد جو متن کے معانی اصلیہ اور مفہوم اول سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے بامحاورہ ترجمہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ایسے میں سورۃ البقرہ، آیت نمبر 197 کے حصہ ''وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ'' کے اُس ترجمہ کو بامحاورہ کہا جا سکتا ہے نہ معیاری جسے ادارہ درالسلام السعودیہ الریاض نے شائع کیا ہے، حقیقت میں اُس کی حیثیت ترجمۃ القرآن کی ہرگز نہیں بلکہ ترجمۃ الفاظ القرآن ہے جس میں بالترتیب الفاظِ قرآن کے انفرادی معانی دوسری زبان میں بیان کیے جاتے ہیں جبکہ ترجمۃ القرآن کلام اللہ کا ترجمہ ہے جو الفاظ و معانی کے مجموعہ سے عبارت ہے، محض الفاظ یا صرف معانی سے نہیں۔

افسوس بالائے افسوس:۔ مولانا حافظ صلاح الدین یوسف اور مولانا محمد عبدالجبار کے اشتراک عمل سے کیا گیا یہ ترجمہ صرف اُردو محاورہ سے خلاف ہے جبکہ اِسی آیت کریمہ کے ترجمہ میں اشرف علی تھانوی، حافظ نذیر احمد دہلوی، عاشق الٰہی میرٹھی، علامہ وحید الزمان، فتح محمد خان جالندھری، مولانا تقی عثمانی، مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے مشاہیر الہند نے جو فساد کیا ہے وہ ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہونے کے ساتھ علمِ الٰہی کے حوالہ سے اسلامی عقیدہ سے بھی خلاف ہے اِن حضرات کے کیے ہوئے تراجم بالترتیب درج ذیل ہیں؛

1. ''اور جو نیک کام کرو گے خدائے تعالیٰ کو اُس کی اطلاع ہوتی ہے۔''
2. ''اور نیکی کا کوئی سا کام بھی کرو وہ خدا کو اُسی وقت معلوم ہو جائے گا۔''
3. ''اور جو کچھ تم کرو گے نیکی اُس کو اللہ جان لے گا۔''
4. ''اور جو نیک کام تم کرو گے اللہ کو معلوم ہو جاوے گا۔''
5. ''اور جو نیک کام تم کرو گے وہ خدا کو معلوم ہو جائے گا۔''
6. ''اور تم جو کوئی نیک کام کرو گے اللہ اُسے جان لے گا۔''
7. ''اور جو کوئی بھی نیک کام کرو گے اللہ کو اُس کا علم ہو کر رہے گا۔''

اُردو محاورہ سے واقف وہ کون ہوسکتا ہے جو تراجم کے اِس انداز کو اُس کے محاورہ کے مطابق کہہ سکے یا علم الٰہی سے متعلق ایسا عقیدہ، ایسے الفاظ اور ایسے انداز کلام کو جائز کہہ سکے نہ صرف اہل علم بلکہ ہر مومن مسلمان جانتا ہے کہ علمِ الٰہی کی کوئی شکل اور کوئی ایک صورت بھی ایسی نہیں ہے جو غیر سے مستفاد ہو، کسی اور کی طرف سے خبر اور اطلاع دینے کی راہ سے ہو تو پھر وہ کون سا مسلمان ہوسکتا ہے جو اول الذکر ترجمہ ''جو نیک کام کرو گے خدائے تعالیٰ کو اُس کی اطلاع ہوتی ہے'' کے اِن الفاظ اور اِس انداز کو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق اور اُس کے ذاتی وازلی علم کے مطابق کہہ سکے۔ نیز ہر مومن مسلمان جانتا ہے کہ انسانوں کے ہر اچھے اور برے یعنی سب اعمال سے متعلق اللہ کو پہلے سے علم ہے جو ازلی ہے اور زمانہ کی قید اور ماضی، حال، مستقبل کی حدود سے ماوراء اور لامحدود ہے جس میں انقطاع کی گنجائش ہے نہ حدود وتغیر کا امکان تو پھر مذکورہ تراجم ''وہ خدا کو اُسی وقت معلوم ہو جائے گا، اُس کو اللہ جان لے گا، اللہ کو معلوم ہو جاوے گا، اللہ کو اُس کا علم ہو کر رہے گا'' کے جواز کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے اور کون سا مسلمان اِسے اسلامی انداز کلام کہہ سکتا ہے؟ الغرض علمِ الٰہی سے متعلق اسلام میں ایسے عقیدہ کی گنجائش ہے نہ ایسے انداز کلام کی جس وجہ سے اُردو محاورہ کی پوری تاریخ میں بھی کہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ لکھتے وقت اگر مترجمین حضرات ترجمہ کی تعریف کو ہی پیشِ نظر رکھتے کہ وہ ''اصل کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام اور اُن کی متعارف حیثیات کے مطابق ہوں'' پھر بھی ایسی فحش غلطی نہ کرتے کیوں کہ وہ سمجھتے کہ آیت کریمہ کے الفاظ ''یعلمه الله'' کے عوض ترجمہ والی زبان سے جو الفاظ ہم استعمال کر رہے ہیں یہ اُن کے قائم مقام ہونے کے قابل نہیں ہیں کیوں کہ اُن کی عرفی حیثیت میں حدوث وانقطاع نہیں بلکہ دوام واستمرار اور ازلیت ہے تو پھر (وہ خدا کو اُسی وقت معلوم ہو جائے گا، اُس کو اللہ جان لے گا، اللہ کو معلوم ہو جاوے گا، اللہ کو اُس کا علم ہو کر رہے گا) جیسے حدوث وانقطاع کے یہ الفاظ اُن کے مطابق ہونے کا کیا تصور باقی رہتا ہے۔ نیز یہ سب کچھ لکھتے وقت اگر وہ ترجمۃ القرآن کی مخصوص شرط ''علم کلام پر عبور'' اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات

سے متعلق مسلمہ اسلامی عقائد کو پیشِ نظر رکھتے پھر بھی ایسی فحش غلطی نہ کرتے لیکن افسوس کہ یہ حضرات ترجمۃ القرآن کی شرائط کو خاطر میں لائے اور نہ اُس کی تعریف کو پیشِ نظر رکھا بلکہ لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے والوں کی طرح بغیر شرائط کے مترجم بننے کے شوق نے انہیں کدھر سے کدھر پہنچا دیا۔ (العیاذ باللہ)

بے محاورہ ترجمہ کی یہ مثالیں بتا رہی ہیں کہ ترجمہ کے حوالہ سے قرآن شریف کتنا مظلوم ہے، جب مشاہیر الہند کے کیے ہوئے تراجم کی غلطیوں کا یہ عالَم ہے تو پھر غیر معروف حضرات کے کیے ہوئے تراجم کا کہنا ہی کیا ہے اس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہونے کی بنا پر قرآن شریف کے جس ترجمہ کو بے محاورہ اور غلط قرار دیا جاتا ہے اُس کی مشتے نمونہ از خروارے ان مثالوں کے علاوہ بطور دانہ از انبارے دوسری مثال کے لیے سورۃ آلِ عمران، آیت نمبر 26 ''قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ٘ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ'' کے اس ترجمہ کو دیکھا جا سکتا ہے ''اے محمد! آپ اللہ تعالیٰ سے یوں کہیے کہ اے اللہ مالک تمام ملک کے آپ ملک جس کو چاہیں دے دیتے ہیں اور جس سے چاہیں ملک لے لیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں غالب کر دیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں پست کر دیتے ہیں آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی بلاشبہ آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں'' یہ ترجمہ اشرف علی تھانوی کا کیا ہوا ہے جو دو وجہ سے ترجمہ والی زبان کے محاورے سے خلاف ہے:

پہلی وجہ:۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جبکہ اُردو محاورہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کرنا متعارف نہیں ہے اور اُردو زبان کے ماہرین اور اس کے امام سمجھے جانے والے حضرات سے بھی ایسا کوئی محاورہ اور کوئی مثال موجود نہیں ہے بلکہ سب نے اُس وحدہ لاشریک کی واحد و یکتا ذات کے لیے مفرد الفاظ استعمال کیے ہیں۔

دوسری وجہ:۔ اس میں آیت کریمہ کے ابتدائی حصہ کے ترجمہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے

رسول اللہ ﷺ سے خطاب کا ترجمہ اور بعد والے حصوں میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اللہ تعالیٰ سے خطاب کا ترجمہ بھی لفظ (آپ) میں کیا گیا ہے جو ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے سراسر خلاف ہے کیوں کہ اردو محاورہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرنے میں لفظ آپ متعارف ہے نہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کو خطاب کرنے میں بلکہ ہر دو طرف سے خطاب کے لیے حسب مناسب دوسرے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ پیشِ نظر آیت کریمہ میں بھی ایسا ہی ہے۔

ایسے میں ترجمہ کے اِس انداز کو با محاورہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ ہمیشہ با محاورہ ہوتا ہے اور با محاورہ ہونے کے لیے معیار یہ ہے کہ دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو اِس سے قرآن شریف کے بے محاورہ ترجمہ کی پہچان آپ ہی واضح ہو جاتی ہے کہ اُس کی تین قسمیں ہیں؛

پہلی قسم:۔ وہ جو ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہو جس کی مثالیں گزشتہ سطور میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

دوسری قسم:۔ وہ ہے جو متن کے محاورہ سے خلاف ہو اِس کی **ایک مثال** مشتے نمونہ ازخروارے دیباجۂ سُورالقرآن یعنیٰ ''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' شریف کا مولانا محمد جونا گڑھی کا کیا ہوا ترجمہ ہے ''شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے'' اِس ترجمہ میں مولانا محمد جونا گڑھی منفرد نہیں ہے بلکہ اُن سے پہلے اور بعد بھی بہت سے مترجمین نے بسم اللہ شریف کا اِسی انداز سے ترجمہ کیا ہے ہم یہاں پر مولانا جونا گڑھی کا حوالہ اِس لیے دے رہے ہیں کہ اُس ترجمہ کو سعودیہ العربیہ کے اُمورِ مذہبیہ اور وزارۃ الاوقاف واشاعۃ القرآن میں بڑا اعتماد حاصل ہے اور السعودیۃ العربیۃ کے زیر اہتمام لاکھوں کی تعداد میں اِس کی اشاعت و تقسیم کا اہتمام کیا جاتا ہے ہمارا مقصد اہل علم کو آگاہ کرنا ہے کہ سعودیہ

عربیہ کے اُمورِ مذہبیہ میں دخیل اور مجمع الملک الفہد لطباعۃ القرآن کے نگران اعلیٰ عالی جناب ڈاکٹر عبداللہ ابن عبدالمحسن الترکی کے اعتماد یافتہ شخصیت کے ترجمہ کا یہ عالم ہے تو پھر دوسروں کے تراجم کا کہنا ہی کیا ہے۔ مولانا محمد جونا گڑھی اور ان جیسے دوسرے مترجمین کے کیے گئے یہ تمام تراجم اِس لیے غلط ہیں کہ بامحاورہ نہیں ہیں کیوں کہ اِن میں ترجمہ والی زبان کے مفرد متن کا ترجمہ مرکب تام میں کیا گیا ہے جیسا ان کے الفاظ ''جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے'' سے صاف ظاہر ہے جس میں لفظ ''ہے'' لگا کر اسم جلالت پر ''رحمٰن ورحیم'' کا حکم کیا گیا ہے یعنی اسم جلالت کو مسند الیہ اور ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کو اُس کے لیے خبر اور مسند ظاہر کیا گیا ہے جو مرکب غیر تام ومفرد میں نہیں ہوتا بلکہ مرکب تام کا خاصہ ہے جو متن میں نہیں ہے کیوں کہ نحوی اُصولوں کے مطابق یہاں پر اسم جلالت موصوف اور اس کے بعد ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' بالترتیب اُس کی صفات ہیں اور صفات وموصوف سے مجموع مرکب ہونے والے الفاظ مرکب تام اور جملہ نہیں ہوتے کیوں کہ وہ جملہ کے مقابلہ میں ہمیشہ مفرد اور مرکب غیر تام ہی کہلاتے ہیں جس میں نحاۃ کی دو رائے ہیں نہ بلغاء کی جس کے مطابق بسم اللہ شریف کا بامحاورہ ترجمہ (اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا...... شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا) جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا ہے جو بامحاورہ یعنی دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ دوسری تمام شرائط پر بھی منطبق ہیں۔

تیسری قسم:۔ جو دونوں زبانوں کے محاورہ سے خلاف ہو یعنی یک نہ شُد دو شُد اِس کی مثال کے لیے بطور دانے از انبارے ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' شریف کا اشرف علی تھانوی کا کیا ہوا ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے ''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں'' جس میں لفظ ''ہیں'' کا حکم لگا کر جہاں متن کے محاورہ سے خلاف کیا ہے وہاں ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے بھی خلاف کیا ہے کیوں کہ اُردو محاورہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے جمع

کے الفاظ استعمال کرنے کی کوئی مثال موجود نہیں ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی تعظیم وادب کو انسانوں کی تعظیم وادب پر قیاس کرکے ایسا لہجہ استعمال کرنے کا تعارف ہے تو پھر ترجمہ کے اس انوکھے انداز کو دونوں محاوروں سے خلاف کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔ حقائق کی اِس روشنی میں ترجمہ کی عمومی شرائط کے اجتماعی وجود کو ترجمۃ القرآن کی مخصوص شرائط کا حصہ قرار دینے میں کس کو شک ہوسکتا ہے۔

ایک ضروری وضاحت:۔ نظم قرآن یعنی آیت کریمہ اور اُس کے الفاظ کی ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھنا ہر اُس جگہ ترجمہ کی صحت کے لیے شرط قرار پاتا ہے جہاں پر ترجمہ کے الفاظ کو اُس کے مطابق رکھنا ممکن ہو ورنہ دونوں زبانوں کے محاورہ کی مطابقت کو ترتیب پر ترجیح ہونے کی وجہ سے اِس شرط کا تصور باقی نہیں رہتا کیوں کہ دونوں زبانوں میں الفاظ کی ترتیب کا توافق ضروری نہیں ہے کبھی ممکن ہوتا ہے کبھی ناممکن جبکہ ترجمہ کو بامقصد بنانے کے لیے بامحاورہ کرنا ضروری ہے۔ نیز ترجمہ کی تعریف میں ترجمہ والی زبان کے محاورہ کا متن کے محاورہ سے توافق معتبر ہے جبکہ الفاظ کی ترتیب کا توافق مسکوت عنہ کے درجہ میں ہے اور خارجی دلائل سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں۔ ہونے کی مثال کے لیے مشتے نمونہ از خروارے سورۃ الاخلاص کا یہ ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے" کہہ دے وہ اللہ ہے ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اُس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ اُس کے جوڑ کا کوئی" سب ناظرین وقارئین پر واضح ہے کہ اِس میں ترجمہ بامحاورہ ہونے کے ساتھ اِس کے الفاظ کی ترتیب بھی متن کی ترتیب کے عین مطابق ہے۔ اور نہ ہونے کی مثال کے لیے بطور دانے از انبارے" بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ " کے اِس ترجمہ کو دیکھا جا سکتا ہے" اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا" جو بامحاورہ یعنی دونوں زبانوں کے محاورہ کے تو مطابق ہے لیکن متن کی ترتیب کے مطابق نہیں ہے اگر اُس کے مطابق کرکے یوں کہا جائے" شروع سے نام اللہ جو بہت مہربان رحمت والا" تو بامحاورہ نہ رہے گا یعنی ترجمہ والی زبان کے محاورہ سے خلاف ہوکر بے مقصد ہوگا نہ صرف اتنا بلکہ ترجمہ کی تعریف سے بھی خلاف ہوگا

کیوں کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف کہ وہ ''قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہوسکیں'' الفاظ کی انفرادی حیثیات کو شامل ہونے کی طرح اُن کی اجتماعی نوعیت کو بھی شامل ہے جس میں دونوں زبانوں کے محاورہ کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اِن حقائق کا فطری تقاضا ہے کہ جس جگہ ترتیب متن کی بحالی ممکن ہو وہاں پر اُس کی پابندی شرط ہو کہ وہ اصل ہے اور مزاحم و معارض موجود نہیں ہے جبکہ بغیر معارض کے اصل سے خلاف کرنا جائز نہیں ہے اِس کی منفی مثالوں کے لیے مشتے نمونہ از خروارے ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' شریف کا ایک مشہور ہندی عالم مولانا عبد الماجد دریا آبادی کا کیا ہوا یہ ترجمہ دیکھا جاسکتا ہے ''شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے'' جس میں اسم اللہ یعنی اللہ کی طرف منسوب نام جو متن میں مقدم ہے کو آخر میں رکھ کر ترتیب سے خلاف کیا گیا ہے جو کم از کم تین خرابیوں پر منتج ہے؛

پہلی خرابی:۔ خلاف الاصل ہے جبکہ معقول و موثر معارض کے بغیر اصل سے خلاف کرنا جائز نہیں ہے اہل علم جانتے ہیں کہ یہاں پر قطعاً کوئی معارض موجود نہیں ہے بلکہ دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہوتے ہوئے ترجمہ کی ترتیب متن کی ترتیب کے مطابق ہونا ممکن ہے تو پھر ترجمہ کے اِس بے ڈھنگے پن کا جواز ہی کیا ہے؟

دوسری خرابی:۔ متن کی بلاغی حیثیت سے خلاف ہے کیوں کہ بسم اللہ میں لفظ ''ب'' یعنی جار و مجرور کا مجموعہ جسے علم کی زبان میں قائم مقام ظرف بھی کہتے ہیں بغیر عامل کے نہیں ہوتا جسے متعلق کہا جاتا ہے مفسرین کی روشنی میں یہاں پر اُس کے حوالہ سے متعدد احتمالات ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اِس سے موخر ہو اِس صورت میں علم بلاغت کے مطابق تقدیم ماحقہ التاخیر سے مقصد حصر کا افادہ ہے کہ شروع کرنے کا عمل اسم اللہ کی مدد کے بغیر کسی اور سے نہیں ہے جبکہ ترجمہ کا یہ انداز حصر سے صریح خلاف ہے جو کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے جسے علم المعانی سے قدرے شناسائی ہو۔

تیسری خرابی:۔ ترتیب متن کی عرفانی اور واقعی حیثیت سے خلاف ہے کیوں کہ اہل کشف عرفاء کے مطابق کائنات کا یہ پورا نظام "بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" کی ترتیب کے انداز پر وجود میں آیا ہے۔ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْفَ) نے اِس کے پسِ منظر سے پردہ اُٹھاتے ہوئے لکھا ہے؛

"بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ظهر العالم"(۱)

یعنی "بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" کی اِس ترتیب سے ہی عالَم کا ظہور ہوا ہے۔

نیز اسم بمعنی وسم ہے یعنی پہچان وعلامت جس کے مطابق دنیا کی ہر شے حق سبحانہ وتعالیٰ کی پہچان اور اُسے جاننے کی علامت ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (نَوَّرَاللّٰہُ مَرْقَدَہُ الشَّرِیْفَ) نے حضرت عبداللہ ابن عباس (رَضِیَ اللّٰه تَعَالٰی عَنْهُمَا) کے حوالہ سے فرمایا:

"في كل شيئى اسم من اسمائه واسم كل شيئى من اسمه"(۲)

یعنی دنیا کی ہر شے میں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے کوئی نہ کوئی اسم کارفرما ہے یہاں تک کہ ہر شے کا اسم بھی اللہ تعالیٰ کے اسم سے ہے۔

اِس کے مطابق اگر اُردو زبان میں مضاف الیہ کو مضاف سے پہلے ذکر کرنے کا محاورہ نہ ہوتا اسم کا ترجمہ بھی لفظ "اللہ" سے پہلے کیا جاتا چہ جائیکہ اُس کی صفات یعنی "بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" سے بھی موخر کرنا جائز ہو۔ پیشِ نظر شرط کی مزید توضیح کی خاطر **دوسری مثال** کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 203 کے حصہ "وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ فِيۡٓ اَيَّامٍ مَّعۡدُوۡدٰتٍ" کے ڈپٹی نذیر احمد، فتح محمد خان جالندھری، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مفتی غلام سرور لاہوری، ڈاکٹر طاہر القادری، مولانا تقی عثمانی کے کیے ہوئے تراجم کو بھی دیکھا جاسکتا ہے جو بالترتیب اِس طرح ہیں:

---

(۱) الفتوحات المکیه، ج، ص:102، مطبوعه دار صادر بیروت۔

(۲) فتوح الغیب، مقاله نمبر:74، ص:502، مطبوعه النوریه الرضویه لاهور۔

❶ اور گنتی کے اِن چند دنوں میں خدا کی یاد کرتے رہو۔

❷ اور قیامِ منیٰ کے دنوں میں جو گنتی کے دن ہیں خدا کو یاد کرو۔

❸ اور اللہ کو ان چند گنے ہوئے دنوں میں برابر یاد کرتے رہو۔

❹ اور تشریق کے گنتی کے تین دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔

❺ اور اللہ کو اِن گنتی کے چند دنوں میں خوب یاد کیا کرو۔

❻ اور اللہ کو گنتی کے (اِن چند) دنوں میں (جب تم منی میں مقیم ہو) یاد کرتے رہو۔

جن میں اِن چھ مشاہیر نے کسی مجبوری اور کسی عارضہ کے بغیر آیت کریمہ میں موخر الذکر الفاظ ''فِی اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ '' کے ترجمہ کو ''وَاذْکُرُوا اللّٰہَ'' سے پہلے ذکر کر کے اُس کی ترتیب سے خلاف کیا ہے جبکہ ترجمہ کو محاورہ کے مطابق کرنے کے ساتھ یہاں پر متن کی ترتیب کے مطابق کرنا بھی ممکن ہے جیسا ''اور اللہ کی یاد کرو گنے ہوئے دنوں، اور اللہ کو یاد کرو گنتی کے دنوں میں'' جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا ہے تو پھر اُس کی ترتیب سے خلاف کرنے کا کیا جواز ہے۔

متوقع اشتباہ کا ازالہ:۔ کسی ضرورت داعیہ یا ترجمہ والی زبان کی طرف سے کسی مجبوری کے بغیر متن کی ترتیب سے خلاف کیے جانے والے تراجم کی اِن مثالوں سے ناپختہ ذہنوں میں اِس اشتباہ کا پیدا ہونا بعید نہیں ہے کہ اِن کے مقابلہ میں جن تراجم کو با محاورہ ہونے کے ساتھ متن کی ترتیب کے مطابق قرار دے رہے ہو اُن میں بھی ترتیبِ متن کی پوری طرح موافقت نہیں ہے کیوں کہ اول الذکر ''اور اللہ کی یاد کرو گنے ہوئے دنوں میں'' اور ثانی الذکر ''اور اللہ کو یاد کرو گنتی کے دنوں میں''، فعل کے متعلق یعنی ''فِی اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ '' کا ترجمہ اگرچہ فعل ''وَاذْکُرُوا اللّٰہَ '' سے موخر ہے جسے بالترتیب کہنا درست ہے لیکن فعل ''وَاذْکُرُوا '' کا ترجمہ اسم جلالت ''اللّٰہَ'' سے مؤخر ہونے کی وجہ سے اُس کی ترتیب سے خلاف ہے تو پھر ان کے مقابلہ میں اُن تراجم کو با محاورہ و بالترتیب قرار کیوں نہ دیا جائے جن میں متن کے ہر جزو کی ترتیب سے موافقت ہو رہی ہے جیسا (اور تم یاد کرو اللہ کو گنتی کے دنوں میں، اور تم یاد کرو اللہ کی گنتی کے دنوں میں، اور یاد کرو اللہ کو گنتی

کے چند دنوں میں) جیسے کسی بھی انداز کو دیکھا جا سکتا ہے جو با محاورہ ہونے کے ساتھ ترتیب متن کے بھی پوری طرح موافق ہیں۔

اِس کا جواب سمجھنے کے لیے علی سبیل التمہید چند مسلمات کو سمجھنے کی ضرورت ہے؛

پہلی تمہید:۔ قرآن شریف کے با محاورہ ترجمہ کی صرف ایک صورت ہے کہ دونوں محاوروں کے مطابق ہو۔

دوسری تمہید:۔ متنِ قرآن کے محاورہ میں اُس کی بلاغت وفصاحت بھی شامل ہیں یعنی فصاحت و بلاغت کے بغیر لسانِ قرآنی کا محاورہ متصور نہیں ہے اور ترجمہ کے محاورہ اُس کے محاورہ کے مطابق ہونے سے مطلب یہ ہے کہ اُس کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ اندازِ کلام سے بھی خلاف نہ ہو۔

تیسری تمہید:۔ جس مقام پر ترجمہ کو متنِ قرآن کی ترتیب کے مطابق رکھنے میں ترجمہ کی فصاحت متاثر ہو رہی ہو یا کم ازکم افصح کے مقابلہ میں فصیح ہو رہا ہو تب بھی ترجمہ کے محاورہ کو ترتیبِ متن پر ترجیح دینا ضروری ہے۔ ترجمۃ القرآن کی صحت کے لیے اِن ناگزیر مسلمات کو ذہن میں مستحضر رکھنے کے بعد مذکورہ اشتباہ کا جواب آسان ہو جاتا ہے کہ جن تراجم کی ترتیب کو آیت کریمہ کی ترتیب کے ساتھ پوری طرح موافق کہا جا رہا ہے وہ فصیح نہیں ہیں جب فصیح نہیں تو پھر با محاورہ بھی نہیں ہیں جبکہ ترجمہ کا با محاورہ ہونا ضروری ہے۔

تیسری تمہید:۔ قرآن شریف کی جس آیت اور جس حصے کا ترجمہ کیا جا رہا ہے اُس کی تمام متعارف حیثیات کا احاطہ ہو، متعارف حیثیات اِس لیے کہہ رہے ہیں کہ قرآن شریف کے ترجمہ کا تعلق اُس سے معلوم ہونے والے معانی سے ہے جنہیں مفہومِ اول کہا جاتا ہے اور قرآن شریف کے ترجمہ سے مقصد بھی اِن ہی معانی سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرنا ہے اور یہ وہ معانی ہیں جنہیں اہل لسان یعنی عرب صرف سننے اور پڑھنے سے ہی سمجھ سکتے ہیں اور اہل عجم علوم خادمہ لفہم

القرآن کے وسیلہ سے سمجھتے ہیں قرآن شریف کے ترجمہ سے غرض و غایت کا تعلق اِن ہی کے ساتھ مختص ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ جمہور الناس اِن ہی کو سمجھنے اور اِن پر عمل کرنے کے ذمہ دار و مکلف ہیں جس وجہ سے اِن ہی سے اہل عجم کو ترجمۃ القرآن کے ذریعہ سے آگاہ کرنا اُمت پر فرض کیا گیا ہے جبکہ اِن کے بعد نظم قرآن کے حسن میں لپٹے ہوئے وہ معانی و رموز اور معارف و اسرار جنہیں مفہوم ثانی اور مثانی القرآن جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے اُن کے ساتھ قرآن شریف کے ترجمہ کا تعلق ہے نہ جمہور الناس پر اُن کا اِدراک و عمل فرض ہے۔ ایسے میں ترجمۃ القرآن کی مخصوص شرائط کے سلسلہ میں متن قرآن کی متعارف حیثیات کو پیشِ نظر رکھے بغیر چارہ کار نہیں ہے یہ وہ نکتہ ہے جس سے غفلت کی بنا پر مترجمین کی غالب اکثریت بے اعتدالیوں کے گھڑے میں گر رہی ہے اور تراجم پر تبصرہ کرنے والے معیاری تراجم کی تغلیط اور غیر معیاری کی تصویب کرنے کی معکوس العملی میں مبتلا نظر آ رہی ہے۔ (فیا لَلعجب لھٰذا العَجَب)

الغرض ترجمۃ القرآن کی مخصوص شرائط کے سلسلہ میں اِس تیسری شرط (آیت کریمہ کی تمام متعارف حیثیات) کے احاطہ کے تحت ضروری اُمور درج ذیل ہیں:

1. ترجمہ کی جانے والی آیات جن اشتقاقی الفاظ پر مشتمل ہوتی ہیں اُن کے مشتق منہ اور اصل کی علی وجہ البصیرت پہچان ضروری ہے ورنہ ترجمہ غلط ہو سکتا ہے جس کی منفی مثالوں کی مشتے نمونہ از خروارے ایک مثال کے لیے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 254 ''وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ'' کا وہ ترجمہ دیکھا جائے جو مولانا ریاض حسین شاہ نے کیا ہے ''اور دبیز اندھیروں میں تو درحقیقت کفر والے ہیں'' وہ کون سا ہوش مند انسان ہوگا جو پیشِ نظر آیت کریمہ کے اِس ترجمہ کو یہاں پر درست کہہ سکے۔ اِس کے غلط ہونے کی وجوہ اگرچہ متعدد ہیں تاہم یہاں پر ہمارا مقصد محض ایک وجہ کی توضیح ہے کہ دبیز اندھیرے متن کے لفظ ''الظّٰلِمُوْنَ'' کے قائم مقام ہے نہ اُس کے مطابق جس کی واحد وجہ یہی ہے کہ یہ اُس کے اشتقاق سے خلاف ہے کیوں کہ وہ ''ظُلْمَة'' سے نہیں بلکہ ''ظلم'' سے اشتقاق پا کر استعمال ہوا ہے جبکہ مترجم نے بزعم خویش

اُسے ''ظلمة'' سے مشتق سمجھ کر یہ ترجمہ کر ڈالا جسے سوٗفہم اور بناء الغلط علی الغلط کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ لکھتے وقت اگر مترجم لفظ ''الظّٰلِمُوْنَ'' کی اشتقاقی حیثیت پر غور کرتا اور ''ظلم'' و ''ظلمة'' کے مابین لُغوی فرق کی تمیز کرتا تو ترجمة القرآن کے نام سے خبط کی یہ مثال قائم نہ کرتا۔ ایسے میں الفاظِ قرآنی کی اشتقاقی حیثیت کو اور اُن کے اصل کو جاننا ترجمہ کی صحت کے لیے ناگزیر شرط نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

اِس شرط کی اہمیت کے پیشِ نظر مزید وضاحت کی غرض سے دوسری مثال کے لیے سورۃ حٰمٓ السجدہ، آیت نمبر 41 ''وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ'' کے وہ تراجم دیکھے جا سکتے ہیں جو مولانا محمد جونا گڑھی اور اشرف علی تھانوی نے کیے ہیں جو بالترتیب اِس طرح ہیں (یہ بڑی باوقعت کتاب ہے جس کے پاس باطل پھٹک بھی نہیں سکتا نہ اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے، اور یہ قرآن بڑی باوقعت کتاب ہے جس میں غیر واقعی بات نہ اس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور اس کے پیچھے کی طرف سے) جن میں ''عزیز'' کا ترجمہ ''باوقعت'' میں کر کے اس کی اشتقاقی حیثیت سے خلاف کیا گیا ہے جس سے لُغوی حیثیت سے خلاف ہونا آپ ہی لازم آرہا ہے کیوں کہ صفت مشبہ کا یہ لفظ ''عزة'' سے مشتق ہے جبکہ لسانِ قرآنی کی لُغت کے مطابق خود لفظ ''عزة'' بھی اور اس سے مشتق ہو کر استعمال ہونے والا لفظ ''عزیز'' بھی جن معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں اُن میں باوقعت جیسا کوئی مفہوم شامل نہیں ہے۔

اِس سلسلہ میں ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ سید محمود بغدادی آلوسی نے امام جلال الدین السیوطی کے حوالہ سے جو تحقیق پیش کی ہے اُسی پر اکتفا کریں کیوں کہ وہ اِس سلسلہ کا ایسا جوہر ہے جس کے بعد کسی کلام کی ضرورت ہی نہیں رہتی وہ یہ ہے کہ جب اِس کا مفہوم قلیل الوجود اور نایاب ہونے کے ہو یا مکرم و معزز ہونے کے ہو یا عظیم الذات والصفات یا ذِلت کی ضد میں ہو اِن چاروں صورتوں میں مضارع مکسور العین سے استعمال ہوتا ہے جس کے مطابق سورۃ آلِ عمران، آیت نمبر ۱۸ ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' اور سورۃ ہود، آیت نمبر ۹۱ ''وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا

بِعَزِیزِ ''اور سورۃ مجادلہ، آیت نمبر ۲۱ میں لفظ ''عزیز'' جس مصدر ''عـزّا، عزۃً، عزازۃ'' میں سے جس سے بھی اِشتقاق پا کر ''عزیز'' کی صورت میں آیا ہو اُس کا اصل استعمال ''عَـزَزَ، یَعزِزُ'' میں متصور ہوگا جو تلفظ میں سہولت لسانی کی غرض سے ادغام پا کر ''عَزَّ، یَعِزُّ'' کی معروف شکل میں آ چکا ہے۔

اور سخت، گراں، دشوار جیسے کسی مفہوم میں ہونے کی صورت میں باب ''سَمِعَ، یَسْمَعُ'' سے استعمال ہوتا ہے جس کے مطابق سورۃ التوبہ، آیت نمبر ۱۲۸ ''عَـزِیـزٌ عَلَیْـهِ مَـا عَنِتُّمْ'' میں اس کا اصل استعمال ''عَزِزَ، یَعْزَزُ'' متصور ہوگا جو سہولت لسانی کی خاطر مدغم ہو کر ''عَزَّ، یَعَزّ'' کی معروف تلفظ سے ''عزیز'' کی شکل اختیار کر چکا ہے اور کسی کو مدد دے کر غالب کرنے یا اِس کی ضد یعنی کسی کے خلاف مدد دے کر اُسے مغلوب و ذلیل کرنے کے مفہوم میں ہونے کی صورت میں ''نَصَرَ، یَنْصُرُ'' سے استعمال ہوتا ہے جس کے مطابق سورۃ مجادلہ کی آیت نمبر 21 ''کَتَبَ اللّٰـهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَـا وَرُسُلِي اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ'' اور سورۃ القمر، آیت نمبر 42 ''فَاَخَذْنَاهُمْ اَخْذَ عَزِيزٍ مُّقْتَدِرٍ'' کا اصل استعمال ''عَـزَزَ، یَعْـزُزُ'' متصور ہوگا جو اِدغام کے بعد ''عَـزَّ، یَعُـزُّ'' کی معروف شکل سے ''عزیز'' کی صورت اختیار کی ہے۔

باقی رہا یہ تصور کہ یہ آخری دونوں مفہوم جو باب ''نَصَرَ، یَنْصُرُ'' سے استعمال ہوتے ہیں متعدی ہیں جبکہ صفت مشبہ کی ساخت فعل متعدی سے نہیں بلکہ فعل لازم سے ہوتی ہے۔ ایسے میں لفظ ''عزیز'' جیسے صفت مشبہ کے متعدی ہونے کا کیا جواز ہے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی لفظ ''رحمان و رحیم'' کا صفتِ مشبہ ہونے کے قبیل سے ہے کہ صفت مشبہ کے اِن الفاظ کو وجود میں لانے سے قبل اِن کے متعدی افعال کو باب ''کَـرُمَ، یَـکْـرُمُ'' کے انداز پر رکھ کر اِن کا اشتقاق کیا جاتا ہے، بہرحال لفظ ''عزیز'' اور اِس کے اصل استعمال اور معانی و مفہوم سے متعلق حضرت محمود آلوسی نے جلال الدین السیوطی کے حوالہ سے جو تحقیق پیش کی ہے وہ اُن کے اپنے منظوم کلام میں اس طرح ہے:

يـا قـارِئـا كُتُبَ الآدابِ كُن يـقِظًا　　وَحَـرِّرِ الـفَـرقَ فِـى الافـعـالِ تَـحرِيرا

عَزَّالـمـضـاعف يـاتى فى مضارِعِهِ　　تَثـلِيـثُ عينٍ بِفَـرقٍ جَآءَ مشهورا

فـمـا كَـقَـلَّ وَضِـدُ الـذِّلِ مَعَ عَـظـمِ　　كـذاكَـرُمـتَ عَـلَيـنَـا جَآءَ مَكسورًا

ومـاكَـعَزَّ عَـلَيـنَـا الحالُ اى صَعُبَت　　فَـافتَح مـضـارِعَـهُ اِن كُنتَ نَحرِيرًا

وهـذه الـخـمسة الافـعـال لازمة　　واضـمُـم مـضـارِعَ فعلٍ ليس مقصورا

عَـزَزْتُ ذيـدا بـمـعـنـى قَـدغَلَبتُ كذا　　اَعـنـتُـهُ فـكـلا ذاجـآء مـاثـورا

وقيـل اذاكـنـت فـى ذكـر القنوت ولا　　يَعِـزُّ يـا رب من عـاديت مكسورا

واشـكـر لا هل علوم الشرع اذشرحوا　　لك الـصـواب وَاَبـدُوا فِيـهِ تَـذكِيـرًا

امام سیوطی کے اِن اشعار کا بالترتیب مفہوم یہ ہے کہ ”اے ادب کی کتابوں کو پڑھنے والے بیدار رہو اور افعال میں فرق کو اچھی طرح لکھ، ”عَـزَّ“ جو ثلاثی مجرد سے مضاعف ہے اِسکے مضارع میں عین پر تینوں حرکات آتی ہیں جن کا استعمال متفرق و مشہور معانی کے لیے آیا ہے تو پھر جس کا استعمال کم ہونے کے مفہوم کے لیے، ذلت کی ضد کے لیے، عظیم ہونے کے لیے، مکرم ہونے کے لیے ہو اِن چاروں صورتوں میں مکسور العین آیا ہے اور جس کا استعمال ”عَزَّ علینا الحال“ جیسے مفہوم کے لیے ہو یعنی سخت اور دشوار ہونے جیسے کسی بھی مفہوم کے لیے ہو تو اُس وقت اِسے مفتوح العین پڑھے اگر تو اہل علم ہے اور یہ پانچوں افعال لازم ہیں جو صرف فاعل پر تمام ہوتے ہیں مفعول بہ کی ضرورت نہیں ہوتی اور متعدی ہونے کی صورت میں اِس کے مضارع کو مضموم العین پڑھے اِس صورت میں کبھی ”عززت ذيدا“ یعنی میں نے زید کو مغلوب و مقہور کیا، جیسے مفہوم میں ہوتا ہے اور کبھی اِس کی ضد یعنی میں نے اُس کو مدد دی کے مفہوم میں ہوتا ہے، لفظ ”عَـزَّ“ کا استعمال اِن دونوں معانی کے لیے مستعمل آیا ہے۔ اور جب دعائے قنوت میں تو ”ولا يَعِزُّ يا رب من عاديت“ پڑھے تو اِس کو بھی مکسور العین کہا گیا ہے اور علوم شرعیہ کے اہل کا شکر ادا کرے کہ اُنہوں نے ایسے

مشکل مسائل میں تیرے لیے صواب کی تشریح کی اور اِس میں ہمیشہ یاددہانی کا فریضہ انجام دیا۔(۱)
لفظ ''عزیز'' کی لُغت کے حوالہ سے اِس تحقیق کی روشنی میں دیکھا جائے تو اِس کے مفہوم میں باوقعت جیسے کسی معنی کی گنجائش نہیں ہے۔ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ پیشِ نظر آیت کریمہ کے لفظ ''عزیز'' کا ترجمہ ''باوقعت'' میں کرنے والے یہ حضرات اگر اِس کی اشتقاقی حیثیت کو پیشِ نظر رکھتے اور اشتقاق کی ہر صورت کے تحت پائے جانے والے معانی کا خیال رکھتے تو ایسی غلطی کبھی نہ کرتے۔ نیز اردو محاورہ کے مطابق باوقعت لفظ کا تعلق عرفِ عام سے ہے اور یہ کتاب سے نہیں بلکہ اشخاص سے متعلق ہوتا ہے کہ بااثر شخص کو باوقعت اور بے اثر آدمی کو بے وقعت کہا جاتا ہے۔ جبکہ کسی کتاب کی معنویت اور افادیت ظاہر کرنے کے لیے باوقعت نہیں بلکہ لفظ وقیع استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسے میں آیت کریمہ کے مذکورہ ترجمہ کی حیثیت دونوں محاوروں سے خلاف ہے۔

پانچویں بحث:۔ جو ترجمۃ القرآن کی شرعی حیثیت کے بارے میں ہے۔ اِس کے دوزاویے ہیں:

پہلا زاویہ:۔ اِسے وجود میں لانے سے متعلق ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرکے وجود میں لانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

دوسرا زاویہ:۔ اِسے وجود میں لائے جانے کے بعد سے ہے کہ دستیاب ترجمۃ القرآن کی کیا حیثیت ہے؟ کہ شریعت مقدسہ میں جو احکام قرآن شریف کے لیے ثابت ہیں آیا وہ اِس پر بھی جاری ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

پہلا زاویہ:۔ جہاں تک قرآن مجید کا ترجمہ کرنے اور اِسے وجود میں لانے کا مسئلہ ہے اِس حوالہ سے درج ذیل حقائق کو جاننا ضروری ہے:

❶ متنِ قرآن کے بغیر نہ ہو ورنہ التباس الحق بالباطل کا ایسا ہی خطرہ ہوسکتا ہے جیسا یہود و نصاریٰ کے احبار و رہبان کے ہاتھ سے تورات و انجیل کا ہوا کہ اُن میں سے ہر ایک نے اپنی

---

(۱) امام السیوطی بحوالہ تفسیر روح المعانی، ج:3،ص:114،مطبوعہ بیروت۔

سمجھ کے مطابق ترجمہ کر کے متن کے بغیر پھیلا دیا جنہیں ناواقف حال عوام نے تورات وانجیل سمجھا اور رفتہ رفتہ مرورایام سے اصل تورات وانجیل نایاب ہوتے گئے۔ انجام کار اُن کی جگہ اِن ترجموں نے لے لی اور آپس میں اِن کا تضاد، شانِ الٰہی اور شانِ نبوت کے منافی انداز اور حقائق وبدیہیات سے برعکس گفتگو جیسے الفاظ وکلام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تورات وانجیل کے یہ مترجمین معیاری نہ تھے، جامع الشرائط نہ تھے اور ترجمہ میں کتاب اللہ کے مقاصد کی پابندی کرنے کے بجائے اپنی سمجھ اور اپنی پسند کو ترجیح دینے والے تھے ورنہ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی کتاب میں تضاد ممکن نہیں ہے۔ شان الوہیت اور شان نبوت سے خلاف ہونے کا تصور نہیں ہے اور حقائق وبدیہیات کے منافی ہونے کا امکان نہیں ہے بلکہ دُنیا کی ہزاروں زبانوں کے مختلف الفاظ میں کیے گئے تراجم بھی اگر معیاری ہوں، شرائط کے مطابق اور مرادِ الٰہی کی پابندی پر مبنی ہوں پھر بھی اصل معانی ومقاصد کے حوالہ سے اُن میں قطعاً کوئی اختلاف وتضاد نہیں ہوتا کیوں کہ صرف قرآن شریف میں نہیں بلکہ کسی بھی کتاب اللہ میں تضاد وخرافات ممکن نہیں ہیں جبکہ تورات وانجیل کے نام سے دُنیا بھر میں مشہور ہونے والے یہ تراجم اِن تمام محذورات سے بھرے پڑے ہیں جس سے ہر واقف حال انسان یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ سب کچھ یہود ونصاریٰ کے قسیس ورہبانی اور احبار ورہبان کہلانے والے ناقص ذمہ دارانِ مذہب کی ناقص کارکردگی ہے۔ قرآن شریف کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ تکوینی نظام کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ متن قرآن کے بغیر اُس کے ترجمہ کی اجازت اسلام نے نہیں دی ہے جس کا پسِ منظر اور سب سے بڑا فلسفہ التباس الحق بالباطل کا انسداد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں پر یہ تصور نہ ہو وہاں پر اجازت ہے مثال کے طور پر جائز مقصد کے پیشِ نظر کسی آیت کریمہ کے ایک دو حصوں کا یا ایک دو چھوٹی آیتوں کا ترجمہ بغیر متن کے شائع کرنے یا بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے فقہاء احناف کی صف میں نہایت قابلِ اعتماد امام محمد کمال الدین ابن ہمام

المتوفی 861ھ نے بھی اپنے سے پیشرو اسلاف کے حوالہ سے ایسا ہی لکھا ہے:

"اراد ان یکتب مصحفا بها یمنع وان فعل فی آیة او آیتین لا"(۱)

ترجمہ:۔کوئی شخص فارسی میں قرآن لکھنا چاہے اُسے منع کیا جائے گا اور اگر ایک یا دو آیتوں میں ایسا کیا تو منع نہ کیا جائے گا۔

حضرت ابن ہمام سے متاخر فقہاء کرام نے بھی اسلاف سے منقول اِس خاص جوازی صورت کے ساتھ اتفاق کیا ہے جیسا مفتی الدیار الشامیہ فی السنة المائة بعد الالف الهجری الامام علاؤالدین الحصکفی المتوفی 1088ھ نے لکھا ہے:

"وتجوز کتابة آیة او آیتین بالفارسیة لا اکثر"(۲)

ترجمہ:۔ایک یا دو آیتوں کو فارسی میں لکھنا جائز ہوگا زیادہ کا نہیں۔

اِس کی تشریح کرتے ہوئے دیارِ شامیہ کے دوسرے شہرہ آفاق مفتی فی السنة المائة الثانیہ بعد الالف من الهجرة النبویہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ الی یوم الدین محمد امین ابن عابدین المتوفی 1252ھ نے بھی فتح القدیر کی مذکورہ عبارت کو نقل کرنے کے بعد تسلیم کے انداز میں بحال رکھی ہے۔(۳)

فقہاءِ احناف کی اِن عظیم ہستیوں سے منقول اِس جوازی صورت سے متعلق ہم صرف اتنا اضافہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ دو آیات تک کے جواز کا جو قول کیا گیا ہے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اِس سے مراد چھوٹی آیتیں ہوں وہ بھی اِس شرط کے ساتھ مشروط کہ اُن کا ترجمہ کرنا آسان ہو اور کسی قسم کی غلطی یا مترجم کی رائے شامل ہونے کا امکان بھی نہ ہو ورنہ لمبی آیات یا وہ جن کے ترجمہ میں مغالطہ ہونے یا مترجم کی رائے داخل ہونے کا امکان ہو۔مثال کے طور پر سورۃ البقرہ، آیت نمبر 233،282 جیسی کسی ایک طویل آیت میں بھی احتیاط کے منافی ہوگا اِس کے علاوہ یہ بھی ہے

---

(۱) فتح القدیر، ج:1،ص:248،مطبوعہ نوریہ رضویہ سکھر پاکستان۔

(۲) الدرالمختار، ج:1،ص:4،مطبوعہ امیر حمزہ کتب خانہ کوئٹہ پاکستان۔

(۳) فتاوی ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:1،ص:359،مطبوعہ الماجدیہ کوئٹہ پاکستان۔

کہ قرآن شریف کی کسی سورت کا یا پورے قرآن شریف کا مستقل ترجمہ بغیر متن کے شائع کرنے میں اور ایک یا دو آیات کا ترجمہ بغیر متن کے شائع کرنے میں بڑا فرق ہے کہ پہلی صورت میں التباس الحق بالباطل کا امکان ہوسکتا ہے کہ ناواقف حال لوگ مترجم کی بے اعتدالی پر مشتمل غلط ترجمہ کو معنوی قرآن سمجھ کر گمراہ ہوں گے جبکہ دوسری صورت میں ایسا نہیں ہے کیوں کہ یہ مستقل نہیں بلکہ وقتی اور عارضی عمل ہے اِس کے باوجود عام حالات مین احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ کسی ایک آیت کا ترجمہ بھی بغیر متن کے شائع نہ کیا جائے کیوں کہ فقہاء کرام کی لکھی ہوئی اِس جوازی صورت کا تعلق عام حالات کے ساتھ نہیں بلکہ انسانی عوارضات اور مخصوص حالات کے ساتھ ہے۔ نیز ترجمہ اصل کے تابع اور اُس پر متفرع ہونے کی بنیاد پر مقتضی ہے کہ اِس سے پہلے آیت کریمہ لکھی جائے ورنہ ترجمہ کا تصور ہوسکتا ہے نہ تفسیر کا اسی فلسفہ کی بنیاد پر محمد کمال الدین ابن ہمام نے مذکورہ عبارت سے متصلاً بعد ترجمہ وتفسیر کی صرف اسی ایک صورت کو جائز قرار دیا ہے اُن کے الفاظ یہ ہیں:

''فَاِنَ کَتَبَ القُرآنَ وتفسیرَ کلِّ حرفٍ وترجمتَہٗ جاز''(۱)

ترجمہ:۔ اگر قرآن لکھ کر اُس کے ہر لفظ کی تفسیر وترجمہ لکھے جائز ہوگا۔

نہ صرف برصغیر پاک وہند کی مختلف زبانوں میں بلکہ پورے برصغیر کی مختلف زبانوں میں ترجمۃ القرآن کا یہی طریقہ مروّج ہے۔ خدا کرے کہ اِسے دوام ملے علماء کرام کا یہ کردار قابلِ تحسین ہے کہ اگر اسلام کا کوئی اِکا دُکا نادان دوست متن قرآن کے بغیر ترجمہ شائع کرنے کی جسارت کرتا ہے۔ یہ حضرات اُس کے انسداد کے لیے آواز اُٹھاتے ہیں کاش دین کی حفاظت کے ذمہ داروں میں اِس قسم بیداری معیاری اور غیر معیاری تراجم کی تمیز کے حوالہ سے بھی وجود میں آتی تو کیا ہی اچھا ہوتا لیکن وجہ فرق ظاہر ہے کہ اِس سلسلہ میں ترجمۃ القرآن کی تعریف، غرض، موضوع سے آگاہی ضروری ہے۔ شرائط کا احاطہ اور احتیاطی تقاضوں کا احساس درکار ہے اور قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم وفنون میں مہارت ناگزیر ہے۔ جس میں ترقی کے بجائے دُنیا انحطاط وتنزّل کی

---

(۱) فتح القدیر، ج:1، ص:248، مطبوعہ نورھی رضویہ سکھر پاکستان۔

طرف جارہی ہے۔تو پھر ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے درست ونادرست کی تمیز کہاں سے ہوگی۔(الا ماشآء اللہ وقلیل ماھم ابقاھم اللہ وآدام وجودھم المسعود)

۲ قرآن شریف کا ترجمہ وجود میں لانے کے جواز کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف کے مطابق ہو ورنہ کسی ایسے ترجمہ کو جائز کہا جاسکتا ہے نہ اِس کی اجازت دی جاسکتی ہے جو اِس سے خلاف ہو اور ترجمۃ القرآن کی تعریف یہ ہے کہ قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے بدلا جائے جو اُن کے قائم مقام ہوسکیں۔(۱) یعنی اُن کی لسانی، مرادی، فنی، عرفی اور محاورتی گویا تمام قابلِ فہم ومتعارف حیثیات کے مطابق ہو جس میں ترجمہ کے الفاظ کی انفرادی حیثیت سے آیت کریمہ کے انفرادی الفاظ کے مطابق ہونے کے ساتھ اِن کی اجتماعی نوعیت اُن کی اجتماعی نوعیت کے مطابق ہونے کے نتیجہ میں ترجمہ بامحاورہ ہوتا ہے یعنی دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہوتا ہے۔اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ترجمۃ القرآن کی اِس تعریف کا اول حصہ یعنی قرآن شریف کے الفاظ سے بدل کے طور پر مذکور ہونیوالے الفاظ بمنزلہ جنس قریب ہے ترجمۃ القرآن کے لیے جبکہ دوسرا حصہ یعنی قرآنی الفاظ کے قائم مقام ہونے والی صفت بمنزلہ فصل قریب ہے اور جنس قریب وفصل قریب سے ترکیب پانے والی یہ تعریف ترجمۃ القرآن کے لیے حد تام قرار پاتی ہے اور اہل علم سے یہ بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ کسی بھی محدود ومعرّف اور ماہیت کی فصل قریب اُس کے لیے مقوّم ہوتی ہے یعنی اُس کے وجود وقوام میں داخل ہوتی ہے اِس کے مطابق ترجمہ کے الفاظ جب تک قرآنی الفاظ کے قائم مقام یعنی اُن کی تمام متعارف حیثیات کے مطابق نہیں ہوتے اُس وقت تک ترجمۃ القرآن کا حقیقی وجود ممکن نہیں ہوتا جب ترجمۃ القرآن کہلانے کا قابل ہی نہیں ہوتا تو پھر اُس پر ترجمۃ القرآن کا اطلاق کرنا بھی جائز نہیں ہوسکتا اور نہ ہی ترجمۃ القرآن کے نام سے پائے جانے والے کسی ایسے الفاظ وکلام کو معنوی قرآن سمجھنا جائز ہوسکتا ہے جبکہ حدِ تام کے مطابق وجود میں آنے والا ترجمۃ القرآن معنوی قرآن کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

---

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، ج:1،ص:111،مطبوعہ حجازی القاھرہ مصر۔

خلاصۃ البحث:۔ ترجمہ کے الفاظ وکلام اگر قرآن شریف کے الفاظ اور اُن کی کلامی حیثیت کے مطابق نہیں ہیں تو اُنہیں چاہے ترجمہ کے نام سے یاد کیا جائے یا کسی دوسرے نام سے بہر حال ترجمۃ القرآن کہلانے کے قابل ہرگز نہیں ہوتے۔ اِس کی مثال ایسی ہے جیسے فلسفہ کے حصہ منطق کی تعریف میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے قانون سے عبارت ہے جو فکری غلطی سے بچا سکے یعنی اُسے پیشِ نظر رکھ کر فکر کرنے والے کو غلطی نہیں لگ سکتی اور اُس کے ترازو میں ہونے والی انسانی فکر کبھی خطا نہیں ہو سکتی یہاں پر بھی قانون بمنزلہ جنس ہے منطق کے لیے جبکہ فکری خطائی سے بچانے والی صفت اس کے لیے بمنزلہ فصل ہے جب علم منطق کے لیے جنس وفصل ہونے کی حیثیت سے یہ دونوں بالترتیب پائے جائیں گے تب فنِ منطق کا وجود وقوام ممکن ہوگا ورنہ نہیں انجام کار منطق کا جو ضابطہ وقانون فکری خطائی سے بچانے والی صفت کے بغیر پایا جائے وہ نہ صرف بے سود وبے مقصد ہوگا بلکہ منطق کہلانے کے قابل بھی نہیں ہوگا۔ اِسی طرح علم اُصول فقہ ایک فن ہے جس کی جامع ومانع تعریف بشکل حدِ تام اِس طرح ہے کہ وہ ایسے ضوابط سے عبارت ہے جن کی وساطت سے شرعی احکام کو اُن کی تفصیلی دلائل سے مستنبط کیا جا سکتا ہے اِس میں اُصول کہلانے والے ضوابط بمنزلہ جنس ہیں جبکہ شرعی احکام کو اُن کے تفصیلی دلائل سے سمجھنے کے لیے وسیلہ بننے والی صفت بمنزلہ فصل ہے جب یہ دونوں اِسی ترتیب سے پائے جائیں گے تب اُصولِ فقہ کا وجود وقیام ہوگا اور دونوں کے مجموعے پر اُصولِ فقہ کا اطلاق درست ہوگا ورنہ صفت مقوّمہ ومميّزہ کے بغیر برائے نام ضابطہ کا وجود وعدم برابر ہے۔ اِسی طرح پیشِ نظر مسئلہ میں بھی ترجمہ کے الفاظ اور اُن کی یہ صفت کہ قرآنی الفاظ کے قائم مقام یعنی اُن کی تمام متعارف حیثیات کے مطابق ہونا بھی دونوں اپنی رُتبی ترتیب کے ساتھ جب پائے جائیں گے تب ترجمۃ القرآن کا وجود وقوام ممکن ہوگا، ترجمۃ القرآن کا اس پر اطلاق درست ہوگا۔ انجام کار ترجمہ بھی سودمند اور بامقصد کہلائے گا ورنہ بغیر تطابق کے محض ترجمہ والے الفاظ کو ترجمہ کہا جائے یا کسی دوسرے نام سے یاد کیا جائے۔ بہر حال حقیقت کی نظر میں وہ ترجمۃ القرآن کہلانے کے قابل نہیں ہوگا۔ اسلام میں ترجمۃ القرآن کے نام سے ایسے الفاظ کی

اجازت ہوسکتی ہے نہ ایسے کلام کی یہ وہ حقیقت ہے جس سے انحراف کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ہے لیکن حقائق سے پردہ اُٹھانے کے سوا ہم کچھ اور نہیں کرسکتے جبکہ ہمارے پچاس سالہ تجربہ کے مطابق قرآن شریف کا ترجمہ کرنے والوں کی غالب اکثریت اِس حقیقت سے نا آشنا ہے جو بجائے خود المیہ ہے۔ ہم پورے وثوق واعتماد کے ساتھ اہل علم کو بتانا چاہتے ہیں کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف ''ابدال لفظة بلفظة تقوم مقامها'' یا اِس اجمال واختصار سے زیادہ واضح اور سہل الفہم الفاظ میں ''ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التي تقوم مقامها'' کو پیش نظر رکھ کر ترجمہ کرنے والے سے قرآن شریف کا ترجمہ کرنے میں کبھی بے اعتدالی نہیں ہوسکتی لیکن المترجمين عنه غافلون یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر قرآن وسنت کا سیاسی اقتدار ہوتو ترجمۃ القرآن کی جامع ومانع تعریف سے خلاف ترجمہ کرنے والوں کی جگہ زندان کے سوا کہیں اور نہ ہوگی جس پر عمل حضرت امام مہدی کی آمد سے قبل ممکن ہوتا نظر نہیں آرہا۔

❸ ترجمۃ القرآن کی مذکورہ جامع ومانع تعریف کے مطابق اُس کی فصل مقوّم کی پہچان یعنی یہ تمیز کرنا کہ ترجمہ کے الفاظ قرآنی الفاظ کے قائم مقام کہلانے اور اُن کی تمام متعارف حیثیات کے مطابق کہلانے کے قابل ہیں یا نہیں تاکہ سقیم سے سلیم کی تفریق کرنا آسان ہوجائے اور ترجمۃ القرآن کے نام سے التباس الحق بالباطل کے اندھیرے سے بچا جاسکے۔ اِس کے لیے اُن علوم میں دسترس ضروری ہے جو قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ کہلاتے ہیں جنہیں ترجمۃ القرآن کی صحت کے لیے شرائط بھی کہا جاتا ہے جبکہ حقیقت میں وہ ترجمۃ القرآن کی تعریف میں موجود اِس فصل مقوّم کی پہچان کے لیے شرائط ہیں جو کسی چیز کی صفت بحال متعلقہ کو اُس کی صفت کہنے کی طرح یہاں پر بھی ترجمۃ القرآن کے فصل ممیز ومقوم کی پہچان کے لیے شرائط کو ترجمۃ القرآن کے لیے شرائط کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیوں کہ اِن سب کا اجتماعی وجود فصل مقوّم کے وجود کو مستلزم ہے جبکہ فصل مقوم کا وجود ترجمۃ القرآن کے وجود کو مستلزم ہے اور قرآن شریف کا کیا گیا جو ترجمہ بھی اِس قابل ہو کہ اُسے ترجمۃ القرآن کہنا درست ہو وہ ہمیشہ صحیح ومعیاری ہوتا ہے اِسی طرح جن چیزوں کو ہم فصل

مقوّم کی پہچان کے لیے شرط کہہ رہے ہیں اُن کی فوتگی فصلِ مقوّم کی فوتگی کو مستلزم ہے اور اُس کی فوتگی ترجمۃ القرآن کی فوتگی کو مستلزم ہے، جس کے مطابق قرآن شریف کا کیا گیا جو ترجمہ بھی شرائط سے منحرف ہو یعنی اُس کے الفاظ قرآنی الفاظ کے مطابق اور اُن کے قائم مقام کہلانے کے قابل نہ ہو وہ ہر لحاظ سے کالعدم ہوتا ہے، بے سود و بے مقصد ہوتا ہے اور نادرست و غیر معیاری ہوتا ہے۔ ایسے میں جن چیزوں کو شرائط کہا جاتا ہے اُنہیں فصلِ مقوّم کی پہچان کی طرف منسوب کر کے شرائط لتمیز الفصل المقوم کہا جائے یا ترجمۃ القرآن کی صحت کی طرف منسوب کر کے شرائط لصحت ترجمۃ القرآن کہا جائے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ ہر طرح جائز ہے نہ صرف اتنا بلکہ صحت ترجمۃ القرآن اور فصل مقوّم لترجمۃ القرآن میں سے کسی ایک کی طرف منسوب کیے بغیر نفس ترجمۃ القرآن کی طرف منسوب کر کے شرائط لترجمۃ القرآن کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اصل حقیقت تک رسائی کے بعد جواز کے حوالہ سے لفظی اطلاق و استعمال میں بڑی وسعت ہوتی ہے۔

تفصیل بعد التفصیل:۔ ترجمۃ القرآن لکھنے اور دُنیا کی کسی بھی زبان میں اسے وجود دینے کے جواز کے لیے صرف ایک صورت ہے جو اُس کا صحیح و درست ہونا ہے ورنہ قرآن شریف کا غلط ترجمہ لکھنے اور غیر معیاری حضرات کو اِس میدان میں آنے کا جواز ہرگز نہیں ہے اور اِس کے صحیح و درست ہونا تب ہی ممکن ہوگا جب تعریف کے مطابق ہو اور تعریف کے مطابق ہونے کے لیے ضروری ہے کہ شرائط کے مطابق ہو اور شرائط کے مطابق ہونا تب ممکن ہو سکتا ہے جب مترجم اِن تمام شرائط کے جامع اور معیاری ہو ورنہ فاقد الشرائط اور غیر معیاری مترجم سے قرآن شریف کا معیاری ترجمہ وجود میں آنا ایسی ہی ناممکن ہے جیسا اونٹ کا دودھ دینا اِسی فلسفہ کے مطابق نبی اکرم سیدِ عالم ﷺ نے نااہل کے لیے اِسے ممنوع قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوٴ مقعده من النار“(۱)

---

(۱) ترمذی، ج:2، ص:119، کتاب التفسیر۔

دوسری روایت میں فرمایا:

''من قال فی القرآن برایہ فاصاب فقداخطاء''(۱)

اِس کی تشریح کرتے ہوئے محدثین کی غالب اکثریت نے یہی کہا ہے کہ اِس سے مراد وہ حضرات ہیں جو بغیر شرائط کے ترجمہ وتفسیر کرتے ہیں کیوں کہ شرائط اور قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم و فنون سے عاری یا ناقص حضرات کو اِس میں آنا ہی جائز نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ مشہور مقالہ ''رمیۃ من غیر رام''کے حسن اتفاق سے اُس کا کیا ہوا ترجمہ وتفسیر اگر درست ہو بھی جائے پھر بھی گناہ سے خالی نہیں ہوگا کیوں کہ فاقد الشرائط کا اِس عمل میں آنا بجائے خود بے اعتدالی اور موجب سزا جرم ہے۔''لہوا لگا کر خود کو شہیدوں میں'' شمار کرنے والوں کی طرح فاقد الشرائط کا مترجم بننے کو گناہ اور قابلِ سزا جرم قرار دینے میں محدثین کا اختلاف ہے نہ فقہاء کا اِس سلسلہ میں وارد یہ روایات اگر بالفرض محدثین کے طبقہ ناقدین کی نگاہ میں ثابت نہ بھی ہوں پھر بھی اِس کے مضمون کی صحت میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ محدثین سے لے کر فقہاء ومفسرین تک سب کے نزدیک فاقد الشرائط ترجمۃ القرآن کے لیے بھی نا اہل ہوتا ہے تفسیر کے لیے بھی اِس کے باوجود اُس کا مترجم بننا بالا جماع ناجائز وحرام ہے، شرعی حدود سے تجاوز اور معصیت ہے جس سے بچنے کے لیے ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے''من قال فی القرآن برایہ فقد کفر''ایک اور روایت میں''فلیتبؤ مقعدہ من النار''(۲) جیسے الفاظ بھی آئے ہیں۔ اِس قسم روایات سے قطع نظر محض درایۃ کی روشنی میں دیکھا جائے تب بھی نتیجہ یہی آتا ہے کہ فاقد الشرائط اور ناقص شخص کا مترجم بننا جائز نہیں ہے۔ نیز قرآن شریف جامع العلوم والمعارف کتاب ہے اپنی زبان کی جملہ لسانی حیثیات سے لے کر دُنیا بھر کے علوم وفنون اور عقلیات کے تمام زاویوں پر محیط ہے جس وجہ سے حدیث شریف میں اِسے ''لاتنقضی عجائبہ''جیسی صفت سے موصوف بتایا گیا ہے کہ جس علم اور جس فن کے زاویہ سے

---

(۱) ترمذی، ج:2،ص:119، کتاب التفسیر۔

(۲) ترمذی، ج:2،ص:119، کتاب التفسیر۔

بھی اِس پر غور کیا جائے اِس کے عجائبات و معارف لانہایت دکھائی دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اِس کے ترجمہ کی صحت کے لیے جو شرائط اِس کتاب کے گزشتہ صفحات میں ہم بیان کر چکے ہیں اُن کی غالب اکثریت کا تعلق بھی اِن ہی علوم وفنون کے ساتھ ہے جن میں دسترس کے بغیر مترجم بننے والے کی مثال اندھیرے میں تیر چلانے والے سے مختلف نہیں ہوگی اور اہل علم سے یہ بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ میں غلطی کے خطرناک نتائج ہوتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف خلافِ واقعہ نسبت کرنے کے ساتھ التباس الحق بالباطل کا وبال بھی ہوتا ہے جس کی مذمت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اِنَّ الَّذِینَ یَفْتَرُونَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُونَ''(۱)

اللہ کے رسول سید عالم ﷺ نے فرمایا:

''اتَّقُوا الحَدِيثَ عَنِّي اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ''(۲)

نیز فرمایا: ''لَا تَكْذِبُوا عَلَيَّ فَاِنَّ الْكَذِبَ عَلَيَّ يُوْلِجُ النَّارَ''(۳)

اِس سلسلہ میں تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ تفسیر کی صحت کے لیے شرائط کے جامع و معیاری حضرات پر حسبِ ضرورت قرآن شریف کی تفسیر کرنا اور اُسے وجود میں لانا لازم ہونے کی طرح ترجمہ کی شرائط کے جامع و معیاری خوش قسمتوں پر بھی حسبِ ضرورت ترجمۃ القرآن لکھنا اور اُسے وجود میں لانا شریعت مقدسہ کا ناگزیر حکم ہے اگر ضرورت کے وقت وہ اِس سے کتراتے ہیں، کاہلی و سستی کرتے ہیں اور استطاعت کے باوجود خود کو اِس شرف سے محروم رکھتے ہیں کتمانِ علم کی وعید میں آتے ہیں اللہ کے رسول سیدِ عالم ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) یونس:69۔

(۲) ترمذی شریف،ج:2،ص:119،مطبوعہ میرمحمد کتب خانہ کتاب محل کراچی۔

(۳) ابن ماجہ شریف،ص:5،مطبوعہ نورمحمد اصح المطابع کراچی۔

"مامن رجل یحفظ علما فیکتمہ الااُتِیَ بِہٖ یوم القیامہ مُلْجَمًا بلجام من النار"(۱)

باقی رہا یہ تصور کہ ترجمۃ القرآن کی شرائط کے جامع و معیاری حضرات پر شریعت کا یہ حکم کس درجہ میں ہے تو اِس کی تفصیل درج ذیل ہے:

❶ جس جگہ کسی اہل کتاب قوم کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا جارہا ہو کہ توحید الٰہی، بحث بعد الموت، مجازاۃ اعمال اور عدل و انصاف کی اہمیت جیسے کسی بھی بین الاقوامی مسئلہ سے متعلق آیاتِ قرآنی کا ترجمہ کیا جائے اور اِس مطالبہ سے اُن کا مقصد مروجہ تورات و انجیل کے ساتھ اِس کا تقابل کرنا ہو اور مطالبہ کرنے والے اِس بات پر آمادہ بھی ہوں کہ قرآن شریف کے احکام تورات و انجیل کے فرامین و احکام سے زیادہ مناسب اور زیادہ جامع ثابت ہونے کی صورت میں اِس پر ایمان لائیں گے۔

❷ کسی غیر مسلم عجم قوم یا جماعت سے فقط اتنی اُمید ہو کہ وہ اپنی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر اُس پر ایمان لائے گی یا کم از کم اسلام کی طرف مائل ہوگی یا اسلام کے خلاف منفی پروپیگنڈا کا زہر پھیلانے سے باز آئے گی یا کسی بھی حوالہ سے اسلام کے حق میں سودمند ہونے کی اُمید ہو۔

❸ دُنیا کی کسی زبان اور معاشرہ میں جب قرآن شریف کے غلط ترجمے مروّج ہو رہے ہوں عام اس سے کہ مترجم غیر مسلم ہو یا مسلم اناڑی جو قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم سے اور فنون آلیہ سے ہی بے خبر ہیں یا ان علوم و فنون میں نیم خواندہ اور ناقص ہوں یا ترجمہ کی شرائط کے جامع نہ ہو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو موجودہ دور میں غیر معیاری مترجمین کے اِن تمام طبقوں کے ہاتھوں لکھے ہوئے تراجم کی بہتات ہے جنہیں قرآن شریف کی معنوی تحریف کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

---

(۱) ابن ماجہ، ص:23، مطبوعہ اصح المطابع کراچی۔

❹ جس جگہ کسی عجم معاشرہ یا کسی قوم کو اسلام کے خلاف نفرت دلانے کی غرض سے دیدہ و دانستہ طور پر سازش کے تحت قرآن کا غلط ترجمہ شائع کیا جارہا ہو۔

❺ جس جگہ یا جس معاشرہ میں اِس اُفتاد کا امکان زیادہ ہو کہ آئندہ چل کر فاقد الشرائط اور نااہل حضرات قرآن شریف کا ترجمہ کرنے کی جسارت کریں گے اور غلط ترجمہ کرکے التباس الحق بالباطل کی راہ نکالیں گے۔

❻ جس معاشرہ میں موجود کسی جامع الشرائط معیاری شخصیت کو کسی قسم کی ایسی ناگزیر مجبوری لاحق ہو جس وجہ سے وہ خود پورے قرآن شریف کا ترجمہ نہیں لکھ سکتا اور لکھنے کو اُس معاشرہ کے لیے تحفظ ایمان کا واحد ذریعہ سمجھتا ہو تو جتنا کرسکتا ہے یا جن سورتوں کا یا حسب مناسب جن آیات کا ترجمہ کرسکتا ہے اُس کی ذمہ داری اُسی حد تک ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ''(۱) ہر جگہ کارفرما ہے جس سے تجاوز نہیں ہوسکتا۔

❼ جس معاشرہ میں کچھ جامع الشرائط کاملین پائے جاتے ہوں لیکن اُنہیں قرآن شریف کے ترجمہ کرنے کا عملی تجربہ نہ ہو جبکہ اُس معاشرہ میں موجود واحد و یکتا جامع الشرائط تجربہ کار کو یہ احساس ہو رہا ہو کہ ترجمہ کے عمل میں آنے پر تجربہ کا فقدان اِن کے علم پر غالب آسکتا ہے۔ انجامِ کار انجانے میں ترجمہ غلط ہوسکتا ہے اِس صورت میں بھی اُنہیں ترجمۃ القرآن کی مشق وتمرین کرا کر رہنمائی کرنا فرض عین قرار پاتا ہے جو اسلام کے مشہور اُصول ''مقدمۃ الواجب واجب'' کے زمرہ میں آتا ہے۔

ایسی تمام صورتوں میں جامع الشرائط حضرات پر فرض لازم قرار پاتا ہے کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ وجود میں لائیں۔ دراصل یہ کام مسلم اسٹیٹ کا ہے کہ جامع الشرائط ہستیوں کی افزائش بھی کرے اور اُن سے یہ کام بھی لے اور صحیح معنی میں مسلم اسٹیٹ یعنی خلافت علی منہاج النبوۃ کی عدم موجودگی میں اِس کی فرضیت پوری اُمہ پر عائد ہوتی ہے جسے فرض کفایہ کہا جاتا ہے اور

(۱) البقرۃ:286۔

ظاہر ہے کہ مسلم اُمہ میں موجود ہر شخص یہ کام نہیں کرسکتا بلکہ ایسے مشکل امتحان میں اسلام کو سر بلند کرنے تبلیغ بالقرآن کا حق ادا کرنے اور دفاعِ قرآن کا فریضہ انجام دینے کے لیے وہی کاملین آگے آسکتے ہیں جنہیں نبی اکرم سیدِ عالم ﷺ کے حقیقی وارث کہا جاتا ہے، جن کا وجودِ مسعود پوری اُمہ کے لیے ایسا ہی ضروری ہے جیسا بدن کے لیے روح۔ قرآن شریف کا ترجمہ لکھ کر وجود میں لانا اُمہ پر فرض ہونے کی یہ چند مثالیں جو ہم نے ذکر کیں صرف مثال بقدر مثال ہیں ورنہ اس عمل کے فرض ہونے کی اور بھی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں جبکہ اِس فریضہ کو عملی طور پر انجام دینے کی ذمہ داری جامع الشرائط کاملین کے سوا کسی اور پر عائد نہیں ہوتی۔ قرآن شریف کا ترجمہ کرکے وجود میں لانا فرض کفایہ یا فرض عین ہونے کی اِن صورتوں کے علاوہ کبھی مستحب بھی ہوتا ہے یعنی کرے تو مستحق ثواب ہوگا اور نہ کرے تو عذاب نہیں۔ مثال کے طور پر:

① مسلم عجم کے کسی معاشرہ کے بارے یہ معلوم ہوجائے کہ وہ اپنی زبان میں قرآن شریف کے معانی سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں جس کی واحد سبیل ترجمہ ہے جس میں قرآن شریف کے الفاظ کو اُن کی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلا جائے جو الفاظِ قرآنی کے مطابق ہوں جس میں ترجمہ کے الفاظ متنِ قرآن کے الفاظ کی تعداد کے مطابق نپے تُلے ہوں اور ترجمانی و تفہیم اور تفسیر جیسے عمل دخل سے محفوظ ہو۔

② ازخود کوئی جامع الشرائط ہستی یہ شوق کرے کہ ترجمہ کے ذریعہ قرآن شریف کے معانی و احکام سے دوسری زبان والوں کو آگاہ کرے کہ وہ کسی ترجمان یا ترجمانی اور تفسیر و تاویل جیسی مداخلتِ غیر کے بغیر خود معنوی قرآن سے استفادہ کرسکیں۔

ایسی تمام صورتوں میں جامع الشرائط حضرات کے لیے مستحب قرار پاتا ہے کہ قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کرکے دوسری زبان والوں کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کریں۔ ترجمۃ القرآن کی جوازی صورتوں کے شرعی احکام مختلف ہونے کی طرح عدمِ جواز بھی یکساں نہیں ہے بلکہ بنیادی طور پر اِس کی بھی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم:۔ فاقد الشرائط نا اہل کے لیے اِس عمل میں آنا بالیقین حرام اور نا دانستہ معصیت ہے جس میں فقہاء کی دو رائے ہیں نہ محدثین کی یہ الگ بات ہے کہ اصحاب محراب ومنبر کی غالب اکثریت اِس سے غافل ہے لیکن کسی کی نا سمجھی وغفلت کی وجہ سے حقیقت نہیں بدلتی۔

دوسری قسم:۔ مترجم اکثر شرائط کے جامع ہونے کے باوجود خلوصِ نیت اور للّٰہیت کی توفیق سے محروم ہو یا مَن پسند کو شرائط پر ترجیح دینے والا اور متعصب ہو۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ اِس عمل میں جس شرح تناسب سے فساد ہوگا اُسی کے مطابق عدم جواز کی شرح تناسب ہوگی جو حرام بھی ہوسکتا ہے مکروہ تحریم بھی، اسائت بھی ہوسکتا ہے، مکروہ تنزیہ اور خلافِ اولیٰ بھی کیوں کہ شریعت کے احکام ہمیشہ مقاصد کے مطابق ہوتے ہیں۔

ترجمۃ القرآن کا دوسرا زاویہ:۔

جہاں تک قرآن شریف کا لکھا گیا ترجمہ کی شرعی حیثیت ہے کہ اِسے کس حد تک قرآن شریف کے کمالات اور اس کے شرعی احکام کا حامل کہا جاسکتا ہے؟ اِس سلسلہ میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ:
قرآن شریف کے مخصوص فضائل اور انفرادیات مثلاً اعجاز، فصاحت وبلاغت میں بے مثل ہونا، اور نماز میں قرائۃ بما تیسر من القرآن کا ناگزیر ہونا، الفاظ کی ترتیب اور نظم البیان کی لپیٹ میں لانہایت علوم واسرار اور ماوراء الحس والعقل رموز ومعارف کا پوشیدہ ہونا اور برزخ بین الکتاب والخطاب ہونے کے ساتھ نظم ونثر کے ترازو میں بین بین ہونا جیسی کسی صفت کا ترجمہ کے الفاظ میں آنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا چہ جائیکہ اِن میں سے کسی چیز کا ترجمہ پر اطلاق کرنا جائز ہوسکے۔ اِس سے قبل بھی ہم بتا چکے ہیں کہ مخصوص دواعیات سے قطع نظر عام حالات میں قرآن شریف کا ترجمہ کرنے سے مقصد اُس کے اُن معانی ومقاصد کو دوسری زبان والوں پر ظاہر کرنا ہوتا ہے جنہیں سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے پر عام لوگ مکلف ہیں جو اللہ تعالیٰ کے فرمان "وَمَنْ بَلَغَ"(۱) سے مراد

(۱) الانعام:19۔

ہیں یہ قرآن شریف کے وہی معانی ہیں جنہیں مفہومِ اول اور معانی اولیہ بھی کہا جاتا ہے جنہیں لسان القرآن والے یعنی عرب محض سننے اور پڑھنے سے ہی سمجھ سکتے ہیں بشرطیکہ اِس کی طرف توجہ ہو اور اہل عجم اُن علوم وفنون کی مدد سے سمجھ سکتے ہیں جنہیں علوم خادمہ لفہم القرآن کہا جاتا ہے قرآن شریف کے ترجمہ سے اِس مقصد کو سمجھنے کے بعد کسی شخص کو بھی اِس بات میں تردد نہیں ہوسکتا کہ قرآن شریف کا کیا گیا ہر معیاری ترجمہ اُس کے معانی اولیہ سے عبارت ہے جس میں اعجاز کا تصور ہوسکتا ہے نہ قرآن شریف کے ساتھ مختص کسی اور صفت کا یہ الگ بات ہے کہ شرائط کے مطابق اور معیاری ترجمہ کے الفاظ قرآن شریف کے معانی اولیہ کے سوا کسی اور صفت سے عبارت نہ ہونے کے باوجود اُن رُموز ومعارف کے بھی منافی نہیں ہوتے جو نظم قرآن کی لپیٹ میں پوشیدہ، مثانی ومرموز الیہ ہوتے ہیں جن کی تعبیر اہل کشف حضرات اشارات کے عنوان سے کرتے ہیں ورنہ ترجمہ معیاری اور اصل کے مطابق کہلانے کے قابل نہیں ہوگا۔ قرآن شریف کے کیے گئے ترجمہ کی حقیقت اور اِس کے مظہر ومصداق پر تسلی ہونے کے بعد کہ یہ قرآن شریف کے معانی اولیہ سے عبارت ہے اِس کی شرعی حیثیت آپ ہی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ قرآن شریف کے الفاظ کا بدل ہونے کے ساتھ اُن کے کلامی معنی ومفہوم کا بھی مظہر ہے۔ الفاظِ قرآنی کا بدل اِس لیے کہ یہ ترجمۃ القرآن کی تعریف کا رکن اور اُس کا لازمی جزو ہے جیسا اُس کی تعریف سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ ''ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر التی تقوم مقامها'' سے عبارت ہے اور قرآن شریف کا ترکیبی وکلامی معنی اِس لیے ہے کہ ترجمہ کرنے سے اصل مقصد ومحرک اِن ہی معانی سے دوسری زبان والے لوگوں کو آگاہ کرنا ہوتا ہے، گویا قرآن شریف کا کیا ہوا ترجمہ بیک وقت دو مختلف صفات کا حامل ہے کہ اِس کے الفاظ کو الفاظِ قرآنی سے بدل کہنا بھی درست ہے اور قرآن شریف کا مفہوم اول اور معانی اولیہ کہنا بھی درست ہے اِسی فلسفہ کی بنیاد پر اِسے معنوی قرآن بھی کہا جاسکتا ہے جو عین حقیقت ہے اور قرآن کا اِس پر اطلاق اِس لیے نہیں ہوسکتا کہ یہ محض معانی ہیں جبکہ قرآن شریف اپنے علمی اور اسمی مفہوم میں الفاظ ومعانی کے مجموع مرکب سے عبارت ہے جیسا کہا جاتا ہے:

"ھو اسم للنظم والمعنی جمیعا فی قول عامة العلماء"(۱)

مگر یہ کہ اطلاق مجازی ہو اور اطلاق الکل علی الجزو کے قبیل سے مجاز مرسل ہو جیسا فتاویٰ ردُّ المحتار علی الدر المختار میں ابن عابدین المتوفی 1252ھ نے لکھا ہے:

"والاعجمی انما یسمّٰی قرآنا مجازا وکذا یصح نفی اسم القرآن عنه"(۲)

اِس سے قرآن شریف کے کیے ہوئے ترجمہ کی ایک اور حیثیت بھی واضح ہو رہی ہے کہ اِسے الفاظِ قرآنی کا ترجمہ کہنا درست ہے نہ قرآن شریف کے معانی کا بلکہ ترجمۃ القرآن اور کلام اللہ کا ترجمہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ کلام اللہ یعنی قرآن شریف الفاظ ومعانی دونوں سے مجموع مرکب کا نام ہے۔ اِس حقیقت سے غفلت کی بنا پر المعہد العالی للقضاۃ فی الریاض المملکۃ السعودیۃ کے مدیر المناع القطان نے ترجمۃ القرآن کو قرآن شریف کے معانی کا ترجمہ کہا ہے۔(۳) جس سے اثر لے کر پاکستان کے کچھ علمی حلقے اور خاص کر الجامعۃ الاسلامیۃ بین المللی یونیورسٹی اسلام آباد کے ذمہ داروں نے بھی ترجمۃ القرآن کو ترجمۃ معانی القرآن کے نام سے مشہور کرنا شروع کر دیا ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

موصوف کی اِس اختراع پر مکمل تبصرہ گزشتہ صفحات میں ہم کر چکے ہیں تاہم یہاں پر اس کی شرعی حیثیت سے متعلق بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی عقائد کی روشنی میں ترجمۃ القرآن کو ترجمہ معانی القرآن کہنا غلط محض ہے اِس لیے کہ معانی کی طرف ترجمہ نہیں بلکہ ترجمانی منسوب ہوتی ہے جو کسی بھی اہل علم سے پوشیدہ رہنے کی چیز نہیں ہے تو پھر قرآن شریف سے متعلق ایسی خلافِ حقیقت نسبت کرنے کا کیا جواز ہے اور اہل علم سے یہ بھی مخفی نہیں ہے کہ ترجمانی وترجمہ کا عمل ایک دوسرے

(۱) کتاب الحسامی فی اُصول الفقه بحث کتاب الله۔

(۲) فتاویٰ ردالمحتار علی الدرالمختار، ج:1، ص:358، مطبوعہ الماجدیہ کوئٹہ پاکستان۔

(۳) مباحث فی علوم القرآن للمناع القطان، ص: 285 تا ص: 289، مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ محلہ جنگی پشاور پاکستان۔

سے مختلف ہیں کہ ترجمانی کا اولاً و بالذات تعلق معانی کے ساتھ ہونے کی وجہ سے الفاظ میں کمی وبیشی اور ایجاز واطناب کا فرق ہوسکتا ہے جبکہ ترجمہ کا اولاً و بالذات تعلق کلام سے یعنی الفاظ ومعانی سے مجموع مرکب کے ساتھ ہونے کی بنیاد پر کمی وبیشی جیسی کسی بھی تفریق کی گنجائش نہیں ہوتی جیسا ترجمۃ القرآن کی تعریف ''ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر اللتی تقوم مقامھا'' سے آپ ہی ظاہر ہے۔ ایسے میں مباحث فی علوم القرآن کے سعودی مصنف جناب مناع القطان کے اِس انداز کی اجازت اسلام کے کسی ایک مذہب میں بھی نہیں ہے چہ جائیکہ حنبلی مذہب میں اس کا تصور ہوسکے جبکہ اِس کا ترجمان اور السعودیہ العربیہ کے اہل حدیث سے لے کر تمام حنبلی علماء کے نزدیک قابلِ اعتماد شخصیت حافظ ابن تیمیہ نے بھی لکھا ہے:

''وقال الجمهور من جميع الطوائف ان الكلام اسم للنظم والمعنى جميعا كماان الانسان المتكلم اسم للروح والجسم جميعا وانه اذااطلق على احدهما فبقرينة''(۱)

ایسے میں ترجمۃ القرآن کو ترجمہ معانی القرآن کہنے کو نہ صرف اختراع بلکہ اختلاق کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اِس کے علاوہ ترجمۃ القرآن کو ترجمہ معانی القرآن کہنے کے عدم جواز پر ایک واضح دلیل یہ بھی ہے کہ یہ انوکھے اور غیر مانوس الاستعمال لفظ مرکب اضافی کے قبیل سے ہے کیوں کہ ترجمہ معانی القرآن کہنے میں لفظ ترجمہ مضاف ہے جبکہ معانی القرآن اُس کے لیے مضاف الیہ ہے اور ظاہر ہے کہ مضاف ومضاف الیہ میں مغایرت ضروری ہے کیوں کہ کسی چیز کا اپنی ذات کی طرف مضاف ہونے کو عقل تسلیم کرتی ہے نہ نقل جبکہ یہاں پر ایسا نہیں ہے کیوں کہ ترجمہ کے الفاظ کے سوا معانی القرآن کا وجود ہی نہیں ہے بلکہ ہر معیاری ترجمہ کے الفاظِ مفردہ میں قرآن شریف کے الفاظِ مفردہ کے معانی اور اِن کی ترکیبی وارتباطی حیثیت میں الفاظِ قرآنی کے ارتباطی معانی

(۱) مجموعہ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ج: 12، ص:35، مطبوعہ بامر خادم الحرمین للتوزیع مجانا فی سبیل اللہ المکہ المکرمہ۔

موجود ہوتے ہیں۔ ایسے میں ترجمہ معانی القرآن جیسے اجنبی استعمال کے مضاف ومضاف الیہ کو ایک چیز کہے بغیر کون رہ سکتا ہے۔ جو درایۃً بھی باطل ہے روایۃً بھی۔

المختصر یہ کہ ترجمۃ القرآن کو ترجمہ معانی القرآن کہنے کو عربی محاورہ میں جائز کہا جاسکتا ہے نہ عجمی انداز کلام میں اِسی طرح عرفِ عام میں اِس کی اجازت ہے نہ کسی اسلامی مذہب میں بلکہ اِس کی حیثیت سعودیہ العربیہ سے اُٹھنے والی بدعت کے سوااور کچھ نہیں ہے جس سے عجمی درس گاہوں کے ناواقفِ حال حضرات متاثر ہورہے ہیں۔ اِس کے عدم جواز پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب ترجمۃ القرآن کو ترجمہ الفاظ القرآن کہنا مناسب نہیں ہے تو پھر ترجمہ معانی القرآن کہنا کیوں جائز ہو حالانکہ الفاظ القرآن کہنے میں جواز کا کچھ لائحہ موجود ہے کیوں کہ اِس میں تین احتمالات ہوسکتے ہیں:

پہلا احتمال:۔ اِس سے مراد قرآن شریف کے الفاظِ مفردہ کا ترجمہ ہو لا بشرط شئی کے درجہ میں۔

دوسرا احتمال:۔ اِس سے مراد قرآن شریف کے الفاظِ مفردہ کا ترجمہ ہو بشرط لا کے درجہ میں۔

تیسرا احتمال:۔ اِس سے مراد قرآن شریف کے الفاظ کا ترجمہ ہو بشرف شئی کے درجہ میں یعنی الفاظِ قرآنی مِن حیث الکلام۔

اِسی آخری صورت یعنی الفاظِ القرآن مِن حیث الکلام پر ترجمہ کا اطلاق کر کے ترجمۃ الفاظ القرآن کہنا درست ہوسکتا ہے کیوں کہ ایک لفظ کا دوسرے لفظ پر محمول ہونے سے مقصد ''**اتحاد المفهومين في المصداق**'' کے سوااور کچھ نہیں ہوتا جس میں علوم عقلیہ کے آئمہ کا اختلاف ہے نہ علوم نقلیہ و لسانیہ کا منطق کے سلم العلوم میں ہے:

''**الحمل اتحاد المتغائرين في نحو من التعقل بحسب نحو آخر من الوجود اتحادًا بالذات اوبالعرض**''(۱)

(۱) سلم العلوم فی المنطق بحث تصدیقات۔

اور ظاہر ہے کہ اِن دولفظوں یعنی ترجمۃ الفاظ القرآن باعتبار الترکیب الکلامی اور ترجمۃ القرآن کا مفہوم ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود مصداق دونوں کا ایک ہے اِس کے باوجود ترجمۃ القرآن کو ترجمہ الفاظ القرآن کہنا محض اِس لیے مناسب نہیں ہے کہ پہلی دوصورتوں کے مصداق ترجمۃ القرآن کے مصداق سے مختلف ہیں کہ اُن میں الفاظ کے ترکیبی وکلامی اعتبار کا وجود نہیں ہے جبکہ ترجمۃ القرآن محض الفاظ کا نہیں بلکہ الفاظِ کلامی یعنی کلام اللہ کا ترجمہ ہوتا ہے ورنہ قرآن شریف کو محض الفاظ سے عبارت کہنا پڑے گا جس کا بطلان ایسا ہی واضح ہے جیسا محض معانی سے عبارت کہنے کا بطلان واضح ہے، جمہور اہل اسلام سے خلاف اور اختراع فی الدین ہے۔ (اعاذنا اللہ منہ)

حقائق کی اِس روشنی میں ترجمۃ القرآن کے الفاظ کی مذکورہ دوصفات کہ یہ الفاظِ قرآنی کے قائم مقام ہونے کے ساتھ معنوی قرآن بھی ہیں کے علاوہ مزید ایک اور حیثیت بھی معلوم ہورہی ہے کہ یہ ترجمۃ القرآن کے لیے موضوع بحث بھی ہیں کیوں کہ قرآن شریف کا ترجمہ فنِ ترجمہ کے ماتحت خاص فن اور مستقل صنف ہے اور کسی بھی فن میں موضوع بحث وہی چیز ہوتی ہے جس کے عوارضات وحالات سے بحث کی جاتی ہے جیسا علم تفسیر میں قرآن شریف کے احوال سے من حیث الدلالہ علی مراد اللہ تعالیٰ بحث ہونے کی بنیاد پر خود قرآن شریف اُس کا موضوع قرار پاتا ہے۔ اِسی طرح ترجمۃ القرآن میں بھی ترجمہ کے الفاظ کی صحت وسقم اور معیاری وغیر معیاری اور فصیح وغیر فصیح جیسے احوال سے بحث ہونے کی بنا پر اِس کا موضوع بھی اِن الفاظ کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

قرآن شریف سے منسوب ہر صفت واجب التعظیم ہے:

اسلامی عقیدہ کے مطابق قرآن شریف سے منسوب ہر صفت اور ہر نسبت واجب التعظیم ہونے کی بنا پر ترجمہ کے یہ تینوں اوصاف انفرادی طور پر بھی واجب التعظیم قرار پاتے ہیں جبکہ بیک وقت تینوں کے اجتماعی طور پر حامل ہونے کی وجہ سے وجوبِ تعظیم کی وسعت تین گنا زیادہ ہوجاتی ہے یہاں تک کہ حقیقت میں قرآن نہ بلکہ معانی قرآن ہونے کے باوجود بعض احکام میں قرآن شریف

کے مساوی قرار پاتے ہیں جیسا توہین و بے ادبی کا حرام و معصیت ہونا یعنی قرآن شریف کی اہانت و بے ادبی حرام ہونے کی طرح اُس کے ترجمہ کے اِن الفاظ کی اہانت و بے ادبی بھی حرام ہے اور بغیر طہارت کے مس ناجائز و گناہ ہونا یعنی قرآن شریف کو بغیر طہارت کے مَس کرنا گناہ و ناجائز ہونے کی طرح اُس کے ترجمہ کے الفاظ کو بغیر طہارت مَس کرنا بھی گناہ و ناجائز ہے، حیض و نفاس والی عورت پر اسے پڑھنا اور چھونا ممنوع و گناہ ہونا یعنی جیسا قرآن کا پڑھنا اور اُسے چھونا حیض و نفاس والی عورت کے لیے ناجائز و گناہ ہے۔ اِسی طرح اُس کے ترجمہ کو معنوی قرآن سمجھ کر پڑھنا اور چھونا بھی ممنوع و گناہ ہے، اِسی طرح واجب التعظیم ہونا یعنی جس طرح قرآن شریف واجب التعظیم ہے ویسا اُس کا ترجمہ بھی معنوی قرآن ہونے کے ناطے واجب التعظیم ہے۔ اِسی طرح فرضیت تبلیغ کا ادا ہونا یعنی جیسا اہل عرب کو نفس قرآن کی تبلیغ پہنچانے سے فریضہ ادا ہوتا ہے۔ اِسی طرح اہل عجم کو اُس کا ترجمہ پہنچانے سے بھی تبلیغ کا فریضہ ادا ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ''(الانعام،19)

سجدہ تلاوت کا لازم ہونا یعنی جیسا اصل قرآن میں سجدہ تلاوت کی آیت پڑھنے یا سننے سے سجدہ لازم آتا ہے اِسی طرح اُس کا ترجمہ پڑھنے یا سننے سے بھی لازم ہوتا ہے۔ اور حالتِ جنابت جیسے کسی بھی حدثِ اکبر کی حالت میں کتابت کا ممنوع و ناجائز ہونا یعنی جیسا جنابت کی حالت میں اصل قرآن کی کتابت کرنا ممنوع و ناجائز ہے اِسی طرح اُس کا ترجمہ لکھنا بھی ممنوع و ناجائز ہے۔ فتاویٰ العالمگیریہ میں ہے:

''ولو کان القرآن مکتوبا بالفارسیة یکرہ لهم مسه عندابی حنیفه وکذاعندهما علی الصحیح''(۱)

فتاویٰ البزازیہ میں ہے:

''ولو تلی بالفارسیة تجب علیه وعلی من سمعها السجدة فهم السامع اولم

(۱) الفتاویٰ العالمگیریہ، ج:1، ص:39، مطبوعہ نوری کتب خانہ پشاور پاکستان۔

یفهم اذا اخبر السامع انه قراء آیة السجدة"(۱)

فتاویٰ الدرالمختار میں ہے:"**یمنع قرائة قرآن بقصده ومسه ولو مکتوبا بالفارسیة فی الاصح**"(۲)

فتاویٰ البحرالرائق فی شرح کنزالدقائق میں ہے:"**ولو کان القرآن مکتوبا بالفارسیة یحرم علی الجنب والحائض مسه بالاجماع وهو الصحیح**"(۳)

قرآن شریف کو حاصل اس قسم احکام کا اُس کے ترجمہ کے لیے حاصل ہونے کا فلسفہ اس کے تینوں اوصاف کا اجتماع ہے کہ بیک وقت ترجمۃ القرآن من حیث الفن کے لیے موضوع ہونے کے ساتھ معنوی قرآن بھی ہیں اور الفاظِ قرآنی سے بدل اور اُن کے قائم مقام بھی ہیں جب ان میں سے ہر ایک اپنی انفرادی حیثیت سے موجب تعظیم ہے تو پھر ان کا اجتماع تین گنا زیادہ موجب تعظیم کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی جس زبان میں بھی قرآن شریف کا لکھا ہوا ترجمہ پایا جاتا ہے وہ اُس کے عرفِ عام میں معنوی قرآن کہلاتا ہے اور عرفِ عام کا یہ تاثر محض ترجمۃ القرآن کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر کتاب کے ترجمہ کا یہی حال ہے چاہے عرشی ہو یا فرشی اور تورات وانجیل کے پائے جانے والے تراجم جو تورات وانجیل کے نام سے مشہور ہو چکے ہیں اِس کا فلسفہ بھی یہی کچھ ہے۔

حقائق کی اِس روشنی میں قرآن شریف کے کیے گئے ترجمہ کی شرعی حیثیت واحکام واضح ہونے کے ساتھ اِس عمل میں آنے یعنی ترجمہ کرکے اِسے وجود میں لانے والوں کی شرعی ذمہ داریاں بھی ظاہر ہو رہی ہیں کہ یہ نہایت احتیاط طلب امر ہے، وسیع الجہات اور کثیر الشرائط ہے ایک

---

(۱) الفتاوی النبرازیه علی هامش العالمگیریه، ج: 1، ص: 156، مطبوعه نوری کتب خانه پشاور پاکستان۔

(۲) الدرالمختار فی شرح تنویر الابصار فی المذهب الحنفی، ج: 1، ص: 51، بحث فی احکام الحیض والنفاس۔

(۳) البحرالرائق، ج: 1، ص: 212، دارالمعرفه بیروت۔

شرط سے خلاف ہونے پر بھی آیت کریمہ کا مفہوم کیا سے کیا ہوسکتا ہے یہاں تک کل مکاتب فکر علماء اسلام متفق ہیں اور سب کی ایک آواز ہے کہ کسی فاقد الشرائط نااہل کے لیے اِس عمل میں آنا جائز نہیں ہے، چاہے دُنیوی علوم میں بڑے سے بڑے مقام پر فائز کیوں نہ ہو اور شیخ الحدیث ومرشد الناس کہلانے والا ہی کیوں نہ ہو۔ عہد صحابہ سے لے کر آج تک الٰہیات کے طبقہ محدثین سے لے کر مفسرین اور طبقہ فقہاء تک کسی نے بھی بغیر شرائط کے مفسر بننے کی بھی اجازت نہیں دی ہے چہ جائیکہ ترجمہ کے عمل میں آنے کو جائز کہا جائے جبکہ ترجمہ کا معاملہ تفسیر کی بہ نسبت زیادہ مشکل اور ہمہ جہت قابلِ احتیاط ہے۔ نیز ان تمام حضرات نے اُن لوگوں کو حدیثِ نبوی ﷺ "من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوء مقعده من النار" (ترمذی شریف، ج:2،ص:119، کتاب التفسیر) کا مصداق ومظہر قرار دیا ہے جو بغیر شرائط کے مفسر بننے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر بغیر شرائط کے مترجم بننے والوں کا کیا ہی حال ہوگا۔ مفتی الدیار الشامیہ محمد ابن عابدین نے فتاویٰ ردالمحتار میں علم کلام، علم الاصول، علم النحو، علم متن اللغۃ، علم المعانی اور علم البیان جیسے فنون کے بغیر تفسیر ناجائز ہونے سے متعلق ضمنی گفتگو میں لکھا ہے:

"وکل هذه آلة لعلم التفسیر"(۱)

اور ظاہر ہے کہ آلہ کے بغیر نہ صرف تفسیر بلکہ کوئی کام بھی درست نہیں ہوتا چہ جائیکہ قرآن شریف کے ترجمہ جیسا کثیر الشرائط عمل درست ہوسکے۔

مالکی المذہب مفسر ابو حیان الاندلسی المتوفی 754ھ نے قرآن فہمی کو اصل الاصول قرار دینے کے ساتھ دوسرے تمام علوم وفنون کو اس کی دست آوری کے لیے بمنزلہ آلہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"کتاب الله هو المقصد بالذات وغیره من العلوم له کالادوات"(۲)

اور جن علوم وفنون کو قرآن فہمی کے لیے بمنزلہ آلہ کہا ہے مفسر ومترجم میں اُن کے اجتماع کو ضروری شرط

---

(۱) فتاویٰ ردالمحتار، ج:1، ص:32، مطبوعہ ماجدیہ کوئٹہ پاکستان۔

(۲) خطبہ تفسیر البحر المحیط للامام ابی حیان الاندلسی الغرناطی۔

قرار دینے کے ساتھ ان کے فاقد و ناقص سے متعلق لکھا ہے:

"فانه بمعزل عن فهم غوامض الكتاب وعن ادراك لطائف ماتضمنه من العجب العجاب وحظه من علم التفسير انما هونقل اسطار وتكرار محفوظ على مر الاعصار"(۱)

یہاں پر بھی وہی اُصول ہے کہ جب بغیر شرائط کے تفسیر کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے تو پھر ترجمہ کا حق کیوں ادا ہو جبکہ ترجمہ کا معاملہ تفسیر کے مقابلہ میں درجہا مشکل اور زیادہ قابلِ احتیاط ہے۔شافعی المذہب مفسر امام جلال الدین السیوطی المتوفی 911ھ نے موقوف علیہ علوم وفنون کو ترجمہ وتفسیر کے لیے شرط قرار دینے کے بعد اِن کے بغیر قرآن شریف میں رائے زنی کرنے والوں کو تفسیر بالرائے کی وعید میں شمار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"لايكون مفسراالا بتحصيلها فمن فسر بدونها كان مفسرابالرائے المنهى عنه واذافسر مع حصولها لم يكن مفسرابالرائے المنهى عنه"(۲)

تقریباً اِسی قسم تفصیل الاتقان فی علوم القرآن میں بھی لکھی ہوئی موجود ہے(۳)

معتزلی المذہب مفسر جاراللہ الزمخشری نے علم المعانی اور علم البیان میں پوری طرح مہارت کو قرآن فہمی کے لیے ضروری قرار دینے کے بعد ترجمہ وتفسیر کے لیے دوسری شرائط کے ناگزیر ہونے سے متعلق لکھا ہے:

"بعدان يكون آخذامن سائر العلوم بحظ جامعا بين امرين تحقيق وحفظ كثير المطالعات، طويل المراجعات، قدرجع زمانا ورجع اليه وردوردعليه

---

(۱) البحر المحیط، ج:1،ص:7،مطبوعہ دارالفکر بیروت۔

(۲) التبحیر فی التفسیر،ص:330، للامام جلال الدین السیوطی المتوفی 911ھ، المطبوع دارنشرالکتب الاسلامیہ لاھور۔

(۳) الاتقان فی علوم القرآن،ج:2،ص:182،مطبوعہ حجازی بالقاھرہ۔

فارسا فی علم الاعراب، مقدما فی حملة الکتاب‘‘(۱)

حنفی المذہب مفسر السید محمود البغدادی المتوفی 1270ھ نے اِس موضوع سے متعلق کہ قرآن شریف کی تفسیر وترجمہ کے عمل میں آنا کس کے لیے جائز اور کس کے لیے ناجائز ہے اپنے سے پیشرووں کی تصریحات کو اختصار اور خلاصة الکلام کے طور پر لکھا ہے:

’’فالذی ینبغی أن یعول علیه أن من کان متبحرا فی علم اللسان مترقیا منه إلی ذوق العرفان وله فی ریاض العلوم الدینیة أوفی مرتع، وفی حیاضها أصفی مکرع یدرك إعجاز القرآن بالوجدان لا بالتقلید وقد غدا ذهنه لما أغلق من دقائق التحقیقات احسن اقلید فذاك یجوزله ان یرتقی من علم التفسیر ذروته ویمتطی منه صهوته، وأما من صرف عمره بوساوس أرسطاطالیس واختار شوك القنافذ علی ریش الطواویس فهو بمعزل عن فهم غوامض الکتاب وإدراك ما تضمنه من العجب العجاب‘‘(۲)

جوعلوم وفنون قرآن فہمی کے لیے بمنزلہ آلہ ہیں کہ اُن کی وساطت سے قرآن شریف کے متعارف معانی پہچانے جاتے ہیں جنہیں مفہوم اول یا المعانی الاولیہ کہا جاتا ہے اُن میں پوری طرح تجربہ اور عملی تمرین حاصل کیے بغیر ترجمہ وتفسیر کے عمل میں آنے والوں کو تفسیر بالرائے کی وعید میں شمار کرتے ہوئے مالکی المذہب مفسر الامام ابوعبداللہ القرطبی المتوفی 671ھ نے لکھا ہے:

’’فمن لم یحکم ظاهر التفسیر وبادرالی استنباط المعانی بمجرد فهم العربیه کثر غلطه ودخل فی زمرة من فسر القرآن بالرائی‘‘(۳)

(۱) مقدمة الکشاف، ج:1، ص:17، لجاراللہ الزمخشری المتوفی 538ھ۔

(۲) مقدمه تفسیر روح المعانی، ج: 1، ص:7، للعلامه السید محمود البغدادی المتوفی 1270ھ، مطبوعه دارالمعرفه بیروت۔

(۳) الجامع للاحکام القرآن للامام القرطبی، ج:1، ص:34، مطبوعه الغزالی دمشق الشام۔

شرائط کے جامع ہوئے بغیر قرآن شریف کا ترجمہ کرنے کے ناجائز اور مستحق عذاب ہونے سے متعلق مشتے نمونہ ازخروارے متقدمین کی اِن چند عبارات کے علاوہ ماضی قریب اور وقتِ حاضر کے تمام مکاتب فکر اہل علم نے بھی یہی کچھ کہا ہے اور کہہ رہے ہیں کہ فاقد الشرائط وناقص حضرات کو ترجمۃ القرآن کرنا جائز ہے نہ تفسیر کرنا بلکہ ایسے نااہلوں کا مترجم ومفسر بننا لہولگا کر شہیدوں میں شمار ہونے والوں سے مختلف نہیں ہے نہ صرف اتنا بلکہ ایسے حضرات حدیثِ نبوی ﷺ ''مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ '' کے مظہر قرار پاتے ہیں۔ تفسیر مجمع البیان کے مصحح اور اُس کا مقدمہ لکھنے والے جعفری المذہب سکالر محمد جواد البلاغی نے جاراللہ الزمخشری کی بیان کردہ شرائط کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''لایحل التعاطی لمن عری عنھااوھوفیھاضالع''(۱)

ایک اوراسکالر اور التفسیر الکاشف کے مصنف نے سورۃ البقرہ، آیت نمبر 78 ''ومنھم امیون لا یعلمون الکتابَ الاامانی وانھم الایظنون'' کے تحت لکھا ہے:

''وفی ھذہ الآیۃ دلالۃ واضحۃ علی ان تفسیر الکتاب والسنۃ لایجوز بالتخرص والظن بل لا بد قبل کل شیء من العلم بقواعد التفسیر واُصولہ ومراعاۃ ھذہ القواعد فی بیان مراداللہ ورسولہ حذرامن الکذب علیھما والنسبۃ الیھما دون مبرر شرعی واول الشروط لصحۃ التفسیرالقرأتہ والکتابۃ ثم العلوم العربیہ بشتی اقسامھا من معرفۃ مفردات اللغۃوالصرف والنحو وعلم البیان والفقہ واُصولہ وعلم الکلام والالمام ببعض العلوم الاخری التی یتصل بھاتفسیر بعض الآیات علی ان ھذہ یمکن للمفسر ان یرجع فی معرفتھا لاھل الاختصاص''(۲)

---

(۱) مقدمہ مجمع البیان، ج:1، ص:66، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران۔

(۲) التفسیر الکاشف لمحمدجوادمغنیہ، ج1، ص134، مطبوعہ دارالعلم للملایین بیروت۔

ماضی قریب کے ایک اور مشہور حنفی المسلک سکالر انور شاہ کشمیری المتوفی 1352ھ نے لکھا ہے:

''وممایبنغی ان لا یذهل عنه ان نظم القرآن لایؤدی المراد فقط بل یُنَبِّهُ علی الحقائق ویرمزالیها فعلی المترجم له بلفة اُخری ان یرعی ذٰلك النظم ثم ینظر الی لغة اُخری انها هل تؤدی مؤداه اولا ومن لایبالی بذٰلك ربما یغیر المراد''(۱)

اِس عبارت میں موصوف نے ترجمۃ القرآن کے صرف ایک شرط کی خلاف ورزی کا انجام بد بتایا ہے کہ اِس کے فاقد نااہل کا کیا ہوا ترجمہ مرادِ الٰہی سے خلاف ہوسکتا ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن شریف کا ایسا ترجمہ کرنے کی اجازت اہل اسلام کے کسی بھی مذہب میں نہیں ہے جو مرادِ الٰہی سے خلاف ہوتا ہو تو پھر اِس کا مآل ''مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ''(۲) کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ مفتی محمد شفیع نے لکھا ہے:

''قرآن کریم کی تفسیر ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے، جس کے لیے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں، بلکہ تمام متعلقہ علوم میں مہارت ضروری ہے چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ مفسر قرآن کے لیے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کے نحو وصرف اور بلاغت وادب کے علاوہ علمِ حدیث، اُصولِ فقہ وتفسیر اور عقائد وکلام کا وسیع وعمیق علم رکھتا ہو کیوں کہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو، انسان قرآن کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا

افسوس ہے کہ کچھ عرصہ سے مسلمانوں میں یہ خطرناک وبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف عربی پڑھ لینے کو کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان پڑھ لیتا ہے، وہ قرآن کریم کی تفسیر میں رائے زنی شروع کردیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی معمولی شُدھ بُدھ رکھنے والے لوگ جنہیں عربی پر بھی مکمل عبور

(۱) فیض الباری شرح صحیح البخاری، ج3،ص7،مطبوعہ مکتبہ یعقوب الفراھی۔

(۲) ترمذی، ج:2،ص:119،میرمحمد کراچی پاکستان۔

نہیں ہوتا، نہ صرف من مانے طریقے پر قرآن کریم کی تفسیر شروع کر دیتے ہیں، بلکہ پُرانے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے درپے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں، اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں چُوکتے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ انتہائی خطرناک طرز عمل ہے جو دین کے معاملہ میں نہایت مہلک گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، دنیوی علوم وفنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کرے تو دُنیا کا کوئی صاحب عقل اُسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کرسکتا اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کرسکتا ہے، جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم وتربیت حاصل نہ کی ہو، اس لیے ڈاکٹر بننے کے لیے صرف انگریزی سیکھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم وتربیت حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح کوئی انگریزی داں انجینیر نگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے انجینیر بننا چاہے تو دنیا کا کوئی بھی باخبر انسان اسے انجینیر تسلیم نہیں کرسکتا، اس لیے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آسکتا، بلکہ اس کے لیے ماہر اساتذہ کے زیر تربیت رہ کر ان سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری ہے، جب ڈاکٹر اور انجینیر بننے کے لیے یہ کڑی شرائط ضروری ہیں تو آخر قرآن وحدیث کے معاملہ میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کیسے کافی ہوسکتا ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہر شخص اس اُصول کو جانتا اور اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم وفن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، جنہیں پورا کیے بغیر اس علم وفن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی، تو آخر قرآن وسنت اتنے لاوارث کیسے ہوسکتے ہیں کہ ان کی تشریح وتفسیر کے لیے کسی علم وفن کے حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو اور اس کے معاملہ میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کر دے۔" (۱)

---

(۱) معارف القرآن، ج:1، ص:53تا54، مطبوعہ ادارہ المعارف کراچی نمبر14۔

ایک اشتباہ کا ازالہ:۔ الٰہیات پر سطحی نظر رکھنے والے نیم خواندہ حضرات کو یہاں پر اشتباہ ہوسکتا ہے کہ فاقد الشرائط اور نااہل کے لیے قرآن شریف میں رائے زنی کرنے کے ممنوع و حرام ہونے سے متعلق اسلاف کی یہ تصریحات تفسیر سے متعلق ہیں ترجمہ کے بارے میں نہیں ہیں جبکہ یہاں پر موضوع سخن ترجمہ ہے تفسیر نہیں اور تفسیر وترجمہ ایک دوسرے سے جدا فن ہیں۔ اُن کی تعریف وغرض اور موضوع بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ تفسیر کی تعریف یہ ہے کہ یہ ایسا فن ہے جس میں آیاتِ قرآنیہ کے احوال سے اِس حیثیت سے بحث کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد پر دلالت کریں اور ترجمہ کی تعریف یہ ہے کہ یہ ایسا فن ہے جس میں قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے بدلا جاتا ہے جو اُن کے قائم مقام اور مطابق ہوسکیں اور علم تفسیر کا موضوع خود قرآن شریف ہے جبکہ ترجمۃ القرآن کا موضوع ترجمہ کے الفاظ ہیں اور علم تفسیر سے غرض وغایت یہ ہے کہ اِس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کے مراد اور مقاصد قرآنیہ کی پہچان ہوتی ہے جبکہ ترجمہ سے مقصد دوسری زبان والوں کو قرآن شریف کے مقاصد ومعانی سے آگاہی کا موقع فراہم کرنا ہوتا ہے۔ ایسے میں تفسیر کی شرائط کے فاقد ونااہل کے لیے قرآن شریف کا ترجمہ کرنے کو ناجائز وحرام قرار دینا کون سا انصاف ہے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ اِس قسم کا تصورتفسیر اور ترجمہ کے مابین نسبت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہورہا ہے۔ اِس کی تفصیل اِس طرح ہے کہ ترجمۃ القرآن کا لُغوی مفہوم بھی وہی ہے جو عرفی مفہوم کہلاتا ہے یعنی قرآن شریف کے الفاظ کو ترجمہ والی زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا جو اُن کے قائم مقام اور اُن کی تمام قابل فہم حیثیات کے مطابق ہوسکیں جبکہ تفسیر کے دو الگ الگ مفہوم ہیں:

لُغوی:۔ لُغت کی زبان میں کسی چیز کے کھولنے اور ظاہر کرنے کو تفسیر کہا جاتا ہے۔ مفردات القرآن امام الراغب الاصفہانی میں ہے:''**الفسر اظهار المعنى المعقول**''

عرفی:۔ جو الفاظِ قرآنی کے مفہوم اور مرادِ الٰہی پر دلالت کرنے کی حیثیت میں اُن سے بحث کرنے سے عبارت ہے۔

تفسیر کے اِن دو مفاہیم کے مابین عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے کہ عرفی مفہوم میں تفسیر کی ہر شکل اور ہر فرد پر اُس کا لُغوی مفہوم صادق آتا ہے جس کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ ''**کل تفسیر عرفی تفسیر لغوی**'' لیکن اِس سے برعکس نہیں ہے یعنی یوں نہیں کہا جاسکتا کہ ''**کل تفسیر لغوی تفسیر عرفی**'' جبکہ تفسیر کے یہ دونوں مفہوم ترجمہ کے مقابلہ میں عام مطلقا ہیں۔ جس کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ ''**کل ترجمۃالقرآن المعیاری تفسیر**'' یعنی قرآن شریف کا ہر معیاری ترجمہ اُس کی تفسیر ہے کیوں کہ ترجمہ والی زبان میں مرادِالٰہی کا اظہار ہو رہا ہے تو پھر اِس حمل کے صدق میں کس کو شک ہوسکتا ہے لیکن اِس سے برعکس نہیں ہوسکتا یعنی یوں نہیں کہا جاسکتا کہ ''**کل تفسیر ترجمۃ**'' کیوں کہ تفسیر میں متن کے الفاظ سے زیادہ الفاظ بھی ہوسکتے ہیں بلکہ تفسیر کی غالب اکثریت ایسی ہی ہوتی ہے جبکہ ترجمہ میں زیادہ الفاظ کی گنجائش نہیں ہوتی مگر یہ کہ ترجمہ والی زبان کی طرف سے کوئی خاص مجبوری لاحق ہو جو بہت کم کہیں ہوتا ہے اِس کے لیے بھی مخصوص اُصول وضوابط ہوتے ہیں جن کی تفصیل اِس کتاب کے پہلے باب میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

باقی رہا یہ تصور کہ تفسیر کی جن اقل قلیل قسموں پر ترجمہ صادق آتا ہے اُن کی کیا صورت ہے؟ تو اِس کی مثالوں میں قرآن شریف کے وہ تمام تراجم شامل ہیں جنہیں ترجمۃ القرآن کی حقیقت سے نا آشنا حلقوں میں لفظی ترجمہ، ترجمہ تحت اللفظ اور تحت اللفظ ترجمہ جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ جن کی حقیقت تفسیرِ لفظی کے سوا اور کچھ نہیں ہے جسے تعریف لفظی بھی کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ والی زبان میں قرآنی الفاظ کی ترتیب کے ساتھ تفسیر کی جاتی ہے جس میں کبھی کبھار بعض جگہوں میں ترجمۃ القرآن کی شکل بن جاتی ہے جسے حُسنِ اتفاق کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاتا ترجمۃ القرآن کے نام سے اُردو زبان میں لکھے گئے شاہ رفیع الدین کا ترجمہ ''القرآن الکریم'' گوجرانوالہ پاکستان، پنجاب کے مولانا ظریف القادری کا ترجمہ، اور حافظ صلاح الدین یوسف ومعاونین کی ٹیم کا کیا ہوا ترجمہ بنام ''لفظ بہ لفظ رواں اُردو ترجمہ'' اِس کی زندہ مثالیں ہیں۔ ترجمۃ القرآن اور تفسیر کے مفاہیم کے مابین اِس نسبت کو پیشِ نظر رکھنے والا ہر شخص سمجھتا ہے کہ تفسیر کے عمل میں آنے کے لیے شرائط کا

ترجمہ کے عمل میں آنے کے لیے شرط ہونا ضروری ہے کہ جو شخص تفسیر لکھنے کی شرائط کا جامع نہیں ہے وہ ترجمۃ القرآن لکھنے کے لیے بدرجہ اولیٰ نااہل ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جس کا تفسیر لکھنا جائز نہیں ہے اُس کا مترجم قرآن بننا بدرجہ اولیٰ ناجائز وممنوع ہے۔ نیز جو شخص فاقد الشرائط ہونے کے باوجود مفسر بن کر حدیث نبوی ﷺ "مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ" کا مستحق قرار پاتا ہے قرآن شریف کا مترجم بن کر بدرجہ اولیٰ اِس کا سزاوار قرار پائے گا۔ الغرض اسلاف کی مذکورہ تصریحات کے مطابق جس کا مفسر بننا ممنوع وناجائز ہے اُس کا مترجم قرآن بننا بدرجہ اولیٰ ناجائز وممنوع اور گناہ ہے کیوں کہ مفسر بننے کے لیے ضروری شرائط کا جامع ہونے کے ساتھ مترجم قرآن بننے کے لیے اُن سے کچھ اضافی شرائط کا جامع ہونا بھی ضروری ہے جن کی مکمل تفصیل اِس کتاب کے گزشتہ صفحات میں ہم بیان کر چکے ہیں اور ترجمہ کا معاملہ تفسیر کی بہ نسبت زیادہ مشکل اور ہمہ جہت قابلِ احتیاط ہے جس کے پیشِ نظر بلا تخصیص مسلک کل مکاتب فکر اسلاف کے اولین وآخرین کے نزدیک مفسر بننے کے لیے جملہ شرائط مترجم بننے کے لیے بھی ضروری قرار پاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسلاف کے اولین وآخرین میں کسی ایک مکتب نے بھی فاقد الشرائط کو مترجم بننے کی اجازت نہیں دی ہے۔

کچھ تحسین اور کچھ شکوہ:۔ جن حضرات نے بغیر شرائط واہلیت کے مترجم ومفسر بننے والوں کو گناہ گار قرار دیا ہے، حدیث نبوی ﷺ "مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ" کا مصداق اور سزاوار عذاب قرار دیا ہے اُنہوں نے اِس سلسلہ میں شرعی احکام کا اظہار کیا ہے جو قابل تحسین ہے خاص کر زمرہ متاخرین اور ماضی قریب کے مفتی محمد شفیع نے اپنے مذکورہ کلام میں قرآن شریف پر ہونے والے جن مظالم کا رونا رویا ہے اور قرآن فہمی کے لیے صرف عربی زبان جاننے کو کافی وشافی کہنے والوں کی جن بے اعتدالیوں کا اشارہ دیا ہے اُسے مرض کی درست تشخیص کہا جاسکتا ہے لیکن اِس کے ساتھ سینکڑوں کی تعداد میں لکھے گئے اُن غلط تراجم پر بھی ماتم کرنا چاہیے تھا جو مختلف مکاتب فکر کے ایسے حضرات نے کیا ہے اور کرتے جارہے ہیں

جو شرائط کے جامع نہیں ہیں معیاری اور اِس میدان کے شہسوار بننے کے قابل نہیں ہیں اور حدیث نبوی ﷺ ''مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ'' کی وعید سے مستثنیٰ بھی نہیں ہیں۔ ہمارے علماء کرام کے اِس کردار کو تضاد کے سوااور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک طرف فاقد الشرائط نااہل کے مترجم بننے کو ناجائز اور سزاوار عذاب قرار دے رہے ہیں جو عین حقیقت ہے، دوسری طرف ایسے ناقص حضرات کے کیے ہوئے خلاف شرائط اور غلط تراجم کو قرآن مجید کی خدمت قرار دے رہے ہیں، کافی وشافی کہہ رہے ہیں اور درست ہونے کی سند دے رہے ہیں اور یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ اِن جیسا اچھا کوئی اور نہیں لکھ سکتا۔ (فیاللعجب لھذاالعجب و التضاد)

قول وعمل کے اِس تضاد میں برصغیر پاک وہند علماء کی غالب اکثریت مبتلا ہے جوالمیہ سے کم نہیں ہے مشتے نمونہ از خروارے مفتی محمد شفیع بانی دارالعلوم کراچی پاکستان نے ایک جگہ ترجمۃ القرآن کو ہمہ جہت قابلِ احتیاط بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''تفسیر قرآن جو عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں ہواس میں سب سے اہم اور احتیاط کی چیز قرآن کا ترجمہ ہے کیوں کہ وہ اللہ کے کلام کی حکایت ہے، اس میں ادنیٰ سی کمی بیشی بھی اپنی طرف سے روانہیں، اس لیے میں نے خود کوئی ترجمہ لکھنے کی ہمت نہیں کی۔''(۱)

ہم اِس کی تحسین کرتے ہیں کہ مختصر الفاظ میں ترجمۃ القرآن کی اہمیت بتائی ہے اور اِس میں شرائط سے ادنیٰ کمی وبیشی کو بھی ناروا وناجائز قرار دیا ہے جو حدیث نبوی ﷺ کے مطابق اور حقیقت ہے لیکن اِس کے پانچ صفحات بعد تفسیر شروع کرتے ہوئے قرآن شریف کی ابتدائی آیت ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کا جو ترجمہ کیا ہے وہ اِس سے خلاف ہے لکھا ہے کہ:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

(۱) معارف القرآن، ج:1،ص:68۔

لسانِ قرآنی سے قدرے واقف حضرات بھی جانتے ہیں کہ یہ ترجمہ تین وجوہ سے غلط ہے:

پہلی وجہ:۔ اُس کی نحوی حیثیت سے خلاف ہے کیوں کہ نحوی اُصولوں کے مطابق یہاں پر اسم جلالت (اللّٰہِ) موصوف ہے جس کے بعد ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' اِس کی صفت بعد الصفہ ہیں اور موصوف وصفت کا مجموعہ جملہ ہوتا ہے نہ کلام بلکہ اس کی لسانی اور نحوی حیثیت مفرد کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کلام کے مقابلہ میں اِسے مفرد کہنے میں اہل لسان کی دو رائے ہیں نہ نحاۃ کی جس کے برعکس اِس ترجمہ میں اسے جملہ ظاہر کیا گیا ہے جیسا اُس کے مذکورہ الفاظ'' جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں'' سے ظاہر ہے کیوں کہ اُردو محاورہ کے مطابق لفظ'' ہے، ہیں'' جملہ کے ساتھ خاص ہیں جو الفاظ جملہ و کلام نہیں ہوتے اُن کے لیے انہیں استعمال نہیں کیا جاتا۔ ایسے میں مذکورہ انداز کو ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' شریف کا معیاری ترجمہ کہنے کے لیے نحاۃ تیار ہیں نہ بلغاء اور لسانِ قرآنی اِسے تسلیم کرتی ہے نہ تفسیر۔

دوسری وجہ:۔ ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کی لسانی حیثیت دو حال سے خالی نہیں ہیں:

پہلا حال:۔ جار و مجرور یعنی بسم اللہ کے لیے عامل فعل ہوگا مثلاً (شروع کرتا ہوں) اِس صورت میں پورے ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' شریف میں ایک جملہ ہوگا جبکہ مذکورہ ترجمہ میں اُس کے دو جملے ظاہر کیے گئے ہیں تو پھر اسے غلط محض کے سوا اور کیا کہا جائے۔

دوسرا حال:۔ جار و مجرور یعنی بسم اللہ کے لیے عامل مصدر ہوگا مثلاً (شروع اللہ کے نام سے، اللہ کے نام سے شروع) جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا ہے اِس صورت میں پوری ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' شریف ایک جملہ بھی نہیں ہوگا کیوں کہ نحوی اور بلاغی اُصولوں کے مطابق مصدر اپنے فاعل یا قائم مقامِ فاعل سے مل کر شبہ جملہ بھی نہیں ہوتا چہ جائکہ جملہ ہو تو پھر دو جملوں میں کیے گئے مذکورہ ترجمہ کو اُس کی لسانی اور نحوی حیثیت کے مطابق کون کہے۔

تیسری وجہ:۔ یہ دونوں زبانوں کے محاورہ سے خلاف ہے کیوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کر کے اُس وحدہ لاشریک کے لیے جمع کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جبکہ شانِ الٰہی کی تعظیم کو انسانوں کی تعظیم پر قیاس کرنے کی اجازت اسلام میں نہیں ہے۔ نیز قرآن شریف کی زبان یعنی عربی زبان میں اِس کی کوئی مثال ملتی ہے نہ اُردو زبان میں بلکہ دونوں کے محاورہ سے خلاف ہے اور ترجمہ کی حقیقت سے آگاہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ صرف ایک کے محاورہ سے خلاف ہونے والا ترجمہ بھی بامحاورہ نہیں کہلاتا چہ جائکہ دونوں زبانوں کے محاورہ سے خلاف کو اصل کے مطابق اور بامحاورہ کہا جاسکے۔

مترجمین پر افسوس کہ جب ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' شریف کا معیاری، بامحاورہ اور شرائط کے مطابق ترجمہ (شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان بہت رحم والا، شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان بے حد رحم والا، اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان بے حد رحمت والا، اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان بے حد رحم والا، شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت مہربان بے حد رحم والا) جیسے کسی بھی انداز میں ہوسکتا ہے جو بامحاورہ یعنی دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہونے کے ساتھ جملہ شرائط پر بھی منطبق ہیں اور ترجمہ کی تعریف کے سانچے میں فٹ ہونے کی بدولت ہر قسم اعتراض سے بھی پاک ومحفوظ ہیں۔ ہم مذکورہ غلط ترجمہ کرنے والے مترجمین سے زیادہ اُنہیں پذیرائی دینے والوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں اور انہیں کافی وشافی کہہ کر غلط تراجم کی ترویج کا سبب بننے والے مفتی محمد شفیع جیسے قابلِ ذکر حضرات سے شکوہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جس چیز کی اہمیت واحتیاط ظاہر کرنے میں لسان کی حد تک کمال کیا تھا آگے چل کر عمل کے میدان میں خود اُس کی دھجیاں اُڑادی۔ (فیاللعجب لعدم مساعدة العمل مع القول واللعب) یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ لکھتے وقت اگر تفسیر معارف القرآن کے مصنف ترجمۃ القرآن کی فطری شرائط کو پیشِ نظر رکھتے یا اُس کی جامع ومانع تعریف پر نظر رکھتے یا کم از کم اتنا کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ

الـرَّحْـمٰـنِ الـرَّحِيْمِ ''شریف کی لسانی اور نحوی یا بلاغی حیثیت کو مستحضر رکھتے تو مذکورہ ترجمہ پر کبھی راضی نہ ہوتے۔ اور اُس پر اپنی تفسیر کی بنیاد رکھنے کی غلطی کبھی نہ کرتے لیکن اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہاں پر ''اَلتَّعَصُّبُ اِذَا تَمَلَّكَ اَهلَكَ '' کی کارستانی تھی یا ''حب الشيء يعمي ويصم '' کی کارفرمائی یا کسی اور سبب سے (واللہ اعلم) تفسیر معارف القرآن کے مصنف بھی اپنے دوسرے ہم عصروں کے رنگ میں رنگے گئے اور سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی غلط تراجم کے مروج ہونے کا سبب بن گئے، جس پر جتنا افسو کیا جائے کم ہے۔ غلط اور خلافِ شرائط لکھے گئے تراجم کو صحت کی سند دینے کی بے اعتدالی میں تفسیر معارف القرآن کے مصنف منفرد نہیں ہیں بلکہ یہ عام المیہ ہے خصوصیت مسلک سے قطع نظر برصغیر پاک وہند علماء کی غالب اکثریت اِس میں مبتلا ہے۔ ہم اپنی اِس کتابی کاوش کے ذریعہ نہ صرف برصغیر پاک وہند اہل علم کو بلکہ دُنیا بھر کے اُن حضرات کو جو قرآن شریف کے ترجمہ سے استفادہ کے خواہاں ہیں، آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ جہاں قرآن شریف کا معیاری ترجمہ کرکے عجم اقوام کو اُس کے مقاصد سے آگاہ کرنا حسب ضرورت اُمہ پر فرض ہے اور یہ کام شرائط کے جامع حضرات کے سوا کوئی اور نہیں کرسکتا۔ اِسی طرح فاقد الشرائط نااہل چاہے بڑے سے بڑے دنیوی منصب پر فائز کیوں نہ ہوں، عوام کی نظر میں پیرومرشد اور شیخ الحدیث والتفسیر کہلانے والے ہی کیوں نہ ہوں جب تک شرائط کا جامع نہ ہوں اُن کے لیے اِس عمل میں آنا جائز نہیں ہے۔ اور دنیوی منصب یا مذہبی القاب سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اِس عمل میں آنے اور قرآن مجید کے مترجم بننے والوں کا انجام حدیث نبوی ﷺ ''مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ ''(۱) کا مظہر بننے کے سوا اور کچھ نہیں ہے (اعاذنا الله منه)

طویل تجربہ کا خلاصہ:۔ اللہ کی توفیق سے مجھے قرآنی علوم سے اُس وقت سے لگاؤ ہے جب سے درسِ نظامی سے فارغ تحصیل ہوکر عملی زندگی کا آغاز کیا ہے، الٰہیات کے درس وتدریس کے شعبہ سے منسلک ہوا اور معرفت کی وقیع کتاب (فصوص الحکم) پڑھنے کے بعد قرآن

---

(۱) ترمذی شریف، ج2ص119، مطبوعہ میر محمد کراچی۔

مجید کی آفاقیت کا شعور پایا اور ہر سال دینی مدارس کے تعلیمی سال کے آخر میں تعطیلات کے دوران پابندی کے ساتھ علماء کرام کو ترجمہ قرآن پڑھانے کا فریضہ انجام دیا۔ اِس دوران علوم قرآنی کے مختلف انواع و امواج میں غوطہ زنی کا شرف پایا اور برصغیر پاک و ہند کے مختلف مکاتب فکر مشاہیر کے لکھے ہوئے تراجم کا مطالعہ کیا، شرائط کی روشنی میں تجزیہ کیا اور صحت و سقم کے حوالہ سے تجربہ کیا۔ نصف صدی پر محیط اِس طویل تجربہ کا خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ دو سو سال کے دوران کیے گئے اِن تراجم کی غالب اکثریت غلط ہے، شرائط سے خلاف ہیں اور ترجمۃ القرآن کی تعریف سے برعکس ہے انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ مترجمین نے یہ لکھتے وقت ترجمۃ القرآن کی جامع و مانع تعریف کو دل و دماغ میں مستحضر نہیں کیا تھا، اُس کی شرائط کا پاس نہیں رکھا تھا بلکہ دو تین کے استثناء کے بعد باقی سب نے حسب پسند جیسا چاہا ویسا لکھ دیا ہے اِس کے ساتھ ہمارے تجربہ میں یہ بھی آیا ہے کہ جن جن حضرات نے اِن پر تبصرہ کیا ہے اور انہیں صحت کی سند دی ہے۔ نیز وہ جنہوں نے انہیں کافی وشافی کہہ کر انہیں قرآن شریف کی خدمت قرار دیا ہے اُن میں سے کوئی ایک بھی قرآن شریف کے تراجم پر تبصرہ کرنے اور معیاری و غیر معیاری کی تمیز بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھا، یعنی شرائط کا جامع نہیں تھا کیوں کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف کو معیار بنا کر یا شرائط کو پیشِ نظر رکھ کر تبصرہ کرنے والا کوئی شخص بھی شرائط سے خلاف اور تعریف سے برعکس تراجم کو درست قرار نہیں دے سکتا اور نہ ہی لفظی اور بامحاورہ ترجمہ یا تحت اللفظ اور تفسیری یا معانی کا ترجمہ جیسی مہمل و بے مقصد تقسیم کا تصور کرسکتا ہے کیوں کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف کہ وہ قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ سے بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام ہوسکیں یعنی اُن کی تمام لسانی اور متعارف حیثیات کے مطابق ہوسکیں۔ ایسی تقسیمات کی متحمل نہیں ہے کیوں کہ اِس کا مظہر بامحاورہ ترجمہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے جبکہ قرآن شریف کا بامحاورہ ترجمہ وہی کہلاتا ہے جو دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو ورنہ کسی ایک کے محاورہ سے بھی خلاف ہونے والا ترجمہ بامحاورہ ہرگز نہیں بلکہ بے محاورہ

کہلاتا ہے اور با محاورہ ہونا تب ممکن ہوسکتا ہے جب تمام شرائط کے مطابق ہو جبکہ ترجمۃ القرآن کی جملہ شرائط کا وجود اور اُس کی تعریف کے مظہر کا وجود مساوی فی المصداق ہوتے ہیں یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف کا مصداق موجود ہو لیکن شرائط کا اجتماعی وجود نہ ہو یا اِس سے برعکس نہیں معیاری ترجمہ میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اِس حوالہ سے قضیہ ''کل ما صدق علیه تعریف ترجمةالقرآن صدق علیه اجتماع شرائط الترجمة'' اِسی طرح قضیہ ''کل ما صدق علیه اجتماع شرائط الترجمة صدق علیه تعریف ترجمةالقرآن'' یہ دونوں ایسے ہی ناقابل انکار بدیہی ہیں جیسا قضیہ ''کل ما صدق علیه الانسان صدق علیه المتفکر'' اور قضیہ ''کل ما صدق علیه المتفکر صدق علیه الانسان'' ناقابلِ انکار بدیہی ہیں۔

ترجمۃ القرآن کی تعریف اور اُس کی شرائط سے آگاہ کوئی شخص بھی کسی خلاف شرط ترجمہ پر ترجمۃ القرآن کا اطلاق نہیں کرسکتا یعنی اُسے قرآن شریف کا معیاری ترجمہ نہیں کہہ سکتا یہی حال اُس کی تعریف سے خلاف کیے گئے تراجم کا بھی ہے کہ اُسے قرآن شریف کا درست ترجمہ نہیں کہا جاسکتا چہ جائیکہ کافی وشافی کہا جائے یا اُسے قرآن شریف کی خدمت قرار دیا جائے۔ نیز ترجمۃ القرآن کی تعریف اور اُس کی شرائط کے اجتماع کے مابین اِس نسبت کو سمجھنے والا کوئی شخص بھی ترجمۃ القرآن کو لفظی ترجمہ اور با محاورہ ترجمہ کی طرف تقسیم کرسکتا ہے نہ تحت اللفظ ترجمہ اور با محاورہ ترجمہ کے عنوان سے تقسیم کرسکتا ہے اور نہ ہی لفظ بہ لفظ ترجمہ اور تفسیری ترجمہ کے نام سے تقسیم کرنے کا سوچ سکتا ہے چہ جائیکہ ترجمہ معانی القرآن کے نام سے بدعت ایجاد کرنے کی جسارت کرسکے کیوں کہ ترجمۃ القرآن کی تعریف پر منطبق اور اُس کی شرائط کے مطابق ترجمہ با محاورہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جبکہ لفظ بہ لفظ، تحت اللفظ اور لفظی ترجمہ جیسے ناموں سے یاد کیے جانے والے تراجم ترجمۃ القرآن ہرگز نہیں بلکہ الفاظِ قرآن کے ترجمے ہیں جنہیں تعریفِ لفظی اور تفسیر المفردات

بھی کہا جاتا ہے جبکہ قرآن شریف محض الفاظِ قرآنی سے نہیں بلکہ الفاظ و معانی کے مجموع مرکب سے عبارت ہے۔ اِسی طرح تفسیری ترجمہ اور الترجمۃ التفسیریۃ پر بھی ترجمۃ القرآن کی تعریف صادق نہیں آتی کیوں کہ اِس کی حقیقت مفسر کی ترجیح، اُس کا دخل عمل اور اُس کی تفسیر کا ترجمہ ہے قرآنِ مجید کا نہیں۔ حقائق کی اِس روشنی میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ کہنا کہ:

''لفظی ترجمے کا اصل فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو قرآن کے ہر ہر لفظ کا مطلب معلوم ہو جاتا ہے اور وہ ہر آیت کے نیچے اس کا ترجمہ پڑھ کر جان لیتا ہے کہ اس آیت میں یہ کچھ فرمایا گیا ہے۔ لیکن اس فائدے کے ساتھ اس طریقے میں کئی پہلو نقص کے بھی ہیں جن کی وجہ سے ایک غیر عربی دان ناظر قرآن مجید سے اچھی طرح مستفید نہیں ہوسکتا۔

پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمے کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے وہ روانی عبارت، زورِ بیان، بلاغتِ زبان، اور تاثیر کا فقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایک ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھ کر نہ اس کی روح وجد میں آتی ہے، نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے، نہ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب و جگر تک اُترتی چلی جا رہی ہے۔ اس طرح کا کوئی تاثر رونما ہونا تو درکنار ترجمے کو پڑھتے وقت تو بسا اوقات آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی یہی وہ کتاب ہے جس کی نظیر لانے کے لیے دنیا بھر کو چیلنج دیا گیا تھا؟''(۱)

اِس کے ایک صفحہ بعد لکھا ہے:

''لفظی ترجموں سے طبائع کے پوری طرح متاثر نہ ہوسکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ترجمے بالعموم بین السطور درج کیے جاتے ہیں، یا نئے طرز کے مطابق صفحے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے

---

(۱) تفہیم القرآن، ج:1، ص:7، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور۔

ایک طرف کلام اللہ اور دوسری طرف ترجمہ لکھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اُس غرض کے لیے تو عین مناسب ہے جس کی خاطر آدمی لفظی ترجمہ پڑھتا ہے، کیوں کہ اس طرح ہر لفظ اور ہر آیت کے مقابلے میں اس کا ترجمہ ملتا جاتا ہے۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہے کہ ایک آدمی جس طرح دوسری کتابوں کو پڑھتا اور اُن سے اثر قبول کرتا ہے، اُس طرح وہ ترجمۂ قرآن کو نہ تو مسلسل پڑھ سکتا ہے اور نہ اس سے اثر قبول کرسکتا ہے کیوں کہ بار بار ایک اجنبی زبان کی عبارت اس کے مطالعہ کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہے۔"(۱)

اِس کے ایک صفحہ بعد لکھا ہے: "لفظی ترجمے کے طریقے میں کسر اور خامی کے یہی وہ پہلو ہیں جن کی تلافی کرنے کے لیے میں نے "ترجمانی" کا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اُردو کا جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کردوں۔ اسلوبِ بیان میں ترجمہ پن نہ ہو، عربی مبین کی ترجمانی اُردوئے مبین میں ہو، تقریر کا ربط فطری طریقے سے تحریر کی زبان میں ظاہر ہو، اور کلام الٰہی کا مطلب ومدعا صاف صاف واضح ہونے کے ساتھ اس کا شاہانہ وقار اور زورِ بیان بھی جہاں تک بس چلے ترجمانی میں منعکس ہوجائے۔"(۲)

یہ سب کچھ مذکورہ حقائق سے غفلت کا نتیجہ اور بے مصرف کلام ہے اِسی طرح حافظ صلاح الدین یوسف اور اُن کے معاونین کی شرکت عمل سے وجود میں آنے والا ترجمۃ القرآن بنام معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اُردو ترجمہ میں لکھا گیا یہ کلام:

"قرآن فہمی کے لیے لفظی ترجمہ ہی عوام کے لیے مناسب رہتا ہے۔ بامحاورہ ترجمے سے

---

(۱) تفہیم القرآن، ج:1، ص:8، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور۔

(2) تفہیم القرآن، ج:1، ص:10، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور۔

جوکلامِ الٰہی کی ترجمانی ہوتا ہے، زیادہ سلیس ورواں ہونے کی وجہ سے قرآن کا مفہوم تو بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے لیکن اس رواں دواں ترجمے کو بار بار پڑھنے کے باوجود، پڑھنے والے کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ قرآن کے فلاں لفظ کا ترجمہ کیا ہے اور فلاں کا کیا۔ یوں عمر بھر قرآن خوانی اور ترجمہ خوانی کے باوجود، وہ براہِ راست (ترجمے کے بغیر) قرآن خوانی کے لطف اور اس کے فہم سے اور اس کے اعجاز اور سحر بیانی سے محروم رہتا ہے۔‘‘(۱)

اور دوسری جگہ پر لکھا ہے: ’’ہم یہاں اپنے اس احساس کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس کی توثیق یا تائید بیسیوں دوسرے صاحبانِ علم نے بھی کی ہے اور ان سب آراء کا ملخص یہ ہے کہ قرآن مجید کا کماحقہ ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں، البتہ اس کی ترجمانی کی بہتر سے بہتر کوششوں اور اسالیب کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ بس یہی ایک نقطہ نظر ہے جس کے پیشِ نظر ہر عہد کے مترجمین نے نئے سے نئے قرآنی تراجم پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔‘‘(۲)

اِس کے بعد لکھا ہے: ’’عملی تجربے سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ بامحاورہ ترجمہ، لفظی ترجمے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ لفظی ترجمہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ بامحاورہ ترجمے میں الفاظ کو آگے پیچھے کرنے کی بھی گنجائش ہوتی ہے اور ترجمے میں الفاظ کے اضافے کی بھی۔ جبکہ لفظی ترجمے میں یہ دونوں سہولتیں نہیں ہوتیں۔ اس میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ عربی لفظ کے نیچے اس کا ترجمہ آئے، اس لیے اس میں اختصار و جامعیت کا بھی اہتمام کرنا پڑتا ہے اور تفصیل واضافے سے بچنے کا التزام بھی۔ ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھنا اس کام کو مشکل سے مشکل تر بنا دیتا ہے، اس پر مستزاد یہ بات کہ قرآن کریم کے لفظ لفظ کا ایسا ترجمہ، جو اس کے مفہوم، زورِ بیان اور اعجاز کو مکمل طور پر اپنے اندر سمیٹ لے، ناممکن ہے۔ الفاظ کے دروبست اور زبان و بیان کی

---

(۱) ترجمۃالقرآن بنام معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اُردو، ص:17۔

(۲) ترجمۃالقرآن بنام معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اُردو، ص:9۔

تعبیرات کلامِ الٰہی کی تاثیر اور اس کی معنویت کو کسی بھی زبان میں منتقل کرنے سے قاصر ہیں۔''(۱)

حافظ صلاح الدین ٹیم کے اِن مقامات سے بھی وہی کچھ معلوم ہو رہا ہے جو سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مذکورہ کلام سے معلوم ہو رہا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ سید مودودی نے ترجمۃ القرآن کو لفظی ترجمہ کہہ کر اُس کی کمزوریاں بیان کیں اور اُن سے بچنے کے لیے ترجمہ کی راہ ترک کر کے ترجمانی کی راہ اختیار کی ہے جبکہ حافظ صلاح الدین پارٹی نے ترجمۃ القرآن کو لفظی ترجمہ اور ترجمانی کی طرف تقسیم کر کے ترجمانی کو ہی بامحاورہ ترجمہ کہا ہے اور اپنے ترجمہ کو بین بین القسمین کہا ہے جسے درایہ کے مطابق کہا جا سکتا ہے نہ روایت کے اِس کا پسِ منظر بھی مذکورہ حقائق سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

ایک اور مشہور مترجم و مفسر پیر کرم شاہ الازہری نے تحت اللفظ ترجمہ اور بامحاورہ ترجمہ کی اِس مہمل و بے مصرف تقسیم کو دُہراتے اور تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے:

''قرآن کریم کے اُردو تراجم جو میری نظر سے گزرے ہیں وہ عموماً دو طرح کے ہیں:

ایک قسم تحت اللفظ تراجم کی ہے لیکن اِن میں وہ زورِ بیان مفقود ہے جو قرآن کریم کا طرہ امتیاز بلکہ اس کی روحِ رواں ہے۔

دوسری قسم بامحاورہ تراجم کی ہے۔ ان میں دِقت یہ ہے کہ لفظ کہیں ہوتا ہے اور اس کا ترجمہ دو سطر پہلے یا دو سطر بعد درج ہوتا ہے اور مطالعہ کرنے والا یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ میں جو نیچے لکھا ہوا ترجمہ پڑھ رہا ہوں اس کا تعلق کس کلمہ یا جملہ سے ہے۔

میں نے سعی کی ہے کہ ان دونوں طرزوں کو اس طرح یکجا کر دوں کہ کلام کا تسلسل اور روانی بھی برقرار رہے۔ زورِ بیان میں بھی (حتی الامکان) فرق نہ آنے پائے اور ہر کلمہ کا

(۱) ترجمۃ القرآن بنام معانی القرآن الکریم لفظ بہ لفظ رواں اُردو، ص:18۔

ترجمہ اس کے نیچے بھی مرقوم ہو۔"(۱)

اِسی طرح مفتی محمد شفیع ترجمۃ القرآن کو قرآن شریف سے حکایت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

"قرآن کا ترجمہ اللہ کے کلام کی حکایت ہے۔"(۲)

یہ بھی مذکورہ حقائق سے غفلت کا نتیجہ ہے ورنہ ترجمۃ القرآن پر حکایت عن القرآن کے اطلاق کا جواز ہرگز نہیں ہے یعنی قضیہ "ترجمۃ القرآن حکایۃ عن القرآن" کہنا کذب ہے کیوں کہ اِس کا نقیض یعنی "ترجمۃ القرآن لیس حکایۃ عن القرآن" کہنا صادق ہے۔ اِس پر دلیل یہ ہے کہ دوسرے کے کلام کی حکایت کرنے کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت:۔ عین اُسی کو مِن وعَن اُس کے اپنے الفاظ میں نقل کیا جائے، جسے روایت باللفظ بھی کہتے ہیں۔

دوسری صورت:۔ اُس کے صرف معانی کو نقل کیا جائے جسے روایت بالمعنی بھی کہا جاتا ہے۔

اور سب جانتے ہیں کہ ترجمۃ القرآن میں اِن میں سے کوئی ایک صورت بھی ممکن نہیں ہے اول اِس لیے کہ اِس صورت میں ترجمہ کا تصور ہی باقی نہیں رہتا۔ دوم اِس لیے کہ متنِ قرآن کے بغیر محض ترجمہ لکھنا جائز نہیں ہے تو پھر "ترجمۃ القرآن لیس بحکایۃ عن القرآن" کا جملہ صادق نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ انجامِ کار یہ کہ مصنف معارف القرآن کا ترجمۃ القرآن کو کتاب اللہ سے حکایت قرار دینے کا پسِ منظر بھی مذکورہ حقائق سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے ورنہ اِن ...ت پر نظر رکھنے والوں سے ایسی غلطی کبھی نہیں ہوسکتی۔ اِس لیے ہم اِس کتاب کے ذریعہ مذ...ت سے دُنیا کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں تا کہ ترجمہ کے نام سے کتاب اللہ کو چوں چوں کا مربہ

(۱) ضیاء القرآن، ص:12، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور پاکستان۔

(۲) معارف القرآن، ج: 1، ص:68، حصہ تمہید، مطبوعہ ادارہ معارف القرآن کراچی نمبر14۔

بنانے کے گناہ سے اجتناب کیا جائے اور اُس کے ترجمہ کے لیے واحد فطری طریقہ کو اپنایا جائے جو ترجمۃ القرآن کی تعریف اور اُس کی شرائط کی تفصیل اور ان کے مابین نسبت کو پیشِ نظر رکھے بغیر ممکن نہیں ہے۔

مذکورہ حقائق سے غفلت کے نتیجہ میں جنم پانے والی تمام غلطیوں کی فہرست میں قابلِ تعجب اور نہایت مضحکہ خیز غلطی وہ ہے جس میں ترجمۃ القرآن کی اِس تعبیر کو ہی غلط کہہ کر اِس کی جگہ ترجمہ معانی القرآن کہا جا رہا ہے کنگ سعود یونیورسٹی الریاض کے لیکچرار حافظ عتیق الرحمٰن نے لکھا ہے:

''مختلف زبانوں کا طالب علم ہونے کے ناطے میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی بھی نص کا بعینہٖ ترجمہ کسی دوسری زبان میں پیش کرنا انسانی بساط سے باہر ہے۔ انتہائی کامیاب مترجم بھی صرف قریب ترین مفہوم پیش کر سکتا ہے جس سے ''گزارا'' چل جاتا ہے یہ تو عام عبارات کا حال ہے۔ قرآن کریم کی آیات تو ویسے بھی ''معجزہ'' ہیں، ان کا ترجمہ کیسے ممکن ہے؟ یہی وجہ ہے کہ علماء نے ''ترجمہ قرآن'' کو غلط عبارت قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ درست عبارت ''ترجمہ معانی القرآن'' ہے۔''(۱)

ہم اُن علماء پر افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے ترجمۃ القرآن کی اِس فطری اور درست تعبیر کو غلط کہا ہے یا اِس کی جگہ ترجمۃ معانی القرآن جیسی غیر فطری تعبیر کا سبق دے رہے ہیں۔ ہمارا تجربہ بتا رہا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں کچھ نیم خواندہ علماء کے سعودیہ کے کچھ علماء سے اختلاط سے جنم پانے والا یہ غیر فطری نام اور نامعقول تعبیر مذکورہ حقائق سے غفلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور حافظ عتیق الرحمٰن ولد مولانا عبدالرحمٰن کیلانی نے اِس کے چار صفحہ بعد لفظی یا بامحاورہ ترجمہ کے عنوان سے لکھا ہے:

(۱) مقدمہ تیسیر القرآن، ص: 1تا2، مطبوعہ دارالسلام وسن پورہ لاہور پاکستان۔

''تراجم میں عموماً اس قضیہ کو بہت اہمیت دی جاتی ہے کہ ترجمہ لفظی ہو یا بامحاورہ ہو۔ اگر ترجمہ لفظی ہو تو مفہوم سمجھ آنا مشکل ہے کیوں کہ مضاف مضاف الیہ اور صفہ موصوف وغیرہ اردو اور عربی میں ایک ہی ترتیب سے نہیں ہوتے۔ اسی طرح بعض اوقات بامحاورہ ترجمہ عربی نص سے کافی مختلف ہو جاتا ہے۔ ہم نے ان دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔''(۱)

ترجمۃ القرآن کی تعریف اور اس کی شرائط کا اجتماع اور اِن کے مابین مساوات کی نسبت کو جاننے والا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ مذکورہ حقائق سے غفلت کا نتیجہ ہے، بے مصرف اور مہمل کلام ہے اور غیر فطری تعبیر ہے۔ ہمیں اِس بات کا بھی تجربہ ہے کہ جناب حافظ عتیق الرحمٰن کیلانی اِس خلاف روایت ودرایۃ تعبیر پر جن علماء کو متفق کہہ رہے ہیں وہ سعودیہ اور ہندو پاک کے محدود ذہن والے چند حضرات کے سوا اور کوئی نہیں ہے جو عرفی مفہوم میں ترجمہ القرآن کی حقیقت، اُس کی جامع و مانع تعریف سے بے خبر، اُس کی شرائط کی تفصیل سے ناآشنا اور شرائط کے اجتماعی وجود اور تعریف کے مصداق کے مابین مساوات کی نسبت سے غفلت کی بِنا پر خود بھی خطاء فکری میں مبتلا ہیں دوسروں کو بھی غلط راہ دکھا رہے ہیں۔ اِس کا واحد علاج یہی ہے کہ اِس کی بنیاد کا ازالہ کیا جائے جو مندرجہ ذیل حقائق کی پہچان سے ہی ممکن ہو سکتا ہے:

1. ترجمۃ القرآن کی تعریف کہ وہ قرآن شریف کے الفاظ کو دوسری زبان کے ایسے الفاظ میں بدلنا ہے جو اُن کے قائم مقام یعنی اُن کی تمام متعارف حیثیات کے مطابق ہوں جن میں اُن کے لُغوی معنٰی سے لے کر مرادی معنٰی تک اور لسانی حیثیت کے جملہ پہلوؤں سے لے کر محاورتی حیثیات تک سب شامل ہیں۔

2. ترجمہ کے الفاظ بمنزلہ جنس ہیں یعنی جنس قریب ہیں۔ ترجمۃ القرآن کے لیے جبکہ

---

(۱) مقدمہ تیسیر القرآن، ص:7، مطبوعہ دارالسلام وسن پورہ لاہور پاکستان۔

مطابقت والی صفت یعنی اصل کی جملہ متعارف حیثیات کے مطابق ہونے والی صفت بمنزلہ فصل ہے یعنی فصل قریب اور معیار ممیز ہے ترجمۃ القرآن کے لیے۔

❸ ترجمۃ القرآن سے غرض وغایت کہ ترجمہ والی زبان کے لوگوں کو قرآن شریف کے اُن معانی ومقاصد سے آگاہ کرنا ہے جنہیں مفہومِ اول اور معانی اصلیہ بھی کہا جاتا ہے جنہیں لسانِ قرآنی والے عام حالات میں محض سننے اور پڑھنے سے ہی سمجھتے ہیں اور اہل عجم قرآن فہمی کے لیے موقوف علیہ علوم وفنون کے ذریعے سے سمجھتے ہیں جبکہ اِن کے علاوہ وہ معانی ومعارف جنہیں مفہوم ثانی کہا جاتا ہے جنہیں جاننے اور اُن پر عمل کرنے پر عام انسان مکلّف نہیں ہیں اور اُن کی معرفت صرف اُن مقدس خواص کو ہی نصیب ہوسکتی ہے جو حدیث نبوی ﷺ ''من عمل بما علم ورثه الله علم مالم يعلم''(۱) کے شرف پر فائز ہوتے ہیں جس میں عربی وعجمی کی تفریق نہیں ہے۔

اِسی طرح اعجاز اور فصاحت وبلاغت میں انسانی استطاعت سے ماوراء ہونے جیسی وہ بے شمار خصوصیات جو قرآن شریف کے ساتھ مختص ہیں ایسی کسی چیز کے ساتھ بھی ترجمہ کا تعلق نہیں ہوتا۔

❹ ترجمۃ القرآن کی تفصیلی شرائط سے آگاہی اور یہ سمجھنا کہ تمام شرائط کا اجتماعی وجود قرآن شریف کے بامحاورہ ترجمہ کو لازم ہے یعنی بامحاورہ ترجمہ اور شرائط کا اجتماعی وجود باہم لازم وملزوم ہیں ایسا نہیں ہوسکتا کہ قرآن شریف کا ترجمہ بامحاورہ ہو لیکن شرائط کا اجتماعی وجود نہ ہو یا شرائط کا اجتماعی وجود ہو لیکن ترجمہ بامحاورہ نہ ہو۔

❺ قرآن شریف کا درست اور معیاری ترجمہ اپنے عرفی مفہوم میں ہمیشہ بامحاورہ ہوتا ہے اور بامحاورہ ترجمہ کی صرف ایک صورت ہوتی ہے کہ دونوں زبانوں کے محاورہ کے مطابق ہو اور

(۱) روح المعانی، ج:1،ص:91،مطبوعہ دارالمعرفہ بیروت۔

بامقصد ترجمہ بھی یہی ہوتا ہے اور ترجمۃ القرآن کی تعریف کا مظہر بھی یہی ہے۔ ترجمۃ القرآن کے حوالہ سے اِن حقائق کو پیشِ نظر رکھنے والے اُسے لفظی ترجمہ، بامحاورہ ترجمہ، تحت اللفظ ترجمہ تفسیری ترجمہ یا معنوی ترجمہ جیسی مہمل تقسیمات کی طرف منقسم کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے کیوں کہ جس چیز کو لفظی ترجمہ کہا جاتا ہے وہ ترجمۃ القرآن نہیں بلکہ ترجمہ الفاظِ القرآن ہے جسے ترجمہ والی زبان کے حوالہ سے مفردات کی تفسیر اور تعریفِ لفظی بھی کہا جا سکتا ہے جس پر ترجمۃ القرآن کا حمل درست نہیں ہے کیوں کہ قرآن محض الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ الفاظ و معانی کے مجموع مرکب سے عبارت ہے۔ نیز اِس میں ترجمۃ القرآن کے تصور کے لیے ناگزیر جزو ''تقوم مقامھا'' مفقود ہے تو پھر ترجمۃ القرآن کا اُس پر اطلاق کیونکر درست ہو۔ اِسی طرح جس چیز کو تفسیری ترجمہ کہا جاتا ہے یا الترجمۃ التفسیریہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جیسا مباحث فی علوم القرآن کے سعودی مصنف المناع القطان نے کیا ہے:

''حیث قال ویحلق لنا ان نقول ان علماء الاسلام اذاقاموا بتفسیر للقرآن یتوخیٰ فیه اداء المعنی القریب المیسور الراجح ثم یترجم هٰذاالتفسیر بامانة وبراعة فان هٰذا یقال فیه(ترجمةتفسیر القرآن)او(ترجمة تفیسیرية)بمعنی شرح الکلام وبیان معناه(بلغة اخری)''(۱)

اُس پر بھی ترجمۃ القرآن کی تعریف صادق نہیں آتی کیوں کہ وہ مترجم کی سوچ اور اُس کی فکری فہم کے نتیجہ کی تعبیر ہے، جسے معانی کی ترجمانی بھی کہا جا سکتا ہے جبکہ ترجمۃ القرآن میں قرآنی الفاظ کے مطابق نپے تُلے الفاظ ہوتے ہیں اور اُن کا اصل کی تمام متعارف حیثیات کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے جس میں مترجم کی رائے کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جیسا ترجمۃ القرآن کی تعریف

---

(۱) مباحث فی علوم القرآن، ص: 288، مطبوعہ المکتبة الرشیدیه جنگی محله پشاور پاکستان۔

"ھو ابدال الفاظ القرآن بالفاظ اللسان الآخر اللتی تقوم مقامھا" سے بالکل واضح ہے۔ اِسی طرح جس چیز کو ترجمہ معانی القرآن کہا جاتا ہے اُس پر بھی ترجمۃ القرآن کی تعریف صادق نہیں آتی کیوں کہ قرآن شریف صرف معانی کا نام نہیں ہے بلکہ الفاظ و معانی کے مجموع مرکب سے عبارت ہے۔ نیز ترجمۃ القرآن جیسی فطری اور متعارف تعبیر کے مقابلہ میں جو حضرات ترجمۃ معانی القرآن کہتے ہیں اُن کے نزدیک معانی سے مراد مترجم کی فکری کاوش ہے جیسے مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف کے ذمہ داروں نے اِس کا اعتراف کیا ہے اور مولانا محمد جونا گڑھی کے ترجمہ مع حاشیہ حافظ صلاح الدین یوسف جو مصحف شریف چھاپا گیا ہے۔ اُس کے مقدمہ میں صاف لکھا ہے:

"انا لندرك ان ترجمة معانی القرآن الكريم مهمابلغت دقتها فانها ستكون قاصرة عن اداء المعانی العظيمة التی يحويها النص القرآنی المعجز وان المعانی التی يؤديها الترجمة انما هی حصيلة مابلغه علم المترجم فی فهم كتاب الله الكريم وانه يعتريها ما يعتری عمل البشر كله من خطاء ونقص"(۱)

جبکہ حقیقت میں قرآن مجید کا ترجمہ کسی مفسر کی فکری کاوش کی تعبیر ہے نہ کسی مترجم کے نتیجۂ فکر کا ترجمہ بلکہ وہ فن ترجمہ کے ماتحت مستقل صنف ہے جس کی تعریف، غرض، موضوع سب سے جدا ہونے کی طرح شرائط بھی امتیازی ہیں اور احتیاطی تقاضے و لوازمات بھی سب سے مختلف ہیں کسی مترجم کے نتیجۂ فکر کا تابع اور اُس پر متفرع ہونے کی بجائے اپنی تعریف پر منطبق اور شرائط کے مطابق ہونے کے سوا اور کسی چیز کے مقتضی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلاف کے سلسلۂ دراز میں بھی کسی نے اِسے ترجمۃ معانی القرآن کے نام سے یاد نہیں کیا بلکہ کل مکاتب فکر اہل اسلام کے قابلِ ذکر حضرات میں سے جس نے بھی اِس حوالہ سے کچھ کلام کیا ہے ترجمۃ القرآن ہی کہا ہے۔ ایسے میں

(۱) مقدمہ، ص: 1، القرآن الكريم و ترجمة معانيه و تفسيره الى اللغة الارديه۔

برصغیر پاک وہند کے کچھ نیم خواندہ علماء کا سعودیہ عربیہ کے علماء سے اختلاط کے اِس جنم ''ترجمۃ معانی القرآن'' کو نا معقول بدعت کہے بغیر کون رہ سکتا ہے جو نہ صرف کل مکاتب فکر اسلاف سے خلاف ہے بلکہ درایۃ وروایت سے بھی برعکس ہے۔ جس کی عمر 20 سال سے زیادہ نہیں ہے اور جائے پیدائش سعودیہ عربیہ کے سوا کہیں اور نہیں ہے جہاں تک اِس کا ایجاد واختلاق سعودیہ کے ساتھ خاص ہونا ہے یہ سب پر ظاہر ہے کہ دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے اسلام اور کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں موجود محافظین اسلام میں سے کسی نے ایسا نہیں کہا ہے جہاں تک اِس کی مدت ایجاد 20 سال سے زیادہ نہ ہونے کا تصور ہے۔ اِس کا پسِ منظر یہ ہے کہ ترجمۃ القرآن کے فطری نام کی تغلیط کر کے اِس کی جگہ ترجمۃ القرآن کی یہ انوکھی تعبیر 1417ھ میں اُس وقت سامنے آئی جب مجمع الملک فہد لطباعت المصحف الشریف نے مولانا محمد جونا گڑھی کے ترجمہ مع حاشیہ حافظ صلاح الدین یوسف شائع کیا اُس کی پیشانی پر لکھا گیا ''القرآن الکریم وترجمة معانيه الى اللغة الاردية'' اِس کے علاوہ مذکورہ ادارہ مختلف زبانوں میں مترجم قرآن مجید شائع کر کے دُنیا بھر کے حجاج وزائرین میں تقسیم کر رہا ہے اُن سب میں ترجمۃ القرآن کی جگہ ترجمہ معانی القرآن لکھا جا رہا ہے اور دُنیا کی مختلف زبانوں میں اِس کی اتنی تشہیر کی جا رہی ہے جس سے گوئبلز کا شیطانی مقولہ ''جھوٹ اتنا بولو کہ سچ محسوس کیا جائے'' یاد آنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر پاک وہند کی کچھ جامعات بھی اِس سے رنگ لے رہے ہیں۔ جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

ہمارے تجربہ میں یہ بھی آیا ہے کہ ترجمۃ القرآن کی حقیقت اور اس کی شرائط اور احتیاطی تقاضوں سے ناواقف حضرات کی نظر میں یہ عام سی بات ہے جبکہ حقیقت میں التباس الحق بالباطل کی راہ ہے ترجمۃ القرآن کے فریضہ کو اُس کے فطری سانچہ سے نکال کر مترجم کی اور اُس کی ذہنی ترجیح کے تابع کرنے کے مترادف ہے جس پر کل مکاتب فکر اہل اسلام کے اسلاف راضی ہیں نہ اخلاف کے اہل بصیرت، یہ جو کچھ میں نے لکھا میرے ضمیر کی آواز تھی، ایمان کا مقتضا تھا اور قرآن مجید کی

حفاظت کے حوالہ سے شرعی مسئولیت تھی جس کا اظہار مجھ پر فرض تھا۔

وماتوفیقی الاباللہ علیہ توکلت والیہ انیب.

اللّٰھم انت تعلم ان ھٰذالیس الاجھد المقل لحق کلامک المجید فتقبّلہ بکرمک واجعلہ وسیلۃ لفتح عیون بصیرۃ علماء الاسلام وانا علی یقین بانہ لایغفر الذنوب الاانت فاغفرلی ذنوبی کلھا جلھا ودقھا ظاھرھا و باطنھا وما انت اعلم بہ،ولیس فی شعوری فلک الحمداولاً وآخراًظاھراً وباطناً

وصلی اللہ علی حبیبہ سید العٰلمین والہ السادات الطیبین الطاھرین وصحابتہ الکاملین المکمِّلین وعلی من اتبعھم الی یوم الدین بفضلک وکرمک یااکرم الاکرمین

واناالعبدالضعیف

پیرمحمد چستی طریقۃ وسلوکا، المسلم مذھبًا،الحنفی مسلکًا،الچترالی مولدًا،البشاوری مسکنًا

خادم القرآن فی الجامعۃ الغوثیہ المعینیہ

فی بلدۃ بشاورپاکستان

یوم الجمعۃ:۱۷:۱۲:۱۴۳۶

وفق

2/10/2015

اصول تکفیر: اس کتاب میں اسلام اور کفر کے مابین حد فاصل سے دنیا کو آگاہ کیا گیا ہے۔حضرت شیخ المشائخ مولانا پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب جب سے چھپی ہے تب سے مختلف مکاتب فکر کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف کفر تقسیم کرنے کی مذموم روش میں کافی توقف آیا ہے، اس موضوع میں اولین، جامع اور سب کے لیے قابلِ تسلیم تصنیف ہونے کی بنا پر اسے عام مقبولیت حاصل ہے اور ہر مکتبہ فکر کے دارالافتاء کو اِس کی ضرورت ہے گویا تکفیر کے لیے شرعی معیار کو سمجھنے کے حوالہ سے مسلمانوں کے کل مکاتب فکر کو اِس کی ضرورت ہے، جس وجہ سے اندرون ملک اور بیرون ملک اس کی مانگ میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

الفداء والجہاد فی الاسلام: اِس میں جہاد سے متعلق جو بھی گوشے ممکن تھے اُن سب کا احاطہ کیا گیا ہے اور فدائی حملوں کی شرعی حیثیت، اُس کی تاریخ اور اُس کی قسمیں اور ہر قسم کے شرعی احکام سے دُنیا کو آگاہ کیا گیا ہے۔ جسے پڑھنا اور سمجھنا دورِ حاضر کے ہر مسلمان کی ضرورت ہے نہ صرف اہل اسلام بلکہ غیر مسلم دانشوروں کے لیے مفید ہے کہ اُنہیں اسے پڑھنے کے بعد جہاد کے حوالہ سے اسلامی احکام تک رسائی ہوسکتی ہے تا کہ اس نام کو غلط استعمال کرنے والوں کی جہالت کی وجہ سے اسلام کی جو بدنامی ہورہی ہے اُس کا ازالہ ہوسکے۔

تفسیر مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن: اِس میں برصغیر پاک وہند کے 34 مشاہیر کے لکھے ہوئے تراجم کا تقابلی موازنہ کیا گیا ہے لیکن اِس کے تقابلی جائزہ پر تفسیر کا پہلو غالب ہے جس میں قرآن شریف کی متعدد آیات مقدسہ کی ایسی دلرُبا و دلکش اور اطمینان بخش تفسیر پیش کی گئی ہے جو کتب تفسیر کے ہزاروں صفحات میں نہیں ملتی جس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر تحقیق و تفسیر یقینیات و بدیہیات پر مبنی ہونے کی وجہ سے نا قابل انکار ہے اور ہر بات باحوالہ ہے جس وجہ سے اسے تمام قرآنی علوم کا خزانہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

التوضیح الاحکم فی شرح فصوص الحکم: موجودہ پُرفتن دور میں کہ جہاں دجل وفریب کو شریعت وطریقت بنا کر پیش کیا جارہا ہے، سلوک وعرفان کی ابجد سے بے خبر جُہال طریقت وسلوک کی راہ کو بدنام کررہے ہیں، حقیقی مشائخ ناپید ہوتے جارہے ہیں بالخصوص شیخ اکبر رحمہ اللہ کی تعلیمات کو سمجھنے کا ذوق رکھنے والے بھی معدوم ہوتے جارہے ہیں۔ اس صورتحال میں شیخ اکبر رحمہ اللہ کی سلوک وعرفان کے اسرار ورموز سے لبریز تحریر فصوص الحکم شریف کو سمجھنے کے لیے حضور شیخ المشائخ حضرت قبلہ پیر محمد چشتی رحمہ اللہ نے ''خطبہ فصوص الحکم'' کی توضیح وتشریح کرنے کا بیڑہ اس نیت سے اُٹھایا کہ جہاں ایک طرف شیخ اکبر رحمہ اللہ کی اس مشہور تحریر کو سمجھنے کے لیے ''پیرِ کامل'' میسر آئے گا تو دوسری طرف سلوک وعرفان کی مکمل روح کو بھی شریعت مطہرہ کی روشنی میں سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

مکتبہ آوازِ حق
دارالعلوم جامعہ غوثیہ معینیہ بیرون یکہ توت پشاور شہر
www.aawazehaq.org

المکتبۃ النظامیۃ
مسجد حضرت ابو ایوب انصاری رض گھنٹہ گھر پشاور
0300-5893316 | 0335-8317496

Abid Printers > 091-2564366

اصولِ تکفیر: اِس کتاب میں اسلام اور کفر کے مابین حدِ فاصل سے دنیا کو آگاہ کیا گیا ہے۔حضرت شیخ المشائخ مولانا پیر محمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب جب سے چھپی ہے تب سے مختلف مکاتبِ فکر کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف کفر تقسیم کرنے کی مذموم روش میں کافی توقف آیا ہے، اس موضوع میں اولین، جامع اور سب کے لیے قابلِ تسلیم تصنیف ہونے کی بنا پر اسے عام مقبولیت حاصل ہے اور ہر مکتبہ فکر کے دارالافتاء کو اِس کی ضرورت ہے گویا تکفیر کے لیے شرعی معیار کو سمجھنے کے حوالہ سے مسلمانوں کے کل مکاتبِ فکر کو اِس کی ضرورت ہے، جس وجہ سے اندرون ملک اور بیرون ملک اس کی مانگ میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

انوار الجہاد فی الاسلام: اِس میں جہاد سے متعلق جو بھی گوشے ممکن تھے اُن سب کا احاطہ کیا گیا ہے اور فدائی حملوں کی شرعی حیثیت، اُس کی تاریخ اور اُس کی قسمیں اور ہر قسم کے شرعی احکام سے دُنیا کو آگاہ کیا گیا ہے۔ جسے پڑھنا اور سمجھنا دورِ حاضر کے ہر مسلمان کی ضرورت ہے نہ صرف اہلِ اسلام بلکہ غیر مسلم دانشوروں کے لیے مفید ہے کہ اُنہیں اسے پڑھنے کے بعد جہاد کے حوالہ سے اسلامی احکام تک رسائی ہوسکتی ہے تاکہ اس نام کو غلط استعمال کرنے والوں کی جہالت کی وجہ سے اسلام کی جو بدنامی ہورہی ہے اُس کا ازالہ ہوسکے۔

تفسیر مدارج العرفان فی التقابل بین تراجم القرآن: اِس میں برصغیر پاک وہند کے 34 مشاہیر کے لکھے ہوئے تراجم کا تقابلی موازنہ کیا گیا ہے لیکن اِس کے تقابلی جائزہ پر تفسیر کا پہلو غالب ہے جس میں قرآن شریف کی متعدد آیاتِ مقدسہ کی ایسی دلرُبا و دلکش اور اطمینان بخش تفسیر پیش کی گئی ہے جو کتبِ تفسیر کے ہزاروں صفحات میں نہیں ملتی جس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر تحقیق و تفسیر یقینیات و بدیہیات پر مبنی ہونے کی وجہ سے ناقابلِ انکار ہے اور ہر بات باحوالہ ہے جس وجہ سے اسے تمام قرآنی علوم کا خزانہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

التوشیح الاعظم فی شرح فصوص الحکم: موجودہ پُرفتن دور میں کہ جہاں دجل وفریب کو شریعت وطریقت بنا کر پیش کیا جارہا ہے، سلوک وعرفان کی ابجد سے بے خبر جُہال طریقت وسلوک کی راہ کو بدنام کررہے ہیں، حقیقی مشائخ ناپید ہوتے جارہے ہیں بالخصوص شیخ اکبر رحمہ اللہ کی تعلیمات کو سمجھنے کا ذوق رکھنے والے بھی معدوم ہوتے جارہے ہیں۔ اس صورتحال میں شیخ اکبر رحمہ اللہ کی سلوک وعرفان کے اسرار ورموز سے لبریز تحریر فصوص الحکم شریف کو سمجھنے کے لیے حضور شیخ المشائخ حضرت قبلہ پیر محمد چشتی رحمہ اللہ نے ''خطبہ فصوص الحکم'' کی توضیح وتشریح کرنے کا بیڑہ اس نیت سے اُٹھایا کہ جہاں ایک طرف شیخ اکبر رحمہ اللہ کی اس مشہور تحریر کو سمجھنے کے لیے ''پیرِ کامل'' میسر آئے گا تو دوسری طرف سلوک وعرفان کی مکمل روح کو بھی شریعت مطہرہ کی روشنی میں سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

مکتبہ آوازِ حق
دار العلوم جامعہ غوثیہ معینیہ بیرون یکہ توت پشاور شہر
www.aawazehaq.org

المکتبۃ النظامیۃ
مسجد حضرت ابو ایوب انصاری رضی گھنٹہ گھر پشاور
0300-5893316 | 0335-8317496

Abid Printers > 091-2564366